خطبات حکیم الاسلام

Mujtaba

نعمان پبلشنگ کمپنی
یوسف مارکیٹ۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار
لاہور ۵ پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تحفہ
جناب پروفیسر مظفر محمود خان

خطبات حکیم الاسلام

جلد نہم

افادات

از

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہ
سابق مہتمم دار العلوم دیوبند

ناشر
نعمان پبلشنگ کمپنی

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون : 7241703 فیکس :

نام کتاب: خطبات حکیم الاسلام جلد نہم

ازافادات: قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

کمپوزنگ: دارالنشر یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون :7356963

کمپوزر: دلدار حسین ۔ طاہر انور

ڈیزائینگ: حافظ محمد احمد چوہدری

ترتیب جدید: نعمان پبلشنگ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون نمبر 7241703 فیکس نمبر

قیمت: ....

ملنے کے پتے

☆ مکتبہ حنفیہ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون:7241703

☆ مکتبہ حنفیہ عقب فائر بگیڈ اردو بازار گوجرانوالہ فون پی پی :215507

☆ مکتبہ صدیقیہ نور محل روڈ بہاولپور فون :0621-875998

☆ مکتبہ مدنیہ ۷ اردو بازار لاہور فون :

☆ مکتبہ العارفی متصل جامعہ اسلامیہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد فون پی پی :717811

☆ مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

☆ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

☆ مکتبہ مکیہ 22 علامہ اقبال روڈ لاہور فون :6374594

☆ مکی دارالکتب یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

☆ مکتبہ رحیمیہ چونگی نمبر 2 اڈہ بازار اکوڑہ خٹک صوبہ سرحد

☆ عزیز کتاب گھر بیراج روڈ سکھر

☆ کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

☆ دارالاشاعت اردو بازار کراچی نمبر ا

سٹاکسٹ ایجنسی شمالی علاقہ جات

☆ مکتبہ المیزان القرآن رزمک اڈہ میرانشاہ صوبہ سرحد

فہرست مضامین خطبات حکیم الاسلام جلد نہم

اساسی عبادات

پہلا مظاہرہ عجز ونیاز کا ہے جس کی صورت نماز ہے۔ اور دوسرا مظاہرہ عشق و محبت کا ہے جس کی صورت حج ہے۔۔۔ اس لئے یہ دو ہی عبادتیں اسلام کی اساس و بنیاد بنائی گئیں جب کہ تمام صفات خداوندی بھی دو ہی نوعوں (جلال و جمال) میں سمٹی ہوئی ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی انہی دونوع صفات کے حقوق ادا کرنے سے ممکن تھی، جن کی تشکیل کے لئے نماز اور حج کے افعال رکھے گئے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ،

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآاِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰی کَآفَّةِ لِلنَّاسِ بَشِیْرًاوَّ نَذِیْرًاوَّ دَاعِیاً اِلَیْهِ بِاِذْنِه وَسِرَاجاً مُّنِیْراً.........
اَمَّابَعْدُ..........
فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بنیادی عبادات

بزرگانِ محترم!
اسلام میں بنیادی طور پر عبادتیں، دو ہی ہیں۔ جن پر پورے اسلام کی عمارت کھڑی ہوئی ہے' ایک نماز' دوسرے حج۔ وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی لامحدود صفاتِ کمال کو اگر اصول طور پر سمیٹا جائے تو دو ہی نوعوں میں سمٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک صفاتِ جمال اور دوسرے صفاتِ جلال۔

منشاء عبادات

صفات جمال مہر و لطف کی صفات ہیں جیسے رحمت و رافت، عفو و کرم، علم و صبر، خلاقی و رزاقی، نگہداشت و حفاظت، راہنمائی و ہدایت، ستاری و مغفرت، جود و عطاء،

انعام واحسان، نصرت واعانت وغیرہ

اور صفات جلال قہری صفتیں ہیں جیسے

قہر وغضب، جبر وتشدد، مواخذہ وانتقام، غلبہ واستیلاء، عزت وجبروت، مالکیت وملکیت، حکومت حاکمیت، سلب ومنع وغیرہ۔ قرآن حکیم نے حق تعالیٰ کی ان دونوں شانوں کی طرف جن کے نیچے یہ دونوعیں آئی ہوئیں ہیں، ان جامع اور معجزانہ الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے

تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ.

جلال کے نیچے قہری صفتیں آجاتی ہیں اور اکرام کے نیچے مہری صفات رہتی ہیں۔

ایک جگہ صراحت کے ساتھ ان دونوں شانوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

نَبِّیءْ عِبَادِیْ اَنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ.

ایک جگہ فرمایا

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ.

ایک جگہ صفاتِ جمال کے افعال بیان فرمائے گئے کہ

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا

اور اسی طرح آگے صفات جلال کے افعال کا تذکرہ فرمایا گیا کہ

وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ

اسی طرح ایک موقع پر صفات مہر کے تحت امیدیں باندھتے رہنے کا حکم دیا اور مایوسی ختم فرمادی کہ

اَنَّهٗ لَا یَیْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ.

”بلاشبہ کفار ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں“۔

اور صفاتِ قہر کے تحت بے خوف ہو جانے سے روکا گیا کہ

فَلَا یَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ.

”اور (آدمی) مطمئن نہ ہو بیٹھے اللہ کی مخفی تدبیر سے“۔

منشاء جلال وجمال　ایک جگہ صفاتِ جلال اور صفاتِ جمال دونوں کے منشاء پر مطلع فرمایا گیا کہ صفاتِ قہر کے ظہور کا منشاء جرائم ہیں اور صفات مہر کے نزول کا منشاء ایمان ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ.

ایک جگہ اولاً شان رحمت کے تحت افعال خیر پر انعام کا ذکر فرمایا گیا اور آگے اسی کے ساتھ شان غضب کے تحت شر پر سزا وانتقام کا ذکر کیا گیا

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ.

بہر حال صفاتِ کمالات کی یہی دو بنیادی نوعیں ہیں جن کے نیچے تمام صفات ربانی آئی ہوئی ہیں۔

جلال و جمال اور مہر و قہر' صفاتِ جمال کا سرچشمہ رحمت ہے۔ اور صفات جلال کا سر منشاء غضب ہے۔ اسی لئے اس کی ذات بابرکت رحمٰن بھی ہے اور غضبان بھی۔ رحمت کی شان سے کرم فرماتا ہے۔ اور غضب کی شان سے تنبیہہ و مواخذہ۔ ظاہر ہے کہ بندوں کو دونوں ہی کی ضرورت ہے کیونکہ مخلوق خیر و شر کے دو مادوں سے مرکب ہے' بندہ کی خیر رحمت خداوندی کو جذب کرتی ہے اور اس کا شر غضب الٰہی کو' اور سب جانتے ہیں کہ ان دونوں نوعوں کے جمع ہوئے بغیر ربوبیت اور پال پرورش کا کارخانہ نہیں چل سکتا۔ ماں ایک طرف بچے کو پیار بھی کرتی ہے اور دوسری طرف اسے گھور کر طمانچے بھی مارتی ہے کیونکہ نرم اور گرم دونوں کے جمع کرنے سے ہی تربیت ہوتی ہے۔

بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ

"(اس کے دونوں ہاتھ' مہر کے بھی اور قہر کے بھی) کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہے صَرف فرمائے"۔

جلال و جمال کے آثار و لوازم یہ دونوں شانیں چونکہ ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ اس لئے ان کے آثار و لوازم اور تقاضوں میں بھی یہی تقابل اور تضاد کی شان پائی جاتی ہے صفات جمال یعنی مہر و لطف کا قدرتی اثر انس و محبت اور گرویدگی و شیفتگی ہے کہ بندہ رام ہو جائے' جھک جائے اور الفت میں سرشار ہو جائے' محو ہو مٹا ہوا ہو' نہ اپنا ارادہ ہو نہ خواہش' نہ اپنی خبر نہ اپنے نام لگے ہوؤں کی پروا' سوختہ جانی ہو اور سوختہ روائی۔ ربودگی میں نہ اپنا باہر کا ہوش ہو اور نہ اندر کا جوش۔ مطمع نظر اور مقصد دل ہمہ وقت محبوب ہو اور اس کی ادائیں' اس کی طرف دوڑنا اور اسی کی طرف بھاگنا' سوتے جاگتے اس کا دھیان اور اس کے تصور میں محویت و سرشاری ہو۔ کہ صفات جمال کا یہی قدرتی تقاضا ہے اور صفات جلال یعنی قہر و غضب کا قدرتی اثر رعب و ہیبت' فکر و مغلوبیت' سرنگونی اور سرافگنی ہے کہ بندہ خوفزدہ اور لرزاں و ترساں رہے' گردن جھکی ہوئی ہو' ناک نیچی ہو' اور دربار شاہی (مسجد) میں حاضر ہو تو نگاہ اعضاء کا ادب پیش نظر ہو' زبان خاموش ہو' چال میں سکون و مسکنت ہو' چہرے سے خوف و خشیت نمایاں ہو' ادب سے دلیاں قدم پہلے ہو اور بایاں پیچھے' قیام دست بستہ ہو' ہاتھ بندھے ہوئے ہوں' نشست ہو تو دوزانو ہو' کھڑا ہونا اور چلنا ہو تو سکون و تواضع سے ہو' نہ دوڑنا' بھاگنا' لپکنا' نہ تھرکنا' سکون و متانت میں ہمہ وقت غرق اور جوش کے ساتھ ہوش میں ہو' ہر آن محو و مستغرق' غرض ہر نقل و حرکت اور ہیبت و وضع میں ادب و خاکساری' ذلت و انکساری اور عجز و نیاز مندی رچی ہوئی ہو۔

خلاصہ یہ کہ صفات قہر جلال چاہتی ہیں کہ اللہ کے بندے اس کے سامنے خوف و خشیت اور

مرعوبیت کے ساتھ نیاز مندانہ حاضر ہوں جن کے روئیں روئیں سے بندگی و مسکنت' غلامی و محکومی اور تمام ضوابط حکومت کی عاقلانہ پابندی ٹپکتی ہو' اور صفات مہر و جمال چاہتی ہیں کہ خدا کے بندے اس کے سامنے انس و محبت' فنائیت و محویت اور استغراق و استہلاک کے ساتھ حاضر ہوں' جن کی ہر ایک نقل و حرکت سے ربودگی' خود گزاری از خود رفتگی' ذوق و شوق اور تسلیم و رضا' عاشقانہ انداز سے نمایاں ہو' پہلی صورت مہذب اور باادب محکوم کی ہے۔ دوسری صورت ایک از خود رفتہ اور از خود گزشتہ عاشق کی ہے یعنی ایک شان کے نیچے آدمی عاشق فنا پسند ہوتا ہے۔ ایک کے نیچے عاقل فکر مند اس لئے اللہ کی ان دونوں صفات (جلال و جمال) کے تقاضوں سے انسان پر دو ہی قسم کی عبادتیں فرض ہوئیں۔ صفات جلال کے تحت اظہار عجز و نیاز اور مظاہرہ ذلت و مسکنت کی عبادت رکھی گئی جس کی صورت نماز ہے۔۔۔ اور صفاتِ جمال کے تحت اظہارِ عشق و محبت اور مظاہرہ محویت و فنائیت کی عبادت فرض ہوئی جس کی صورت حج ہے۔

نماز شان کبریائی کا مظہر

چنانچہ نماز کے ایک ایک عمل سے اپنی ہی فدویت و عبدیت' لجاجت و سماجت اور مرعوبیت و ہیبت زدگی نمایاں کی جاتی ہے جس میں فکر و عقل کے ساتھ ادب و شائستگی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ ابتداءِ نماز ہی سے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر دنیا و مافیہا سے بیزار ہونا اور اس کے ساتھ اپنے حاکم مطلق اور بادشاہ عالمین کی بڑائی کا اعلان کرنا ہے جس کا نام تکبیر تحریمہ ہے۔ پھر چاکروں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا جس کا نام قیام ہے۔ پھر ذلیلوں کی طرح سے جھکا دینا جس کا نام رکوع ہے پھر انتہائی پستی کے ساتھ ہاتھ' ناک اور پیشانی زمین پر ٹیک دینا جس کا نام سجدہ ہے۔

پھر انتہاء ادب و تعظیم کے ساتھ اس کی یکتائی کی شہادت دینا جس کا نام تشہد ہے۔ پھر انتہائی بے بسی اور محتاجگی کے ساتھ اسے پکارنا جس کا نام استغاثہ و فریاد ہے۔ پھر کمال ضعف و بے زوری اور انتہائی خوشامد کے ساتھ بھیک مانگنا جس کا نام دعا ہے پھر انتہائی تعلق و نیاز مندی کے ساتھ اس کے نائبوں اور خلفاء (انبیاء و اولیاء) تک پر صلوٰۃ و سلام بھیجنا جس کا نام درود اور صلوٰۃ و سلام ہے۔ پھر انتہائی عقیدت و نیاز سے حاضرین دربار (شرکاء جماعت اور ملائکہ) کو دو طرفہ سلام دے کر رخصت ہونا' جس کا نام تحلیل و تسلیم ہے وغیرہ وغیرہ عاجزانہ اور محکومانہ افعال ہیں جو بلحاظ حقیقت اللہ کی صفت حکومت و مالکیت اور حاکمیت و بادشاہت کا طبعی تقاضا ہیں۔ پس نماز اس کی شان کبریائی۔۔۔ اور شان جلال و حکمرانی کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور بندہ میں خوف و خشیت کی تخم ریزی کرتی ہے جس سے وہ قانون الٰہی کی نافرمانی اور فواحش و منکرات سے بچ کر مقرب بارگاہ بن جاتا ہے۔

حج، ذاتی محبوبیت کا مظہر

ادھر حج کے ایک ایک رکن اور ایک ایک سنت وواجب سے عاشقی، محبت وانس اور محبوب پر مر مٹنے کا والہانہ اور شیدایانہ انداز سے ثبوت دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حج میں مشغول انسان کی عاشقانہ کیفیات اور از خود رفتگی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے تن من دھن کی کچھ پروا نہیں رہتی نہ کپڑوں کی خبر، نہ آرائش وزیبائش کی پروا، نہ وضعدار لباس نہ قطع وبرید کی بوباس، بال بکھرے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے، لبیں پھیلی ہوئیں۔ رواں چکتا ہوا، ننگے سر، ننگے پاؤں، کپڑے گرد آلود، بدن پر میل کچیل کی نمود، در محبوب پر سربہ سجود، گھر سے بے گھر، تارک مال وزر، نہ کھانے کی پروا، نہ پینے کی خبر، دل پر نہ لذت نکاح کا اثر نہ تن پر آثار دولت وزر، نہ صفائی وستھرائی سے سروکار، نہ عطر وخوشبو کا روادار، نہ غسل کا دھیان نہ نظافت کا وہم وگمان، آثار ومحبت سے وارفتہ، گریہ وبکا سے سوختہ۔ رسمی وقار سے دل گرفتہ، خانہ محبوب کے تصور میں از خود رفتہ حضوری ہو تو حاضر حاضر کہہ کر چلنا۔ غیبت ہو تو دم بخود ہو جانا، اور محبوب سامنے آئے تو لپکنا، خانہ محبوب کے اردگرد چکر لگانا، درودیوار کو چھونا، پردہ ہائے دیوار سے لپٹنا اور رونا کہیں شوق میں لپکنا، کہیں خوف سے تھمنا، کہیں ذوق سے دوڑنا کہیں رعب جمال محبوب کا تصور آئے تو اکڑنا اور سینہ تان لینا، تجلی محبوب نمایاں ہو تو سرنگوں ہو جانا، اور دشمن محبوب (شیطان) کا مقام سامنے آجائے تو کنکر پتھر لے کر لپکنا اور مارنا، ہر لذت ہر زینت، اور ہر رسمی صورت سے بیزار رہنا کسی ایک جگہ قرار نہ پکڑنا، کوچہ ہائے محبوب کے در کی خاک چھاننا، کبھی مکہ تو کبھی منیٰ، کبھی عرفات، کبھی مزدلفہ نہ چال میں سکوں، نہ انداز میں قرار کبھی یہاں اور کبھی وہاں۔ اپنے کو مٹا دینے کا جذبہ اور تن من دھن کو خاک میں ملا دینے کا داعیہ اور آخر فدائیت وجاں سپاری کی انتہا پر اپنے نفس کو بھی باذن محبوب فدیہ حیوان دے کر فدا کر دینا ذرا بھی کسو تاہی ہو تو مال وزر دے کر خوشامد سے تلافی کرنا، وسیلہ محبوب کا دھیان آئے جس کی بدولت رسائی ممکن ہو تو سوجان سے وہاں حاضر ہونا، سلام کرنا، لجانا اور شوق وذوق سے عرض ومعروض کر کے وسیلہ لینا وغیرہ وہ عاشقانہ افعال ہیں جو عشق ومحبت کے جذبہ میں فطرتاً عاشق سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی صفات جمال اور ذاتی محبوبیت کا مقتضا ہیں۔

حسن تعبیر

ان میں سے ترک آسائش وآرائش اور ترک وزیبائش کے مجموعہ کا نام احرام ہے خانہ محبوب کے اردگرد گھومنے کا نام طواف ہے۔ تصور اعداء کے موقعہ پر سینہ تان کر اکڑنے کا نام رمل ہے۔ ذوق وشوق میں دوڑنے کا نام سعی ہے کوچہ ہائے محبوب کے دروں کی خاک چھاننے کے نام سیاحت حج ہے۔ خاک صحن پر ٹھہر کر گریہ وبکاء کرنے اور شوق وصال کے اظہار کا نام وقوف ہے۔ شیطان پر پتھر برسانے کا نام رمی ہے۔ اور فدیہ حیوان کے ذریعہ خود فدا ہو جانے کا

نام نحر ہے ان میں سے کسی بھی عاشقانہ فعل میں فروگزاشت کا نام جنایت ہے۔ اور اس کے تدارک و تلافی کا نام صدقہ و کفارہ ہے۔ اور پھر افعال کے مجموعہ کا نام مناسک ہے۔ اور پھر وسیلہ محبوب نبی کریم علیہ کے دربار (مدینہ) میں حاضر ہو کر زیارت کرنے اور صلوۃ وسلام کے بعد ہزار خوشامد سے وسیلہ لینے کا نام زیارت و توسل ہے۔

عجز و عشق کے مظاہر

بہر حال پہلا مظاہرہ عجز و نیاز کا ہے جس کی صورت نماز ہے۔ اور دوسرا مظاہرہ عشق و محبت کا ہے جس کی صورت حج ہے۔ اس لئے یہ دو ہی عبادتیں اسلام کی اساس و بنیاد بنائی گئی ہیں۔ جب کہ تمام صفات خداوندی بھی دونوعوں (جلال و جمال) میں سمٹی ہوئی ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ کے حقوق کے ادائیگی انہی دونوع صفات کے حقوق ادا کرنے سے ممکن تھی جن کی تشکیل کے لئے نماز اور حج کے افعال رکھے گئے۔

اس لئے اصولاً اسلام میں یہ دو ہی عبادتیں اصل ٹھہرتی ہیں کہ بلحاظ حقیقت ان کے سوا کوئی دوسری صورت عبادت کی ہے بھی نہیں، کہ عبادت کی متقاضی صفات کی نوعیں ہی یہ دو ہیں دو سے زائد نہیں۔

زکوۃ وروزہ کی حیثیت

رہ گئی زکوۃ اور روزہ کہ عبادت انہیں بھی کہا گیا، بلکہ نماز و حج کی طرح مبانی اسلام میں شمار کرایا گیا ہے، سو بلاشبہ وہ عبادت ہیں اور اسلام کی اساسی عبادت ہیں لیکن پھر بھی ان کے اور نماز حج کے عبادات ہونیکی نوعیت میں زمین آسمان کا فرق ہے غور کیا جائے تو زکوۃ اور روزہ خود اپنی ذات سے نہ عبادت ہے نہ اپنی ذات سے براہ راست مطلوب ہیں بلکہ نماز و حج کی خاطر مطلوب اور انہی کی بدولت عبادت بنی ہیں زکوۃ تو نماز کے تابع ہو کر اس کے وسیلہ کی حیثیت سے عبادت بنتی ہے اور روزہ حج کے تابع ہو کر اس کے وسیلہ کی حیثیت سے عبادت ہوتا ہے بالفاظ دیگر زکوۃ نماز کے مبادی اور وسائل میں سے ہے اور روزہ حج کے مبادی اور وسائل میں سے ہے اور وسیلہ چونکہ حکم میں مقصد ہی کے ہوتا ہے اس لئے یہ دونوں بھی نماز و حج کی وجہ سے عبادت بنادی گئیں خود اپنی ذات سے عبادت نہیں ہیں۔

موانع نماز اور ان کا تدارک

وجہ یہ ہے کہ اہم عبادت میں اگر کوئی چیز حارج اور سدراہ ہے تو وہ سامان عیش اور وسائل عشرت ہیں جن کی لذتوں میں پڑ کر انسان میں نماز سے غفلت اور سستی و کسل پیدا ہوتا ہے اور آدمی جماعت سے ہی نہیں بلکہ نماز ہی سے بیگانہ ہو جاتا ہے کیونکہ نفس کی توجہ ایک آن میں دو طرف نہیں ہو سکتی ظاہر ہے کہ نفس کے

مرغوبات جب نفس کو اپنی طرف کھینچ لیں گے تو مرغوب روحانی کی طرف کیسے متوجہ ہو سکے گا؟اس لئے اکثروبیشتر امراء ہی نماز سے غافل ہوتے ہیں۔۔۔ کیونکہ ان کے ارد گرد جب اسباب عیش ونشاط اور لذات نفس کا ہجوم رہتا ہے تو انکے نفس کو طبعاً مسجد کی طرف دوڑنے کی فرصت ہی نہیں مل سکتی کہ نماز کی طرف رخ کریں' البتہ غرباء قلیل العیش اور محروم الوسائل ہوتے ہیں اس لئے عموماً وہ تعیش سے فارغ رہتے ہیں توان کا فارغ نفس بھی بے تکلف نماز کی طرف دوڑ سکتا ہے۔

امراء نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے

اس لئے شریعت نے مال وزر اور وسائل عیش و عشرت میں (جن میں لگ کر آدمی نماز اور مسجد سے غافل ہوتا ہے) توازن اور اعتدال پیدا کرنے اور انہیں کم کرنے اور دلوں سے ان کی محبت و شغف نکال دینے کے لئے زکوٰۃ وصدقات کی عبادت رکھی تاکہ مال دولت کو راہ خدا میں خرچ کرنے اور لٹانے کے علاقے سے انسانی نفس میں سے زر پرستی اور اس سے پیدا شدہ تعیش پسندی کے غیر معتدل جذبات نکل جائیں اور مال لٹانے کی سالانہ عبادت' پھر روزمرہ کے صدقات کی خوبیاں سے خود نفس کو بھی راہ خدا اور اور راہ عبادت میں لٹادینے کے جذبات پیدا ہو جائیں۔

پھر چونکہ وسائل عیش کا تعلق صرف نقد وزر ہی سے نہیں بلکہ زمینی پیداوار اور پالتو جانور 'سواریوں کے حیوانات' زرتار لباسوں ' زریں برتنوں حتی کہ ہر تجارتی سامان سے ہے اس لئے شریعت نے زکوٰۃ کا دائرہ بھی صرف نقود سونا چاندی اور دولت زر تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ تمام وسائل عیش میں اپنی اپنی شرائط وحدود کے ساتھ زکوٰۃ رکھی چنانچہ پالتو جانور' گھوڑے' اونٹ گائے بھینس' بکری وغیرہ میں زکوٰۃ رکھی۔۔۔ کھیتوں کی پیداوار وغیرہ میں زکوٰۃ رکھی جس کا نام خمس ہے' پھر ہر ایک مال تجارت پر زکوٰۃ رکھی خواہ وہ مٹی ہی کیوں نہ ہو۔ جس سے زر و مال بڑھنے اور اس کے بڑھنے۔۔۔ سے وسائل عیش اور سامان راحت بڑھنے کا قدرتی تعلق ہے اور وہی تعلق نفس کو عیش پرستی میں مبتلا کر کے عبادت سے غافل اور بے تعلق بنا دیتا ہے' ظاہر ہے کہ جب رکاوٹ کے اسباب ہٹ جاتے ہیں تو شے وجود پذیر ہو جاتی ہے۔ پس جب راہ عبادت کا حارج یعنی زر و مال اور وسائل عیش وعشرت کو بہ صورت زکوٰۃ وصدقات راہ خدا میں فنا کر دینے کی عادت پڑ گئی اور دل میں ان کی رغبت میں شدت اور ہوس قائم نہ رہی تو نماز سے رکاوٹ ڈالنے والے اسباب ختم ہو گئے اس لئے نماز آسان ہو گئی پس زکوٰۃ وصدقات درحقیقت نماز کو بروئے کار لانے کے لئے فرض کی گئی ہے' اس لئے عبادت کی لائن میں نماز اصل ہوئی اور زکوٰۃ اس کے تابع ہو کر عبادت بنی جب کہ وسیلہ مقصود حکم

میں مقصود ہی کے ہوتا ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ زکوٰۃ مبادی نماز میں ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں جگہ جگہ زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ :

اس انداز کی بکثرت آیتیں اس کی شاہد عدل ہیں۔

وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ

نماز کی تمہید

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کے پاس مال وزر نہ ہو اور وہ خود ہی نان شبینہ کا محتاج ہو تو اس پر زکوٰۃ کی فرضیت ہی نہیں کیونکہ علاوہ تکلیف مالا یطاق کے یہاں زکوٰۃ کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ زکوٰۃ نماز کے موانع رفع کرنے کے لئے رکھی تھی جب یہاں موانع صلوٰۃ ہی نہیں تو رفع موانع (زکوٰۃ) کی حاجت ہی کیا ہو سکتی ہے؟ چنانچہ اس قسم کے غریب مسکین انسان عام حالات میں نماز سے بھی بیگانہ نہیں ہوتے کیونکہ جب وسائل عیش ہی مفقود ہیں جو عبادت اور بالخصوص نماز میں حارج ہوتے تھے تو ایک بے زر اور بے پر آدمی طبعی طور پر خدا ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور نماز میں کبھی سست نہیں ہوتا اسی لئے مسلم کو عام حالات میں زہد و قناعت کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ وہ جس قدر قلیل العیش ہوگا اسی قدر طاعت و عبادت کی طرف رخ کئے ہوئے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی اسے زکوٰۃ سے بیگانہ بنانے کے ہوئے اگر زکوٰۃ بذاتہ مقصود ہوتی تو بجائے زہد و قناعت کے تمول اور تکاثر مال کی ترغیب دی جاتی بہر حال دولت ہو تو اس پر اندرون حدود زکوٰۃ و صدقات کے احکام عائد ہو کر اسے قلیل العیش بنا دیتے ہیں اس لئے ان دونوں ہی صورتوں میں آدمی اپنے مقصد تخلیق (عبادت) کی طرف توجہ کئے ہوتا ہے جس سے واضح ہے کہ دولت و مال چونکہ راہ عبادت میں حارج ہوتا ہے اور اس کے نہ ہونے یا کم ہونے کی صورت میں کارخانہ عبادت میں خلل نہیں پڑتا۔

اس لئے زہد و قناعت اور مال کو لٹانے یا گھٹانے کی ترغیبیں دی گئیں جس سے زکوٰۃ کا وسیلہ عبادت اور بالخصوص وسیلہ نماز ہونا نمایاں ہے۔ اور ثابت ہو جاتا کہ حقیقی عبادت اگر ہے تو وہ نماز ہی ہے جس کے بغیر تعلق مع اللہ پیدا نہیں ہو سکتا اور زکوٰۃ اس کا وسیلہ اور اسے بروئے کار لانے کی ایک تمہید ہے خود اصل نہیں۔

موانع حج اور ان کا تدارک

ادھر حج کی عاشقانہ عبادت چونکہ مظاہر محبت ہے اور محبت میں سب سے پہلی چیز ماسوا اور غیر محبوب کا ترک ہے ورنہ اگر عاشق غیر محبوب کی طرف مائل ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ محبوب کی طرف اس کا میلان یا سرے سے ہے ہی نہیں یا ہے تو کمزور ہے، تو اسے عاشق ہی کیوں کہیں گے۔

پس ایک حج کرنے والے عاشق خداوندی کا پہلا قدم خدا کے ماسوئی کو ترک کر دینا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ماسوئی اللہ مرغوبات نفس ہی ہو سکتے ہیں۔ جن میں بڑا مرغوب جس سے انسان کا دل اٹکا ہوا رہتا ہے۔ وہ کھانا پینا اور عورت سے لذت حاصل کرنا ہے کہ دنیا کے سارے جھگڑے انہیں چند مرغوبات نفس کے لئے آدمی سر لیتا ہے ظاہر ہے کہ جب تک دل میں ان چیزوں سے شغف اور کمال رغبت باقی رہے گا۔ محبوب حقیقی (حق تعالیٰ شانہ) کا شغف و عشق اس دل میں کہاں سے جگہ پاسکے گا؟ اس لئے اس محبت و عشق کی عبادت یعنی حج کے ابتدائی مراحل میں ایک عاشق خداوندی کے لئے سب سے پہلے کھانے پینے اور بیوی کی لذت اٹھانے کے شغف اور غیر معمولی لگاؤ سے الگ رہنا قدرتاً ضروری ہو جاتا ہے۔

ورنہ عشق الٰہی کا مظاہر جسے حج کہتے ہیں شروع ہی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے شریعت نے حج کے مہینوں سے قبل متصلاً ہی رمضان کا مہینہ رکھا تاکہ تین دن تک نفس کے ان اولین مرغوبات کھانا پینا اور لذت جماع کی غیر معمولی خواہش کو روزہ کے ذریعے کم سے کم کر دیا جائے۔ پس مہینہ کے تیس دنوں میں دن بھر تو یہ لذتیں روزہ کے ذریعہ بالکل ہی چھڑا دی جاتی ہیں اور بھوک پیاس سے کمزوری لاحق ہو جانے سے رمضان کی راتوں میں بھی آدمی ان لذتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں رہتا ادھر راتوں میں تراویح اور تلاوت قرآن پاک کا شغل مقرر کر دیا گیا جس سے ان لذات کے لئے کچھ وقت بھی پورا نہیں ملتا کہ آدمی کا دل ان میں پھنسے اس لئے یوں کہنا چاہئے کہ پورے ایک ماہ تک ان لذتوں سے بیگانہ رکھ کر رمضان میں یہ بنیادی لذتیں چھڑا دی جاتی ہیں تاکہ ان مرغوبات نفس کی خواہش ابھری ہوئی نہ رہے بلکہ ان کی محبت و رغبت کا دھیان دب جائے اور آدمی ان سے بیگانہ ہو کر محبت حق کے مظاہرہ کے قابل ہو جائے۔

حکمتِ اعتکاف

لیکن اس کے بعد بھی گھر بار کی محبت بدستور باقی رہتی تھی، مکان کی آسائش اور گھریلو سامان کی محبت جوں کی توں قائم تھی۔ حالانکہ یہ بھی وہی ماسوی اللہ ہے جو محبت الٰہی میں خلل انداز ہوتی ہے۔ خواہ دوسرے ہی درجہ میں سہی، اس لئے رمضان کے بیس دن گزرنے کے بعد عشرۂ آخر میں اعتکاف کی سنت کے ذریعہ گھر بھی چھڑا دیا جاتا ہے تاکہ آدمی گھریلو زندگی چھوڑ کر خانہ خدا میں پہنچے اور رات دن وہیں بسر کرے اور اس طرح کھانے پینے اور لذت جماع سے بیگانگی کے بعد وہ گھریلو سامان سے بھی دستبردار ہو جائے اور اس طرح نفس کے اور دوسرے محبوبات بھی ترک کرنے کی اس میں استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جائے۔

خطاب حج

پس! ماہ رمضان میں ان بنیادی لذات کے ترک کر دینے کی مشق سے جب آدمی کا دل محبوب حقیقی کی طرف بڑھ گیا اور اس کی طرف دوڑنے کی اس میں قریبی استعداد پیدا ہو گئی تو رمضان ختم ہوتے ہی اشہر حج (حج کے مہینے) شروع ہو جاتے ہیں اور افعال حج کے آغاز کا وقت آجاتا ہے کہ آدمی دیار محبوب کی طرف دوڑ پڑے گویا اس عاشق خداوندی کی طرف کھانے پینے بیوی بچوں اور گھر بار سے دل ہٹا لیا تھا۔ شرعی خطاب متوجہ ہوتا ہے کہ اس عشق کی راہ میں کھانا پینا بیوی اور گھر چھوڑ دینا کافی نہیں ہے اب وطن بھی ترک کر دو اور دیار محبوب کی طرف کوچ کر دکہ وطن بھی ایک بڑا بت ہے جو راہ خدا میں حارج ہوتا ہے۔

حکمتِ احرام

پھر یہ عاشق خداوندی جب وطن چھوڑ کر جنگلوں بیابانوں اور پہاڑوں کی خاک چھانتا ہوا اور سمندروں کو عبور کرتا ہوا دیار محبوب میں داخل ہو گیا تو حرم الٰہی کی میقات آتے ہی محبوب حقیقی کا حکم یہ ملا کہ یہ کھانے پینے زن و فرزند گھر بار اور وطن و ملک کا چھوڑ دینا بھی اس راہ عشق میں کافی نہیں بلکہ لباس زینت بھی ترک کرو سلے ہوئے کپڑے بھی چھوڑ دکہ اس لذت کا شغل بھی محبوب حقیقی کے وصال میں حارج اور عشق کی غیرت کے خلاف ہے۔ صرف تن ڈھانکنے کی حد تک احرام کی کفنی پر قناعت کرو ایک چادر بدن کا نصف بالا ڈھانکنے کے لئے اور ایک چادر بدن کا نصف زیریں۔۔۔ چھپانے کے لئے ہو نہ سر پر ٹوپی اور عمامہ ہو جو سر کو ڈھانپ دے نہ پیر میں کوئی گھیرا جوتا جو پورا ڈھانپ لے تاکہ جیسے رمضان میں اس عشق الٰہی کا باطن گرویدہ محبت ہو چکا تھا اب اس کا اظہار بھی آثار عشق سے ہو جائے اور اس عاشق الٰہی کو عشق میں تن من دھن کی کوئی خبر نہ رہے۔

عاشقانہ بول

لیکن اس ظاہر و باطن کے درمیان کی ایک چیز ابھی باقی تھی جو ابھی تک آثار عشق سے متاثر نہیں ہوئی تھی اور وہ زبان ہے جو کسی حد تک ظاہر ہے اور کسی حد تک باطن یعنی ظاہر و باطن کے درمیان ایک برزخ ہے جو باطن کی تو ترجمان ہے اور ظاہر کی نگہبان ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اسے بھی اس عشق سے حصہ ملے اور ظاہر ہے کہ زبان کا حصہ قول اور بول ہی کی شکل کا ہو سکتا تھا اس لیے اسے عاشقانہ بول دیا گیا کہ وہ قدم قدم پر خود اپنی ترجمانی کی بجائے محبوب حقیقی کی محبت کی ترجمانی کرے اس لئے احرام باندھتے ہی زبان کو لبیک لبیک کے کلمہ سے ذکر محبوب کا پابند بنایا جاتا ہے تاکہ زبان کے ذریعے نفس اور خواہشات نفس کی ترجمانی نہ ہو بلکہ حضوری حق کے جذبات کی ترجمانی ہو اور اس قینچی کی طرح چلنے والی زبان کے تقاضے آزاد نہ رہیں کہ وہ جتنا چاہئے اور جو چاہے بولتی رہے اس لئے عاشق کے ان ایام عشق میں ہر تغیر اور ہر موڑ پر لبیک کا نعرہ

لازم کر دیا گیا ہے کہ ہر نیچائی اونچائی ہر پہاڑ ہر غار، ہر قافلہ ہر جماعت کی مڈ بھیڑ پر یہی عاشقانہ ووالہانہ نعرہ زبان پر چھایا ہوا رہے کہ لبیك اللھم لبیك لبیك لاشریك لك لبیك پس اس طرح کی آزاد لذت بھی اس عاشق حق سے ترک کرادی گئی اور یہ عاشق اپنی زبان اپنے دل اور اپنے تمام تر اعضاء وجوارح سے صرف اپنے محبوب حقیقی ہی میں مشغول ومنہمک ہو گیا۔

حکمتِ طواف

اب جب کہ خانہ محبوب تک رسائی ہو گئی۔ آدمی مکہ محترمہ اور حرم محترم میں پہنچ گیا اور خانہ خدا کے سامنے آ گیا جسمیں جمالات حق تجلی ریز ہیں تو پھر شرعی خطاب متوجہ ہوا کہ تم نے اب تک محبوبات نفس گھر بار وسائل عیش اور اسباب راحت وعیش کی خاطر بہت چکر لگائے تھے اب یہ حال اور چکر ان سب چیزوں سے ختم کر کے خانہ محبوب کے لیئے مختص کر دو، اور عشق کی وارفتگیوں میں غرق ہو کر محبوب کے گھر کے ارد گرد پروانوں کی طرح چکر لگاؤ ایک دو پھیروں سے نہیں بلکہ سات پھیرے پھر وجو فن حساب کی رو سے عدد زائد ہے اور کبھی گھٹنے والا نہیں پھر طواف بھی ایک دوبار نہیں بلکہ ان پاک ایام اور مکہ کے قیام کی اعلیٰ ترین عبادت ہی یہ چکر لگانا اور خانہ محبوب کے ارد گرد گھومتے پھرتے رہنا ہے جس کا نام طواف ہے۔

حکمتِ وقوفِ عرفات

پھر مکہ کے مقدس شہر کا قیام گو وطن کا قیام نہیں مگر بہر حال شہر کا قیام ضرور ہے۔ اس میں وطن کی عمارتیں نہ سہی بلدِ الٰہی کی ہی سہی جو شہری زندگی کی ساری راحتیں لذتیں اور زینتیں لئے ہوئے ہیں اور عاشق کی شان غیرت کے یہ بھی خلاف تھا کہ عاشق کا دل عمارتوں اور سامان عیش وتمدن میں کسی بھی درجہ میں اٹکا رہے اس لئے اصل حج کے لئے جو حقیقی طور پر شان عشق کا مظاہرہ تھا ایام حج میں حکم یہ ملا کہ مکہ کی شہری آبادی بھی ترک کرو اور عرفات کے ریگستان میں ننگے سر ننگے پاؤں کفنی پہنے ہوئے پہنچو کہ اصل حج یہی ہے کہ ایک چٹیل میدان میں ایک کپڑے کا مسافر خانہ یعنی خیمہ ہو اور تم ہو۔ تاکہ اعلیٰ ترین ترک لذات کا مقام حاصل ہو جائے جو ایک عاشق کے لئے سزاوار واجبات عشق کے لئے درکار ہے۔

فدیۂ جان

ہاں مگر پھر بھی سب تروک کے بعد عاشق کا نفس ابھی عاشق کے پاس ہی تھا جس کی رو سے وہ اپنے کو "انا" اور "میں" کہہ سکتا تھا۔ دار انحالیکہ کمال عشق کے لئے یہ بھی ایک چیلنج ہے کہ عاشق اپنی ہستی کو برقرار رکھ کر بمقابلہ محبوب اس کا تصور بھی دل میں قائم رکھے۔ بلکہ اس کا آخری فریضہ یہ ہے کہ راہ محبوب میں اپنے نفس کو بھی ایثار کر دے اور اس ظاہری

ہستی سے بھی سبکدوش ہو جائے تو خطاب شرعی متوجہ ہوا کہ عرفات سے لوٹ کر منی پہنچو اور اس کے قطعہ جاں سپاری میں پہنچ کر جسے منحر کہتے ہیں نثار ہونے کے لئے اپنی جان بھی پیش کر دو یعنی اسے بھی ترک کرنے کا عزم باندھ لو اب یہ محبوب حقیقی کا لطف و کرم ہے کہ اس سچے عاشق کی طرف سے جس نے اپنی ساری زندگی کی تمام لذات اور آخر کار خود زندگی ہی کو پیش کر دیا قبول فرما کر اس کی جان کے بدلے قربانی کے جانور کی جان بطور فدیہ قبول فرمالے اور اس کے بعد پھر گھر لوٹ جانے اور متروکہ وسائل عیش سے لذت اندوز ہونے کی اجازت عطا فرمائے۔

اس لئے منی میں قربانی کا حکم ہوا کہ جان کا فدیہ یہ خود تمہارا اپنے نفس کا فدا ہونا ہی سمجھا جائے گا پس محبوب کے لئے آخر میں جان بھی پیش کر دی جاتی ہے جو عشق کا انتہائی مقام ہے۔

مقدمہ حج

بہر حال اس سے واضح ہے کہ حج تروک کا مجموعہ ہے، ترک لذت، ترک زینت، ترک راحت خانہ، ترک لباس ترک وطن ترک جاہ۔۔۔ اور ترک مال وغیرہ جس کی ابتداء کھانے پینے او عورت اور گھر کے ترک کرنے سے ہوتی ہے، یہی دینوی زندگی کی لذت کا اعظم ترین حصہ ہے بلکہ دوسری لذات کا سر چشمہ ہے، جسے اشہر حج سے قبل کے مہینے (رمضان) میں حج کی خاطر چھڑا دیا جاتا ہے تاکہ آئندہ کے تروک کی استعداد پیدا ہو جائے اگر کھانے پینے اور بیوی۔۔۔ سے کنارہ کشی کی استعداد پیدا نہ کی جائے تو اگلے کسی ترک پر بھی آدمی مستعد اور آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے روزہ کی عبادت در حقیقت حج کا مقدمہ ثابت ہوتی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی عبادت نماز کا مقدمہ ثابت ہوئی تھی جس سے پوری طرح کھل جاتا ہے کہ اسلام میں اصل عبادتیں دو ہی ہیں نماز اور حج۔ ایک صفات جلال کا تقاضا ہے اور ایک صفات جمال کا اور زکوٰۃ اور روزہ ان کے وسائل اور مبادی میں سے ہیں۔ جنہیں ان دو کی وجہ سے عبادت بنا دیا گیا ہے۔ خود بذاتہ عبادت کے بارہ میں اصل نہیں ہیں۔

زکوٰۃ و روزہ ''عبادت لغیرہ'' ہیں

یہی وجہ ہے کہ جہاں نماز اور حج میں وسائل دولت یا وسائل لذت کے حارج ہونے کا امکان نہ ہو وہاں نماز اور حج تو ہو گا مگر زکوٰۃ و روزہ کی عبادت نہ ہو گی جیسے ملائکہ کو نماز بھی دی گئی ہے وہ ہر وقت رکوع و سجود اور قیام میں ہیں اور حج بھی دیا گیا ہے۔ کہ وہ روزانہ ساتویں آسمان پر ''بیت المعمور'' کا حج اور طواف کرتے ہیں بلکہ ہر آسمان میں بیت المعمور کی سیدھ میں ایک ایک قبلہ ہے جس کا اس آسمان کے باشندے طواف کرتے ہیں مگر ملائکہ میں چونکہ نہ مال و دولت کا قصہ ہے نہ شہوت و زینت اور غضب کا اس لئے انہیں نہ زکوٰۃ کا پابند کیا گیا نہ روزہ کا کہ وہ خود ہی پاک ہیں پھر مال دلوا کر اور روزہ رکھوا کر

انہیں پاک کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس سے صاف نمایاں ہے زکوٰۃ اور روزہ در حقیقت نماز اور حج ہی کے لئے رکھا گیا ہے اور یہ ان کے مبادی میں سے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ نفس کو پاک اور صالح بنا کر نماز اور حج کے لئے مستعد بنایا جائے پاکی اور صفائی پہلے سے حاصل ہے وہاں نماز اور حج تو قائم رہے زکوٰۃ اور روزہ درمیان میں سے نکال لیا گیا' اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ نماز اور حج تو صفات الٰہیہ کا تقاضا ہیں۔ ایک صفات جلال کا اور ایک صفات جمال کا لیکن زکوٰۃ اور روزہ صفات نفس کا تقاضا ہیں کہ جب تک زکوٰۃ اور روزہ کے ذریعے انسانی نفس کو پاک نہ کیا جائے وہ نماز اور حج کے قابل نہیں بنتا اور ظاہر ہے کہ حقیقی معنی میں عبادت وہی ہوتی ہے جس کا تقاضا معبود کی صفات کریں نہ کہ وہ جن کا تقاضا خود عابد کی صفات کریں گو معبود ہی کے لئے کریں اس لئے نماز اور حج تو بذاتہ یا خود عبادت ثابت ہوئیں اور زکوٰۃ اور روزہ بذاتہ عبادت نہیں بلکہ ان دو اصلی عبادتوں کا وسیلہ بن کر لغیرہ عبادت ثابت ہوئیں اور یہی مقصود تھا اس بیان کا۔

نماز و حج میں باہم نسبت تضاد

اب ان دو اصل عبادتوں نماز اور حج میں مزید غور کیا جائے تو جیسے ان میں بلحاظ منشاء کے فرق ہے کہ ایک جلالی صفات سے پیدا شدہ ہے اور ایک جمالی صفات سے ایک میں گرمی ہے اور ایک میں نرمی ویسے ہی ان کے آثار ولوازم میں بھی کافی فرق بلکہ تضاد کی نسبت ہے' جو چیزیں نماز میں مستحسن اور ضروری ہیں وہ حج میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ ممنوع اور قبیح ہیں' اور جو باتیں حج میں مطلوب اور ضروری ہیں وہ نماز میں مکروہ اور ناپسندیدہ ہیں۔

نماز چونکہ احکم الحاکمین کے شاہی دربار کی حاضری ہے اس لئے اس میں تو آداب شاہی کی رعایت کی گئی ہے پنج وقتہ وضو جو غسل کے قائم مقام ہے لباس کی صفائی اور ستھرائی اور اس پر خوشبویات کا استعمال وقار اور متانت کے ساتھ مساجد کی حاضری کی بھاگتے دوڑتے نہ آویں بلکہ متین چال سے چل کر پہنچیں' سنجیدگی سے نشست و برخاست ہو' بے ڈھنگا پن نہ ہو' سکوت و خاموشی یا ذکر خفی کے ساتھ بیٹھنا ہو' شور و شغب یا آواز کی بلندی نہ ہو' بخلاف حج کے کہ وہ محبوب کے در پر عشاق کی حاضری ہے اس لئے وہاں عشق و محبت کی وارفتگی' سوز و گداز افروختن و سوختن و جامہ گزیدن اور بیتابی و تڑپ کے ساتھ وجدی حرکتیں مطلوب ہیں تا کہ عقل و مصلحت بینی کی باتیں یا اپنی آرائش و زیبائش اور زیب و زینت جس سے عاشق کو اپنی دھن میں مٹے رہنے کے سبب کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس لئے اگر نماز میں صفائی ستھرائی اصل تھی تو یہاں بے زیب و زینت رہنا اصل ہے کہ الحج

’’ الخ الخ وہاں لباس عمدگی کی مطلوب تھی تو یہاں سرے سے سلا ہو لباس ہی ممنوع ہے وہاں لباس کی زینت مطلوب تھی تو یہاں ترک زینت مطلوب ہے وہاں خوشبو لگانا مستحسن تھا یہاں احرام کے بعد خوشبو حرام ہے، وہاں نمازوں اور بالخصوص جمعہ و عیدین کی نمازوں کے لئے بدن کی معتدل زینت ضروری تھی جو حجامت سے حاصل ہوتی ہے۔ یہاں محرم کے لئے سرے سے بدن کی آرائش اصلاح خط اور حجامت ہی ناجائز ہے، وہاں سکوت اور سر و خفا ضروری تھا یہاں لبیک لبیک کا شور ہے وہاں سکون اعضاء و جوارح ضروری تھا کہ ایک جگہ جم کر کھڑے رہیں یا فکر میں مستغرق رہیں اور بیٹھیں تو گردن جھکا کر سکون سے بیٹھے رہیں۔ یہاں نقل و حرکت بلکہ بھاگ دوڑ ضروری ہے۔ کہیں صفا مروہ پر دوڑنا کہیں طواف میں چکر کاٹنا، وہاں تواضع سے گردن جھکانا ضروری تھی اور یہاں سعی سے پہلے کے طواف میں گردن تاننا اور اکڑ اکڑ کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا واجبات میں سے ہے، وہاں نمازوں کا اکثر حصہ جیسے سنتیں اور نفلیں گھر میں پڑھنا مستحب تھا، یہاں سرے سے گھر چھوڑ دیا محبوب میں آنا ضروری ہے کہ حج فرض ہو یا نفل گھر بیٹھ کر ہو ہی نہیں سکتا۔

وہاں خون گرانے سے بچنا ضروری تھا اور یہاں اہراق دم یعنی منیٰ میں خون بہانا ہی اصل عبادت ہے، وہاں شیطانی وسوسوں کا مقابلہ ناپسند بلکہ دفع الوقتی اور ادھر سے خیال ہٹا دینا ہی وسوسہ کا علاج ہے۔ یہاں خود شیطان کے مواقع و محل کے بھی مد مقابل آکر اسے کنکروں سے سنگسار کرنا ضروری ہے، غرض وہاں افعال ہی افعال ہیں اور یہاں تروک ہی تروک۔

وہاں بقا و شعور کی شان کے غلبہ کے لوازم و آثار میں تضاد کی نسبت ہے، جیسا کہ عقل اور عشق کے تقاضوں میں تضاد کی نسبت ہے، بادشاہ کے دربار میں عقل و ہوش کے ساتھ آنا پڑتا ہے، اور محبوب کے در پر عقل و شعور سے بالا ہو کر محویت و ربودگی کے ساتھ حاضر ہونا ہوتا ہے غرض یہ واضح ہو گیا کہ ادھر حق تعالیٰ کی صفات کمال کی دو شانیں تھیں، صفات جلال اور صفات جمال اور ادھر ہر بندہ میں بھی دو ہی جوہر رکھے گئے تھے۔۔۔ ایک عقل اور ایک عشق یعنی اگر اللہ کی شانوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حاکم بھی ہو اور محبوب بھی۔ تو بندہ کے ان دو جوہروں کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا محکوم بھی ہو اور عاشق بھی۔

ان دونوں تقاضوں سے یہ دونوں عبادتیں مقرر ہوئیں، ایک نماز جس میں حاکم حقیقی کے سامنے اپنی محکومیت و فدویت اور نیاز مندی و عبدیت پیش کی جاتی ہے، اس لئے دونوں عبادتیں اسلام کا بنیادی موضوع ثابت ہوتی ہیں۔ اسی لئے جن میں اسلام سمجھانے کے لئے تحریری مواد فراہم کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے وہ اولاً عبادات اور خصوصاً نماز و حج کے لئے سب سے پہلے مواد فراہم کرتے ہیں اور بلاشبہ یہ دونوں عبادتیں اسی کی مستحق بھی ہیں کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی جائیں۔۔۔ چنانچہ نماز پر

بھی سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں جن میں نماز کے مسائل نماز کے افعال، نماز کی روح، نماز کے اسرار، نماز کے مصالح، نماز کی غرض وغایت، نماز کے ثمرات ونتائج وغیرہ جمع کئے گئے ہیں اور ایسی کتابوں کا ایک بڑا عدد تاریخ کے اوراق میں دستیاب ہوتا ہے۔

اسی طرح مناسک حج پر بھی کتابوں کا ایک ذخیرہ ملے گا جو اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے مرتب ہوا ہے۔ فضائل حج، مسائل حج، دلائل حج، اسرار حج، آثار حج، شعائر حج، مقامات حج، تاریخ حج، جغرافیہ حج، طریق حج وغیرہ پر ضخیم ضخیم جلدیں لکھی گئی ہیں۔ اور بلاشبہ یہ دونوں موضوع اسی کے مستحق بھی تھے کہ ان پر سفینے مرتب ہوں اور ان کے حقائق محض سینوں کی امانت نہ بنے رہیں جب کہ یہی دو عبادتیں اسلام کی اساس اور حقیقی عبادتیں تھیں جن سے دوسری عبادتوں نے جنم لیا پھر اس میں بھی خصوصیت سے حج کی عبادت چونکہ نقل وحرکت اور سیر وسیاحت کی عبادت تھی جس میں ایک حاجی کو اپنی نظر وفکر کی مستعدی کی حد تک مختلف رنگ کے تجربات بھی حاصل ہوتے ہیں اس لئے حج سے متعلقہ تصانیف میں سفر ناموں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے جو اہل علم حجاج نے بوقت سفر حج قلمبند کیا اور اپنے تجربات سے مابعد کے حجاج کو مستفید ہونے کا موقع بخشا تاکہ ان کے تجربات سے بعد کے لوگ مختلف معلوماتی فوائد بھی حاصل کریں اور پچھلوں کے تجربات اگلوں کے لئے راہ حج میں مدد اور آسانیوں کا ذریعہ ثابت ہوں۔

علمی حج

خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے بھائی مگر بزرگ بھائی دوست اور مخلص دوست متدین اور متقی عالم مولانا محمود حسن صاحب گیاوی دام مجدہ فاضل دیوبند نے بھی اپنے سفر حج میں اپنے عملی حج کو علمی حج بنانے کی سعی مشکور فرمائی اور اپنے سفر حج کے کوائف و تجربات کو نہایت جامعیت کے ساتھ سفر نامہ کی صورت میں مرتب فرمایا نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ شرعی اور فنی طور بھی حج کے مختلف پہلوؤں کو اپنے علم وعمل اور تجربہ کی روشنی میں جمع فرمایا ہے، جس کے عنوانات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں حج کے تمام مالہ وماعلیہ سے بحث کرتے ہوئے مسائل، فضائل، دلائل، شمائل، شعائر آثار، وقائع حوادث وضروریات وغیرہ کا ایک معتدبہ اور بڑا ذخیرہ جمع فرمادیا ہے جو ان کے علم وعمل اور اخلاص وایثار کا شاہکار ہے اس لئے یہ سفر نامہ تاریخ، تحقیق، فقہ، کلام، روایت اور درایت ہر پہلو سے حج کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہے۔ جس نے حج کو "آئینہ" بنا کر طالبوں کے سامنے رکھ دیا ہے اور خصوصیت سے یہ مصنف ممدوح کا خاص احسان ہے کہ انہوں نے مسائل کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربات سے بھی دنیا کو فائدہ پہنچانے کی سعی فرمائی ہے۔

فجزاهم الله عنّا وعن جميع المسلمين خير الجزاء

آئینہ حج اور آئینہ نمائی

محترم مصنف کی خواہش تھی کہ میں اس رسالہ "آئینہ حج" پر بطور مقدمہ چند سطریں لکھ کر پیش کروں میرے لئے سب سے بڑی مشکل وقت نکالنے کی تھی پھر اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے ایسے اہم اسلامی موضوع پر قلم چلانے کی تھی اور اوپر سے کتاب اپنی جامعیت اور مکمل تفصیلات کا آئینہ ہونے کی وجہ سے بھی مقدمہ و تمہید سے بے نیاز بھی تھی جب کہ اس میں جس کا پہلو خود ہی موجود ہے اس لئے تعمیل میں غیر معمولی تاخیر ہوئی پھر بھی یہ چند سطریں کسی نہ کسی طرح سفر و حضر میں تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر پوری کیں اور محض "آئینہ حج" پیش کر دینے کے لئے پیش کر دی گئیں تا کہ اس میں اپنا چہرہ دیکھ کر لوگ خود ہی اس کا اور اپنا اندازہ لگا سکیں۔ ورنہ جہاں تک حج کے پہلوؤں کا تعلق ہے یہ "آئینہ" سارے حج کا خود ہی آئینہ دار ہے، جس کے جوہروں میں حج کے سارے ہی پہلو جلوہ گر ہیں، نہ اس میں کسی کمی بیشی کی گنجائش ہے نہ اضافہ کی 'نہ تمہید کی 'نہ مقدمہ کی' پس یہ مقدمہ آئینہ حج میں خود اپنے کو دیکھنے کے لئے بطور آئینہ کے پیش کیا جا رہا ہے نہ کہ حج کو دیکھنے کے لئے۔ کہ حج نمائی کا آئینہ بنانا۔

مصنف محترم جیسے عالم و فاضل کا کام تھا جنہوں نے آئینہ حقیقتاً بنا کر دنیا کو دکھا دیا۔ میرا کام صرف آئینہ نمائی تھا جو برے بھلے انداز سے بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ حق تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور مصنف ممدوح کو جزائے خیر عطا فرمائے اور سفر نامہ کی اس علمی سعی کو مشکور فرمائے۔ آمین۔

والحمد لله الذی بنعمته تتمّ الصالحات.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پس منظر

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی سلور جوبلی کے موقع پر ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو نماز جمعہ کے بعد جامعہ کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس موقع پر امیر جامعہ اور منتظمین جلسہ کے اصرار پر حضر مہتمم صاحب (رحمۃ اللہ) نے ایک نہایت ہی مختصر مگر نہایت جامع خطبہ ارشاد فرمایا جو اس درجہ موثر و مقبول ہوا کہ اساتذہ کرام جامعہ ملیہ اور دیگر حضرات نے حضرت موصوف سے اس کے قلمبند کرنے کی فرمائش کی۔ تاکہ اشاعت کے ذریعہ اس کو غائبین تک بھی پہنچایا جائے اور وہ بھی اس سے اسی طرح مستفیض و محظوظ ہوں جس طرح حاضرین نے فیض حاصل کیا۔ چونکہ وہاں مصروفیت زیادہ رہی اور قیام گاہ پر زائرین اور ملاقاتیوں کا برابر ہجوم رہا۔ اس لئے اس خطبہ کو قلمبند کرنے کا موقع نہ ملا۔

دیوبند مراجعت فرمانے کے بعد احقر کے اصرار پر باوجود انتہائی عدیم الفرحتی کے حضرت موصوف نے یہ خطبہ قلمبند فرما کر مرحمت فرمایا ہے کہ اگرچہ تقریر کا بعد از وقت بعینہ تحریر میں آجانا تو عادتاً ناممکن ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ چونکہ یہ تحریر حضرت موصوف کے قلم سے ہو کر شائع ہو رہی ہے اس لئے ایک حد تک اصل تقریر کی غمازی کر سکے گی۔

(احقر مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اہمیت نماز

دین کے دوسرے کاموں کی بقا بھی در حقیقت نماز سے ہی ہے۔ اسی سے اوقات کی پابندی ہوتی ہے اسی سے عظمت حق دل میں جاگزیں ہوتی ہے اسی سے دین کے اوامر کی عظمت ہوتی ہے اور پھر ان کی تعمیل پر دل مجبور کرتا ہے۔۔۔

غرض نماز ہے تو کل دین ہے۔ اور وہ نہیں تو دین بھی نہیں۔ اور مسلمان کا دین ہے تو دنیا بھی ہے۔ ورنہ دنیا بھی نہیں۔ پس نماز ہے تو جہاں سے ورنہ حرمان و خسران ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهٗ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًاوَ نَذِيْرًاوَ دَاعِياً اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجاً مُّنِيْراً........ اَمَّابَعْدُ........

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ . بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْامَعَ الرَّاكِعِيْنَ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِىُّ الْعَظِيْمُ.

کائنات کا انتہائی مقصد

بزرگان محترم!

مجھے اس وقت کوئی تقریر کرنا منظور نہیں ہے اور نہ اس کا پروگرام ہی ہے، مجھے امر کیا گیا ہے کہ میں آپ حضرات سے مسجد کے سنگ بنیاد کے سلسلہ میں دعا کراؤں یہ ظاہر ہے کہ دعا کرانے کی چیز نہیں ہے۔ کرنے کی چیز ہے۔ آپ بھی خود ہی دعا کریں گے اور یہ بھی دعا کرنے میں آپ کے ساتھ شامل ہوگا۔ اس لئے دعا کرانے کے لئے بھی میں نہیں کھڑا ہوا ہوں۔ مقصد دعا سے پہلے دعا

کے نقاط پر توجہ دلانا ہے کہ کن پہلوؤں پر دعا کریں گے۔ اور حق تعالیٰ سے کن مقاصد کا سوال کریں گے۔ کیونکہ اس وقت مطلقاً دعا مقصود نہیں ہے بلکہ دعا خاص مقصود ہے۔ سو اس دعا کے نقاط اور پہلوؤں پر اس طرح سے غور کیجئے کہ اس ساری کائنات کا پھل اور آخری مقصد انسان ہے جس کے لئے زمین و آسمان کا یہ سارا خیمہ تانا گیا ہے۔ اگر انسان کی تخلیق منظور نہ ہوتی تو کائنات کی تخلیق بھی عمل میں نہ آتی۔ پس ساری کائنات انسان کی خاطر بنائی گئی ہے۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

انّ الدّنیا خُلقت لکم.

"ساری دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے"۔

ارشاد ربانی ہے:

خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَ رْض جَمِیْعاً.

"اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے ہی نفع کے لئے ہیں"۔

ایک جگہ فرماتے ہیں:

اَللّٰهُ الَّذِی خَلَقَ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَ خْرَجْ بِهٖ مِنَ الثَّمرَاتِ رِزقًالَّکُمْ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخّرَلَکُمُ الْاَنْهَارَ وَسَخَّرَلَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَیْنِ وَسَخّرَلَکُمُ الَّلیْلُ وَالنَّهَارَ وَاٰتَا کُمْ مِنْ کُلِّ مَاسَئَا لتُمُوْهُ.

"اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی کو اتارا اور اس سے پھل اگائے تمہارے رزق کے لئے اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگایا تاکہ اس کے حکم سے وہ دریا میں چلیں اور دریا تمہارے کام میں لگائے اور آفتاب ماہتاب تمہارے کام میں جو چل رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے کام میں لگا دیا اور وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے اس سے مانگا (خواہ دعا قولی سے یا دعا عملی یعنی اختیار و اسباب سے)"۔

پس زمین و آسمان، رات دن کا لوٹ پھیر، شجر و حجر اور بحر و بر کا کارخانہ سب کچھ انسان ہی کے لئے تیار کیا گیا ہے جس سے واضح ہے کہ تخلیق کائنات کا انتہائی مقصد انسان ہے۔

پھر یہ انسان کس لئے ہے؟ ظاہر ہے کہ کائنات کے لئے نہیں۔ ورنہ وسیلہ ہونے کی بجائے مقصد ہو جائے گا اور یہ خلاف نقل و عقل اور خلاف مشاہدہ ہے جیسا کہ واضح ہوا۔ اس لئے ایک ہی نتیجہ ہے کہ انسان کائنات کے لئے نہیں بلکہ خالق کائنات کے لئے ہے یعنی اس کی عبادت کے

لئے۔ اس کے سامنے جھکنے اور گڑگڑانے اور اس کے آگے سر عبودیت خم کرنے کے لئے پس انسان کا مقصد تخلیق عبادت نکلا اور اب منطقی اصول پر نتیجہ یہ نکلا کہ کائنات انسان کے لئے اور انسان عبادت کے لئے تو ساری کائنات کی یہ تنظیم و تخلیق صرف عبادت کے لئے عمل میں آئی ہے۔

عبادت کا فرد کامل

عبادت پر اگر آپ غور کریں گے تو اس کا فرد کامل نماز ہے۔ گویا ساری دنیا نماز کے لئے بنائی گئی ہے کہ یہی عبادت کا فرد کامل اور مظہر اتم ہے بلکہ میں ترقی کر کے یہ عرض کروں گا کہ سلسلہ عبادت میں عبادت صرف نماز ہی ہے اور کوئی چیز بذاتہ عبادت نہیں۔ کیونکہ عبادت کے معنی غایت تذلل اور انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جو انتہائی عزت والے کے سامنے اختیار کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے نماز کے سوا کوئی چیز بذاتہ عبادت نہیں نکلتی۔ مثلاً روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں کیونکہ روزہ کے معنی کھانے پینے اور تمام لذات نفسانیہ سے مستغنی ہو جانے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ غنا اور عدم احتیاج ذلت نہیں۔ کیونکہ غنا تو خود خالق کی شان ہے تو خالق کی شان اختیار کرنا عیاذاً باللہ ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یا صدقہ و زکوۃ دینا عطا ہے اور عطا تو خود اللہ کی صفت ہے اور معاذ اللہ ذلت کیسے ہو سکتی ہے؟ یا سچ بولنا خدا کی شان ہے تو اسے عبادت اور غایت تذلل کیسے کہ دیں گے۔ اسی طرح اور تمام اخلاق حسنہ اور اعمال فاضلہ بذاتہ ذلت نہیں کہ انہیں عبادت کہا جائے پھر بھی جو انہیں عبادت کہا جاتا ہے محض امتثال امر خداوندی کی وجہ سے نہ کہ بالذات۔ ہاں نماز بالذات عبادت ہے، کیونکہ اس کی ہیئت کذائی قیام قعود رکوع اور آخر کار سجدہ میں ناک اور پیشانی زمین پر ٹیکنا انتہائی ذلت اور عبودیت کا اظہار ہے، اس کے اذکار مشتمل ہیں یا اظہار فدویت نفس پر یا اعلان عزت رب پر۔ اور یہ خود شان تذلل ہے۔ غرض نماز کی ہیئت اور حقیقت سب مظہر ہے شئون تذلل اور احوال عبودیت پر۔

حاصل یہ ہوا کہ کائنات کی تخلیق عبودیت یعنی نماز کے واسطے ہوئی ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے نماز ہی کا ساری کائنات کو پابند ظاہر فرمایا ہے نہ کہ زکوۃ و حج اور صوم و صدقہ کا۔ فرمایا:

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ.

"ہر چیز نے (خلقۃ اور تکوینی ہدایت سے) اپنی نماز اور تسبیح (یعنی ہیئتِ نماز اور اذکارِ نماز) کو جان لیا ہے"۔

جس سے واضح ہے کہ ساری کائنات نمازی ہے، بھلا پھر انسان کو تو کیوں نہ نمازی بنایا جاتا۔ فرق اتنا ہے کہ اور مخلوق غیر عاقل ہے تو اس میں نماز کا داعیہ جبلی اور تکوینی طور پر رکھ دیا گیا ہے اور انسان ذی عقل و ہوش ہے۔ تو اس کی نماز اختیاری ہے، جس کے لئے ہدایت و رہنمائی اور وعظ و پند کی

ضرورت پڑتی ہے۔ پس اگر انسان نمازی نہ ہو تو گویا اس نے اپنے مقصد تخلیق کو فوت اور ضائع کردیا۔۔۔ اس لئے فاروق اعظمؓ نے اپنے دورِ خلافت میں تمام رعایائے اسلام کے نام فرمان جاری فرمایا تھا کہ :

نماز ہے تو کل دین ہے

اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اب تک تو جامعہ نے اپنے پروگراموں میں رسوم ادا کی ہیں اور اب حقیقت ادا کی ہے وہ سب چیزیں نمائشی تھیں۔ حقیقت اگر ہے تو صرف یہ، جیسے اس وقت انجام دے رہے ہیں کہ اس سے مقصد زندگی تکمیل پا رہا ہے۔ نماز مظہر اتم ہے تعلق مع اللہ کی۔ اگر نماز اور تعلق مع اللہ قائم ہے تب تو یہ ساری رسمیں جو ہم نے ادا کی ہیں بارو ح اور زندہ کہی جائیں گی، ورنہ یہ سب چیزیں جو رسم کی شکل سے ادا کی گئی ہیں ایک بے جان لاش ثابت ہوں گی۔ اور لاش کا انجام یہ ہے کہ وہ چند ہی دن بعد گلے، سڑے، پھولے اور پھٹے اور اس کی بدبو سے دماغ متعفن ہوں اور احساسات گندے ہو جائیں۔

نیز یہ تعلق مع اللہ ہے جو ان رسموں کی شکلوں کی بھی اصلاح کر سکتا ہے ورنہ بلا تعلق مع اللہ اور بلا واسطہ اوامر الہیہ کے یہ رسمیں بھونڈی اور بدشکل متصور ہوں گی پس اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھ کر اور نمازی بن کر در حقیقت ہم اس کا تہیہ کر رہے ہیں کہ اپنی رسوم کی صورتوں کی بھی اصلاح کریں اور اس میں حقیقت وروح بھی پیدا کریں۔ تاکہ ہمارا ہر عمل پائیدار اور عواقب کے لحاظ سے نتیجہ خیز ہو۔ اور بے جان لاش کی طرح ضائع اور بے جڑ درخت کی طرح بے ثمر نہ رہے۔

قیامِ نماز سے ایک خاص فضا پیدا کرنا مقصود ہے

اس لئے ہمیں دعا اس کی کرنی ہے کہ اے اللہ ہمیں نماز کی توفیق دے اور نماز کے لئے ہمارے اس مکان مقدس یعنی مسجد کی تکمیل کرا دے اور اس مسجد کو بنانے والوں، اس کی تعمیر کرنے والوں، اس میں امداد دینے والوں، اور اس کے منتظموں کا یہ عمل قبول فرما۔

ہمیں اللہ سے یہ مانگنا ہے کہ وہ اس نماز کے ذریعے ہمارے ہاتھوں جامعہ میں ایسی فضا پیدا کر دے کہ جس میں نیکیاں پھلیں پھولیں اور بدیاں اپنی موت مر جائیں۔ آج کا دور وہ ہے کہ نیک نیکی کر کے شرماتا اور منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ جیسے گویا اس نے کوئی بڑا بھاری جرم کیا ہے اور مجرم بدکاریاں کر کے فخر سے سر اونچا کرتا ہے کہ گویا اس نے دنیا کا کوئی محترم کام انجام دیا ہے۔ ہمیں اللہ سے واسطہ پیدا کر کے اور نماز کو قائم کر کے ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ نیکی کر کے نیک سر ابھارے اور مجرم اور بدکار خلاف شریعت امور کر کے منہ چھپاتا رہے اور اپنی برائی کو محسوس کرے۔

آج کے دور میں ایمان سے کورے آدمی کا لقب ہے دانا، عالی ظرف اور بہادر، اور ایماندار کا

لقب ہے احمق بے وقوف مجنون اور دیوانہ۔ حدیث میں ارشاد فرمایا ہے۔

یقال للرجل ما اعقلہ وما اظرفہ ' وما اجلدہ ' ولیس فی قلبہ مثقال ذرۃ من الایمان۔

"آدمی کے لئے کہا جائے گا کہ کس قدر دانا ہے کس قدر عالی ظرف ہے اور کیسا بہادر ہے۔ درانحالیکہ اس کے دل میں ذرہ برابر ایمان کا نشان نہ ہو گا"۔

اور دوسری روایات میں فرمایا گیا ہے کہ امین کو خائن کہا جائے گا اور خائن کو امین علم والے کی اتنی بھی عزت نہ رہے گی جتنی کہ ایک مردار گدھے کی لاش کی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں آج مشاہدہ میں آرہی ہیں۔ اہل تقویٰ کا نام مذہبی دیوانے' احمق ملانے وغیرہ ہیں اور اہل فجور کے القاب اعقل' اظراف اور اجلا ہیں تو ہمیں تعلق مع اللہ والوں کی کثرت کر کے ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ ہر ایک کو اسی کے صحیح لقب سے یاد کیا جائے اور اسی کے مرتبہ کے مطابق اس سے معاملہ کیا جائے۔ پس دعا میں ایک نقطہ یہ بھی ہمیں لانا ہے کہ اے اللہ ہمیں اہل تقویٰ میں سے اور نمازی کر کے ہمیں اہل سعادت کر اور اہل سعادت کی عزت و توقیر اور شوکت دنیا میں قائم فرما۔ ہماری مادی شوکت اگر ہمیں حاصل ہو اور جس کا ہم فوجی انداز میں مظاہرہ کر کے گویا اس کی تحصیل کی خواہش ظاہر کر رہے ہیں اس کا ثمرہ اور آخری غایت بھی نماز ہی ہے یعنی خدا سے تعلق۔

سلطنت اسلامی کا مقصود

حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔

پس ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ مسلمانوں کا دنیوی عروج اور تمکین فی الارض یعنی سلطنت و امارت اس لئے نہیں کہ کیک' پیسٹری کی فکر میں مستغرق ہوں۔ کوٹھی بنگلوں کی تعمیر ان کا منتہائے نظر ہو اور انڈا مکھن ان کا آخری مطلب ہو۔ بلکہ ان کا عروج اس لئے ہو گا کہ وہ خدا کی چوکھٹ پر جھکیں اور اس کی مخلوق کو جھکا دیں۔ دنیا میں معروف اور اچھی باتیں پھیلائیں اور برائی سے دنیا کو پاک کریں صدقہ و خیرات سے غریبوں کی غربت مٹا دیں سائلوں اور محتاجوں کے دلوں کو تھامیں۔ اخوۃ ہمدردی سے عالم کو بھر دیں۔ تفوق اور علو و فساد کا قلع قمع کریں۔

نماز یا نماز کے ثمرات

پس محض اس کی دعا کرنی ہے کہ خداوندا ہمیں عروج دے تا کہ ہم تیرے اس مقدس مکان میں جمع ہو کر تیری یاد کریں اور اس بھولی ہوئی اور غافل دنیا کو تیرے بارے سمیں ہوشیار بنا دیں۔ پس یہ کام ہم اس مسجد مقدس میں جماعتی حیثیت

سے انجام دینے کی توفیق اللہ سے مانگنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہمیں اپنی دعا میں نماز کی، مکان نماز کی تکمیل کی توفیق، نماز کے شوکت کے وسائل قائم کرنیکی توفیق، نماز کے لئے مادی شوکت فراہم کرنیکی فوفیق اور نماز کے ذریعے اپنی صورت وسیرت اور ہیئت و حقیقت کے پاکیزہ اور مطلوب انداز پر لانے کی توفیق مانگنا ہے۔ یعنی جو کچھ بھی مانگنا ہے وہ نمازی یا نماز کے ثمرات ہیں یا نماز کے مبادی لور وسائل ہیں۔ ہم صرف نماز ہی دنیا میں چاہتے ہیں اور نماز ہی کے لئے ہر کام بھی چاہتے ہیں۔

اگر حقیقتاً ہمیں یہ زندگی میسر ہو جائے تو اسی زندگی کا نام قرآن کی زبان میں حیات طیبہ ہے۔ اسی کا نام اسوہ حسنہ اور پاک سیرت ہے جس کے لئے اسلام آیا اور پیغمبروں کا سلسلہ قائم کیا گیا۔

پس دعا کے یہی چند نقاط تھے جن پر توجہ دلانے کے لئے میں کھڑا ہوا تھا' مجھے کوئی تقریر یا نماز کے موضوع پر کوئی سیر حاصل بحث کرنا منظور نہیں تھا۔ نہ اس کا وقت ہے اور نہ کوئی پروگرام اس لئے اب آپ سب حضرات ہاتھ اٹھائیں اور اپنے رب کریم کی بارگاہ میں ان مطلوبہ نقاط پر مخلصانہ دعا فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رمضان اور اس کے مقاصد و برکات

وہ مرد مومن کیسے ہلاک ہو سکتا ہے جس کے عباداتی سال کا اول رمضان المبارک ہو' اور جس کا وسط اشہر حج اور محرم الحرام ہو۔ اور جس کا آخر شعبان معظم ہو۔ پس جس مومن کی عمر پر اس طرح کے سال گزرتے رہیں تا آنکہ اس کی عمر پوری ہو جائے' تو یقیناً اس کے دل کی زمین اس اول و آخر اور وسط کے ساتھ جاہ و باہ کے تروک کے ذریعے نفسانی خس و خاشاک سے پاک ہو گئی اور وہ افعال طاعت و عبودیت اور بر کے ذریعے نور و برکت سے چمک اٹھے گی۔ اور اس کے رذائل زائل ہوں گے اور اس میں فضائل وال ہوں گے وہ نار سے بچ جائے گا۔ اور نور سے سرفراز ہو گا۔ جو حقیقی فوز و فلاح ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ'

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہ' وَ نَسْتَعِیْنُہ' وَنَسْتَغْفِرُہ' وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہ' وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہ' وَنَشْھَدُاَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہ' لَاشَرِیْکَ لَہ' وَنَشْھَدُاَنْ نَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُہ' وَرَسُوْلُہ' اَرْسَلَہ' اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًاوَّ نَذِیْرًاوَّ دَاعِیاً اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً.................اَمَّابَعْدُ..........

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ . بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم. شَھْرُرَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ(صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ).

اصلاحِ طینت

بزرگانِ محترم!

ایک اعلیٰ ترین باغ کا بہار آفریں نشو و نما' اس کی دلکش اور نظر افروز سرسبزی شادابی' تازگی اور بار آوری اس وقت تک اپنے عروج کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کی زمین کو خودرو گھاس پھونس اور

خس وخشاک سے پاک نہ کر دیا جائے' اسی طرح ایک پاکیزہ برتن پر قلعی سے اس وقت تک چمک نہیں آئیگی جب تک اس کے جگری زنگ کو دور نہ کر دیا جائے اور اس پر چھائی ہوئی کدورتوں سے اسے صاف نہ کر دیا جائے ہو بہو اسی طرح ایک قیمتی کپڑے پر کوئی نظر فریب رنگ اس وقت تک کھل نہیں سکتا جب تک کہ میل کچیل اور آئے ہوئے دھبوں سے اسے صاف نہ کر دیا جائے۔

اصول یہ نکلا کہ کوئی شی بھی تہذیب وتمدن اور اصلاح عمل کے ذریعہ اعلیٰ جوہروں سے اس وقت تک شائستہ اور آراستہ نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اس کے اندر سے ابھرنے والی خرابیوں کے مادوں کو سنت سے مغلوب اور مضمحل کر کے اس کی طینت کو صاف نہ کر دیا جائے۔

سعادت کی بنیاد ٹھیک اسی فطری اصول کے مطابق اس کائنات کے اشرف اصول اور افضل ترین رکن انسان کو بھی دیکھو کہ اسے بھی سعادت و شرافت' بزرگی اور برتری اور ظاہر و باطن کے فضل وکمال سے اس وقت تک آراستہ نہیں کیا جاسکتا' جب تک کہ اس کے اندرونی شر و فساد اور جبلی عیبوں' اور اخلاقی خرابیوں کے ناپاک مادوں سے اسے صاف نہ کر لیا جائے۔ اس میں پاکیزہ اخلاق اور نیکوکارانہ افعال کے مادے اس وقت تک جڑ نہیں پکڑ سکتے جب تک اس کے ظاہر و باطن کو زنگ خودی اور زنگ آز او ہوس سے پاک نہ بنالیا جائے اور اس کے دل کی زمین میں ایمان و ہدایت کا شجرہ طیبہ اس وقت تک نشو ونما اور ثمر نہیں پاسکتا جب تک کہ اس میں سے خود رو وساوس واوہام ہوائے نفس اور فانی لذتوں کی ہولناکیاں کھرچ کر باہر نہ پھینک دی جائیں۔

تخلیہ وتحلیہ اس صورت میں قدرتی طور پر انسانی تہذیب وتربیت کے دو عمل قرار پائے جاتے ہیں' افعال اور تروک یعنی کچھ کرنے کی چیزیں جو اس سے کرائی جائیں گویا اس کے نفس میں بھری جائیں اور کچھ بچنے کے چیزیں جو اس سے چھڑائی جائیں گویا اس کے نفس میں سے نکالی جائیں کرنے کی چیزوں سے اس کا نفس خیر وخوبی سے آراستہ ہوگا' اور بچنے کی چیزوں سے اس کا نفس شر اور شیطنت سے پاک ہوگا۔ اسی طرح تربیت انسانی دو عملوں کا مجموعہ بنتی ہے ایک تحلیہ اور ایک تخلیہ (یعنی خالی کرنا اور بھرنا) تخلیہ کے ذریعے اس رذائل نفس سے پاک کیا جاتا ہے اور تحلیہ کے ذریعے اس کو فضائل سے آراستہ کیا جاتا ہے جب تک کہ دونوں مثبت اور منفی عمل اس میں جاری نہ کئے جائیں نہ ان کی تہذیب مکمل ہو سکتی ہے اور نہ وہ سعادت ورشد کے نور سے روشن ہو سکتا ہے' یہی وجہ ہے کہ شریعت خداوندی جو انسان کی تہذیب واصلاح کی کفیل بن کر آئی ہے' دو ہی اجزاء سے مرکب ہو کر نازل ہوئی ہے' ایک امر' اور ایک نہی یعنی ایک حصہ اس میں مامورات کا ہے جن کے کرنیکا امر کیا گیا ہے تاکہ نفس کو اس کی سعادت ملجائے' اور ایک حصہ منہیات کا ہے جن سے بچنے کا اسے پابند کیا گیا

ہے، تاکہ نفس کی شقاوت دور ہو۔ پس مامورات کو از قسم افعال سمجھو اور منہیات کو از قسم تروک، یہی مامورات نیکیاں ہیں جن کا نوع اور اصل نام شریعت کی زبان میں معروف ہے اور یہی منہیات بدیاں ہیں۔ جن کا نوعی اور اصولی نام اصطلاح شرع میں منکر ہے، اور یہیں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغی اصطلاح بنتی ہے۔ جسے سب پہچانتے ہیں۔ اور قرآن نے جابجا اس کی تاکید کی ہیں، کہیں اس کا امر کیا ہے۔

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

"اچھی باتوں کا حکم کرو اور برائیوں کو روکو اور کچھ تکلیف پہنچے اس پر صبر کرو۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے"۔

کہیں امت کی خیریت اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر دائر کر دی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.

"ان تمام امتوں میں تم بہترین اُمت ہو جو تمام انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے، بھلائیوں کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو"۔

کہیں رفعت و برتری اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قرار دیا گیا ہے فرمایا گیا کہ

اَلنَّبِيُّ الْاُمِّيُّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ.

"نبی امی کہ جس کی بات وہ تورات و انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو اچھی باتوں کا حکم کرتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے"۔

نظام سعادت

شریعت کے یہ تمام مامورات یا معروفات جس کا شمار نیک افعال میں ہے، اصلاح شریعت میں ان کے افعال کا نام بر ہے اور وہ تمام منہیات یا منکرات جو از قسم تروک ہیں ان سے بچنے کا اصطلاحی نام تقویٰ ہے اس لئے گویا پوری شریعت کا خلاصہ بر و تقویٰ نکل آتا ہے جس پر انسانی سعادت کا نظام قائم ہے۔

اگر افعال بر یا امور خیر کو معطل کر دیا جائے تو حصول خیر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا جس کو شرعی زبان میں اثم کہتے ہیں اور یہ اثم یا گناہ ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے اور اگر تقویٰ کو معطل کر دیا جائے تو دفع شر کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ جس کا اصطلاحی نام "عدوان" ہے (یعنی حدود سے تجاوز اور زیادتی) اور اللہ کی قائم کی ہوئی ان حدود سے تجاوز کرنا ہی تمام فساد انگیزیوں اور فتنہ سامانیوں کی جڑ ہے۔ پس کوئی انسان محض بر سے یا نیک کاموں سے کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں تقویٰ

کے تروک نہ ہوں اور کوئی فرد بشر محض تروک تقویٰ سے کامیاب نہیں ہو سکتا' جب تک اس میں بر (نیکی) کے افعال اور تاثیرات نہ ہوں۔

اب چونکہ برو تقویٰ نیکی اختیار کرنے اور برائیوں سے بچنے کے اس مثبت و منفی عمل کے مجموعی نظم ہی سے دین اور تہذیب و تمدن کا نظام استوار ہوتا ہے' اس لئے شریعت اسلام نے ان دونوں میں باہمی تعاون کی اور انکی اضداد یعنی اثم وعدوان سے عدم تعاون کی دعوت دی ہے۔ قرآن حکیم نے یہ ساری بنیادی تفصیلات بلکہ پور شریعت کے امر و نہی کے نظام کو ان دو جامع اور معجزانہ جملوں میں ادا کر دیا ہے جن سے ان انواع کے یہ اصطلاحی نام بھی متعین ہو جاتے ہیں۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ.

"تعاون کرو نیکی اور تقویٰ پر اور گناہوں اور سرکشی پر تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرو اللہ تعالیٰ زبردست انتقال لینے والے ہیں"۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ برو تقویٰ کے یہ افعال و تروک محض ان کے نظم (الفاظ) کی جوہری خوبی اور برتری سے انسانوں میں قائم نہیں ہو سکتے' جب تک کہ خود انسانوں میں بھی برو تقویٰ کو قبول کرنے اور ان سے اثر پذیر ہونے کا مادہ اور صلاحیت نہ ہو۔ اور اس میں ایسی قوتیں رکھی ہوئی نہ ہوں جو اس برو تقویٰ کے جذب کرنے پر جھکی ہوئی ہوں اور اسے برداشت کریں جس سے نفس انسانی پر برو تقویٰ کا رنگ چڑھ سکے' ورنہ اگر اندورنی قابلیت کے بغیر ہی برو تقویٰ کا خطاب صحیح ہوتا یا محض برو تقویٰ کے شرعی نظام کو خوبی اور برتری ہی نفوس میں اسے جاگزیں کر دیا کرتی تو حیوانات آخر اس تکلیف شرعی سے الگ کیوں رکھے جاتے؟ ان کو برو تقویٰ کا مکلّف نہ بنائے جانے کی اس کے سوا وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ان میں بار اور متقی نیک اور پرہیز گار بننے کی یا برو تقویٰ قبول کر نیکی کوئی استعداد اور کوئی قوت موجود نہیں اس لئے محض برو تقویٰ کے شرعی نظام کا اعلیٰ اور منضبط ہونا ان کے لئے کار آمد نہیں' اس سے یہ نتیجہ نکل آنا قدرتی ہے کہ اگر خدا نے انسان کو برو تقویٰ کا مکلّف ٹھہرایا ہے تو ضروری ہے کہ اس میں بھی برو تقویٰ کے نظام کو قبول کر لینے کی قوتیں بھی ہوں جن پر یہ نظام برو تقویٰ اپنا عمل کرے اور انسان بار و متقی۔ نیکوکار اور پرہیز گار بنے' اسی طرح انسان میں اثم وعدوان کے مادے بھی ہونے ضروری ہیں جن سے وہ اثم وعدوان کا مرتکب ہوتا ہے بلکہ ہوتا ہو اور شریعت اسے ان قبیح حرکات سے روکے' ورنہ اس میں ان گناہ کاریوں کے مادے ہی نہ ہوتے تو وہ کبھی بھی اثم وعدوان کا مرتکب نہ ہو سکتا اور ایسی صورت میں اسے اثم وعدوان سے باز رہنے کا حکم دیا جانا بالکل ایسا ہی حکم ہے جیسا کہ کسی جنگلی جانور شیر اور بھیڑیئے کہ کہا جائے کہ خبردار گناہ مت کرنا اور اثم وعدوان

کا مرتکب نہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جیسے یہ حکم غیر حکیمانہ ہے ایسی ہی اثم وعدوان کے مادے کے بغیر انسان کو یہ حکم دیا جانا لغو اور لایعنی ہوتا ہے، جس سے اللہ کی شریعت بری ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان میں میں اثم وعدوان کے مادے بھی ہوں اور وہ ان قبیح حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہو بلکہ ہوتا ہو اور پھر اسے روکا جائے جس سے وہ اپنے اختیار سے خود رکے' تاکہ یہ رکنا شریعت کے لئے حکیمانہ فعل ثابت ہو' اور رکنے والے کے لئے امر حسن باعثِ اجر و کمال بنے۔

ایمان وامانت اس اصول کے بعد سمجھئے کہ انسان میں جو قوت افعال بر کا تحمل کرتی ہے بلکہ افعال بر کا مصدر ہے جس سے یہ افعال صادر ہوتے ہیں ان کا نام شریعت کی اصطلاح میں امانت ہے اور جو قوت تقویٰ کا بوجھ اٹھاتی ہے اور اس سے متقیانہ تروک کا ظہور ہوتا ہے اس کا نام شریعت کی زبان میں حیاء ہے۔ پس امانت امر حسن اور اچھے کام کی رغبت کے مادے کا نام ہے اور حیاء امر قبیح سے انقباض کے مادہ کا نام ہے۔

پس ایمان اور اس کے سارے عملی شعبے عبادۃ' اطاعۃ' تفویض وغیرہ در حقیقت امانت کے کندھوں پر سوار ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔ اگر امانت نہ ہو یعنی دل میں ان امور حسنہ کی رغبت و قبول کا مادہ ہی نہ ہو تو آدمی نہ ایمان قبول کر سکتا ہے نہ عمل صالح نہ دین دیانت۔

پس امانت کی وہی نوعیت ہے جو رنگریزوں پھٹکری کی ہوتی ہے کہ وہ ہر رنگ، کے لئے زمین ہے اگر رنگ کو پھٹکری نہ دی جائے تو کوئی رنگ بھی نہ کپڑے پر چڑھ سکتا ہے نہ کھل سکتا ہے۔ یا جیسا کہ عطاروں میں تل کے تیل کو ہوتی ہے کہ ہر خوشبو کے لئے یہ سادہ تیل زمین ہے جو گلاب' چنبیلی اور کیوڑہ ہر خوشبو کو قبول کر لیتی ہے' اور مختلف عطر بن جاتے ہیں۔ اگر یہ زمین (تل کا تیل) نہ ہو' تو کوئی عطر تیار نہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح امانت زمین ہے' ایمان اور ایمانیات کے لئے جس پر ایمان کا رنگ چڑھ جاتا ہے یا ایمان اور ایمانیات کی خوشبو میں جم جاتی ہیں' اگر قلب میں یہ امانت کا مادہ نہ ہو تو نہ ایمان ہو نہ ایمانیات' اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

لا ایمان لمن لا امانة له'.

"اس میں ایمان ہی نہیں جس میں امانت نہ ہو"۔

پس ایمان و ایمانیات کو امر حسن اور مرغوب سمجھوانے والی طاقت اور پھر اسے جذب کرنے والی قوۃ یہ امانت ہی کی قوۃ ہے۔

امانت کی ضد بد دیانتی اور خیانت ہے جس کے معنی ہیں امور خیر کی رغبت نہ کرنا انہیں مستحسن نہ سمجھنا اور قبول نہ کرنا اور نتیجہ کے طور پر لہو ولعب اور خرافات میں مبتلا رہنا اور زندگی کو برباد

کر دینا۔

اس خیانت کی قوت کو جو امور خیر کو بالا دافع کر دیتی ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں فتنہ کہتے ہیں جو در حقیقت امانت کی ضد ہے۔ پس امانت 'ایمان اور عمل صالح کو جذب کرتی ہے اور فتنہ اسے دفع کرتا ہے۔ فتنہ کا ما حصل بددیانتی 'اور خیانت ہے اور خیانت امر خیر میں ہوتی ہے۔ امر شر کو درع کرنے کا نام خیانت نہیں۔ ایمان کے نظام صالح اور حسن معاشرت میں رخنہ اندازہ اور اس کے نظام میں افرا تفری پھیلانا ہی خیانت ہے جسے فتنہ کہتے ہیں۔ پس بر ہونے کی وت کا مادہ امانت ہے اور ہر نیکی کو دفع کرنے کے اور توڑنے درہم برہم کرنے کے مادہ کا نام فتنہ ہے اور دونوں مادے انسان میں موجود ہیں۔ شریعت 'مادہ امانت کو اجاگر کرنے اور مادہ فتنہ کے استیصال کے لئے آئی ہے۔

جہاد و قتال انسانوں کے گلے کاٹنے کے لئے نہیں رکھا گیا بلکہ دفع فتنہ کے لئے رکھا گیا ہے۔ تاکہ کوئی فتنہ زدہ قوم نظام صالح کو برباد نہ کر پائے۔ یہ جدا بات ہے کہ اس کی بربادی اور رخنہ اندازی انسانوں ہی کے ہاتھوں ہوا کرتی ہے تو وہ فتنوں کو مٹانے والی طاقت بالآخر ان ہی کی گردنوں پر مسلط ہوتی ہے ورنہ اصل مقصود دفع فتنہ ہے قتل انان نہیں۔ چنانچہ یہی فتنہ زدہ انسان اگر فتنہ سے ہٹ کر امانت پر آجائیں تو قتال فوراً بند ہو جاتا ہے۔ بہر حال امانت امور حسنہ کے امتحان کی قوت ہے اور فتنہ امور حسنہ کے استہجان و تخریب کی قوت ہے۔

حیاداری اور فحش کاری

ترک تقویٰ کو بروئے کار لانے والی قوت جو انسان کے باطن میں رکھی گئی ہے حیاء ہے جس سے انسان امر قبیح کے ارتکاب سے سکڑتا اور منقبض ہوتا ہے جس سے قبائح متروک ہو جاتے ہیں اگر حیاء کا مادہ نہ ہو تو امور قبیحہ سے رکنے بچنے کی صورت نہ ہو۔ پس منکرات کو برا ثابت کرنے والی اور بچانے والی طاقت حیاء ہے حیاء کی عدم موجودگی میں نہ آدمی قبیح کو قبیح کہتا ہے اور نہ اس سے رک سکتا ہے اس لئے فرمایا گیا۔

اذا فاتك الحياء فاصنع ماشئت۔

"جب تجھ سے حیاء جاتی رہے تو جو تیرا جی چاہے کر"۔

اسی لئے حدیث میں الحياء خير كله' (حیاء کل کی کل خیر ہی خیر ہے) فرمایا گیا اور اسی لئے حیاء کو ایمان کا عظیم ترین شعبہ قرار دیا گیا ہے کہ خلاف ایمان حرکات سے بچاؤ اس قوت کے بغیر میسر آنا ممکن نہ تھا۔

حیاء کی ضد فحش ہے جو ہر امر قبیح پر بے حیائی اور بے غیرتی کی بات کو بروئے کار لاتی ہے اور حیاء دارانہ امور کا نظام گڑبڑ ہو جاتا ہے 'زناکار 'شراب خوری' جوئے بازی 'نقب زنی 'کذب بیانی اور

بدگوئی وغیرہ سارے قبائح پر آمادگی اور ان کا ارتکاب اسی قوت فحش سے ہوتا ہے۔ پس حیاء منکرات سے دور کرتی ہے اور فحش منکرات کے قریب لاتا ہے۔ پس منکرات شرعیہ کا مصدر اور سرچشمہ فحش ہے اور ان سے بچاؤ کا سرچشمہ اور مصدر حیاء ہے۔

خلاصہ کلام خلاصہ یہ نکلا کہ امور خیر یعنی معروفات کی رغبت و تعمیل کا سرچشمہ امانت ہے اور ان کی خلاف ورزی اور درہمی برہم کا سرچشمہ فتنہ ہے اور تمام امور شر یعنی منکرات سے بچاؤ کا سرچشمہ حیاء ہے اور ان کے ارتکاب اور سیہ کاری کا سرچشمہ فحش ہے۔ پس امانت و فتنہ، حیاء و فحش کی یہی چار قوتیں ہیں جس سے معروف، منکر اور بر و تقویٰ کا تعلق ہے۔ اول دو طاقتوں کا تعلق افعال بر کے کرنے اور چھوڑنے سے ہے، اور آخر کی دو قوتوں کا تعلق متروکاتِ تقویٰ کے ترک اور ارتکاب سے ہے۔ اس لئے شریعتِ الٰہی کا کام جو بنی آدم کی تہذیب و اصلاح کی کفیل بن کر آئی ہے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ افعال بر کا امر کر کے امانت کی طاقت کو مضبوط بنائے اور اس کی ضد فتنہ کا استیصال کرے اور تروک تقویٰ سے نہی کر کے حیاء کی طاقت کو مستحکم بنائے اور اس کی ضد فحش کا استیصال کر کے کہ یہی عین عدل و احسان ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاءِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ.

"اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا، اور روکتا ہے برے کاموں اور منکر سے، اور نصیحت کرتا ہے تم کو شاید کہ یاد کرو"۔

بر و تقویٰ سے انقلابِ باطن پس یہ امر بالمعروف یا امر بالبر براہ راست قوت امانت پر اثر انداز ہوتا ہے جس سے آدمی امین بنتا ہے، اور امین بن کر ایماندار ہوتا ہے ایماندار ہو کر مامون ہوتا ہے جس سے خیر کے عناصر ابھر جاتے ہیں اور فتنے دب جاتے ہیں اور نہی عن المنکر یا ہدایت و تقویٰ براہ راست قوت حیاء پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے آدمی باحیاء بنتا ہے، اور حیاء دار بن کر برائیوں اور منکرات سے نفرت کرنے لگتا ہے جس سے شر کے عناصر دب جاتے ہیں اور ایمانداری کے موانع دور ہو کر ایمان اور عمل صالح کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔

الحاصل بر و تقویٰ کے عمل سلسلے پیش کرنے سے پہلے انسان کے ان چار اندرونی مادوں اور قوتوں کی تشریح ضروری تھی تاکہ یہ معلوم رہے کہ شریعت کا نظام بر و تقویٰ اور لائحہ انسان کی کن طاقتوں پر اثر انداز ہوتا ہے کن قوتوں کو ابھارتا ہے اور کن طاقتوں کو پشت کرتا ہے اور اصلاح کے اسی

مثبت و منفی عمل سے انسان کے باطن میں کیا کیا انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ جس سے اس کا نفس اور بگڑتا ہے۔

الحاصل بر و تقویٰ کے عملی سلسلے پیش کرنے سے پہلے انسان کے ان چار اندرونی مادوں اور قوتوں کی تشریح ضروری تھی تاکہ یہ معلوم رہے کہ شریعت کا نظام بر و تقویٰ اور لائحہ افعال و تروک انسان کی کن طاقتوں پر اثر انداز ہوتا ہے، کن قوتوں کو ابھارتا ہے اور کن طاقتوں کو پست کرتا ہے اور اصلاح کے اس مثبت و منفی عمل سے انسان کے باطن میں کیا کیا انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ جس سے اس کا نفس اور بگڑتا ہے۔

اب افعال و تروک یا بر و تقویٰ (احکام اور امتناعی احکام نیکوکاری اور پرہیزگاری) کے اصولی نقشہ کے عملی پہلو پر نظر ڈالو۔ تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں ایمان باللہ۔ اخلاص للہ، ذکر اللہ تذکر بایام اللہ، تلاوت کلام اللہ، تعظیم شعائر اللہ، جہاد فی سبیل اللہ اور حضور مع اللہ یا (نماز و دعا اور مجاہدہ و مراقبہ وغیرہ) ادھر تعلق مع الخلق کے سلسلہ میں خدمت خلق اللہ، انفاق فی سبیل اللہ، احسان للہ، اطعام لوجہ اللہ، اخوۃ فی اللہ اور النصح لدین اللہ یعنی عام خیر خواہی بنی نوع انسان، عدل و انصاف، وفاء عہد اور ایفائے عہد وغیرہ سب کے سب امور بر کے اجزاء ہیں جن کے کرنے سے انسانی نفس سربلند مقبول اور محبوب خدا و خلق بنتا ہے، عند اللہ اس کی وجاہت قائم ہوتی ہے، اور عند الناس اس کی بالادستی اور برتری مسلم ہو جاتی ہے جس سے وہ دنیا و آخرت کے بلند مناصب و مقامات کا حق دار ہو کر ابرار واخیار کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن بر (نیکوکاری) کا یہ سارا لمبا چوڑا سلسلہ اس وقت تک کارگر اور موثر نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ نفس انسانی میں سے نفسانیت اور اس کے رذائل کا خاتمہ نہ ہو جو اس امور بر کے حق میں سم قاتل اور قوی مانع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور کسی طرح بھی انسان کو ان سربلندیوں پر نہیں پہنچنے دیتے مثلاً جب تک انسانی نفس سے باہ کے رذائل جیسے حرص و ہوا، ہوس رانی اور بدمستی سے کھانے پینے کی لذتوں میں غرقابی جنسی خواہشات اور نفسانی عیش میں ہمہ وقت سرگردانی کے جراثیم خارج نہ کئے جائیں یا جاہ کے رذائل جیسے ہوس اقتدار، نمائش و وقار کی ہمہ وقت بھوک، جذبات انانیت و خودی اور ہوس ریاست و امارت زائل نہ ہوں گے۔

نفسانیت کا شر دور کئے بغیر ملکیت کی خیر قرار نہیں پکڑ سکتی

خلاصہ یہ نکلا کہ ایک طرف زن، زر، زمین کی جاہ پسندانہ بدمستیوں اور دوسری طرف نفس و ہوائے نفس کی جاہ پسندانہ خودی، خود بینی اور خود آرائیوں کا سودا انسان کے سر سے نہ نکالا جائے یا کم از کم ان کے ترک کا خوگر نہ بنایا جائے اس وقت تک انسان پر

اعمال بر کا رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ اگر بتکلف چڑھ بھی گیا' تو وہ جڑ نہیں پکڑ سکتا اور اگر اتفاقاً کچھ جمی گیا تو پختہ نہیں رہ سکتا۔ ایک ہی شوب میں اڑ جائیگا۔

بہر حال نفس میں روحانیت اور ملکیت کی خیر اس وقت تک جاگزیں نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں سے نفسانیت کا یہ جبلی شر کھرچ کر باہر نہ پھینک دیا جائے' بالفاظ دیگر افعال بر کی قلعی سے اس وقت تک نفس پر چمک دمک نہیں آسکتی جب تک کہ تروک تقویٰ سے اس کا رنگ خودی اور زنگ انانیت اتارا نہ جائے اور اس تک قلب کے آئینہ میں انوار الٰہیہ منعکس نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس صیقل کر کے شفاف نہ کر لیا جائے۔

دل را اگر تو صاف کنی چو آئینہ
درد لے جمال دوست بہ بینی چو آئینہ

عباداتی سال کا آغاز و اختتام

اس لئے شریعت نے اپنے آغاز کار سے لے کر انجام کار تک افعال و تروک اور (مثبت اور منفی احکام) کا رشتہ ملا جلا رکھا ہے۔ اور افعال بر کو تروک تقویٰ سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہونے دیا چنانچہ شریعت کا آغاز نزول قرآن سے ہوتا ہے اور نزول قرآن مادہ رمضان سے ہے۔ اس لئے ماہ رمضان گویا شریعت اور اس کی عبادتوں کا سن آغاز سے بالکل اسی طرح جیسے اداروں و کارخانوں اور تعلیم گاہوں وغیرہ میں سال کا آغاز کسی خاص مہینہ سے مقرر کر لیا جاتا ہے' اور اسی ماہ سے اس کے کاروبار کا آغاز سمجھتے ہیں اور اسی سے رجسٹر دفتر اور بہی کھاتے شروع کرتے ہیں مثلاً اسلامی اداروں میں حسابی سال عموماً محرم سے شروع کر کے ذی الحجہ پر ختم کیا جاتا ہے تعلیم گاہوں میں تعلیمی سال عموماً شوال سے شروع کر کے رمضان میں ختم کیا جاتا ہے۔ انگریزی اداروں میں دفتر سال جنوری سے شروع کر کے دسمبر پر ختم کیا جاتا ہے' ایسے ہی اسلامی شریعت کا دینی اور عباداتی سال ماہ رمضان سے شروع ہو کر شعبان پر ختم ہو جاتا ہے۔

چنانچہ نزول قرآن جو اساس شریعت ہے' ماہ رمضان میں ہوا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ.

"رمضان کا مہینہ وہ ہے کہ اس میں قرآن اترا ہے"۔

اسی لئے رمضان گویا عباداتی سال کا نقطہ آغاز نکلا جس سے انسان کا ایمانی نشوونما متعلق ہے۔ اور شعبان نقطہ اختتام ثابت ہوا۔ جو اس ایمانی شباب کے بلوغ کی حد ہے۔ اس لئے بنص حدیث نبوی ﷺ شعبان کے مہینے میں عمروں کے اختتام کا اعلان عالم غیب میں ہو جاتا ہے۔ جو درحقیقت اعمال کے انقطاع کا اعلان ہے کہ عمل کا تعلق عمر سے ہی ہے' بلکہ عمر دی ہی گئی ہے عمل کے لئے اس لئے جس آن یہ زندگی ختم ہو گی' اسی آن انسان کا عمل' رزق اور کسب وغیرہ سب منقطع ہو جائے گا۔

یوں بھی ہر سال پچھلے رزق کا حساب ختم کر کے نئے سال کے لئے روزی رزق اس کا ماہ میں تعین کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے۔ پس شعبان اعلان اختتام طاعات وانقطاع اعمال کا مہینہ نکلا' جسے عباداتی ال کا نقطہ اختتام کہنا چاہئے۔ جس طرح کہ رمضان اس کا نقطہ افتتاح وآغاز تھا۔

ماہ رمضان نیکیوں کا مرکز اِتصال اب رمضان کو لیجئے تو اس میں افعال بر اور تروک تقویٰ کو باہم ایک دوسرے سے اس طرح گوندھ دیا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہلال رمضان نظر آتے ہیں اول شب ہی سے اس ماہ کا افتتاح دو چیزوں سے کیا گیا ہے جو اعمال بر کی جان ہیں یعنی تلاوت قرآن اور نماز تراویح' یہی دو چیزیں ہیں جس سے انسانی نفس کو قرب خداوندی اور لذت وصال کی دولت میسر آتی ہے۔ نماز تراویح سے تو انتہائی قرب ہوتا ہے۔ کیونکہ نص قرآن و بتصریح حدیث سجدہ ہی کمال قرب کا ذریعہ ہے جو افعال صلوٰۃ کا اصلی مقصود ہے۔

ارشاد قرآنی ہے۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ.

''سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ''۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

ان اقرب مایکون العبد من ربہٖ وھو ساجد۔

''بے شک بندہ اپنے رب سے قریب تر اس وقت ہوتا ہے کہ وہ سجدے میں ہو''۔

اور قرب بمعنیٰ اتصال ہی نہیں بلکہ بمعنیٰ الصاق بھی ہے۔ کیونکہ حدیث نبوی ﷺ میں تصریح ہے کہ بحالت سجدہ انسان کا سر اللہ کے قدموں پر گرتا ہے۔ پس اقربیت یعنی کمال قرب وبقا تو نماز سے ملا' اور پھر اس کمال قرب کی بھی تکمیل اور باثمرہ ہو جانا روزانہ کے چالیس سجدوں سے ہو جائے گا۔ کیوں کہ بیس رکعت میں چالیس سجدے ہوتے ہیں اور چالیس کے عدد کو تکمیل شے میں خاص دخل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ دینے کا وقت آیا تو چالیس دن کا چلہ کرا کر مناسبۃ مع الغیب کی تکمیل و تقویہ کرائی گئی۔ اور بنص حدیث نبوی ﷺ قلب سے حکمت کے چشمے پھوٹ نکلے یعنی قلب کی ایک خاص علمی تکمیل کے لئے چالیس دن کا مخلصانہ عمل تجویز فرمایا گیا جس سے حضرات صوفیاء کرام نے چلہ کشی کا اصول اخذ کیا۔

غرض چالیس کے عدد کو تکمیل حال وخیال میں خاص دخل ہے۔ اس لئے رمضان کی تراویح

میں روزانہ چالیس سجدے پیاپے کرائے گئے۔

بندہ و خدا میں ربط باطنی

پھر اس کمال قرب کو بے ثمر نہیں چھوڑ دیا گیا' بلکہ اس کے ساتھ کمال وصال کی سبیل تلاوت قرآن سے کی گئی کیونکہ حدیث نبوی ﷺ میں قرآن کو اللہ کے باطن کی چیز فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے ۔

تَبرّكْ بالقران فانه' كلام الله وخرج منه'.

"قرآن سے برکت حاصل کرو' کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔

اس سے واضح ہوا کہ قرآن اللہ کے اندر سے نکلی ہوئی چیز ہے جو تلاوت کے ذریعے ہمارے اندر پہنچ جاتی ہے یعنی اس کے باطن سے چلتی ہے اور ہمارے باطن میں پہنچ جاتی ہے' جس سے اللہ اور اس کے بندے کے درمیان باطنی ربط پیدا ہوتا ہے۔

کامل ترین ملاپ

ادھر ایک دوسری حدیث میں تلاوت قرآن کو محادثہ مع اللہ یعنی اللہ سے باتیں کرنا بتلایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ بات کر کے متکلم اور مخاطب اپنا اپنا مافی الضمیر دوسرے تک پہنچا دیتے ہیں' جسے علمی قرب کی انتہائی منزل کہنا چاہئے۔

پس! تلاوت کے ذریعے ہمارے اور اس کے باطن کا ریل میل کچھ اس شان سے ہو جاتا ہے کہ اس سے زیادہ توافق اور تواصل کی دوسری صورت نہیں ہو سکتی کیونکہ جسمانی میل میلاپ اور وصل صرف اطراف بدن کے مل جانے کی حد تک ہوتا ہے ایک جسم دوسرے جسم میں سما نہیں سکتا' گویا جسمانی وصال بھی محض سطحی ہوتا ہے۔ اور اس میں لذت بھی اگر ہوتی ہے تو سطحی اور عارضی' لیکن روحانی ملاپ ہے کہ جسمانی میل ملاپ تو بجائے خود ہے' روحانی میل ملاپ تو بجائے' خود ہے' روحانی میل ملاپ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر اس وصل و وصال اور میل ملاپ کو بھی اگر دیکھا جئے تو وہ بھی وسیلہ ہی ہے۔ اصل مقصد قبول ہے نہ کہ وصول۔ اگر وصول ہو اور قبول نہ ہو تو وہ وصول بے کار ہے۔ بادشاہ کے یہاں وصول تو شاگرد پیشہ اور کم مرتبہ ملازمین کو بھی ہو جاتا ہے مگر قبول نہیں ہوتا وزیر اعظم اور امراء شاہی اگر واصل ہوتے ہیں تو یہ محض وصول ہی نہیں بلکہ ان کا قبول بھی ہوتا ہے۔

اعتراف قبولیت

سو اس تلاوت تراویح میں جبکہ فاتحہ کی تلاوت ضروری ہے' اور ہر رکعت میں ضروری ہے۔ خواہ بلاواسطہ ہو یا بواسطہ امام' اور اس کی ایک

آیت پر ادھر سے قبولیت کا بروقت اعتراف واعلان کیا بھی جاتا ہے۔

بندہ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہتا ہے تو فوراً جواب دیتے ہیں حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ (میرے بندے نے میری تعریف کی) وہ کہتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تو فرتے ہیں ' اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ' میرے بندہ نے میری ثناء وصفت بیان کی۔ جب یہ کہتا ہے مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ تو فوراً فرماتے ہیں مَجَدَنِیْ عَبْدِیْ (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی) جب یہ کہتا ہے کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُوَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ تو فرماتے ہیں هٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ (یہ میرا اور بندہ کے درمیان کا معاملہ ہے) جب وہ سوال کرتا ہے اور اِهْدِنَا سے آخر تک پڑھ جاتا ہے تو فوراً فرماتے ہیں۔ وَلِعَبْدِیْ مَاسَاَلَ (میرے بندہ کے لئے وہ سب کچھ ہے جو اس نے مانگا ہے) تو یہ بروقت اقرار واعتراف اور بندہ کو اپنا کہہ کر اس کی بات کو سراہنا ہی قبول ہے جس کے لئے وصول کی تمنا کرتے ہیں۔

بشری عروج کا نقطہ کمال

پس تراویح وتلاوت میں ابتدائی مرتبہ قرب اتصال کا ہے جو نماز سے حاصل ہوتا ہے پھر قرب سے وصول ووصال کا ہے جو تلاوت سے حاصل ہوتا ہے اور پھر وصول سے قبول ورضا کا ہے جو تلاوت خاص کے مکالمہ سے حاصل ہوتا ہے غرض تراویح وتلاوت سے حضرت کی ہم نشینی' معانقہ اور مکالمہ' تراضی طرفین کی دولت حاصل ہو جاتی ہے جس سے آگے بشری عروج وکمال کا کوئی اور مقام نہیں۔

لیکن نظر اس پر کیجئے کہ جہاں رمضان کی راتوں میں نماز و تلاوت سے وصول وقبول کی لذتیں دی جاتیں ہیں۔ وہیں اس مبارک مہینہ کے دونوں میں نفس کی ہوسنا کیوں اور نفسانی لذات کو بھی قوت سے ترک کرایا جاتا ہے۔ کھانا پینا بھی ترک' مقاربت نسواں بھی بند' حتی کہ ان چیزوں سے خالی لذت لینا بھی ناپسندیدہ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ شب کی غیر معمولی لذۃ وصول وقبول' جو افعال بر میں سے فعل تروایح وتلاوت سے ملتی تھی بغیر ان تقوائی تروک کے میسر آنی ناممکن تھی۔

پس رمضان کے مہینہ میں دن بھر روزہ کے ذریعہ جو مجموعہ تروک ہے نفس کو مانجھا اور صاف کیا جاتا ہے اور شب کو اس صاف شدہ ظرف پر تلاوت وتراویح سے جو مجموعہ افعال بر ہے قلعی کی جاتی ہے جس سے وہ چمک اٹھتا ہے اور اس میں قرب واتصال اور قبول ووصال کی اس چمک دمک سے انوار خداوندی منعکس ہونے لگتے ہیں گویا نفس انسان ۔۔۔ میں نفس رحمان نظر انے لگتا ہے۔ پس ماہ رمضان جیسے بر کا مہینہ ہے ویسے ہی تقویٰ کا بھی مہینہ ہے۔ اور جیسے اس میں اثم سے بچاؤ میسر آتا ہے ویسے ہی اس میں عدوان سے بچاؤ کی توفیق ملتی ہے۔

روزہ اور ماہ روزہ کا ثمر

اس لئے قرآن حکیم نے جب رمضان کے روزوں کا ذکر کیا تو اس کا سب سے بڑا ثمرہ تقویٰ بتلایا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ.

”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے تم سے پچھلوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ“۔

اور جب خود ماہ رمضان کا ذکر کیا جس میں دونوں کے ساتھ راتیں بھی شامل ہیں تو نزول قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا سب سے بڑا ثمرہ نور ہدایت، نور دلائل اور نور معرفت ظاہر فرمایا جو در حقیقت انسانی نفس کی چمک دمک اور قلعی کا سب سے اعلیٰ سامان ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ.

”مہینہ رمضان کا وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لئے ہدایت اور ہدایت کے کھلے دلائل کا مجموعہ اور قوت تمیزی کا علم ہے“۔

گویا روزہ کا ثمرہ تقویٰ اور ماہ کا ثمرہ بر نکلا اور اس طرح قرآن کریم سے ماہ رمضان بر و تقویٰ کا مہینہ ثابت ہوا جس سے اثم وعدوان کا خاطر خواہ دفعیہ ہو جاتا ہے۔ حتی کہ اثم وعدوان کے چشمے سوکھ جاتے ہیں۔ چنانچہ نفس کا دلنہ پانی بند ہو جاتا ہے۔ اور شیاطن قید کر دیئے جاتے ہیں جو اثم وعدوان پر ابھارتے تھے۔ ایک دانا دشمن کی حیثیت سے اور ایک نادان دشمن کی حیثیت سے ظاہر ہے کہ دونوں دشمنوں کے اسیر ہو جانے پر اثم وعدوان کا دفعیہ قدرتی تھا۔

صیام و قیام کا باہمی تناسب

اس لئے روزہ تلاوت تراویح یعنی صیام و قیام کا تناسب اور ایک سے دوسرے کا رابطہ بھی واضح ہو گیا کہ ایک تخلیہ کا مقام ہے یعنی روزہ جو انسان کو رذائل نفس سے پاک کرتا ہے اور ایک تحلیہ کا مقام ہے یعنی قرآن اور تراویح جو نفس انسانی کو چمک دار اور نورانی بناتا ہے۔ اس لئے قیامت کے دن صیام و قرآن کی شفاعت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں بطور قرین وعدیل کے ذکر فرمایا گیا ہے۔

خلاصہ مضمون حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن صیام و قرآن دونوں مل کر بندہ کے شفاعت کریں گے۔ روزے کہیں گے کہ خداوندی! ہم نے دن بھر اس بندہ کو کھانے پینے اور شہوانی لذتوں سے محروم رکھا تو اس کے حق میں ہماری شفاعت کو قبول فرما، قرآن کہے گا۔ خداوند! میں نے اس بندہ

کو راتوں میں نیند اور آرام سے محروم رکھا تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما۔ ظاہر ہے کہ ان دو کی شفاعت کا انجام سوائے قبولیت شفاعت کے دوسرا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن کلام الٰہی اور صفت خداوندی ہے۔ تو اس کی شفاعت ایک صفت الٰہی کی شفاعت ذات سے ہے' جو ذات سے جدا نہیں۔ اس لئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ خود ہی اپنی بارگاہ میں شفاعت فرمائیں گے۔ تو کون ہے کہ اس شفاعت کو رد کر سکے؟

اور وہ خود کیسے رد فرمائے گے ۔

چوں خدا از خود سوال و کد کند
پس دعائے خویشتن چوں رد کند

ادھر روزہ کو تمام عبادات میں حق تعالیٰ نے اپنی چیز فرمایا ہے۔ اور یہ کہ میں ہی خود اس کا بدلہ دوں گا اور ظاہر ہے کہ اپنی چیز کو آنا کہہ کر کون بے آبرو کیا کرتا ہے کہ اسے رد کرے۔ اس لئے صیام و قرآن کی شفاعتیں رد ہونی کی کوئی وجہ نہیں۔۔۔ اس سے صاف واضح ہوا کہ شریعت نے اپنے عباداتی سال کا افتتاح افعال و تروک دونوں سے کیا ہے جو تربیت انسانی کے دو بازو ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ دونوں میں ترک کو اصل رکھا اور افعال اس کے ضمن میں رکھے' اور راتوں میں افعال کو اصل قرار دیا' اور تروک اس کے ضمن میں بقدر ضرورت آجاتے ہیں جو بوقت تلاوت و صلوۃ قائم رہتے ہیں۔ اور اس طرح سے اس کی راتیں روشنی میں دونوں سے کم نہیں ہیں بلکہ لَيْلُهَا وَ نَهَارُهَا سَوَاء'' کی مصداق ہیں۔

ہلالِ عید

جب رمضان کے یہ معدودے چند ایام اس شان سے پورے ہو جاتے ہیں کہ اس کے دن تروک میں مصروف اور اس کی راتیں افعال میں مشغول تو ہلال عید تکمیل عبادت کا مسرت بخش پیغام لے کر فضاء آسمان میں نمودار ہو جاتا ہے۔ گویا منجاب اللہ آسمان سے اطلاع دیجاتی ہے کہ اے بندگان الٰہی! تم نے وہ فرض پورا کر دیا جو ہلال رمضان نے تمہارے ذمہ عائد کیا تھا۔ تم نے اپنے دنوں کو نفسانی لذتوں (طعام و شراب اور مقاربت) سے بے نیاز رکھ کر خداوندی قرب و وصال کی لذتوں کو ترجیح دی اور اپنی راتوں کو لہو الحدیث اور قصہ کہانیوں میں گنوانے کی بجائے خیر الحدیث اور احسن القصص کے کہنے اور سننے میں مشغول رکھا' اس لئے تمہیں ہلال عید کے نورانی حروف کے ذریعے مبارک باد دی جاتی ہے کہ تم کامیاب ہوئے اور منزل تک پہنچ گئے' اس پر بندوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے قدرداں اور مشکور پروردگار کا جان و مال سے شکریہ ادا کریں چنانچہ عید کی صبح ہوتے ہی اولاً صدقہ فطر ادا کر کے مال سے اور پھر دوگانہ عید ادا کر کے جان و مال سے اپنے محسن رب اور منعم پروردگار کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے تیس دن کی یہ حقیر اور ناچیز قربانی

قبول فرمائی اور دوران قربانی میں تو خصوصی طور پر لذت قرب ووصال سے نوازا۔ اور بعد تکمیل ہلالی حروف سے اپنی خوشنودی کا اعلان عام فرمایا۔

تتمہ رمضان

پس عید در حقیقت رمضان کے افعال وتروک کا ایک عملی شکریہ ہے جو بندوں کی جانب سے جناب خداوندی میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس شکریہ پر حسب وعدہ الٰہی لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَ زِیْدَنَّکُمْ (اگر تم شکر گزار ہو گے تو تمہاری نعمت میں اضافہ کروں گا) بسلسلہ اضافہ نعمت شش عید یعنی شوال کے ۶ روزوں کا مزید اضافہ کیا جاتا ہے جنہیں رمضان تو نہیں تتمہ رمضان کہا جائے گا۔ کیونکہ رمضان کی مدت ایک ماہ کی مدت جو ایک منضبط اور معتدل مدت ہے جس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی۔

سال سے کم اور ہفتہ سے زیادہ ایک درمیانی مدت ہے۔ اس میں اگر ایک دن کا بھی اضافہ ہو جاتا تو دوسرا ماہ لگ جانے سے رمضان کی مدت دو ماہ ہی کہلاتی۔ اور روزے ایک ماہ کی بجائے دو ماہ کے کہلائے جاتے جو یقیناً طبائع پر بھی شاق گذرتے' مدت بھی معتدل نہ رہتی اور اس میں کسر بڑھ جانے سے مدت کا انضباط بھی فوت ہو جاتا۔ اس لئے روزہ کا ایک ماہ پورا کرا کر اور درمیان میں ایک دن خوشی اور کھانے پینے کا دے کر بطور تتمہ رمضان ۶ روزے اور دیئے اور وہ بھی غایت رحمت سے اختیاری دیئے گئے جن میں کوئی جبر واکراہ نہیں تاکہ بندوں پر بھاری بھی نہ ہو اور خدا کی طرف سے اس شکر گذاری پر حسب قانون الٰہی زیادت نعمت کا وعدہ بھی پورا ہو جائے۔ گویا اس طرح اس عباداتی سال کا افتتاح ۳۶ روزوں اور ۳۰ دن کی تراویح سے کر دیا گیا۔ یعنی ۳۶ تروک ۳۰ افعال سے انسانی عبادت کا سال شروع ہوتا ہے۔

عبادت کا ہمہ گیر نقطہ آغاز

غور کرو تو رمضان میں عبادت کا یہ جمع شدہ ذخیرہ رمضان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ سال بھر تک یہی ذخیرہ توفیق وبرکات کا کام دیتا ہے اگر یہ ذخیرہ اس ماہ میں جمع نہ ہوتا تو پورا سال عبادت سے بیگانگی اور برکات باطن سے محرومی میں بسر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اصولاً ہر شے کے نقطہ آغاز ہی میں اس کا انجام اور وسط پنہاں ہوتا ہے۔ وہ نقطہ پھیل کر وسط سے گذرتا ہوا انجام تک جا پہنچتا ہے یعنی آخر تک اسی کا نقطہ فیض کام کرتا رہتا ہے۔ مثلاً ہر کلمہ اور کلام کا نقطہ آغاز حروف مقطعات (حروف تہجی) ہیں اس لئے ہر کلمہ وکلام اور لمبی سے لمبی عبارات میں فیض ان ہی حروف ہجا کا ہوتا ہے درخت کی ہر شاخ اور پھول پتی کا نقطہ آغاز اس کا تخم ہے' تو وہی تخمی مادہ پھیل پھیل کر پھول پتیاں اور برگ وبار بنتا رہتا ہے۔ وہ نہ

ہو تو نہ شاخ ہو نہ برگ و بار گویا سارے برگ و بار در حقیقت اس تخم کا فیض ہوتی ہیں۔

اعداد کا نقطہ آغاز واحد ہے وہی (ایک) مکرر سہ کرر ہو کر دو اور تین اور سوا لاکھ بنتا رہتا ہے' وہ نہ ہو تو دو نہ ہوں نہ سو اور نہ لاکھ گویا ارب ہا راب اور کھرب در کھرب فیض صرف ایک ہی کا ہوتے ہیں۔ خود بذاتہ کچھ نہیں' اس اصول پر سمجھو کہ عباداتی سال کا نقطہ آغاز رمضان المبارک اور اس کے افعال و تروک ہیں۔ (جیسا کہ ابھی واضح ہوا) یہی ایک حصہ افعال و تروک کا ذخیرہ در حقیقت سال بھر کی عبادت کا نقطہ آغاز ہے اس لئے یہی مادہ عبادت پورے سال کی عبادت کا مادہ ہے جو رنگ بدل بدل کر مختلف طاعات میں ظہور کرتا رہے گا۔ گویا سال بھر کی مختلف الانواع عبادتیں اور بر و تقویٰ کے مختلف مظاہر اس ماہ کے صبر و استقامت کا فیض ہوتے ہیں' یہ نہ ہو تو سال بھر کی توفیق و برکت درجہ صفر میں رہ جائے۔ جیسا کہ روایات حدیث میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔

ماہ رمضان کے اعداد کا اثر

شاید اس لئے اس ماہ مبارک کے افعال و تروک کے اعداد کچھ ایسی مناسب سے رکھے گئے ہیں کہ برکۃً ہی نہیں عدداً بھی پورے سال پر پھیل سکیں۔ بلکہ ان کی ایک ایک اکائی دوسرے مہینوں کی دہائیوں کے برابر ثابت ہو۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے جو خطبہ آخر رمضان میں ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ کا ایک حصہ یہ ہے۔

یاایها الناس قد اظلکم شهر عظیم شهر مبارك شهر فیه لیلة خیر من الف شهر جعل الله صیامه و قیام لیله تطوعا من تقرب فیه بخصلة من الخیر کان کمن ادیٰ فریضة فیما سوا و من ادیٰ فریضة فیه کان کمن ادیٰ سبعین فیما سواه (مشکوٰۃ)

"اے لوگو! تم پر سایہ گستر ہوا ہے ایک عظمت والا مہینہ ایک برکت والا مہینہ' وہ مہینہ جس میں ایک رات' ہزار رات سے بہتر ہے اللہ نے اس میں روزے فرض کئے ہیں اور قیام لیل (تراویح) نفل رکھی ہے جس نے اس مہینے میں کوئی بھی بھلائی کی بات کی تو وہ ایسا ہے کہ کسی شخص نے ماسوا رمضان کے (بقیہ سال میں) کوئی فریضہ ادا کیا۔ اور جس نے اس ماہ میں فریضہ ادا کیا مثلاً (روزے رکھے) تو وہ ایسا ہے جیسا کہ اس نے غیر رمضان میں (بقیہ سال) میں ستر فریضے ادا کئے"۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اس ماہ کی نفل بقیہ سال کے فرض کے برابر ہے اور اس کا فرض بقیہ سال میں ستر فرائض کی برابر ہے۔ گویا بلحاظ برکت ہی نہیں بلکہ بلحاظ اجر اور عدد بھی اس مہینہ کی طاعت کی ایک اکائی دوسرے مہینوں کی طاعت کی دہائیوں کے برابر ہے۔

ماہ رمضان کے دنوں کو دیکھئے تو ان میں ۳۰ روزے رکھے گئے ہیں اور شریعت کی بخششیں بے کراں نے ایک نیکی کو دس نیکی کے برابر شمار کیا ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔ (القرآن)

اس اصول پر یہ ۳۰ روزے ۳۰۰ ہو جاتے ہیں۔ اور ادھر عید کے بعد شش عید جو بطور تتمہ و توابع رمضان کے ساتھ لاحق کئے گئے ہیں (گو بوجہ تسہیل و رحمت انہیں اختیار رکھا گیا' اور جزو رمضان نہیں بنایا گیا) اصول مذکورہ پر ۶۰ ہو جاتے ہیں تو رمضان کے اصل اور ملحقہ روزوں کا مجموعہ بھی وہی ۳۶۰ روزے سال بھر کے تعداد ہے۔ اور اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ رمضان کے یہ انعامی ۳۶۰ روزے سال بھر کے تعداد ہے۔ اور اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ رمضان کے یہ انعامی ۳۶۰ روزے سال بھر کے اوپر ۳۶۰ دنوں کے مساوی ہیں اور رمضان کے یہ اصل اور توابع روزے پورے کر دینے والا سال کے تمام روزے رکھنے والا بن کر صائم الدہر بن جاتا ہے۔ اسی مضمون کو جناب رسول اللہ ﷺ نے الفاظ ذیل میں ارشاد فرمایا ہے۔ جس کو حضرت انصاریؓ روایت فرما رہے ہیں ۔

من صام رمضام ثم اتبعه ستا من شوال كان كصيام الدهر۔ (رواہ مسلم)

"جس نے رمضان کے روزے پورے رکھے۔ پھر شوال میں ۶ روزے ان کے ساتھ اور ملا لئے تو تو یہ عمر بھر روزے رکھنے کی مانند ہے"۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے ۔

رمضان الى رمضان كفارة لما بينهما۔ (الحدیث)

"رمضان سے رمضان تک درمیانی دنوں کے گناہوں کا کفارہ یہ رمضان ہی ادا کر دیتا ہے"۔

اس سے واضح ہو گیا کہ رمضان ہی کی اطاعتوں اور مغفرتوں کا فیض سال بھر تک چلتا رہتا ہے۔ اور یہی فیض منتشر ہو کر سال بھر کے دنوں راتوں کی عبادت اور توفیق کی شکل اختیار کرتا رہتا ہے۔ نہ صرف برکتہً یا اثراً بلکہ عدداً بھی رمضان سال عبادت کا نقطہ آغاز اور تخم توفیق تھا۔ اس لئے مادہ توفیق و طاعت سال بھر کی عبادت کے برگ و بار کی آبیاری کرتا ہے اور پورے سال پر چھایا ہوا رہتا ہے۔

رمضان اور اشہر حج کا باہمی ارتباط

یہی وجہ ہے کہ رمضان کے ایام نے جن تروک (ترک طعام' ترک شرب اور ترک خواہشات) کا پر داز ڈالا وہ رمضان ہی پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ان تروک سے دوسرے اور تروک نشو نما پاتے ہیں اور تقویٰ کے آگے کی منزلیں سامنے چلی جاتی ہیں' جو اگر رمضان میں نہیں ہوتیں مگر رمضان ہی کے

تروک کا ثمرہ ہوتی ہیں۔

ماہ رمضان میں طلب حق نے محبت حق کی خاطر اپنے نفس کی عظیم آرزوؤں یعنی کھانے پینے اور لذت نفسانی کی چیز کو ترک کر کے ترک ہوائے نفس کی استعداد پیدا کرلی تو تروک کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ کھانے پینے اور قرب ووصال کی لذتوں کے سوااور بھی بہت سی لذات ہیں جن کی خواہش نفس میں ہمہ وقت موجزن رہتی ہے، یہ تو صرف باہ کے سلسلہ کی لذتیں تھیں۔ جنہیں رمضان نے ایک دم چھڑا کر فی الجملہ صبر کر لینے کی قوت انسان میں پیدا کر دی تھی۔ لیکن ان سے زیادہ سخت اور ہولناک جاہ کے سلسلہ کی لذتیں ہیں۔ جو انسان کو مغرور و متکبر بنا کر مشاہدہ حق ہی سے نہیں جادہ حق سے بھی بھٹکا دیتی ہیں۔ اور قرب ووصال کے درجات میں سد راہ ہو جاتی ہیں، کبھی مکان، اور بلڈنگ سے اپنے کو باوقار کہلانے کی کوشش کرتا ہے، کبھی اپنے قبیلے اور دوست احباب کے اجتماع اور جمگھٹوں سے اپنے لئے شیخی اور فکر کا سامان بہم پہنچاتا ہے، کبھی اپنی متانت اور سنجیدگی و بامعنی خاموشی کی نمائش سے اپنے سے وقار کی نمائش کرتا ہے، کبھی اپنی زینت و آرائش اور خوبصورتیوں پر گھمنڈ کر کے اپنے خیال میں بدقسمت ہو جاتا ہے اور پھر ان ہی جاہ پسندانہ اندازوں سے دوسروں پر ظلم و تعدی وغیرہ کی بنیادیں کھڑی ہوتی ہیں جن سے دنیا میں فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے اور دنیا امن و سکھ سے محروم ہو جاتی ہے۔

غرض جاہ پسندی اور دوسروں پر بڑا بننے اور عوام میں امتیازی شان نمایاں کرنے کے مختلف ڈھنگ ہیں اور مختلف راستے ہیں جس سے گزر کر ایک مغرور انسان قرب الٰہی اور وصال حق سے محروم ہو جاتا ہے، اس لئے ان کا ترک ان تروک سے بھی زیادہ ضروری ہے جن کی رمضان نے مشق کرائی تھی۔

اس لئے جونہی ان باہی اور شہوانی لذات کے افراط سے نجات پا جانے کی استعداد پیدا کر کے رمضان رخصت ہو جاتا ہے ویسے ہی حج کے مہینے شروع ہو جاتے ہی، جو حج کا پیغام دیتے ہیں جس طرح ہلال رمضان نے اعلان کیا تھا کہ اگر دربار الٰہی میں حاضر ہو کر قرب ووصال شاہی منظور ہے تو شہوانی لذات سے پاک وصاف ہو کر اور انہیں ترک کر کے دربار شاہی (مساجد) میں تراویح و تلاوت کے لئے حاضر ہو جاؤ۔ اسی طرح ہلال شوال اعلان کرتا ہے کہ محل سرائے شاہی (حرم کعبہ) یعنی سید المساجد میں حاضری اور خلوت محبوب مطلوب ہے تو ان جاہ پسندیوں کو ترک کر کے عاشقانہ وار فنگی پیدا کرو اور خدا کے گھر کی طرف پروانہ وار بڑھو مگر ع

شرط اول قدم آن ست کہ مجنون باشی

یہ سامان وقار چھوڑو، اسباب جاہ ترک کرو۔ وسائل غرور و گھمنڈ کو خیر باد کہو اور دیوانہ وار محبوب حقیقی کی طرف چلو، سب سے پہلے گھر بار اور وطن ترک کرو، اور اپنا گھر چھوڑ کر محبوب کے گھر

کی طرف کوچ کرو اپنا شہر چھوڑ کر خدا کے بلد امین کی طرف بڑھو عزیز و اقرباء کی موانست مانع وصال الٰہی ہے تو اسے بھی چھوڑ دو مسافرت اور غربت اختیار کرو جتھے اور قبیلے کی طاقتوں پر بھروسہ تھا تو اسے بھی خیر باد کہو کسمپرسی اور بے کسی کی شان سے گھر سے نکل کھڑے ہو۔ پھر نکلو تو دیوانوں کی طرح عاشقوں کی طرح نکلو۔

عاشقی، درویشی اور سرشاری

سب سے پہلا سامان وقار لباس اور اس کا فیشن ہے اس ترک کر کے احرام باندھو اور ایک لنگی کندھے پر اور ایک لنگی گھٹنوں میں یعنی شاہانہ رئیسانہ اور معممانہ ٹھاٹھ چھوڑ کر فقیروں کا بھیس بھرو اور مسکینوں کی سی وضع بناؤ کپڑوں کی بو کا بھی دھیان نہ رہے۔ کہ خوشبو کی فکر ہو۔ عاشق کو ان نمائشی چیزوں سے کیا واسطہ اگر وہ عشق سے مغلوب ہے۔ بدن کی صفائی ستھرائی کے دھیان کو ترک کرو الحج الشعث التفل حج تو نام ہی ہے میلے کچیلے رہنے یعنی صفائی ستھرائی کے خیال کو غیر سمجھ کر ان سے بے نیاز ہو جانے کا بدن کے بناؤ سنگار کی فکریں چھوڑو نہ غسل کی پرواہ نہ حجامت کی خبر نہ خط کی اصلاح نہ ناخنوں کے بڑھے ہوئے کی فکر حتی کہ میلے بدن میں جوئیں بھی پڑ جائیں تو انہیں بھی مت چھیڑو کہ تم محبوب کے عاشق بن کر چلے ہو تمہیں جانداروں کے قتل و غارت سے کیا سروکار؟ چہرہ غبار آلود پیر گرد آلود نہ سر پر ٹوپی نہ پیر میں جوتہ نہ کندھوں پر عباء و قباء نہ بال سنوارے ہوئے نہ مانگ نہ پٹی نہ ان میں تیل پھر بولنے میں نہ آواز بنانے کی فکر نہ الفاظ کے سنوارنے کی فکر نہ کلمات کی سجاوٹ نہ عبادت کی زینت بلکہ سرے سے ہی فضول کلام ترک کر دو ورد زبان ہو لبیک کبھی پست آواز سے ہو تو کبھی بلند آواز سے کبھی آہستہ سے اور کبھی شور کے ساتھ یعنی آواز بھی عاشقانہ۔

مگر دیوانگی پیدا کرو۔ قافلے میں ہو تو لبیک لبیک کا شور ہو۔ زمین کی اونچ نیچ آجائے تو چلا پڑو تاکہ آواز کا وقار جس کی بناوٹ اور سجاوٹ کی فکر تھی مٹ کر رہ جائے غرض نہ بات اپنی نہ کلام اپنا۔ بات ہو تو محبوب کی اور کلام ہو تو شوق محبوب اور ذوق عشق کا یعنی زبان اور گلا صرف اسی کے لئے وقف ہو۔ محبوب کا گھر آجائے تو آواز شوق بلند کرو شوق و ذوق میں کبھی خانہ محبوب کے پتھروں کو چومو کبھی پردہ دیوار کو تھام کر روؤ اور چیخو کبھی اس گھر کے ارد گرد پروانوں کی طرح گھومو نثار ہو کبھی یاد میں غرق ہو کر سرنگوں ہو اور کبھی بھکاری بن کر بانگ سے سرفراز ہو کبھی فریاد اور کبھی یاد کرو کبھی قرب کا شکریہ کبھی بعد کا شکوہ پیر چکر میں ہوں اور زبان عشق کی حرکت میں پھر ان چکروں میں چال بھی ایک انداز کی نہ ہو جس سے چال کی خوشنمائی کا وقار آگے آئے اگر چند پھیروں میں سیدھے چلو تو چند پھیروں میں اکڑ کر مونڈھے ہلا ہلا کر سینہ تان کر چلو۔

یعنی کبھی در محبوب کے مسکین بن جاؤ۔ اور کبھی محبوب کے سپاہی ہو جاؤ، صورت و سیرت ہی نہیں مرضی بھی تمہاری کوئی اپنی نہ ہو۔

ایک مرضی محبوب ہو اور تم ہو، مرضی حق ہو اور اس کی پیروی تاکہ اندرون میں کوئی شیخی و غرور نہ رہ جائے اور نہ بیرون پر کوئی اتراہٹ اور ناز و انداز کی نمود آئے۔

صورت و وقار کی بھی ممانعت

پھر یہ کفنی کا لباس بھی ان پھیروں میں کبھی ایک ہیئت و رنگ پر نہ ہو کہ صورت وقار پیدا ہو جائے اگر پہلے تین پھیروں میں وہ بر جائے خود نہ ہو۔ تو چار پھیروں میں اسے دائیں کندھے کے اوپر کو لیا جائے۔

تاکہ اس کفنی کے اوڑھنے اور پہننے میں بھی کوئی اتفاقی پن اور سجاوٹ پیدا نہ ہو جائے کہ وہ بھی عاشقی کے شایاں نہیں یعنی اگر غیر اختیاری پن بھی سجاوٹ بن جائے تو وہ بھی یکسر مٹ کر رہ جائے۔ پھر ان گھومنے کے پھیروں میں گو دیوانگی تھی مگر چال ڈھال اور رفتار معمول کی مطابق تھی اس لئے اس کو بھی ختم کرو۔

صفا و مروہ پہنچو تو چال کہیں آہستہ ہو تو کہیں دوڑ بھاگ بھی ہو تاکہ چال کا انداز بھی ایک انداز پر باقی نہ رہے جیسا کہ طواف میں ہیئت بدن کا اپنا انداز مٹا دیا گیا تھا۔ غرض اسی طرح اس عاشق حق کے لباس، بدن، زینت، چال ڈھال، سیرت و صورت، کلام، آواز، رفتار، گفتار وغیرہ میں کوئی شائبہ نمائشی وقار و متانت کا باقی نہ رہ جائے۔

خانہ بدوشی

پھر اگرچہ تم نے وطن اور وطن داروں کا انس چھوڑ دیا، بلد امین میں پہنچ گئے، مگر بلد امین بھی تو بہر حال آبادی ہے جس میں اپنا نہیں تو اس شہر والوں کا سامان زینت، لذت بخش، انکی آوازیں انس افزائے سمع و گوش اور ان کی ملاقاتیں، انس افزائے دید و دل تو ہوتی ہیں جو وصال یار میں حائل ہو سکتی ہیں۔

اس لئے مکہ کی آبادی بھی ترک کرو کہ وہ پھر وطن اقامت اور محل موانست ہے جنگل بیاباں میں بسر کرو جہاں نہ گھر ہو نہ در، نہ تمدن، نہ عمارت نہ سامان معاش، نہ اسباب رفاہیت، عرفات کے ریگستان میں جلتی دوپہر میں دھوپ کے سمندر میں گزارو، کسی کپڑے، خیمہ سے اگر دھوپ سے بچاؤ ہو جائے تو فبہا ورنہ سایہ کی لذت بھی ترک کر دو، تپش کو ترجیح دو اور خنکی کی راحت بھی چھوڑ دو، مسکن اور جائے سکون کی فکر میں مت رہو۔۔۔۔ ویرانہ نشین اور صحرا نورد ہو جاؤ۔ خانہ بدوشوں کی طرح یہ دن منیٰ میں گزارو تو رات مزدلفہ میں بسر ہو۔ نہ وہاں پورا دن، نہ یہاں پوری رات، پھر مزدلفہ کی

رات بھی اس فکر کے ساتھ گزارو۔ کہ صبح ہی یہاں سے کوچ ہے‘ مزدلفہ بھی طلوع آفتاب سے پہلے چھوڑ دو‘ گویا عرفات کے دن کی طرح یہاں کی رات بھی بے فکری سے نہ گزارے کہ عاشق کو چین اور لطف اندوزیوں سے کیا واسطہ؟ پھر مزدلفہ کی آدھی تہائی رات میں خدمت محبوب پیش نظر رہے‘ علاوہ طاعت و عبادت کے اس میدان کی کنکریاں بھی چنو تا کہ اس میگزین سے دشمن الٰہی اور خود عشاق کے پشتینی دشمن شیطان رجیم کو سنگسار کر سکو جو راہ محبوب میں حائل اور ناصح نادان بن کر سامنے آتا ہے۔ مزدلفہ سے منیٰ میں آؤ تو گویا وہاں دو تین شب قیام ہو‘ مگر اس کو بھی سفر در انجمن کا مصداق رکھو‘ ایک جگہ چین سے بسیرا نہ کرو۔ کبھی یہاں سے پھر در محبوب پر جاؤ۔ خانہ محبوب کے گرد پروانہ وار گھومو‘ واپس ہو تو روزانہ اس شیطان سے لڑائی مول لو جو راہ جاں سپاری میں حائل ہوتا ہے تا کہ صلح جوئی سے بیٹھے رہنے کا سکون و وقار بھی ختم ہو جائے‘ اور وہ بھی رمی جمار سے تا کہ سپاہیانہ وقار کا غرور بھی مٹ جائے اور دنیا دیکھ لے تیر و تفنگ چلانے والا سپاہی آج چھوٹی چھوٹی کنکریاں مارنے پر اتر آیا ہے۔

فدیہ جان

تو اب وقت آگیا کہ سر سے اس نفس ہی کو راہ محبوب میں نثار کر دو اور خود اسی کے گلے پر چھری چلا دو‘ اگر سب کچھ کھو کر جان باقی رہ گئی تھی تو اس سے بھی دریغ نہ کرو‘ یہ الگ بات ہے کہ محبوب حقیقی محض اپنی شفقت بے پایاں سے ذبیحہ جان کا فدیہ ذبیحہ حیوان سے قبول فرمالے‘ ورنہ اس راہ میں یہ جان‘ جان آفریں کے سامنے کوئی قیمت نہیں رکھتی‘ اور وہ جب کہ اسی کو بخشی ہوئی ہو تو سودا بہت ہی ارزاں ہو جاتا ہے ؎

جان دی‘ دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بہر حال شکر محبوب کے ساتھ اس کی مرضی کے مطابق منحر میں پہنچ کر اپنا فدیہ ایک جان کی قربانی سے دیدو کہ یہ آخری ترک ہے تروک میں سے جس کے ذریعے وصال محبوب کی آرزو کی جاسکتی ہے۔

بہر حال شہر رمضان نے اگر باہی لذات ترک کرائی تھیں تو اشہر حج نے جاہی لذات کے ترک کا پروگرام پیش کیا‘ جو ترک وطن‘ ترک مسکن اور ترک لباس‘ ترک زینت‘ ترک راحت‘ ترک فیشن‘ ترک نمائش‘ ترک وقار‘ ترک جاہ‘ ترک افتخار ترک نشاط اور ترک مال سے شروع ہو کر ترک جان پر ختم ہو جاتا ہے۔

ایام حج میں یاد رمضان

مگر ساتھ ہی ساتھ باہ کی ان لذات کے ترک سے بھی چشم پوشی نہیں

کہ جو رمضان نے سکھلائی تھیں' بلکہ اشہر حج میں خاص تروک کے ساتھ رمضان کے تروک کو بروئے کار لانے کے لئے گویا نصف ماہ رمضان کو پھر دہرا لیا جاتا ہے۔ یعنی چھ روزے شوال کے اور نو روزے عشرہ ذی الحجہ کے اشہر حج میں رکھ کر پندرہ روزوں کا پروگرام اشہر حج میں رکھ دیا گیا ہے' تاکہ ان مہینوں میں بھی آدمی رمضان کو فراموش نہ کر سکے' حتیٰ کہ بعض روایات میں عشرہ ذی الحجہ کے دنوں کو رمضان کے دنوں پر فوقیت اور فضیلت دی گئی ہے۔

دونوں کی لذتوں کا سلسلہ منقطع کرا لیا جاتا ہے۔ تب آدمی خانہ محبوب کی حاضر باشی اور مشاہدہ حق کے قابل بنتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ رمضان ابتدائی تروک کا مہینہ ہے۔ اور اشہر حج ان تروک کی تکمیل وانتہا کے مہینے ہیں۔

حکمتِ عید قربان

ہاں پھر جس طرح رمضان کے تروک وافعال کی تکمیل پر یکم شوال کو دوگانہ شکر ادا کیا گیا تھا اور مالی شکریہ میں صدقہ فطر سے عیال محبوب (غرباء واحباب) کی خدمت کی گئی تھی' اسی طرح یہاں بھی حج کے تروک وافعال کی تکمیل پر جو نویں ذوالحجہ تک ہوتا ہے دسویں ذی الحجہ کو اسی انداز سے بجان ودل دوگانہ شکر ادا کیا جاتا ہے اور اس کے بعد صدقہ اضحیہ (قربانی) سے غربا واحباب کی خدمت کی جاتی ہے تاکہ مالی شکریہ بھی ادا ہو جائے۔

شان جلال وجمال کا شکریہ

پس عیدین کے تہوار اسلام میں رنگ رلیاں منانے کے لئے نہیں رکھے گئے ہیں بلکہ رنگ رلیوں کو مٹانے اور اس قسم کے تمام مادی اور نفسانی لذتوں اور خواہشوں کو ختم کر کے روحانی قرب ووصال کے شکریہ کے طور پر قائم کئے گئے ہیں' فرق اتنا ہے کہ رمضان کے تروک کے ساتھ افعال بر کے سلسلہ میں نماز (تراویح) کا فعل رکھ لیا گیا جو حق تعالیٰ کے جلال وعظمت کے سامنے اظہار نیاز وعبودیت کے لئے ہے تاکہ اس کی علی الاطلاق آقائی اور حکمرانی کے ساتھ اپنی علی الاطلاق ذلت ونیاز مندی اور محکومیت کا ثبوت پیش کیا جائے اور اشہر حج کے تروک کے ساتھ افعال بر کے سلسلہ میں مناسک حج رکھے گئے جو حق تعالیٰ کے جمال ومحبوبیت کے سامنے اپنی شیفتگی اور گرویدگی اور اپنے عشق ومحبت کے جذبات پیش کرنے کے لئے ہیں تاکہ اس کے علی الاطلاق جمال وخوبی کے سامنے اپنا علی الاطلاق عشق ومحبت پیش کر دیا جائے۔

دوسرے رخ سے دیکھئے تو ترک کے سلسلہ میں محکوم اور غلام کو بسلسلہ حاضری ملازمت نفس کی مرغوبات اور خواہشات ترک کرنی پڑتی ہیں جس سے وہ کھانے کمانے اور اڑانے کے کام کا

نہیں رہتا۔ ورنہ اسے خدمت کا وقت کیسے ملتا' اور عاشق و محبّ کو محض خواہشات نفس ہی نہیں سرے سے نفس ہی کو تج دینا پڑتا ہے' نفس کی شخصیت اور تشخص ہی کو عشق میں گم کر دینا پڑتا ہے اسکی حیثیت عرفی اور طبعی' غرور و قار تو دور کی چیز ہے جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی' دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ نماز تو شاہی خدمات بجالانے کے لئے سرکاری طور پر حاضری دربار شاہی ہے جس کے لئے وقت اور عیش کی قربانی کافی ہے مگر شاہی آداب بجالانے کے ساتھ' اور حج عاشقی کے جوش میں حرم سرائے شاہی میں شخصی حاضری ہے جس کے لئے جان و مال دونوں کی قربانی ضروری ہے۔ مگر آداب عشق کے ساتھ جس کا حاصل خود گزاری اور خود فراموشی ہے۔

نماز میں سکون و متانت مطلوب ہے کہ دربار اور دفتر معبودیت میں حاضر ہوتی ہے اور حج سے اسی سکون و متانت کو مٹایا جاتا ہے کہ عاشقانہ رنگ سے در محبوب کی حاضری ہے' پس تلاوت و تراویح رمضان کے لئے تو باہی ترک رکھے گئے جن کا تعلق عیش سے تھا سکون و متانت سے نہ تھا۔

اور۔۔۔۔۔اس کے لئے وقت کی قربانی کافی تھی۔

لیکن حرم سرائے میں پہنچ کر قرب و وصال کے لئے جاہی ترک بھی ضروری ہو گئے جن کا تعلق جاہ و باہ' عیش و وقار' متانت و ہیبت سب ہی سے تھا' تاکہ عاشقی کی مسکنت اور خود گزاری پیدا ہو جائے' تو اس کے لئے محض وقت کی قربانی کافی نہ تھی جب تک کہ عین نفس کی قربانی نہ کر دی جائے۔

پس عیدالفطر سے شئون جلال کے حقوق کی ادائیگی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ بندوں کو غلام بننا میسر آگیا' اور عیدالاضحیٰ سے شئونِ جمال کے حقوق کی ادائیگی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ بندوں کو عاشق ہونا میسر آگیا۔

اصل عبادت صرف نماز اور حج ہے

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ علی الاطلاق مالک الملک اور آقا و حاکم ہیں ایسے ہی وہ علی الاطلاق محبوب و مطلوب اور جمیل و مرغوب بھی ہیں اور اس لئے جہاں ایک بندہ کو ان کے شاہی دربار (مساجد) میں حکمبر دار اور نیاز مند بن کر حاضر ہونا ضروری ہے وہیں اس کے لئے انکے شاہی حرم (مسجد حرام) میں عاشق دگرویدہ بن کر بھی پہنچنا ضروری ہے' یعنی اس کی بندگی تام و کامل نہیں ہو گی اگر ان میں سے ایک نوع بھی بندگی کی رہ جائے' اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اسلام میں حج نہ ہوتا اسلام ناقص رہ جاتا کہ شئونِ جمال کے تقاضے منعدم رہ جاتے' پس جہاں اسلام کی تکمیل و تتمیم نماز اور حج کے بغیر ممکن نہ تھی' وہیں مسلمان کی تکمیل بھی بغیر ادائیگی نماز و حج کے ممکن نہ تھی۔

اس لئے اسلام کی دو ہی بنیادی عبادتیں اصل نکلتی ہیں' نماز اور حج' ایک جلالی عبادت ہے اور

ایک جمالی۔ بقیہ دو عبادتیں زکوٰۃ وصوم یہ خود اصل نہیں ہیں' بلکہ ان دونوں اصلی عبادتوں کے تابع اور ان کے مقدمہ و تمہید کے طور پر ہیں۔ زکوٰۃ مقدمہ نماز ہے جس سے نماز قائم ہوتی ہے کیونکہ نماز اور حاضری دربار میں اگر حارج ہے تو مال ومنال اور اسی کی عیش کوشیاں بھی ہوتی ہیں اس لئے اس لئے اسے زکوٰۃ وصدقات کے ذریعے ترک کرا کر دل سے اس کی محبت نکال جاتی ہے' تاکہ موانع مرتفع ہو کر مقصود کا جمال سامنے آجائے۔

ادھر روزہ مقدمہ حج ہے سرائے شاہی میں حضوری اور قرب خاص سے لذت اندوزی میں اگر حارج ہے تو نفس اور نفسانیت کے تقاضے یعنی وہ جاہ واقتدار اور کبر وغرور ہوتے ہیں۔ اس لئے روزہ سے تروک کی ابتداء کی جاتی ہے اور اشہر حج پر لا کر انہیں مختتم کر دیا جاتا ہے' تاکہ موانع ختم ہو کر مطلوب ہو جائے اس لئے اشہر حج کو رمضان سے متصل رکھا گیا کہ ابتدائی تروک ختم ہوتے ہی انتہائی آگئیں اور تروک کا سلسلہ متصل رہے۔

پس اسلام میں بنیادی عبادتیں دو ہیں' نماز اور حج اور عبادتیں ان کے مقدمات اور تمہید ہیں یعنی زکوٰۃ اور صوم۔ بنیادی عبادتوں میں اصل حصہ افعال کا ہے جو مقصود اصلی ہیں اور نفس ان سے آراستہ ہوتا ہے اور تمہیدی عبادتیں یعنی زکوٰۃ اور صیام میں اصل حصہ تروک کا ہے جو مبادی ہیں جن سے نفس کا رذائل سے صاف ہونا ہے۔

اجتماعی دین

اسلام چونکہ اجتماعی دین ہے اس لئے اس کی یہ اصل عبادتیں نماز اور حج تو اجتماعی رکھی گئیں' چنانچہ دونوں میں اصل اجتماع ہے اور دونوں کے لئے امام وامیر ناگزیر ہے جو اجتماعی رنگ کا خاصہ لازمہ ہے اور تمہیدی عبادتیں چوں کہ محض ان اجتماعی عبادتوں کے لئے نفس کو تیار کرنے کے لئے تھیں اور نفس ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ اس لئے یہ دونوں عبادتیں (صوم وزکوٰۃ) بھی انفرادی رنگ کی رکھی گئیں' چنانچہ ہر ایک کا مال اور اس کی مقدار الگ الگ ہے۔ اس لئے ہر ایک کی زکوٰۃ بھی مقدار ومدت کے لحاظ سے الگ الگ ہے۔ اسی طرح ترک طعام وشہوات بھی ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ اس لئے روزہ بھی ہر شخص کا اپنا اپنا الگ ہے۔ غرض اسلام کے اجتماعی دن ہونے کا مقتضی بھی یہی تھا کہ اس کی بنیادی عبادتیں تو اجتماعی ہوں اور تمہیدی عبادتوں میں اجتماعیت کی شرط نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب وتربیت میں ایک مسلم کا عباداتی سال افعال وتروک اور برو تقویٰ سے مخلوط اور ملا جلا رکھا گیا ہے اگر اس کی بنیاد عبادتوں میں سے دو عبادتیں افعال کی قسم سے رکھی گئی ہیں۔ یعنی نماز اور حج تو دو تروک کی قسم سے رکھی گئی ہیں یعنی صوم وزکوٰۃ اور اگر اس عباداتی

سال کے ابتدائی مہینے (رمضان) میں افعال بر، تلاوت و تراویح وغیرہ رکھے گئے ہیں تو اسی ماہ میں تروک تقویٰ (ترک طعام و شہوات) بھی رکھے گئے۔

عباداتی سال کے درمیانی روزوں کی اہمیت

اسی طرح اگر اس عباداتی سال کے درمیانی حصوں مثلاً اشہر حج میں بر، طواف و زیارت اور صلوٰۃ و تلاوت کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے تو ان ہی مہینوں میں جا ہی وہا ہی دونوں قسم کے انتہائی تروک بھی جمع کئے گئے ہیں جن میں صیام عشرہ ذی الحجہ اور بالخصوص صوم یوم عرفہ خاص اہمیت رکھتے ہیں یا مثلاً اشہر حج کے بعد محرم میں جہاں افعال بر تلاوت و نماز اور اذکار وغیرہ معمولاً رکھے گئے ہیں۔ وہیں تروک کے سلسلہ میں یوم عاشورہ کا روزہ بھی اہمیت کے ساتھ رکھا گیا ہے، جس سے سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جیسے ان درمیانی مہینوں میں بسلسلۂ افعال بر خاص فرائض ہی پر نہیں قناعت کی گئی، بلکہ عام نوافل و تطوعات بھی رکھے گئے ہیں، ایسے ہی بسلسلہ تروک تقویٰ محض خاص روزوں صوم یوم عرفہ اور صوم یوم عاشورہ وغیرہ ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ہر ماہ میں ایام بیض کے تین روزے اور ہر ہفتہ میں پیر اور جمعرات کے روزے بھی رکھے گئے ہیں تاکہ درمیان سال کا کوئی مہینہ بھی افعال بر اور تروک تقویٰ سے خالی نہ رہے اور رمضان کی یاد فعل و ترک دونوں حیثیتوں سے تازہ ہوتی رہے، اسی طرح اسی عباداتی سال کے نقطہ اختتام یعنی شعبان میں شب برات کے افعال بر بصورت صلوٰۃ و تلاوت اور مجاہدہ مراقبہ رکھے گئے ہیں جس سے اس رات کا احیاء ہوتا ہے۔

تو وہیں یوم برات کا روزہ بھی سنت اسلام قرار دیا گیا اور پھر بطرز سابق اس خاص فعل و ترک ہی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ حضور ﷺ کی عادت کریمہ افعال بر کے ساتھ شعبان میں زیادہ روزے رکھنے کی تھی۔ گویا شعبان افعال و تروک سے بھرپور رہتا تھا۔ جس میں شب برات کے افعال اور یوم برات کے تروک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ماہ و سال کا توازن

بہر حال سال جس کی ابتداء میں رمضان اور اس کے افعال و تروک ہوں اور جس کے درمیانی مہینوں میں اشہر حج اور محرم وغیرہ کے جامع ترین افعال و تروک ہوں اور جس کی انتہا میں شعبان اور اس کے مخصوص افعال و تروک ہوں تو ظاہر ہے کہ اس سال کی برکت وہدایت اور نورانیت کی، کیا انتہا ہو سکتی ہے، کیونکہ جس چیز کا اول و آخر اور وسط درست و صحیح ہو وہ یقیناً محفوظ اور نجات یافتہ اور ہلاکت سے دور ہوتی ہے۔

پس جر طرح نبی کریم ﷺ نے امت مرحومہ کے اول و آخر اور وسط کا ذکر کر کے بحیثیت

مجموعی امت کی نجات اور عدم ہلاکت کا یقین دلایا اور فرمایا۔

کیف تھلك امة انا اولھا والمھدی وسطھا والمسیح اخرھا۔ (مشکوٰۃ)

"وہ امت کیسے ہلاک ہو سکتی ہے جس کا اول میں ہوں اور جس کے درمیان مہدی ہوں اور جس کا آخر حضرت مسیح علیہ السلام ہوں"۔

ایسے ہی بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ وہ مرد مومن کیسے ہلاک ہو سکتا جس کے عباداتی سال کا اول رمضان المبارک ہو اور جس کا اوسط اشہر حج اور محرم الحرام ہو اور جس کا آخر شعبان معظم ہو۔ پس جس مومن کی عمر پر اس طرح کے سال گزرتے رہیں تا آنکہ اس کی عمر پوری ہو جائے' تو یقیناً اس کے دل کی زمین اس اول و آخر اور وسط کے ساتھ جاہ و باہ کے تروک کے ذریعہ نفسانی خس و خاشاک سے پاک ہو گی اور افعال طاعت و عبودیت اور بر کے ذریعہ نور و برکت سے چمک اٹھے گی' اس کے رذائل زائل ہوں گے اور اس میں فضائل داخل ہوں گے۔ وہ نار سے بچ جائے گا اور نور سے سرفراز ہو گا جو حقیقی فوز و فلاح ہے۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ.

"جو نار سے نکالا گیا اور جنت (نور محض) میں داخل کر دیا گیا تو وہ کامیاب ہوا۔ اور یہ دنیا کی زندگی سوائے دھوکہ کے سامان کے اور کچھ نہیں"۔

ان اوراق پریشان سے امید ہے کہ ناظرین پر رمضان' عید اور مناسک حج کی حقیقتیں اور حکمتیں اور ان کے آثار و نتائج ایک حد تک واضح ہو گئے ہوں گے جو ان سطور کا مقصد اور اس زیر نظر رسالہ کا نصب العین ہے۔ زیادہ تفصیلات کے یہ صفحات متحمل نہ تھے اس لئے اسی قدر قلیل پر قناعت کی گئی۔

فھل علی الرسل الا البلاغ
المبین وباللّٰه التوفیق

حضرت عبادہ بن صامتؓ نے بیان کیا۔ جب رمضان آتا تو آپ ﷺ ہم کو ان کلمات کی تعلیم دیتے۔

اللّٰھم سلّمنی لرمضان وسلمّ رمضان لی وسلّمه' لی متقبلا۔

"اے میرے اللہ! مجھ کو رمضان کے لئے محفوظ کر دے اور رمضان کو میرے لئے محفوظ کر دے۔ اور اس رمضان کو بحفاظت میرے لئے قبول فرما"۔

(حیاۃ الصحابہ جلد ۳ صفحہ ۲۰۱' الحدیث)

اللّٰھم ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا وھب لنا من لدنك رحمة انك انت الوھاب ربنا ھب لنا من ازواجنا وذرّیّتنا قرة اعین وّاجعلنا للمتّقین اماماً.

اللّٰھم وتوفّنا مسلمین والحقنا بالصّالحین امین یارب العٰلمین.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فضیلتِ تقویٰ

عام طور سے دنیا میں فسق و فجور، مار دھاڑ، بدامنی، بدنیتی اور فسادات عام ہوتے جارہے ہیں۔ ارتکاب جرائم کی وجہ یہ نہیں کہ اس دور میں پولیس اور فوج کی کمی ہے۔۔۔۔ بلکہ دلوں میں اللہ کا ڈر اور خوف باقی نہیں ہے اگر یہ ہو تو آدمی میں اِرتکاب جرائم کی ہمت ہی نہیں ہوگی۔ خواہ وہاں پولیس اور فوج ہو یا نہ ہو۔ پھر چاہے تنہائی میں بھی ہو وہاں بھی گناہ سے بچے گا۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سِيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْراًوَّ نَذِيْراًوَّ دَاعِياً اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجاً مُّنِيْراً..................اَمَّابَعْدُ.

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ہ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَے اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْجَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِیُّ الْعَظِيْمُ.

احوالِ واقعی

بزرگانِ محترم!

یہاں آنے کے بعد میں نے کچھ بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر بیماری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور نزلہ زکام، بخار وغیرہ کی وجہ سے کچھ کمزوری پیدا ہوئی تو میں نے معذرت کردی کہ بھائی! آج رہنے دو

پھر دیکھی جاویگی' چنانچہ ہمارے بھائی رشید نے یہ بھی فرمایا کہ واپسی میں ایک دن دیا جائے اس میں کچھ بیان وہ جائے گا۔ میں نے اس پر کہا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آج میں نے سوچا کہ شاید بھول گئے ہوں گے اور یہ دیکھ کر کوئی سامان بھی جلسہ واجلاس کا نہیں بالکل مطمئن تھا مگر اب معلوم ہوا کہ سب جمع ہیں تو اچانک ایک چیز سامنے آئی اور مجمع کے احترام کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ کچھ بیان کر دیا جائے چاہے ہو مختصر ہی ہو۔ اس لئے زیادہ وقت بھی نہ لے سکوں گا۔ مختصر طریق پر چند باتیں گزارش کروں گا۔

طریق سلف اور وصیت تقویٰ

سلفِ صالحین یعنی حضرات صحابہؓ اور حضرات تابعینؒ کی یہ عادت رہی ہے کہ جب ایک دوسرے سے رخصت ہوتے تو کہتے تھے کہ کچھ نصیحت کیجئے چھوٹے اپنے بڑوں سے نصیحت کی فرمائش کرتے تھے اور بڑے اپنے چھوٹوں سے نصیحت طلب کرتے تھے • عام طور سے سلف کی یہ نصیحت ہوتی تھی کہ ۔

اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ۔

"میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں"۔

یہ سلف کا عام جواب ہوتا تھا۔ اسی مناسبت سے میں نے یہ آیت تلاوت کی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ سے تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ اللہ اس کے لئے مشکلات میں ایسے راستے کھولتا ہے کہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔ مشکل میں پھنسا ہوا ہے ہر طرف سے راستے بند ہیں غیب سے سامان ہوتا ہے اور راہ نکل آتی ہے اور وہ مشکل سے نکل جاتا ہے۔

نتائج تقویٰ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجاً.

"تقویٰ پر مرتب شدہ پہلا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشکلات میں اس کے کام آتے ہیں"۔

اور دوسرا وعدہ یہ ہے کہ ۔

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَايَحْتَسِبُ.

"حق تعالیٰ اس کو ایسے انداز سے رزق دیتے ہیں کہ اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوتا کہ میرا رزق یہاں سے پہنچ جائے گا اور پہنچتا ہے وہیں سے"۔

تیسرا وعدہ یہ فرمایا ہے ۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ.

"کہ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں"۔

اور چوتھا ثمرہ اور نتیجہ یہ بیان فرمایا ہے۔

وَيُعْظِمْ لَهُ اَجْرًا.

"اللہ اس کے اجر و ثواب ۔۔۔۔ کو بہت بڑھا دیتا ہے"۔

تو تقویٰ اختیار کرنے پر ان آیات میں چار وعدے دیئے گئے ہیں مشکلات میں راستہ کھول دینا، رزق بے شان و گمان پہنچانا، معصیت کا کفارہ کر دینا۔ اجر و ثواب کو بڑھا دینا۔

تقویٰ کے ایک معنی تو لغت میں ڈرنے اور خوف کے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ

"اللہ سے ڈرو اور خوف و خشیہ اختیار کرو"۔

کسی حالت میں بے فکر ہو کر مت بیٹھو، خواہ دولت مند ہو خواہ مفلس ہو۔ ہر حالت میں اللہ کا ڈر انسان کو رہنا چاہئے

تقویٰ، امن عالم کا ضامن ہے

اگر غور کیا جائے تو جتنے بھی جرائم اور معصیتیں ہیں وہ اللہ کے ڈر سے ہی ختم ہوتی ہیں۔ جرائم کو نہ پولیس روک سکتی ہے، نہ فوج روک سکتی ہے اور نہ ہتھیار روک سکتے ہیں۔ جب تک کہ دل میں ڈر اور خوف خداوندی نہ ہو گا۔ آدمی جرائم سے باز نہیں رہ سکتا۔ اگر محض پولیس اور فوج کی طاقت سے جرائم بند ہو جایا کرتے تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی۔ اس لئے کہ آج نہ فوجوں کی کمی ہے اور نہ پولیس کی کمی ہے اور نہ ہتھیاروں کی کمی ہے بلکہ آج کل ایسے ایسے ہتھیار موجود ہیں کہ دنیا نے کبھی دیکھے بھی نہ ہوں گے۔ توپیں بھی ہیں، بم بھی ہیں۔ غرض ایسے ایسے ہتھیار موجود ہیں جن کے اثرات دور دور تک جاتے ہیں۔

ایک بم سے لاکھوں آدمی ختم ہو سکتے ہیں۔ اگر ان ذرائع سے دنیا میں امن قائم ہو سکتا اور جرائم مٹ سکتے تو آج کی دنیا میں کوئی جرم باقی نہ رہتا۔ سب کے سب متقی اور پرہیز گار ہوتے لیکن جتنی پولیس بڑھتی جاتی ہے اور جتنی فوج اور ہتھیار بڑھائے جاتے ہیں اس سے دگنے جرائم بڑھتے جاتے ہیں۔ اور عام طور سے دنیا میں فسق و فجور مار دھاڑ اور بدامنی، بدنیتی اور فسادات عام ہوتے جا رہے ہیں۔ ارتکاب جرائم کی وجہ یہ نہیں کہ اس دور میں پولیس اور فوج کی کمی ہے، بلکہ دلوں میں اللہ کا ڈر اور خوف باقی نہیں ہے۔ اگر یہ ہو تو آدمی کو اتکارب جرائم کی ہمت ہی نہیں ہو گی۔ خواہ وہاں پولیس اور فوج ہو یا نہ ہو پھر چاہے تنہائی میں بھی ہو وہاں بھی گناہ سے بچے گا۔

تقویٰ کے بغیر قیام امن ناممکن ہے

مثلاً آپ کے سامنے لاکھوں روپے کا خزانہ رکھا ہوا ہے اگر آپ اٹھا کر لے جانا چاہیں تو لے جا سکتے ہیں کیونکہ وہاں نہ پولیس ہے نہ فوج ہے مگر آپ اسے نہیں اٹھاتے۔ کیوں۔؟ اس لئے کہ اللہ کا ڈر دل میں گھر کئے ہوئے ہے کہ میں نے اگر ایسا کیا تو اللہ کے سامنے قیامت کو کیا جواب دوں گا۔ جب پوچھا جائے گا کہ تو نے غیر کے مال میں بغیر اس کی اجازت کے کیوں تصرف کیا تھا۔

توسب سے بڑی پولیس جو دلوں پر بیٹھی ہوتی ہے وہ خوف خداوندی ہے۔ وہی تمام جرائم سے بچانے والی ہے اور معصیت سے روکنے والی ہے۔ ورنہ دنیا میں کوئی صورت نہیں ہے جرائم سے روکنے کی اور جرائم سے بچنے کی۔ اسلام نے آخرت کا جو عقیدہ پیش کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو ہر وقت یہ تصور رہے کہ مجھے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اور ہر شخص سے اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ زندگی کس طرح سے گزاری۔ اس کا جواب دینا پڑے گا۔ تو یہ عقیدہ ایسا ہے کہ جس سے انسان حرکات ناشائستہ سے رک سکتا ہے۔ اسی عقیدے کی وجہ سے دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ اور ہر شخص ارتکاب جرائم سے بچ سکتا ہے۔ اور کوئی صورت ایسی نہیں جس کے اختیار کرنے سے جرائم سے بچ سکتے۔

باطنی فساد بھی تقویٰ سے رفع ہوتا ہے

جبلی طور پر انسان درندہ واقع ہوا ہے۔ مار کاٹ، چیر پھاڑ اس کا خاصہ ہے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت آدمؑ کو زمین پر اتارا گیا اور حضرت حواؑ بھی اتریں تو فرمایا۔

اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ.

جاؤ تم دنیا کے اندر، اور ایک دوسرے کی دشمنی تمہارے اندر ڈال دی گئی ہے۔ اس لئے انسان ایک دوسرے کا دشمن بھی ہے اور برا چاہنے والا بھی۔ اس کے قلوب میں کہیں حرص رکھی گئی ہے کہیں بغض رکھا گیا ہے، کہیں حسد رکھا گیا ہے، کہیں تکبر رکھا گیا ہے۔ ان اخلاق رذیلہ کی بناء پر جب آدمی حریص ہوگا تو دوسرے کے مال پر نگاہ ڈالے گا۔ اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ پھر اسے جائز و ناجائز کی پرواہ نہ ہوگی۔ چوری ڈکیتی بے تحاشہ کرے گا۔ اس لئے کہ اس کے اندر حرص کا مادہ موجود ہے اور اگر انسان میں حسد کا مادہ موجود ہے تو وہ اپنے کسی بھائی کو بڑھتا ہوا دیکھنا نہیں چاہے گا۔ دنیا میں کوئی عزت کے اعتبار سے ذرا بڑھا تو دلوں میں حسد شروع ہو جاتا ہے کہ یہ کیوں بڑھ گیا۔ لوگ اس پر تو غور نہیں کرتے کہ اس نے اپنی صلاحتیں استعمال کیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے بڑھا دیا۔ ہم بھی وہ صلاحتیں پیدا کریں مگر یہ نہیں ہوتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ ترقیات و مراتب اس کے

پاس نہ رہیں چاہے مجھے ملیں یا نہ ملیں۔ یہ حسد کا خاصہ ہے کہ آدمی دوسرے کی نعمت کو زائل ہوتا دیکھ کر خوش ہو' چاہے خود بالکل محتاج اور مفلس کیوں نہ ہو۔

ایسے ہی تکبر' طمع لالچ وغیرہ ہیں۔ ان اشیاءِ رذیلہ پر اگر بریک لگانے والی کوئی چیز ہے تو وہ تقویٰ اور خوف خداوندی ہے اگر یہ نہ ہو تو سوائے مار دھاڑ کے اور ڈکیتی ڈالنے کے اور کیا کرے گا تو اس سے دنیا میں ایک عجیب انار کی پھیل جائے گی۔ یہ اخلاق عام ہیں اور یہ انسان کی جبلت ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اپنا قانون اتارا کہ ان چیزوں سے بچ کر زندگی گزارو۔

اس لئے حکم ہے کہ حسد ختم کرو اور ایثار اختیار کرو' اگر اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ دولت ملی ہے تو اس پر اتنے ہی خوش ہو جیسے کہ یہ دولت مجھے ہی مل گئی اور یہ سمجھو کہ وہ میری ہی دولت ہے اگر کسی کو عزت ملی ہے تو یہ سمجھو کہ یہ میری عزت ہے' اگر خدانخواستہ یہ ذلیل بنا تو یہ میری ذلت ہے۔ یہ جذبہ دین نے پیدا کیا ہے کہ حسد کو چھوڑ کر ایثا اختیار کرو۔ لالچ چھوڑ کر قناعت اختیار کرو کہ جتنا تمہیں اللہ نے دیا ہے اس پر خوش رہو' شکر کرتے رہو اللہ تعالیٰ اسے بڑھادے گا۔

اسی طرح کبر سے بچا کر دین نے تواضع کی تعلیم دی ہے کہ خاکساری برتو' ہر ایک کے سامنے چھوٹے بن کر پیش ہو کر تم بڑے ہو' میں چھوٹا ہوں۔ لڑائی دنگا جب بھی ہوتا ہے تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہر ایک کہتا ہے کہ میں بڑا ہوں اور قاعدہ ہے کہ دو بڑے ایک جگہ نہیں سما سکتے۔ یقیناً ایک گھٹے گا ایک بڑھے گا۔ ایک ختم ہو گا ایک آگے آئے گا۔ لیکن جب ہر ایک یوں سمجھے گا کہ میں بڑا نہیں۔ بڑا تو وہ ہے۔ جو یہ کہے کہ میں بڑا نہیں یہ بڑا ہے۔ تو پھر لڑائی جھگڑا کس چیز کا ہوگا۔؟

اس لئے امن وامان کا ذریعہ تواضع اور خاکساری ہے اور لڑائی جھگڑوں کا سبب تکبر اور نخوت ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان میں موجود ہیں ان کا علاج اگر کیا ہے تو دین نے کیا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ و السلام نے دنیا میں آکر اس کی تعلیم دی اس کے طریقے بتلائے ہیں کہ اگر یہ طرز اختیار کرو گے تو تمہاری حرص زائل ہو جائے گی اور یہ طریقہ اختیار کرو گے تو تمہارا حسد ختم ہو جائے گا۔ یہ تمام طریقے دین کے بتلائے ہوئے ہیں۔

تقویٰ محاسبہ آخرت سے نجات کا ذریعہ ہے

یہ دو بنیادی باتیں ہیں ایک دل میں اللہ کا ڈر' دوسرے آخرت کے عقیدے میں مضبوطی اور پختگی کہ جو کچھ دنیا میں کر رہا ہوں مجھے جواب دینا ہے اور حق تعالیٰ کے پاس ایک ایک چیز کا حساب ہوگا۔ حتی کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سردیوں میں گرم پانی نعمت ہے اسکا بھی احسان جتلایا جائے گا کہ ہم نے سردیوں میں گرم پانی دیا تم نے اس کا کیا حق ادا کیا؟ گرمیوں میں ٹھنڈا پانی نعمت ہے

اس کا حساب ہو گا کہ تم نے اس ٹھنڈے پانی کو استعمال کر کے کیا شکر یہ ادا کیا۔

وہاں ایک ایک چیز کا حساب ہو گا۔ تمہیں اتنی عمر دی تھی تم نے کاہے میں صرف کی۔ تمہیں اتنی دولت دی گئی تھی تم نے اس کو کاہے میں صرف کیا۔ تو سب چیزوں کو الگ الگ پوچھا جائے گا۔

یہ نہیں کہ سارے نبی آدم سے مشترکہ طور پر سوال ہو گا اور وہ سب مل کر جواب دیں گے نہیں بلکہ ہر کسی کی پوری زندگی سامنے کر دی جائے گی اور پھر اسی کے مطابق حساب و کتاب ہو گا۔۔۔ یہ عقیدہ جب ایک مومن کے دل میں جما ہوا ہے تو وہ جرات و ہمت نہیں کر سکتا۔ خیانت کی بدیانتی کی۔ اور جب بھی یہ حرکت کرے گا تو معلوم ہو گا کہ عقیدے میں ڈھیلا پن آ گیا ہے۔ وہ عقیدہ دل میں چھپ گیا ہے۔ سامنے نہیں رہا ہے لیکن اگر سامنے ہو تو پھر یقیناً جرات نہیں ہو گی اور اگر کر ہی گزرے گا تو پھر جلدی سے توبہ کی توفیق ہو گی اور ندامت ہو گی کہ میں نے بہت بری حرکت کی ہے۔ اس کے نیچے میں توبہ کرے گا' استغفار کرے گا۔ یہ ندامت توبہ و استغفار اسی وجہ سے کہ یہ دو بنیادیں ہیں اس کے ذہن میں۔

تقویٰ میں احتیاط کا پہلو

تقویٰ کے ایک معنی ہیں ڈرنے کے کہ آدمی اللہ سے ڈرے اور یہ ہی گویا جرائم سے انسداد کا طریقہ ہے۔ تقویٰ کے دوسرے معنی ہیں احتیاط۔۔۔ کہ میں آدمی محتاط زندگی بسر کرے جس میں بڑے جرائم سے بچنے کے لئے چھوٹے جرائم کو چھوڑ دے کہ اگر میں نے مکروہ فعل کیا تو ممکن ہے کہ کل کو فعل حرام کروں اور مکروہ سے بچنے کے لئے بعض جائز چیزیں بھی ترک کرنی پڑتی ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ جائز میں گھر گھر اکر مکروہ میں مبتلا ہو جاؤں۔ شریعت کی اصطلاح میں اسی کا نام سد ذرائع ہے یعنی ذرائع اور وسائل کو ترک کر دو تاکہ ناجائز مقاصد تک پہنچنے نہ پاؤں اور پہلے ہی رک جاؤں۔

مثلاً زناکاری ایک فعل خبیث ہے اور حرام ہے۔ اس سے بچانے کے لئے فرمایا گیا کہ اجنبی عورت پر نگاہ بھی مت ڈالو۔ اجنبی عورت سے خلوت بھی مت اختیار کرو۔ اجنبی عورت کی آواز پر کان بھی مت لگاؤ' یہ ساری چیزیں سد ذرائع ہیں۔ جو ان چیزوں میں پڑا تو اندیشہ ہے کہ مبتلا ہو جائے گا۔ اصل گناہ سے بچانے کے لئے شریعت نے یہاں سے روکنا شروع کیا کہ نگاہ ہی مت ڈالو' کان ہی مت لگاؤ۔۔۔ اور اگر عورت خوشبو لگائے ہوئے ہو تو اپنی ناک کو موڑ لو۔ گویا ہم خوشبو نہیں سونگھ رہے ہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ خوشبو ذریعہ بنتی ہے خیال کے متوجہ ہونے کا۔

یہ ہے احتیاط جسے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر عورت وضو کرے اور اس کا بچا ہوا پانی لوٹے میں موجود ہے اس سے وضو مت کرو۔ دوسرا اپنا پانی لو۔ اس لئے کہ اس کے بچے ہوئے پان سے دھیان

جا سکتا ہے کہ یہ فلاں عورت کا وضو ہے۔ اس خیال کو اگر متوجہ کر دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ دل کے اندر فتنہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے شریعت نے احتیاط کی رو سے حکم دیا کہ تم اس پانی کو چھوڑ دو نیا پانی الگ لو۔ کیوں اپنے خیال کو گندہ کرتے ہو۔ خیال گندہ ہوا تو ارادہ گندہ ہوگا اور ارادہ گندہ ہوگا تو فعل ناپاک ہو جائے گا۔ اس لئے شروع اور ابتداء ہی سے بچتے ہیں۔

زنا گناہ کبیرہ ہے اور یہ جو ابتدائی وسائل ہیں ان کو صغیرہ گناہ کہتے ہیں۔ اور صغیرہ گناہوں سے اس لئے بچایا گیا ہے کہ کبیرہ تک نہ پہنچنے پائے۔ یہ احتیاط کی زندگی ہے۔ چوری کے اندر جو اصل فعل ہے اور جس کی ممانعت ہے وہ یہ ہے کہ غیر کے مال کو بلا اس کی مرضی کے اٹھا لائے لیکن شریعت نے اس سے بچانے کے لئے ایک سلسلہ قائم کیا ہے کہ کسی کے گھر میں جاؤ تو اس کے سامان کو مت دیکھو ممکن ہے خیال پیدا ہو کہ آنکھ بچا کر اٹھالوں یہ تانک جھانک پیش خیمہ ہے اور چوری تو انجام کار اور آخری فعل ہے جو اصل میں ممنوع ہے۔ اس سے بچانے کے لئے یہ لمبا سلسلہ قائم کیا ہے۔۔۔ہاں اگر خود مالک ہی دکھلائے کہ مجھے اللہ نے یہ نعمت دی ہے تو آدمی شوق سے دیکھے اور دیکھ کر شکریہ ادا کرے اور خوشی کا اظہار کرے گویا کہ یہ جو کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے ہمیں ہی دیا ہے لیکن از خود تانک جھانک کرنا یا یہ غور کرنا کہ کس مکان میں ہے مال اور یہ دھیان جائے کہ اگر نقب لگاؤں تو یہاں سے مناسب رہے گا یہاں سے یہ نقب لگانے کا دھیان اور تانک جھانک کرنا اور نگاہ ڈالنا۔ صغیرہ گناہ ہیں۔ شریعت نے ان صغیرہ گناہوں سے روکا ہے تاکہ اصل گناہ جو کہ چوری ہے اس تک نہ جانے پائے۔ اسی کو کہتے ہیں سد ذرائع اور وسائل پر پابندی تاکہ اصل مقصد تک نہ پہنچنے پائے۔

درجات تقویٰ

یہ ہی ہے وہ سد ذرائع کہ ابتداء میں جو ہلکی صورت ہے اسے بھی اختیار مت کرو تاکہ بڑی صورت تک نہ پہنچ سکو۔ تو شریعت اسلام نے ایک سلسلہ کبائر کا رکھا ہے۔ کہ یہ حرام ہے مثلاً زناکاری' چوری' بے ایمانی اور کچھ اس کے دواعی و اسباب ہیں ان تک کو روکا ہے تاکہ اصل مقصد تک پہنچنے نہ پائے' اب اگر تقویٰ کے لغوی معنی بھی مراد لئے جاویں۔ یعنی ڈرنے کے تو بھی اپنی جگہ درست ہیں اس لئے کہ ڈر سے معاصی چھوٹ جاتے ہیں اور اگر تقویٰ سے احتیاط کے معنی لئے جاویں تو بدرجہ اولیٰ معصیت سے حفاظت ہو جائے گی کہ بعض جائز چیزیں بھی چھوٹ جاتی ہیں۔

پھر اس کے بعد آدمی کی زندگی پاک بن جاتی ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جو دنیا کی تمام آلائشوں اور گندگیوں سے پاک ہو جاتی ہے اور آدمی کو جہنم سے ہٹا کر جنت میں ابدالآباد والی نعمتوں میں داخل کر دیتی ہے اور آدمی کو اللہ کا مقرب بنا دیتی ہے۔ مگر تقویٰ کے اس درجہ کا حصول موقوف ہے بادشاہ

حقیقی کے مرتبے کے معلوم ہونے پر یہ محتاط زندگی والا تقویٰ تو بڑوں کا نصیب ہے۔ ہم اور آپ جیسے بہت مشکل سے اس کی طرف جا سکیں گے کہ ناجائز سے بچنے کے لئے جائز چیزوں کو بھی ترک کر دیں یہ تو بہت اونچا مقام ہے مگر ابتدائی درجہ ہر ایک کے بس کا ہے کہ اللہ اسے ڈرے۔

حصولِ تقویٰ اور ڈرنے کی صورت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اقتدار اور قبضے کو تصور میں لاتا رہے کہ وہ مالک ہے جس طرح چاہے کرے۔ جب چاہے موت دیدے جب چاہے حیات دے' جب چاہے صحت دے دے' جب چاہے بیماری مسلط کر دے' جب چاہے امن دے دے اور جب چاہے بدامنی مسلط کر دے۔ اسی کی یہ قدرت ہے اور اس کی اس قدرت کا جب دھیان ہوتا ہے تو ڈر پیدا ہوتا ہے کہ میں بڑے قادر کے قبضے میں ہوں معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ تو آدمی حق تعالیٰ کی عظمت و جلال کا تصور کرتا رہے اس سے ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔

جاہل مقام تقویٰ سے نا آشنا ہے اگر کوئی بالکل انجام اور جاہل محض ہے اسے کبھی بھی ڈر نہیں ہو گا اس لئے کہ وہ واقف ہی نہیں ہے بادشاہ کے اقتدار سے۔۔۔ ایک دیہاتی اگر بادشاہ کے دربار میں آئے تو وہ زیادہ نہیں ڈرے گا۔ اس لئے کہ وہ واقف ہی نہیں ہے کہ بادشاہ کے اختیارات کیا ہیں اس کا اقتدار کیا ہے؟ بادشاہ کو یوں ہی سمجھے گا کہ مجھ جیسا ایک آدمی ہے۔ مگر وزیر اعظم تھرائیگا' کپکپائے گا۔ اس لئے کہ وہ بادشاہ کے اختیار و اقتدار کو جانتا ہے۔ وہ آنکھ نیچی رکھے گا۔ ادھر ادھر بھی نہیں دیکھے گا کہ کہیں بے ادبی نہ ہو جائے۔ میری گردن نہ مار دی جائے۔

تو جس کو علم اور پہچان ہو گی باری تعالیٰ کی بڑائی اور اقتدار کی اور اس کے جلال کی' اس کے دل کے اندر خوف پیدا ہو گا۔ اور جو جاہل ہے اس کے دل کے اندر کچھ بھی پیدا نہ ہو گا۔

کہتے ہیں کہ اکبر بادشاہ نے مشاعرہ کی مجلس کی کہ شعراء آئیں اور اپنا اپنا کلام سنائیں اور اعلان کیا کہ جس کی نظم عمدہ ہو گی اسے انعام دیا جائے گا۔ سینکڑوں شعرائے نے نظمیں اور غزلیں لکھیں اور بہت بڑا دربار ہوا۔ گاؤں کے ایک دیہاتی نے بھی ارادہ کیا کہ میں بھی کچھ تک بندی کر کے لے جاؤں تو مجھے بھی بادشاہ انعام دے گا۔ تو چودھری صاحب بھی دربار میں کچھ لکھ کر لائے۔ وزیر اعظم نے دیہاتی آدمی سمجھ کر اسے بلایا اور پوچھا کہ تو کیا لایا ہے اسے شبہ ہوا کہ پتہ نہیں کیا اناپ شناپ لکھ کر لایا ہو گا' الٹا بادشاہ ناراض ہو کر اس کی گردن نہ مار دے۔ اس بنا پر وزیر اعظم نے یہاتی سے کہا۔ کہ چودھری صاحب! تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی مجھے سنا دو۔

اس نے اچھا سن لو۔۔۔۔چودھری صاحب نے وہ قطعہ سنایا۔

قطعہ یہ تھا کہ ؂

سب درکھت ماں بجرگ بڑ

ہرے ہرے پتوا میں لال لال پھل

یعنی سارے درختوں میں جو بڑا درخت ہے وہ بڑ کا درخت ہے جس کی ڈاڑھی اور چھالیں لٹکی رہتی ہیں اور اس کے سبز سبز پتے ہوتے ہیں اور سرخ سرخ پھل ہوتے ہیں۔ گویا یہ قطعہ کہا اور اس قطعہ کے اخیر میں کہا کہ ؂

اکبر بادشاہ گیدی خر

یعنی اکبر بادشاہ حرام زادہ ہے۔

یہ سن کر وزیر اعظم تو کانپ گیا کہ اس کمبخت نے خود بھی جان کوئی اور مجھے بھی پٹوائے گا' تو خیر وزیر اعظم نے کہا کہ ؂

چودھری صاحب! شعر بڑے عمدہ ہیں مگر یہ جو اخیر کا شعر ہے (اکبر بادشاہ گیدی خر) یہ نہ لکھو۔

اس نے کہا کہ اور کیا لکھوں؟

وزیر اعظم نے کہا کہ یہ لکھو کہ ؂

اکبر بادشاہ بحر وبرَ۔۔۔۔۔

یعنی اکبر' بحر وبرَ کا بادشاہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑا اونچا بادشاہ ہے۔ اس نے کہا جی اچھا کھدوں گا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ شعراء نے اپنی اپنی نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ اعلان ہوا کہ چودھری صاحب بھی ایک قطعہ پڑھیں گے۔

چودھری صاحب نے کھڑے ہو کر ایک قطعہ پڑھا کہ ؂

سب درکھت ماں بجرگ بڑ

ہرے ہرے پتوا میں لال لال پھل

اکبر بادشاہ بحر و بر

اکبر نے کہا چودھری صاحب! یہ مصرع تو بہت عمدہ ہے مگر یہ اخیر کا مصرع ہے ؂

اکبر بادشاہ بحر و بر

یہ بہت بڑا مصرع ہے۔ اکبر سمجھ گیا کہ مصرعہ اس کا نہیں ہے۔ یہ اس کو کسی نے بتایا ہے تو چودھری نے وہیں کھڑے کھڑے وزیر اعظم کو ماں کی گالی دے کر کہا کہ اس حرام زادے نے کہا تھا کہ اس طرح کہنا ورنہ میں تو یوں لکھ کر لایا تھا۔

اکبر باد شاہ گیدی خر

اکبر بادشاہ نے کہا یہ بہت عمدہ ہے وہ ٹھیک نہیں تھا۔

چودھری صاحب نے کہا جی ہاں! میرا تو یہ ہی مصرعہ ہے پھر اس کو بادشاہ کی طرف سے بہت انعام واکرام ملا۔ اس نے یہ مصرعہ ''اکبر باد شاہ گیدی خر'' کیوں کہا تھا؟ اس لئے کہ وہ دیہاتی ہے۔ نہ اکبر کی جاہ و جلال سے واقف اور نہ اس کی عظمت واقتدار سے واقف' فقط ایک دیہات کا رہنے والا ہے۔ تو دیہاتی لوگ بیچارے بالکل سادہ ہوتے ہیں۔ ان میں چھل فریب' مکروفریب دغابازی' دھوکہ دہی کچھ نہیں ہوتی ہے۔ سادہ زندگی ہوتی ہے جو دل میں آیا بے تکلف کہہ دیا۔

قدر تقویٰ بقدر عظمت

اس واسطے احادیث میں آیا ہے کہ حضرات صحابہؓ انتظار میں رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی آئے اور آکر سوال کرے تاکہ علوم کھلیں اور ہم سب کو اس کی بدولت تازہ علوم حاصل ہوں۔ صحابہؓ پر حضور ﷺ کے جاہ و جلال کی عظمت غالب تھی اس لئے ہر ایک کو سوال کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ چونکہ شان نبوت سے واقف تھے۔ اس لئے ان کی دل پر ہیبت تھی اور خوف تھا۔ اور دیہات والے بیچارے سادے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی جو چاہے آکر پوچھ لیا' جو چاہے آکر کہہ دیا۔

جیسے کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ حضور ﷺ مال غنیمت تقسیم فرمارہے تھے ایک دیہاتی بھی آگیا اس کو دینے میں دیر لگی۔ آپ ﷺ اوروں کو دے رہے تھے۔ اس نے کھڑے ہو کر فوراً کہا کہ ۔

''اے محمد! یہ مال نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے اس میں ہمارا بھی تو حق ہے''۔

آپؐ نے فرمایا کہ ۔

''چودھری صاحب تمہیں بھی ملے گا گھبراؤ مت''۔

یہ کہہ دینا کہ یہ مال تیرا نہیں اور نہ تیرے باپ کا ہے۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جسے شان نبوت کا پتہ نہ ہو۔

اس لئے صحابہؓ منتظر رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی آجائے اور آکے سوال کرے حضورؐ جواب دیں گے اور ہمارا علم بڑھے گا' جتنا جلال وعظمت دل میں پیدا ہوگی اور ڈر بڑھتا چلا جائے گا۔ اور عظمت خداوندی سے جتنا جاہل ہوگا اتنا ہی آزاد ہوگا جو چاہے کر گزرے۔

تقویٰ کا اعلیٰ ترین ذریعہ

تو اس کے لئے اعلیٰ ترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم اپنے دل میں خوف

خداوندی پیدا کریں تاکہ جرائم سے بچیں اور خوف پیدا کرنے کی یہی صورت ہے کہ ہم تصور کریں کہ اللہ مالک الملک ہے۔ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ موت وحیات اسی کے قبضے میں ہے۔ صحت و بیماری اسی کے ہاتھ میں ہے۔ تونگری و مفلسی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

”جو کچھ وہ کردے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ کیوں کیا ہے؟“۔

وہ بری ہے ان سب چیزوں سے تو جب یہ یقین و تصور ہوگا بندہ کو کہ وہ غنی مطلق ہے جو چاہے کرے، تو دل میں ہیبت پیدا ہوگی کہ میں ایک بندہ ذرہ بے مقدار ہوں اور مالک الملک کے سامنے ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی بے ادبی ہو جائے۔ تو دل میں ڈر بیٹھ جائے گا تو پہلا درجہ یہ ہے تقویٰ کا جس کے معنی خوف کے ہیں کہ دل میں اللہ کا ڈر اختیا کرے تاکہ معصیت سے بچ جائے۔

فقر وغنا میں تقویٰ کی ضرورت

بہر حال خوف خدا جب دل میں ہوگا تو آدمی مالداری میں بھی گناہ سے بچے گا۔ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اور کیسی پاک نصیحت ارشاد فرمائی ہے۔ حدیث قدسی ہے آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اپنے بندوں سے کہ

”اے بندے! تونگری اور دولت مندی کے زمانے میں تو مجھے یاد رکھ تاکہ تیری مفلسی کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں اور اے بندے! تو اپنی صحت کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تاکہ میں تیری بیماری کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں“۔

اس سے معلوم ہوا کہ تونگری کی حالت میں ہو تو جب بھی خوف خدا ضروری ہے اور مفلسی کی حالت میں ہو تو جب بھی خوف خدا ضروری ہے۔ اگر تونگری میں خوف خدا نہیں تو ڈر ہے کہ تونگری چھن جائے اور اگر مفلسی میں خوف ہے تو ممکن ہے کہ وہ تونگر بن جائے۔ یہ اللہ کے قبضے میں ہے جسے چاہے دیتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔ جس کو دینا بہتر سمجھتے ہیں اس کو دے دیتے ہیں مگر دیتے ہیں اسی حد تک جس حد تک باری تعالیٰ کی حکمت و مصلحت اجازت دیتی ہے۔ معاذ اللہ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جسے چاہیں لکھ پتی بنادیں اور جسے چاہیں مفلس۔

تقسیم دولت احوالِ قلوب کے مُطابق ہے

اس نے جیسی خلقت بنائی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کو یہ دینا مصلحت ہے اور اس کو نہ دینا مصلحت ہے اسے تونگر بنانا حکمت ہے اور اسے مفلس بنانا مصلحت ہے۔ قلوب کی حالت کو وہی بہتر جانتا ہے جس نے خلقت بنائی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ چار پیسے ان کے ہاتھ میں

آئے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں تکبر اور غرور میں مبتلا ہو جاتے ہی اور دوسروں کو حقیر جاننے لگتے ہیں ایسوں کو اگر دنیا کی دولت دیدی جائے تو ظلم کا کارخانہ کھل جائے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ لاکھوں روپے آجائیں پھر بھی انسان بنے ہوئے ہیں پھر بھی ان میں وہی دینداری ہے پھر بھی ان میں وہی جذبہ ہے۔ پھر حق تعالیٰ ان کو دولت دنیا میں ترقی دیتے ہیں۔ تو باری تعالیٰ جسے دولت دیتے ہیں اسے جانتے ہیں کہ کس مصلحت کے تحت اسے دولت دی گئی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

کاد الفقران یکون کفرا.

بعض دفعہ فقر وفاقہ کفر کا ذریعہ بن جاتا ہے اور آدمی' اللہ کی شکایتیں کرنے لگتا ہے اور ایمان کھو بیٹھتا ہے۔ اس کو پیسے دے دیئے جائیں تاکہ ایمان محفوظ رہے اور بعض ایسے ہیں کہ چار پیسے ہاتھ میں آئے وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں انہیں مفلس رکھا جاتا ہے تاکہ وہ آپے میں رہیں۔

تو مفلس اور تونگری مِن جانبِ اللہ ہے۔ جیسی جیسی جس کی خلقت بنائی ہے اس کی مناسبت سے اسے دیتے ہیں۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا.

ہم نے ہی رزق تقسیم کیا ہے ہم نے ہی معاش تقسیم کی ہے اور ہم نے ہی درجے قائم کئے ہیں بعضوں کو اونچا بنایا بعضوں کو نیچا بنایا۔ اب اونچے کا کام یہ ہے کہ وہ جھکے اور شکر کرے اور نیچے کا کام یہ ہے کہ وہ صبر کے ساتھ دعاء کرے اور مانگے۔ اس سے دونوں کا فائدہ ہوگا۔ اللہ نے دونوں کے لئے راستہ رکھ دیا ہے۔ تونگر بھی نجات پائے اور مفلس بھی نجات پائے۔

باطنی دولت حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ہر ایک کے کچھ درجات ہیں' کچھ نعمتیں دولت مندوں کو بھی ملیں گی اور کچھ مفلسوں کو بھی ملیں گی یعنی مایوس نہ ہوں کہ ہمیں کچھ ملا ہی نہیں بلکہ ان کے بڑھنے کی دوسری چیزیں ان کو دے دیں۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے صدقات وخیرات کے فضائل بیان فرمائے کہ صدقات دیں گے' زکوٰۃ دیں گے' دین کا کام ان سے چلے گا۔ وہ بہت دین کا کام کریں گے انکا مال آخرت کا ذریعہ بنے گا' درجات کمائیں گے' ان فضائل سے مفلسوں کا دل ٹوٹنے لگا۔ کہ بھائی یہ تونگر تو بڑے اچھے رہے کہ دنیا میں بھی انہوں نے مزے کی زندگی گزاری اور آخرت میں بھی ان کے درجات بلند ہیں اور ہم نے دنیا میں بھی مصیبت جھیلی اور آخرت میں بھی ہمارے لئے کچھ نہیں۔ یہ مالدار لوگ بڑھ گئے اور ہم رہ گئے۔ تو یہ گروہ مفلسین حضور ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ۔

"یارسول اللہ! سبق المفترضون یہ مالدار تو جیت گئے ہم سے دنیا میں

بھی اور آخرت میں بھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ مالدار اپنی دولت کا حساب دیتے رہ جائیں اور تم پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہو"۔

انہوں نے کہا کہ بس یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے لئے کافی ہے۔ ہمیں دولت نہیں چاہئے تو بہت سی دولتیں مفلسوں کو بھی دی گئی ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ تونگروں کو ہی نعمتیں دی گئی ہیں۔ نہیں بلکہ سب کو دی گئی ہیں۔ کسی کو یہاں دی گئی ہے کسی کو وہاں کیا گیا سب کو برابر۔ یہ مالک کی حکمت ہے کہ کسی کو یہاں بڑھا دیا مگر فیضان سب کے اوپر عام ہے' اگر کسی کی ظاہری دولت بڑھا دی تو کسی کی باطنی بڑھا دی۔ وہ اپنے رنگ میں خوش ہے یہ اپنے رنگ میں خوش اور بسا اوقات باطنی نعمت مال سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایمان کی دولت مضبوط ہے اور توکل کی دولت مضبوط ہے تو ہزاروں مال اس کے نیچے دب جاتے ہیں اور یہ دولت سب اونچی ہو جاتی ہے۔

دولتِ معرفت کا تفوق

ایک بزرگ کسی شہر میں پہنچے۔ بڑا شہر تھا اور قلعہ بند تھا۔ دیکھا کہ سارے دروازے بند ہیں۔ اور ہزاروں مال گاڑیاں ادھر رکی ہوئی کھڑی ہیں' اور ہزاروں مال گاڑیاں اندر رکی ہوئی کھڑی ہیں۔ دن کا وقت ہے اور شہر میں بالکل آمد و رفت نہیں ہے۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا تجارتی شہر ہے کہ کروڑوں کا بیوپار ہے اس میں اور دروازے بند ہیں۔

انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی شہر کے دروازے کیوں بند ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ صاحب! بادشاہ کا باز گم ہو گیا ہے (باز ایک شکاری پرندہ ہوتا ہے) اس لئے بادشاہ نے کہا ہے کہ شہر کے دروازے بند کر دو کہیں باہر نہ جاسکے اور پھر ڈھونڈتے پھریں۔

بزرگ بڑی حیرت میں رہ گئے کہ بادشاہ بے وقوف ہے کہ ایک پرندہ کے لئے دروازے بند ہیں۔ بھلا وہ اڑ کر نہیں جاسکتا چھتوں کے اوپر سے؟ دل ہی دل میں کہا کہ بڑا بیوقوف ہے بادشاہ اور اللہ میاں سے عرض کیا کہ۔

"خدایا تیری قدرت! کہ کندہ ناتراش کو تو نے بنا دیا بادشاہ' جسے اتنی بھی عقل نہیں کہ جانور کو روکنے کے لئے جال ڈالنے کی ضرورت ہے یا شہر پناہ کے دروازے بند کرنے کی۔ اسے تو نے ملک دے دیا اور ہم جیسا فضل جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے جس کے اندر علم بھی ہے' معرفت بھی اور کمالات بھی بھرے ہوئے ہیں ہمیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں' ایک وقت کھا لیا اور ایک وقت فاقہ ہے۔

تو جس میں یہ دولت موجود ہے وہ جوتیاں چٹخاتا پھرے اور جو ایسے احمق
اور کندہ ناتراش ہیں وہ تخت سلطنت پر بیٹھ جاویں۔ آپ کی عجیب قدرت ہے"۔

یہ گویا ایک سوال اور خلجان اللہ کے سامنے پیش کیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اچھا کیا۔ تم اس پر اراضی ہو کہ تمہارا علم، تمہاری معرفت، تمہارا ایمان چھین کہ اس بادشاہ کو دے دیں اور اس کی ساری سلطنت تمہیں دیدیں۔ تیار ہو؟ انہوں نے کہا نہیں اس پر تیار نہیں ہوں۔ معلوم ہوا کہ ایمان کی قوت زیادہ تھی اور توکل کی قوت زیادہ تھی دولت سے ورنہ راضی ہو جاتے کہ میں نے علم بھی دیا ایمان بھی دیا۔ لایئے مجھے تخت سلطنت دیجئے نہیں بلکہ تخت سلطنت پر لات مار دی اور ایمان و علم اور معرفت نہیں چھوڑی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑی دولت ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دونوں دولتیں دے دے کہ مال کی دولت بھی ہو اور ایمان کی قوت بھی ہو اور اللہ پر بھروسہ بھی ہو تو اس کے پاس اللہ نے دین ودنیا دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے دے دے۔ تو بہر حال دولت دنیا بھی ایک نعمت ہے اور دولت دین اس سے بڑھ کر نعمت ہے اور جمع ہو جاویں تو سب نعمتوں سے بڑھ کر نعمت ہے۔

صبر و شکر کے ذریعے ترقی درجات

دونوں کے بچاؤ کی صورت یہ ہے کہ مالداری کے اندر آدمی غرور میں نہ پڑے اور ہر وقت شکر گزار رہے اپنے پروردگار کا اس لئے کہ جو کچھ اسے ملا ہے وہ اس کا حق نہیں تھا بلکہ محض عطاء خداوندی ہے۔ اللہ کے اوپر کسی کا حق نہیں۔ جب فضل سے ملے تو شکر واجب ہوتا ہے لہذا ملنے پر شکر ادا کرے اور جس کو مفلسی دی ہے وہ عدل سے دی۔ گویا حکمت وانصاف کا یہی تقاضا تھا کہ اس کو اس حالت میں رکھا جائے تاکہ وہ صبر کرے کیونکہ دونوں ہی راستے جنت کی طرف لے جاتے ہیں۔ صبر اپنے راستے سے جنت میں پہنچائے گا اور شکر اپنے راستے سے جنت کی طرف لے جائے گا' ہیں دونوں کامیاب اور ناجی۔ اور محبوب خداوندی شاکر بھی ہے اور صابر بھی۔۔۔ علماء میں ایک عالم گذرے ہیں فن نحو کے بہت بڑے امام جن کا نام ہے اثم اور انتہائی درجہ بدصورت تھے۔ جتنی بدصورتی کی علامتیں ہیں وہ سب ان میں جمع تھیں۔ رنگ بے حد کالا۔ دانت بہت چوڑے چوڑے۔ آنکھیں نہایت چھوٹی اور کرنجی اور آنکھوں میں چیڑے لگے ہوئے' دانتوں میں زردی لگی ہوئی غرض جتنی بدصورت کی علامتیں ہو سکتی ہیں ساری ان میں جمع تھیں اور علم وہنر کا یہ عالم کہ بہت اونچا اور بہت بلند' ان کی شادی ایک ایسی عورت سے ہوئی کہ دور دور تک اس کی نظر نہیں تھی' جب خاوند اور بیوی آمنے سامنے بیٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے دھوپ چھاؤں کہ ایک طرف دھوپ نکل رہی ہے اور ایک طرف

سایہ ہے اور ایک طرف نور اور ایک طرف ظلمت۔

تو آمنے سامنے بیٹھ کر بیوی سے کہتے ہیں کہ میں بھی قطعی جنتی ہوں اور تو بھی قطعی جنتی۔ بیوی کہتی کہ کیا بات ہے۔ فرماتے کہ میں تو اس لئے جنتی کہ تجھ جیسی مجھے بیوی ملی میں رات دن شکر ادا کرتا ہوں اس شکر کے راستے سے جنت میں پہنچوں گا اور تو اس لئے جنتی کہ مجھ جیسا بدصورت خاوند تجھے ملا' تو رات دن صبر کرتی ہے کہ کس بلا میں گرفتار ہو گئی۔۔۔۔ اسلئے تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچے گی۔ تو میں نے بھی جنتی اور تو بھی جنتی۔ اس بناء پر دولت مند کے لئے اللہ نے شکر کا راستہ رکھا ہے اور وعدہ ہے۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ.

"جتنا تم شکر کرو گے اتنا ہی میں اس نعمت کو بڑھاتا چلا جاؤں گا"۔

یہ صاحب دولت کے لئے ترقی درجات کا ذریعہ ہے۔

غریب اور مفلس کو حکم ہے کہ تو کسی دولت مند کی دولت پر نگاہ مت کر' صرف میرے اوپر نگاہ رکھ اور صبر اختیار کر میں نے کتنی دولت تیرے لئے جمع کر رکھی ہے۔ تجھے معلوم نہیں ہے' گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ عنقریب ملنے والی ہے۔ حدیث صحیح میں موجود ہے کہ اگر کوئی شخص دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ مجھے رزق دے دے' مجھے دولت دے دے' فاقے اتر رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ دعا پوری نہیں ہوتی مہینے گزر گئے' برس گزر گئے' حتیٰ کہ عمر گزر گئی۔ اب اس نے کہا کہ کچھ بھی میری قسمت میں نہیں ہے۔ مانگتے مانگتے تھک گیا۔ نہیں ملا۔ قیامت میں جب میدان محشر میں پہنچے گا تو دیکھے گا کہ اجر و ثواب کے ڈھیر بھرے ہوئے ہیں۔ ہزاروں' لاکھوں کو وہ نعمتیں نہیں ملیں جو اس کے لئے جمع ہیں۔

عرض کرے گا کہ اے اللہ یہ نعمتیں کہاں سے آئی ہیں۔ میں نے تو کوئی عمل نہیں کیا؟

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا تو دعائیں نہیں مانگا کرتا تھا؟ اس دعا کو ہم نے پالا پرورش کیا' بڑھایا۔ یہ تیری ان دعاؤں کے ثمرات ہیں۔ وہاں دنیا میں اگر دیدیتے تو تو آپے سے باہر ہو جاتا۔ اس لئے ہم نے تیری دعا کو ذخیرہ کیا۔ اب تو ابدی طور پر عیش و آرام کر تیرے لئے انتہائی درجات ہیں۔ تو غریب کے لئے موقعہ مایوسی کا نہیں اور امیر کے لئے موقعہ کفران نعمت کا نہیں۔ اس پر شکر واجب ہے' اس پر صبر واجب ہے اور دونوں کے اوپر اعتماد علی اللہ واجب ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے تو میرا کوئی حق نہیں محض اپنے فضل و کرم سے دیا ہے اسے اگر نہیں دیا تو کوئی ظلم نہیں ہے وہ عدل ہے جس کہ وجہ سے نہیں دیا ہے۔ دونوں انشاء اللہ کامیاب ہیں۔۔۔۔ باقی جسے بھی جو ملتا ہے وہ ملتا ہے۔ فضل خداوندی سے کسی کا کوئی حق اللہ کا اوپر نہیں کہ وہ مجبور کرے بھلا اللہ پر کس کا جبر چل سکتا ہے۔

بہر حال تقویٰ اور اس کی فضیلت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین!

دعا کیجئے اللہ تعالیٰ اعمال صالحہ کی توفیق عطاء فرمائے۔ خاتمہ بالخیر فرمائے۔ اور اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلام میں عید کا تصور

عید کا حاصل ذکرِ الٰہی، عبادتِ ربانی، خدمت خلق اللہ، روح اجتماعیات، دنیا میں رہ کر آخرت کو نہ بھولنا اور زندوں کے ساتھ ہی اموات سے بھی رشتہ جوڑے رکھنا اور ان میں سے ہر چیز کی روح اور معیار ایمان کو قرار دینا ۔۔۔ نہ کہ ظاہر داری اور دنیا سازی ۔۔۔ تاکہ خلق اللہ کے ساتھ اللہ سے وابستگی اصل اصول ثابت ہوتی رہے۔

حضرت حکیم اسلام قدس اللہ سرہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآاِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًاوَّ نَذِيْرًاوَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.........اَمَّابَعْدُ.........

فَقَدْقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعِيْدُ لِمَنْ خَافَ الْوَعِيْدَ لَالِمَنْ لَبِسَ الْجَدِيْدَ (صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

اجتماعیّت عامّہ !

بزرگان محترم!

دنیا کی ہر قوم تہوار رکھتی ہے، اور اپنی حد تک اسے شاندار طریقے سے مناتی ہے، پارسیوں میں نوروز اور مہرجان کی عیدیں ہیں، عیسائیوں میں کرسمس اور بڑے دن وغیرہ کے نام سے عید ہے، ہندوؤں میں ہولی، دیوالی وغیرہ وغیرہ سینکڑوں تہوار اور آئے دن کے میلے ٹھیلے ہیں۔

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے عیدین (عید الفطر اور عید قربان) کے تہوار عطاء فرمائے، فرق یہ

ہے کہ اقوام عالم میں عید اور تہوار کے معنی رنگ رلیاں منانے یا اپنی قومیت کو مستحکم کرنے اور یا کسی مقتدا شخصیت کی یاد تازہ کرنے کے ہیں۔ اسلام میں عید اور تہوار کے معنی اجتماعی طور پر خدا کی یاد کرنے، اس کی طرف رجوع کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے اور اس کے نام پر غریبوں کی مدد کرنے کے ہیں۔ تاکہ اجتماعیت عامہ کا ظہور عادت اور عبادت دونوں میں ہو جائے، پس اگر مذاہب کے ناموں کے سلسلہ میں ہر مذہب کا نام اس کی نوعیت پر روشنی ڈالتا ہے 'ہندومت کے لفظ سے طینت پر روشنی پڑتی ہے' عیسائیت کے لفظ سے ایک ہادی اعظم کی شخصیت سامنے آتی ہے 'یہودیت کے لفظ سے ایک قومیت کا تصور بندھتا ہے' پارسیتا سے ایک ملک کا دھیان دلوں میں جمتا ہے جس کا حاصل حدود بندی' اور محدودیت ہے تو اسلام کے لفظ سے نہ وطن سامنے آتا ہے نہ ملک' قوم نہ شخصیت بلکہ اطاعت حق میں فنائیت اور مالک الملک میں محویت کے جذبات کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو اس کی طرف صاف اشارہ ہے کہ دنیا کے مذاہب نسل و قوم' وطن اور شخصیت پرستی کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکے لیکن اسلام نے اپنے سادہ عنوان ہی سے ان تمام حد بندیوں کو توڑ کر ایک عالمگیر تصور سامنے رکھا اور وہ اطاعت حق ہے، کیوں کہ حق خود لامحدود اور وسیع ہے اس کی اطاعت کا دم بھرنے والی قوم بھی اپنے کو مسلم کہہ کر عبادت گزار بن کر اور عبادت غیر سے منقطع ہو کر گویا اعلان کرتی ہے کہ وہ ایسی ذات سے تعلق رکھتی ہے جو وسیع سے وسیع تر ہے دنیا کی پوری زمین اور اس کے رقبے اور رقبوں پر بسنے والی قومیں اپنی حد بندیوں سے اس کی لامحدود وسعتوں میں خلل انداز نہیں ہو سکتیں۔

حکمت دوگانہ

ٹھیک اسی طرح تہواروں اور عیدوں کے سلسلہ میں اپنے تہواروں سے ہر قوم اگر یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ رنگ رلیوں میں منہمک ہو کر اپنی نفسیات کی پابند ہے یا کسی بڑی شخصیت کا میلاد منا کر وہ صرف اس عظمت کو نمایاں کرنا چاہتی ہے جو اس کے دل میں اس شخص کو موجزن ہے گویا وہ اپنی شخصی عقیدت مندیوں کی پابند ہے یا کسی وطن اور قوم کا نام اجاگر کر کے اپنے کی اس کا اسیر اور پابند دکھانا چاہتی ہے۔۔۔ تو مسلم قوم عیدوں کے تہواروں میں خدا کی جناب میں دوگانہ ادا کر کے اور اسکے نام پر قربانی دے کر حاجت مندوں پر فطرہ کا صدقہ اور قربانی کا صدقہ بانٹ کر گویا یہ بتلانا چاہتی ہے کہ ایک طرف تو وہ صرف خدائی نام لیوا ہے اور اس کی عظمتوں کو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہے۔

حکمت فطرانہ و قربانی

اور دوسری طرف دنیا کے مفلوک الحال انسانوں کو اس خوشی کے موقع پر صدقہ اور خیرات دے کر یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ ایک عوامی اور عالمی

قوم ہے جس کو نہ قبیلے تقسیم کر سکتے ہیں نہ ملکوں کی حد بندیاں بانٹ سکتی ہیں۔ نہ شخصیتوں کی عقیدت مندیاں اسے دوسری شخصیتوں کی عظمت و عقیدت سے روک سکتی ہیں۔ اور یہ ہی وہ جماعت کبری ہے جسے لے کر اسلام دنیا میں آیا ہے اور جس کا اعلان اس نے اپنے نام اور اپنے کام سے قدم قدم پر کیا ہے۔

روح عید

بہر حال اسلامی تہوار نفسیانی یا قومیتی یا شخصیاتی تصورات کے آئینہ دار نہیں بلکہ اجتماعیت عامہ کے حامل ہیں اور یہ اجتماعیت عامہ وطن، قوم، نسل شخصیت کے تصور سے نہیں بن سکتی تھی بلکہ ان سب سے بالاتر اور مافوق ذات سے وابستگی سے ہی بن سکتی تھی جس کا نام پاک اللہ ربّ العزت ہے۔

تو ان تہواروں کی روح اسی کا نام اور اسی کی عظمتِ مطلقہ قرار دی گئی ہے چنانچہ عید کی نماز کے لئے جب مسلمان چلتے ہیں تو رنگ چھینکتے ہوئے۔۔۔ یا کسی شخصیت یا قومیت کے نعرے لگاتے اور جے کار کرتے ہوئے نہیں چلتے بلکہ۔

اَللّٰہُ اَکْبَرْ اَللّٰہُ اَکْبَرْ لَآاِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرْ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ.

عید الفطر میں آہستہ آہستہ اور عید قربان میں باآواز بلند تہوار کے لئے روانگی ہوتی ہے تو تکبیر یا دالہی عظمتِ خداوندی اور توحید کے اعلان کے ساتھ ہوتی ہے اس میں نہ شور ہے نہ شر نہ ہنگامہ آرائی نہ میلوں، ٹھیلوں کی شان ہے بلکہ قدوسیوں، سبوحیوں اور مقدس ملائکہ کی صفوں کی طرح تسبیح الٰہی اور تقدس ربانی کہتے ہوئے روانہ ہوتے ہیں عیدگاہ میں پہنچ کر بھی تسبیح و تہلیل جاری رہتی ہے اس کے بعد امام آگے بڑھتا ہے اس کے تکبیر تحریمہ کہتے ہیں مکبر تکبیرات کی آوازیں بلند کرتے ہیں، تلاوت قرآن ہوتی ہے سب مقتدی سکون و خشوع کے ساتھ اسے سننے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ رکوع و سجود سے اپنے مالک کے سامنے بندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور آخر کار سلام پھیر کر پھر تکبیرات کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔

عظیم اجتماعیت

نماز سے فارغ ہوتے ہی امام خطیب کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور ممبر پر کھڑے ہو کر وعظ و نصیحت اور احکام سناتا ہے جس کو تمام مقتدی سماع عظمت و قبول سے سنتے ہیں۔

اس عبادت سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں اس خوشی کے موقع پر جبکہ ہر طرف چہل پہل اور روحانی مسرتوں کا دلوں پر ہجوم ہوتا ہے۔ ممکن تھا کہ اس میں کسی نفسانی تفریح یا دنیاداری کے جذبات کی آمیزش ہو جائے، تو ان تہوار منانے والوں کے لئے مسنون کیا گیا کہ

قبرستان میں جا کر اپنے مردہ بھائیوں کی ارواح سے ملاقات کریں۔ ان کو ثواب پہنچائیں ان سے قریب تر ہوں تاکہ ان کو آخرت کے گھرانے دیکھ کر خود بخود اپنی آخرت کی یاد تازہ ہو جائے اور دنیا میں اس خوشی کے موقع پر ادھر سے دھیان نہ ہٹ جائے۔

دوسرے لفظوں میں یہ بتلانا ہے کہ مسلمان اجتماعیت کبریٰ کو لے کر اٹھا ہے اس کا دائرہ صرف اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ عالم برزخ کے اربوں کھربوں انسان بھی اس کی اجتماعیت کے ممبر ہوں اس کی بنیاد ڈالی ہے جو دنیا سے گزر کر برزخ سے گزر کر عالم حشر تک جا پہنچتی ہے جس میں دنیا کے کسی ایک قرن کے ہی انسان نہ ہوں گے۔ بلکہ آدمؑ کی ساری اولاد' اور اولین و آخرین کی ساری شخصیتیں مجتمع ہوں گی۔

عالم گیر اجتماعیت پس جو لوگ مسلمانوں سے سن کر اجتماعیت کا نام لیتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ علمی اجتماعیت کا دم بھریں گے اور وہ بھی صرف اپنے زمانے کے ملکوں اور قوموں سے کوئی سیاسی رابطہ قائم کرلیں گے۔ لیکن حقیقتاً جو قوم اجتماعیت کے لئے دنیا میں برپا کی گئی ہے وہ عید کے وظائف کی رو سے گویا اس اجتماعیت کو پھر ایک غیر محدود اجتماعیت ظاہر کرتی ہے اور اس کا رابطہ اجتماعی دنیا سے اتر کر برزخ کے ان تمام پاکباز انسانوں سے قائم ہوتا ہے جو ایمان کے ساتھ اس عالم سے گزر کر اس عالم میں پہنچ گئے ہیں' اور گویا وہ محض دنیا والے بھائی بھائی کا نعرہ لگاتے ہیں مگر اس ساری اجتماعیت کی حقیقی روح جس سے یہ عالم گیر ہی نہیں عوالم گیر اجتماعیت بن جاتی ہے۔ خدا کا نام ہے کہ اس سے زیادہ واسع اور وسیع کوئی نہیں۔ اس لئے عید کے لئے جسے اس دنیا میں ایمان کی قید ہے ایسے آخرت کے باشندوں کی ملاقات کے لئے بھی وہی ایمان کی شرط ہے اور ایمان کے معنی بجز اس کے دوسرے نہیں کہ اللہ رب العزت کی ذات و صفات' افعال و اوامر و نواہی اور اس کے قوانین کو مانا جائے کیونکہ اس کے بغیر یہ وسعت و اجتماعیت قائم ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس سے زیادہ وسیع رشتہ اور معیار ہی دوسرا نہیں۔

خوش قسمت قوم

اس لئے عید تہوار تو ہے مگر محض لفظ تہوار کی وجہ سے اسے دنیا کی عام اقوام کے تہواروں کی نظر سے نہ دیکھا جائے کہ اس کی غیر معمولی وسعتیں ان دوسرے ظرفوں میں کسی طرح نہیں سما سکتیں۔

پس خوش قسمت ہے وہ قوم جسے ایسے تہوار دیئے جائیں اور خوش نصیب ہیں وہ افراد جو ان تہواروں میں ان کی شرعی حدود و شروط کے مطابق شرکت کریں تہوار عید بندگی حق اور خدمت خلق ہے نہ کہ محض نیا اور فاخرہ لباس' عطر و خوشبو اور شیریں چیزیں کھا پی لینا۔ اسی لئے حدیث نبوی ﷺ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

العید لمن خاف الوعید لا لمن لبس الجدید۔ (الحدیث)

”یہ عید اس کے لئے ہے جو خدا سے ڈرا اور اس کی طرف جھکا نہ کہ اس کی جس نے عمدہ اور نئے کپڑے پہن لئے“۔

عید کا اصل اُصول

پس عید کا حاصل ؟ ذکر الٰہی، ذکر ربانی، خدمت خلق اللہ، روح اجتماعیت دنیا میں رہ کر آخرت کو نہ بھولنا اور زندوں کے ساتھ ہی اموات سے بھی رشتہ جوڑے رکھنا اور ان میں سے ہر چیز کی روح اور معیار ایمان کو قرار دینا نہ کہ ظاہر داری اور دنیا سازی، تاکہ خلق اللہ کے ساتھ اللہ سے وابستگی اصل اصول ثابت ہو۔

سال بھر کے لئے نورانی اثرات

ساتھ ہی یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عبادتیں دو طرح کی ہیں ایک فعلی اور ایک ترکی، نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ فعلی ہیں جس میں کچھ افعال ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ترکی عبادت روزہ ہے جس میں ترک اکل، ترک شرب اور ترک لذات ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پورے ایک ماہ تک محبت حق میں دنیا کے اس معظم حصے کو ترک کئے رہنا کوئی معمولی مجاہدہ نہیں بلکہ نفس کی ایک عظیم قربانی ہے۔ جیسے بغیر مدد خداوندی پورا نہیں کیا جاسکتا۔ ماہ رمضان المبارک میں دن بھر اس مجاہدے سے نفس کو رگڑ کر اور مانجھ کر اس میں صفائی پیدا کی جاتی ہے لیکن کسی ظرف میں محض صفائی آجانا اور میل کچیل دور ہو جانا کافی نہیں جب تک کہ اس میں آب نہ آجائے اور وہ چمک نہ اٹھے ایک قلعی گر بھی برتن کو اول رگڑتا اور مانجھتا ہے، اینٹ، پتھر سے برتن کو رگڑ کر اپنے پیروں تک اسے پامال کرتا ہے تاکہ برتن کا میل صاف اور زنگ دور ہو جائے لیکن محض صفائی کے لئے برتن قلعی گر کے یہاں نہیں بھیجا جاتا بلکہ اصل مقصود اس کی آراستگی اور جگمگاہٹ ہوتی ہے چنانچہ قلعی گر بھی اس صفائی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ صاف برتن کو آنچ دیتا ہے اور تپا کر جب صاف شدہ برتن پر قلعی پھیرتا ہے تو اسی دم برتن چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے، اور قلعی گر کے پاس برتن بھیجنے کا مقصد اب آکر پورا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ظرف قلب کو صاف کرنے کے لئے تو رمضان کے روزے رکھے گئے ہیں تاکہ نفس کی محبوبیت اس سے چھڑا کر اسے رگڑ دیا جائے، اور غیر اللہ کی محبت والفت کی ان آلائش سے اسے صاف کیا جائے پس روزے کے یہ تروک نفس کے لئے وہی کام کرتے ہیں جو برتن مانجھنے کے لئے اینٹ، پتھر اور مٹی کام کرتی ہے۔ دن بھر جبکہ نفس کی رگڑائی ہوئی اس کا دانہ پانی بند کر کے اس کی نفسانی لذات کے دروازے بند کر دیئے گئے اور اس عمل سے اس کی روحانی آلائشوں کا میل کچیل نکال دیا گیا تو شب کو اس پر قلعی کا سامان تراویح اور تلاوت قرآن سے کیا جاتا ہے تاکہ دن بھر تپائے ہوئے

نفس پر کلام خداوندی کی قلعی سے آب اور چمک پیدا کر دی جائے اور اس کی روح نور الٰہی سے جگمگا اٹھے۔ یہ تمیں کے تمیں دن دن بھر کی کمائی رگڑائی اور منجھائی اور پھر شب بھر قلعی ایک ماہ میں انسانی نفس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ سال بھر تک اس چمک دمک سے فائدہ اٹھاتا رہے اور میل کچیل سے مبرا رہ کر ان نورانی اثرات کو سال بھر تک استعمال کرے بشرطیکہ اس مجاہدہ کے اثرات کو سال بھر باقی رکھنے میں ساعی رہے۔

اجتماعیاتی صلاحیت کا شکرانہ

بہر حال یہ ایک سال بھر کی نورانیت کی کفالت کرتا ہے' اور بندے کے خدا سے قریب تر ہونے کے تمام موانع کو دور کر دیتا ہے' تاکہ اس سے قریب ہو کر بندہ وسیع الظرف اور وسعت عامہ کا اہل ہو جائے اور اس کی ذات اسلام کی اجماعیت کبریٰ کی طویل وعریض زنجیر کی ایک مضبوط کڑی ثابت ہو۔

پورے ایک ماہ کی اس مشقت محنت اور اس پر مرتب شدہ اجتماعیاتی صلاحیت جیسی عظیم نعمت ملنے پر جو محض خدا کی مدد' اور اس کی توفیق ہی سے اسے میسر ہو سکتی تھی' اتنی ہی بڑی شکر گزاری کا فریضہ بندے پر عائد ہوتا تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ادائے شکر کا طریقہ دوگانہ عید کو قرار دیا تاکہ ادھر رمضان کامیاب ہو کر ختم ہوا ادھر اسی دم ہلال عید آسمان سے سر نکال کر یہ اعلان کرے "اے بندو! اس عظیم کامیابی پر جو تمہیں اجتماعیت کبرٰے کی صلاحیتوں کے ملنے کی صورت میں حاصل ہوئی ہے۔ اپنے مالک کا شکر ادا کرو' یا بالفاظ دیگر رمضان میں جو صلاحتیں تمہیں عطاء کر دی گئی ہیں ان کو عید کے میدان میں فعلیت میں لاکر ان صلاحیتوں کا عملی ثبوت دو اور اجتماعیت عامہ کی صورت اور حقیقت اجتماع عید میں توجہ الی اللہ کے ساتھ نمایاں کر کے دکھلاؤ۔

حقیقت رمضان

پس رمضان المبارک صلاحیتیں پیدا کرنے کا مہینہ ہے' اور ماہ عید ان صلاحیتوں کے عملی آغاز کا مہینہ ہے جس کا سلسلہ سال بھر تک جاری رہتا ہے' اس درمیان میں اگر کچھ کمی یا کوتاہی راہ پاتی ہے تو اگلا رمضان پھر اگلے سال کے لئے ان کوتاہیوں کو دور کر کے ان صلاحیتوں کی تجدید کر دیتا ہے تاکہ نہ مجاہدے کا سلسلہ ختم ہو' نہ اجماعیت کی روح مضمحل ہونے پائے اور انسانی عمر اسی مبارک سلسلہ میں ختم ہو جائے۔

فرد مسلم کا درجہ اُمت

تاکہ جب وہ اپنے رب سے ملے تو تنہا اپنا نفس ہی ساتھ نہ لے جائے بلکہ اس کے ساتھ اجتماعی نسبتوں کی ایک عظیم کمک ہو۔ لاکھوں

دعائیں ہوں جو اس اجتماع میں مل کر کی گئی تھیں۔ ہزاروں ایصال ثواب ہوں جو عید کے موقع پر اموات تک پہنچائے گئے تھے۔ کروڑوں باطنی ہمتیں ہوں جو صف بندیوں میں ایک کی دوسرے کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور دنیا و برزخ کے تعلقات کے بے شمار رشتے ہوں جو اس کے لئے جناب باری میں سفارشی اور مساعی ہوں تاکہ اس فرد پر جو اجتماعی صلاحیتوں سے ایک امت بن کر اپنے خدا کے پاس پہنچ رہا ہے۔ اللہ کی لاکھوں رحمتیں متوجہ ہوں اور وہ اسی طرح اپنے مقصد تخلیق کو پورا کر کے سرخروئی کے ساتھ اپنے مالک سے جا ملے

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَوَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلاَّ مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ٥

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

محبت و معیت

جو مجھ سے محبت کرے گا۔ وہ میری اطاعت بھی کرے گا' اور میری سنتوں کی پیروی بھی کرے گا۔۔۔ اور جو میری سنتوں پر چلے گا وہ میرے ساتھ بھی ہو گا جنت میں وہ میرے سے الگ نہیں رہے گا۔۔۔۔ آپ ﷺ نے بنیادی قرار دیا ہے۔ محبت کو کہ مجھ سے محبت کرنا علامت ہے اس بات کی کہ وہ جنت میں میرا رفیق ہو گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے۔ مگر محبت پہچاننے کی علامت اطاعت اور اتباع سنت ہے۔ جب یہ ہو گی تو معلوم ہو گا کہ محبت میں سچا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ'

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِيْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَہٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَہٗ لَا شَرِيْكَ لَہٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہٗ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔۔۔۔۔۔۔۔ اَمَّا بَعْدُ۔۔۔۔۔۔۔۔

فَقَدْ قَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاہُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِہٖ وَقَالَ اللّٰهُ جَلَّ ذِكْرُہٗ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِىٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِ

اَلْكَرِيْمُ.

حقیقت ہر شی

بزرگان محترم!

دنیا کی ہر چیز بلکہ ہم اور آپ بھی دو چیزوں سے مرکب ہیں۔ ایک ہمارا ظاہری حصہ ہے جس

کو ہم بدن کہتے ہیں یہ ہیئت وشکل ہے مثلاً آنکھ ہے جس سے ہم ایک دوسرے کی شکل وصورت دیکھ کر پہچانتے ہیں۔ یہ ظاہری حصہ اور ظاہری پیکر ہے اور ایک اس کے اندر پوشیدہ حقیقت ہے۔ وہی در حقیقت انسان ہے۔ اس صورت ظاہری کا نام انسان نہیں۔ انسان حقیقت کا نام ہے جو اندر چھپی ہوئی ہے اس کے دکھلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ صورت بنادی ہے جو کہ دراصل ذریعہ تعارف ہے اصل مقصود نہیں ہے

پھر مقصود کہاں ہے؟ شریعت اسلام پتہ دیتی ہے کہ اندرون باطن ایک قلب ہے اسی میں ساری حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں اور اسی کا نام انسان ہے' اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے جب پھیلایا اور صورت وشکل دی تو قالب نمودار ہو گیا۔ شکل بن گئی۔ اب اس دیکھ کر پہچان گئے کہ یہ فلاں ہے یہ فلاں ورنہ حقیقت میں انسان قلب ہی ہے اور اسی کے اندر سب کچھ پوشیدہ ہے۔

تائید ونکتہ چینی حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا فرمایا اور بدن بنایا۔ ابھی اس میں روح بھی نہیں ڈالی تھی تو ملائکہ علیہم السلام اس کی زیارت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے عجیب شکل وصورت بنائی ہے اور بہت ہی عمدہ ہے اور سب کے دل میں ایک عظمت ومحبت اس صورت کو بیٹھ گئی۔ ادھر ابلیس کو بھی حکم ہوا کہ تو بھی اس صورت کو جاکر دیکھ۔ اس کے دل میں عداوت چھپی ہوئی تھی' اس نے جاکر دیکھا اور حضرت آدمؑ کے پتلے کے اندر گھسا اور ریزے ریزے میں سرایت کی' بعد میں اس نے کہا کہ کوئی عجیب چیز نہیں ہے اور کہا کہ ۔

نَفس " لَا تَتَمَلَّكْ.

یہ تو اندر سے کھوکھلا ہے خود کو بھی نہیں سنبھال سکتا ہے جب تک کہ باہر سے اس کی مدد نہ ہو اور غذا' ہوا' گرمی باہر سے نہ پہنچے اس کے اندر کوئی طاقت نہیں۔ اس ابلیس نے اپنی شیطنت اور عداوت کے مطابق رپورٹ دی۔

سارے ملائکہ نے تو تائید کی اور مدحت کی اور اس کمبخت نے آر نکتہ چینی کی مگر یہ کہا کہ میں نے سارے بدن میں گھس کر دیکھا ہے یہ اندر سے بالکل کھوکھلا ہے البتہ اس کے بیچ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی ہے اس میں سب کچھ ہو گا اگر ہوا۔ وہاں میں گھس نہ سکا۔

اشارہ تھا قلب کی طرف کہ جو کچھ حقیقت ہے وہ اس قلب رکھی گئی ہے اس کی حقیقت اس لعین کے سامنے نہ کھل سکی وہاں جاکر مجبور ہو گیا۔

اقلیم بدن کا بادشاہ چنانچہ سب سے بڑی چیز انسان میں قلب ہے۔۔۔ اور باقی جتنے اعضاء ہیں سب اس کے خدام ہیں۔ قلب میں جو جذبہ پیدا ہوتا ہے یہ سب

خدام اس کے مطابق عمل شروع کر دیتے ہیں۔ اگر دل میں آیا کہ ی چیز کو دیکھوں تو دل آنکھ کو زبان سے آرڈر نہیں دیتا کہ تو دیکھ بلکہ دل میں خیال آتے ہی آنکھ اپنا کام شروع کر دیتی ہے' دل میں خیال آیا کہ میں چلوں' تو دل کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ پاؤں کو زبان سے حکم دے کہ چلو' بلکہ دل کا منشاء ہوا اور پیروں نے حرکت شروع کر دی۔ دل نے کسی چیز کو پکڑنا چاہا تو دل ہاتھوں کو لفظوں میں حکم نہیں دے گا کہ اے ہاتھو! تم پکڑو۔ بلکہ دل میں جذبہ آیا اور ہاتھوں نے اپنا کام شروع کر دیا تو انسان کے تمام اعضاء خدام ہیں۔ اصل حاکم اعلیٰ اور اس اقلیم بدن کا سلطان وہ دل ہے اور دل میں ہی سب کچھ ہے۔

قلبؒ اصل ہے یا دماغ؟

اس میں اطباء اور موجودہ زمانے کے ڈاکٹروں کا اختلاف ہوا ہے کہ اصل انسان میں دماغ ہے یا قلب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اصل انسان میں دماغ ہے کیونکہ اسی سے تمام چیزیں چلتی ہیں اسی میں شعور ہے' اسی میں ادراک ہے' اسی میں علم ہے' اسی میں احساس ہے اور قلب صرف ایک آلہ ہے جو خون کے ذریعے سے دماغ کو بنا دیتا ہے اور دماغ کے اندر کچھ چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہر حال وہ کہتے ہیں کہ قلب آلہ کار ہے اصل نہیں ہے۔ یہ بعض اطباء کا بھی خیال ہے اور اس زمانے کے ڈاکٹروں کا بھی یہی خیال ہے لیکن ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ یہ بالکل غلط ہے اور یہ بھی نہیں کہتے کہ بالکل صحیح ہے بہت سی اس میں صحت بھی ہے اور بہت سی اس میں غلطیاں بھی ہیں۔

مدارِ اعمال قلبؒ ہے

چنانچہ ہم بنانے والے کی طرف رجوع کریں گے کہ اس نے کس چیز کو اصل کہا ہے حق تعالیٰ خالق ہے وہ جانتا ہے کہ میں نے کیا چیز بنائی ہے اور کس لئے بنائی ہے اور نبی کریم ﷺ ان چیزوں کی اصلاح کے لئے آئے ہیں۔ آپ کو علم دیا گیا ہے اس بات کا کہ دل کیا ہے اور دماغ کیا ہے اور ہاتھ پیر کیا ہیں اس لئے ہم نے رجوع کیا کہ بنانے والے سے پوچھو کہ اصل کیا چیز ہے قلب ہی اصل ہے یا دماغ اصل ہے۔ تو شریعت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلب ہی اصل ہے وہی حاکم مطلق ہے اس اقلیم بدن کا۔ بدن کی ساری حکومت اسی سے چل رہی ہے۔

حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

انّ فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کلّه' واذا فسدت فسد الجسد کلّه' الا وهی القلب.

"انسان کے بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے وہ اگر صحیح ہو تو سارا انسان صحیح ہے

وہ اگر غلط ہے تو سارا انسان غلط ہے اور فرمایا کہ وہ قلب ہے"۔

تو انسان کی خوبی و خرابی کا دارومدار قلب پر ہوتا ہے۔ دل ہی کے اندر نیت پیدا ہوتی ہے اور نیت سے سارے اعمال بنتے ہیں اور فرمایا گیا کہ۔

انما الاعمال بالنیات.

"سارے اعمال کا مدار نیت پر ہے"۔

نیت اچھی ہے تو عمل بھی اچھا ہے اور نیت اگر بری ہے تو عمل بھی برا ہوگا اور نیت کا دارومدار قلب کے اوپر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ سارے کے سارے اعمال و افعال کا دارومدار انسان کے قلب پر ٹھہر گیا اور فی الحقیقت زندگی بھی قلب ہی سے چلتی ہے۔

مدارِ حیات قلبؐ ہے

جیسے اعمال کا مدار قلب پر ہے ایسے ہی حیات کا مدار قلب پر ہے کیونکہ قلب پہلے زندہ ہوتا ہے پھر حیات دماغ میں پہنچتی ہے۔ تو اس بناء پر مدار حیات دل کے اوپر رکھا گیا ہے اور اطباء بھی اسی کا اقرار کرتے ہیں۔ اطباء کہتے ہیں کہ آدمی جو غذا کھاتا ہے وہ اولاً معدے کے اندر پہنچتی ہے۔ معدے کے اندر خار ہوتے ہیں جو اسے پیستے ہیں اور پیس کر حریرہ بنا دیتے ہیں۔ اس میں جو حصہ فضلات کا ہے وہ زائد ہے وہ انتڑیوں میں چلا جاتا ہے اور بول و براز ہو کر نکل جاتا ہے اور جو رقیق جوہر ہے اس کو قلب معدے کی طرف سے جگر کی طرف بھیجتا ہے۔ معدے کی طرف سے جگر کی طرف کو جانیوالی نالیوں کی شکل کی چھوٹی چھوٹی رگیں ہیں ان کے ذریعے سے وہ غذا جگر میں پہنچتی ہے۔

جگر کو کہتے ہیں کہ وہ طباخ اور بدن کا باورچی ہے، جگر میں گرمی اور حرارت ہے وہ اس گرمی سے حریرے کو پکاتا ہے اور خوب گرمی پہنچاتا ہے جب وہ ہنڈیا پکتی ہے تو اس میں ایک حصہ ابال کا آتا ہے جھاگ کی شکل میں ایک حصہ نیچے بیٹھ جاتا ہے جسے تلچھٹ کہتے ہیں۔ ایک حصہ بیچ میں پانی میں رہتا ہے وہ کھولتا رہتا ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ جو اوپر کا حصہ ہے جھاگ کا وہ بلغم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور نیچے کا حصہ جو تلچھٹ ہے سیاہ ہوتا ہے اسے سوداء کہتے ہیں اور بیچ میں جو رقیق اور پتلا حصہ ہے اسے اطباء کہتے ہیں کہ وہ صفراء ہے۔

تو سوداء، صفرا، بلغم۔ یہ تین حصے ہیں جن کو جگر تیار کرتا ہے اور پکاتا ہے ان تینوں چیزوں کے مجموعے سے خون بنتا ہے تو جگر کا کام ہے خون بنانا، معدہ کا کام تھا غذا کو پیسنا۔ پھر جگر اسی خون کو بھیجتا ہے قلب کی طرف۔ جگر سے قلب کی طرف جانے والی بہت باریک رگیں ہیں جن کو طب کی اصطلاح میں شرائین کہتے ہیں (شرائین جمع ہے شریان کی) ان ہی باریک رگوں سے خون قلب کے

طرف پہنچتا ہے۔اور قلب کی شکل تو مٹھی کی سی ہے کہ اوپر سے پتلا' بیچ میں سے موٹا' پھر نیچے سے پتلا۔

اوپر کے حصے کو کہتے ہیں بطن عالی اور نیچے کے حصے کو بطن سافل۔ ان میں باریک اور رقیق خون پہنچتا ہے اور قلب میں گرمی' جگر سے بھی زیادہ ہے اور دل پھر اس لطیف جوہر کو پکاتا ہے اور پکانے سے ایک لطیف بھاپ اٹھتی ہے' جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی وہ بھاپ رگ و پے میں سرایت کرتی ہے اسے اطباء کہتے ہیں کہ یہ روح حیوانی ہے اسی روح سے آدمی میں حس ہے' احساس ہے عقل ہے زندگی ہے۔ اطباء کی اصطلاح میں اس کو روح حیوانی کہتے ہیں۔

اور شریعت کی اصطلاح میں اس کا نام روح نَسَمَۃ ہے اس کو نفس بھی کہتے ہیں۔ نفس کے معنے پھونکنے اور پھیلنے کے ہیں چونکہ یہ پورے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ اس بناء پر اس کو نفس بھی کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل پر مدار ہے۔ انسان کی زندگی کا' وہی حیوانی پیدا کرتا ہے جس سے انسان کے بدن میں حس' حرارت اور احساس وغیرہ طاقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بدن میں قلب اصل ہے دماغ اصل نہیں ہے۔

تمام اعضاء کا تعلق قلب سے ہے دماغ سے نہیں اور زندگی کا مدار بھی دل ہی پر ہے۔ عمل کا جذبہ بھی دل ہی سے ابھرتا ہے۔ محبت اور عداوت بھی دل ہی سے متعلق ہے۔ جس سے ہزاروں معاملات وابستہ ہیں۔

دماغ قلبؑ کے تابع ہے

تو شریعت کا منشا یہ ہے کہ اصل چیز انسان میں قلب ہے دماغ نہیں بلکہ دماغ قلب کا تابع ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قلب میں جو علم اور شعور ہے وہ اجمالی ہے' مختصر ہے اور مجمل ہے۔ دماغ میں جا کر اس کی تفصیل ہوتی ہے اور پھیل کر جزئیات نکلتی ہیں۔ پھر آدمی ان سے نظریات قائم کرتا ہے۔ نظریات سے پھر پروگرام بنتے ہیں۔۔۔۔ تو علم اجمالی قلب میں ہے دماغ میں آکر اس کی تفصیل ہوتی ہے اور چونکہ تفصیل ہوتی ہے اجمال کیلئے اس لئے دماغ تابع ہے قلب کے' برعکس نہیں۔ یہ شریعت کا منشاء ہے اس لئے شریعت اسلام کا موضوع اور مقصد یہ ہے کہ دل کی اصلاح کی جاوے' اگر دل درست ہو گیا تو دماغ بھی درست ہے۔ ہاتھ پیر بھی درست ہیں۔ اخلاق بھی درست ہیں۔ اگر انسان کا دل بگڑ جائے تو نہ زندگی ہے اور نہ عمل ہے' نہ ہنر ہے نہ کمال ہے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دل زندہ ہے تو سارا انسان زندہ ہے۔ دل مردہ ہے تو سارا انسان مردہ ہے تو دارومدار حقیقت میں دل ہی کے اوپر ہے کیونکہ ہر چیز دل سے چلتی ہے' اس لئے شریعت نے دل کو اپنا موضوع بنالیا ہے اگر دل درست ہو گا تو اعمال شرعیہ بھی درست ہوں گے اور سارا بدن درست ہو جائے گا اور دماغ بھی صحیح ہو جائے گا اور اگر قلب بگڑ گیا تو دماغ بھی خراب رہے گا اور تمام اعضاء بھی خراب رہیں گے۔

مُدرکِ حقیقی قلبؐ ہے

یہ ہی وجہ ہے کہ آنکھیں دیکھتی ہیں اور کان سنتے ہیں۔ تو اطباء کہتے ہیں کہ یہ سارا دماغ سے ہوتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ بھی دل سے ہوتا ہے۔ مثلاً آپ بھرے بازار میں جائیں اور اچھی اچھی بلڈ نگیں دیکھیں بڑے اچھے مناظر سامنے ہیں۔ جب آپ واپس آئیں گے تو آپ کا دوست کہے گا کہ بھائی! آج تو بڑی بڑی عمدہ عمدہ بلڈ نگیں دیکھی ہیں۔ یہاں تو بڑے اعلیٰ اعلیٰ مناظر ہیں۔ بڑی بہترین سڑکیں ہیں' صاف ستھرا شہر ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ دوست کہے گا کہ خدا کے بندے آنکھیں تیری کھلی ہوئی تھیں۔ چیزیں سامنے تھیں اور تو کہتا ہے کہ نہیں دیکھیں تو جواب میں کہتا ہے کہ اوفوہ میرا دھیان دوسری طرف تھا' مجھے خبر نہیں ہوئی کہ میرے سامنے کیا چیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کو کوئی چیز نظر نہیں آئے گی گھنٹے بج رہے ہیں آواز آرہی ہیں۔ لوگ سارے سن رہے ہیں مگر آپ کو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا لوگ کہتے ہیں کہ بہت گھنٹے بجے' آوازیں آئیں' آپ کہتے ہیں کہ میں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ ہم نے تو سب کچھ سنا ہے' وہ کہتا ہے کہ افوہ اصل میں میرا خیال دوسری طرف متوجہ تھا' مجھے سننے کا خیال ہی نہیں آیا۔

معلوم ہوا کہ کان نہیں سنتا بلکہ دل سنتا ہے۔ دل متوجہ ہو جائے تو ساری آوازیں کان میں آئیں گی اگر دل ہی متوجہ نہیں تو کوئی چیز بھی کان میں نہیں آئے گی ذائقہ ء ہے وہ بھی دل ہی کا کام ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ غذائیں کھائیں اور دل متوجہ ہو دوسری طرف' نہ کھٹے کا پتہ چلے گا نہ میٹھے کا پتہ چلے گا۔ اگر کوئی کھٹے میٹھے کا پتہ پوچھے گا تو کہے گا کہ بھائی میرا دل تو دوسری طرف تھا مجھے کچھ خبر نہیں۔

مجھے ذائقہ پر ایک حکایت یاد آگئی کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے ایک سالے تھے حاجی مقبول صاحب بہت نیک صالح تھے اور حضرت ہی کے یہاں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ اتفاق سے چار پانچ روز تک مسلسل چنے کی دال پکتی رہی۔ اور روزانہ تو آدمی سے پلاؤ کھانا بھی مشکل ہو جاتا ہے جب تک کہ غذا نہ بدلے۔

انہوں نے اپنی بہن سے کہا کہ کیا تمام دالیں مٹ مٹا کر ایک ہی چنے کی دال رہ گئی ہے ہفتہ بھر ہو گیا ہے اس ایک دال کو ہی کھاتے ہوئے اور جی بھر گیا کبھی دوسری دال بھی پکالیا کرو۔ انہوں

نے اگلے دن ماش کی دال پکائی۔ کھانے کے بعد کہنے لگے۔ آج پھر وہی چنے کی دال پکائی۔ انہوں نے کمر پر ہاتھ مار کر کہا آنکھیں ہیں کہ نہیں چنے کی دال ہے یا ماش کی؟ تو کہنے لگے کہ مجھے کچھ دھیان نہیں رہا میں سمجھا کہ وہی چنے کی دال کھا رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ چکھنا دل سے ہوتا ہے۔ زبان نہیں چکھتی۔۔۔ کھٹے میٹھے کا ذائقہ' اس کا احساس اور اس کا ادراک یہ سب دل سے متعلق ہے۔ اس لئے اصل چیز انسان کے بدن میں دل ہے اور باقی سب اعضاء اس کے تابع ہیں۔

مرکز اصلاح قلبؒ ہے

دماغ بہت اعلیٰ چیز ہے مگر دماغ تفصیل کرتا ہے اس علم کی جو قلب کے اندر پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ قلب اپنے اس علم اجمالی کو دماغ کے سامنے پیش کرتا ہے وہ دماغ کی نالیوں میں چکر کھاتا ہے پھر نظریہ بن جاتا ہے اور نظریہ سے پروگرام بن جاتا ہے پروگرام سے اس کی اشاعت ہو کر پارٹی بن جاتی ہے۔ قلب اگر دماغ کے اندر علم نہ بھیجتا تو نہ نظریہ بنتا نہ پارٹی وجود میں آتی۔

اسی لئے شریعت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ دل اصل ہے دماغ اس کے تابع ہے۔ ہاتھ پیر بھی اس کے تابع ہیں۔ پیٹ اور پیٹھ بھی اس کے تابع ہیں۔

اسی بناء پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اصلاح کا مرکز دل کو بنایا ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ نگاہ بھی ٹھیک ہو جاتی ہے کان بھی درست' ناک بھی درست' یہ غلط ہے تو ساری چیزیں غلط ہیں۔ اگر دل میں خرابی ہے اور نیت بری ہے تو نگاہ بھی لامحالہ غلط جگہ پر پڑے گی اور دل میں تقدس' تقویٰ اور طہارت ہے تو نگاہ بھی غلط جگہ نہیں جائے گی۔ اگر دل میں صلاح تقویٰ ہے تو غلط قسم کی آوازیں باجے گاجے کبھی نہ سنے گا۔ اس طرف توجہ بھی نہ کرے گا اور اگر دل میں دیانت و تقویٰ نہیں ہے تو اس کے لئے جائز و ناجائز سب برابر ہے۔ باجے گاجے بھی سنے گا' حرام آوازیں بھی سنے گا' حلال آوازیں بھی سنے گا۔ اگر دل میں دین ہے تو راستہ درست رہے گا' اچھی چیزوں کی طرف طبیعت جائے گی بری چیزوں سے ہٹ جائے گی۔

افتائے قلبؒ

چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ

استفت قلبك فان القلب خير المفتي.

کہ جب تمہیں کوئی معاملہ درپیش ہو تو تم اپنے دل سے فتویٰ لے لیا کرو' دل آدمی کا مخلص ہوتا ہے وہ بتاتا ہے کہ بات صحیح ہے کہ غلط ہے۔ آپ نے دوست کے اوپر دعویٰ کر دیا کہ یہ جائیداد

میری ہے فلاں کی نہیں۔ حالانکہ دل سے جانتا ہے کہ یہ اسی کی ہے میری نہیں ہے۔ آپ نے قانونی طور پر مقدمہ بنایا تاکہ جائیداد میرے نام پر آجائے۔ اس پر وکلاء بحث کریں گے، ممکن ہے آپ کامیاب بھی ہو جائیں، جائیداد آپ کی ہو جائے گی، مگر دل آپ کا ملامت کرے گا کہ کمبخت تو غیر کا حق مار رہا ہے۔ دل فتویٰ دے رہا ہے کہ زمین تیری نہیں ہے۔ اگر آدمی دل کی طرف متوجہ ہو جائے تو سارے قصے ختم ہو جائیں لیکن بات تو یہ ہے کہ لوگ مطلب کے پیچھے رہتے ہیں۔

ایک عالم نے فتویٰ دیا جو کہ مرضی کے خلاف تھا۔ اب اس سوال کا دوسرا رخ بدل کر فتویٰ بھیج دیا۔ اب اس فتوے کا دوسرا جواب آگیا وہ بھی مرضی کے مطابق نہ تھا۔ اب پھر تیسرے مفتی کے پاس بھیج دیا تو جو فتویٰ مرضی کے مطابق ہوا اس پر عمل کر لیا اور جو مرضی کے مطابق نہ ہوا اس پر عمل نہ کیا۔ یہ کوئی شریعت کا حکم ہے؟ یہ کیا شریعت کا پیرو ہے؟ یہ تو اپنے نفس کا تابع ہے۔ نفس میں جو چیز آگئی چاہتا ہے کہ اس کے مطابق فتویٰ مل جائے۔ اس لئے شریعت نے کہا کہ مفتیوں سے فتویٰ بعد میں لینا پہلے اپنے دل سے فتویٰ لے لو، دل انسان کا مخلص ہے وہ سچا مشورہ دے گا اور صحیح فتویٰ دے گا۔

ایمان کا مورد اوّل قلبؒ ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلام نے دل کو پکڑا ہے اور اسی کا اعتبار کیا ہے کہ انسان کے ضمیر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ حق ہوتا ہے اور بحث سے اور نفسانی خواہشات سے جو بھی رائے قائم کرے دل اس کو جانتا ہے کہ وہ غلط ہے، ہاتھ چوری کرتا ہے مگر دل ملامت کرتا ہے کہ تجھے حق نہیں دوسرے کے مال چرانے کا، اگر دل کی بات مانے تو کبھی چوری نہ کرے۔ بہر حال دل انسان کا اصل ہے اس لئے شریعت نے دل کو تاکا ہے کہ اس کی اصلاح کر دو۔ بنیاد درست ہو جائے تو سارا انسان ہی درست ہو جاتا ہے اور بغیر اس کے انسان درست نہیں ہو سکتا۔

شریعت نے دل کی اصلاح کے لئے ایمان رکھا ہے، اس لحاظ سے ایمان کا محل بھی قلب انسان ہے۔ اللہ و رسول ﷺ کی محبت بھی دل کے اندر ہوتی ہے یہی محبت آدمی سے عمل کراتی ہے۔ دل کے اندر جذبے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی جذبے کے مطابق انسان چلتا ہے۔ تو اولاً ایمان قلب انسان پر وارد ہوتا ہے۔ وہاں سے وہ ترقی کر کے دوسرے مقامات پر پہنچتا ہے، اس کی تاثیر سارے بدن پر پہنچتی ہے تو پھر ہاتھ بھی مومن بن جاتا ہے اور کان بھی مومن بن جاتا ہے اور سب اعضاء میں ایمانداری پیدا ہو جاتی ہے، اگر دل میں بے ایمانی گھسی ہوئی ہو تو ہاتھ پیر بھی بے ایمان ہوں گے اور بے ایمانی کی حرکتیں کریں گے اور دماغ بھی بے ایمان ہو جائیگا سوچے گا تو بے ایمانی کی باتیں سوچے گا اس لئے کہ دل کی نیت خراب ہے۔

چنانچہ دل کو اصل قرار دے کر انبیاء اسی کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے ہیں کہ اس کے اندر نور و چمک پیدا کریں تا کہ اس کے اندر علم غیب کی چیزیں روشن ہو جائیں اور یہ اسی وقت ہو گا جب کہ قلب پر ایمان وارد ہو۔ اور قلب چونکہ پاک ظرف ہے اس لئے اس میں پاک چیز یعنی ایمان داخل ہوتا ہے اور پھر عمل بھی ویسا ہی ظاہر ہوتا ہے اگر دل میں خوشی ہے تو چہرے پر بھی خوشی کے آثار ظاہر ہوں گے چونکہ خوشی درحقیقت قلب کی صفت ہے، مگر چہرے سے نظر آتی ہے۔ دل میں اگر غم بھرا ہوا ہے تو چہرے سے معلوم ہو جاتا ہے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آج تم بڑے غمگین نظر آتے ہو حالانکہ غم چھپی ہوئی چیز ہے وہ آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے چوں کہ دل کا اثر چہرے پر پڑتا ہے تو ہر جاننے والا جان لیتا ہے کہ یہ غم زدہ ہے اور واقعی وہ غم زدہ ہوتا ہے۔۔۔ تو غمی و خوشی' محبت و عداوت اور کرنا نہ کرنا یہ چیزیں انسان کے قلب سے متعلق ہیں۔ اگر دل درست ہے سب چیزیں درست ہیں۔۔۔ اگر دل خراب ہے تو اس کی وجہ سے سب چیزیں خراب ہیں اور اسی وجہ سے ہاتھ پیر پر اثر پڑتا ہے اور وہ اثر جو قلب پر وارد ہوتا ہے وہ متعدی ہو کر اعضاء و جوارح پر طاری ہوتا ہے۔ اچھا ہو یا برا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب کسی آدمی کے انتقال کا وقت قریب آتا ہے اور ملائکہ نزع روح کرتے ہیں تو ہاتھوں اور پیروں کو سونگھتے ہیں اور دماغ کو دیگر بدن کو بھی سونگھتے ہیں اور ایمان کی خوشبو سونگھنا چاہتے ہیں۔ دل میں اگر ایمان ہے تو ہاتھ پیر میں بھی ان کے اثرات رچے ہوئے ہوتے ہیں ہاتھوں کو بھی سونگھتے ہیں کہ ان میں بھی ایمان کی خوشبو ہے یا نہیں اصل خوشبو کا مرکز تو دل ہے مگر اعضاء پر اس کے اثرات پہنچ جاتے ہیں جیسے خوشبو کا مخزن تو باغ ہے اور پھول ہے مگر کپڑوں سے بھی خوشبو آنے لگتی ہے اور باغ والی خوشبو کے اثرات سے جہاں جہاں ہوا پہنچے گی وہ شے معطر ہوتی چلی جائے گی۔

بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر دل اصل ہے اس کو درست کیا جائے اور اسکی درستگی کی پہلی بنیاد ایمان ہے' ایمان رہتا ہے کہ قلب کے اندر اور ان کے اثرات ہاتھ پر عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

محل اسلام

اس سے معلوم ہوا کہ دل' ایمان کی جگہ ہے اور ہاتھ پیر اسلام کی جگہ ہیں۔ ایمان چھپی ہوئی شے ہے جو دل میں رہتا ہے' اور اسلام کھلی ہوئی شئے ہے جو ہاتھ اور پیروں پر آتا ہے۔ آپ نے نماز پڑھی ہاتھ پاؤں سے پڑھی۔ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ آپ نے نماز پڑھی مگر اس کا فعل کا سرچشمہ قلب کے اندر ہے۔ اگر اس میں جذبہ عقیدت کا محبت کا اور اللہ کی

چاہت کا پیدا نہ ہوتا تو کبھی نماز نہ پڑھتے۔ معلوم ہوا کہ اصل میں نماز پڑھنے والا دل ہے لیکن عمل کی صورت ہاتھ پیر پر ظاہر ہوتی ہے، ایمان کا محل دل ہوتا ہے اس کے اثرات جب ہاتھ پاؤں پر آتے ہیں تو وہ اسلام بنجاتے ہیں۔

چونکہ ایمان پوشیدہ شے ہے اور اسلام ظاہر شئے ہے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ **الایمان سر والا سلام علانیة** کہ ایمان چھپی ہوئی چیز ہے جس کو دل لئے ہوئے ہے اور اسلام کھلی ہوئی شے ہے جو ہاتھ پاؤں پر ظاہر ہوتی ہے۔ تو وہی اندرونی شئے جب تک چھپی رہتی ہے اسے ہی ایمان کہتے ہیں اور وہی شئے جب ہاتھ پاؤں پر آتی ہے تو اسے اسلام کہتے ہیں۔

حقیقت ایمانیہ

ایمان کے معنے کیا ہیں؟ اور کس طرح سے ہمارے اندر آتا ہے؟ اور اس کے آثار کیا ہیں؟ اور کیسے پہچانا جاتا ہے؟ تو سنئے! ایمان کی حقیقت ہے محبت اگر اللہ کی محبت کامل ہے تو کہیں گے کہ اس کا ایمان کامل ہے اور نبی کریم ﷺ کی محبت دل میں رچ گئی ہے تو کہیں گے کہ ایمان آگیا۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ.

جو لوگ ایمان لائے ہیں ان میں اللہ کی محبت اور عشق سرایت کئے ہوئے ہے۔ اگر عشق و محبت نہ ہوتا تو ایمان کبھی نہ آتا۔ اگر نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دل کے رگ و پے میں حضور ﷺ کی محبت بس گئی ہے اور اللہ کی محبت جم گئی ہے۔

تو محبت در حقیقت ایمان کا دوسرا نام ہے۔ ایمان نہیں محبت نہیں۔ محبت نہیں تو ایمان نہیں۔ اصل چیز اللہ و رسول ﷺ کی محبت ہے۔ یہی چیز ایمان بناتی ہے یہی اعتقاد قائم کرتی ہے۔ اسی کو فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہا:

لا یؤ من احد کم حتیٰ اکون احب الیه من ولده ووالده والناس اجمعین.

کوئی بھی تم میں مومن نہیں بنے گا جب تک قلب میں میری اتنی محبت نہ ہو کہ اس کو اتنی نہ اپنے ماں باپ سے اور نہ اولاد سے محبت ہو اور نہ کسی اور سے اتنی محبت ہو۔ بغیر حب نبی کے ایمان کامل نہیں ہوتا۔

آثارِ ایمانیہ

علامت اس کی یہ ہے کہ ایک طرف تو ہے اولاد کی محبت، ایک طرف اللہ و رسول ﷺ کی محبت، جب ٹکرا جائیں تو اللہ و رسول ﷺ کی محبت کو اختیار کرے اور اولاد کی محبت چھوڑ دے، یہ علامت ہوگی کہ واقعی محبت رسول ﷺ موجود ہے اگر

آدمی نے اولاد کی محبت کو اختیار کیا اور رسول کی محبت کو چھوڑ دیا تو کہا جائے گا کہ رسول سے محبت نہیں بلکہ اولاد سے محبت ہے تو ٹکراؤ سے پتہ چلتا ہے کہ کون سی محبت غالب ہے، مثلاً آپ لحاف میں آرام سے پڑے ہوئے ہیں بڑی خوشگوار نیند آرہی ہے۔ اچانک موذن نے آواز دی:

حیّ علی الصلوٰۃ. حیّ علی الفلاح.

"دوڑو نماز کی طرف، دوڑو کامیابی کی طرف"۔

آپ نے لبیک نہیں کہا تو کہیں گے کہ نفس کی محبت غالب ہے، اور اگر آرام چھوڑ کر کھڑے ہوئے اور وضو کیا اور مسجد میں گئے نماز پڑھی تو کہیں گے کہ محبت خدا اور رسول غالب ہے۔ تو ٹکراؤ کے وقت ہی آدمی جدھر مائل ہوتا ہے اسی طرف کی محبت کا حکم لگا دیا جاتا ہے۔

تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تم مومن نہیں بن سکتے جب تک میری محبت اولاد، ماں باپ وغیرہ سب کی محبت سے غالب نہ ہو جائے کہ جب ماں باپ کی محبت میری محبت سے ٹکرائے تو مجھے اختیار کرو، ماں باپ کو چھوڑ دو، اور جب میری محبت اولاد کی محبت سے ٹکرا جائے تو مجھے اختیار کرو، اولاد کی محبت کو چھوڑ دو۔۔۔ یہی وجہ ہے حضرات صحابہ کرامؓ میں محبت نبوی اتنی غالب تھی کہ آپ ﷺ نے جب ہجرت فرمائی تو صحابہؓ نے بھی اس محبت کی وجہ سے وطن چھوڑا۔ گھر بار چھوڑا۔ عزیز و اقارب چھوڑے، جائیدادیں چھوڑیں اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ہو لئے مکہ میں ساری تجارتیں ترک کیں اور مدینہ میں غربت کی زندگی اختیار کی ان کو کس چیز نے مجبور کیا؟ یہ اللہ و رسول ﷺ کی محبت ہی تو تھی۔ اس محبت کی وجہ سے عیش و آرام کا سب سامان ترک کیا، مفلس و قلاش ہو کر رہنا گوارہ کیا مگر خدا اور رسول ﷺ کو چھوڑنا گوارہ نہیں کیا۔

مقام صدیقیت حدیث میں ایک واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ غزوہ بدر میں ۳۱۳ صحابیؓ شریک تھے۔ ان میں صدیق اکبرؓ بھی موجود تھے۔ صدیق اکبر کے چھوٹے بیٹے جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے بعد میں وہ ایمان لائے وہ اس غزوہ میں کفار کی طرف سے لڑنے کے لئے آئے تھے ایمان لانے کے بعد ایک روز صدیق اکبرؓ سے عرض کیا کہ ابا جان غزوہ بدر کے موقع پر کئی موقعے ایسے آئے کہ آپ بالکل میری تلوار کی زد پر تھے اگر میں وار کرتا تو آپ بچ نہیں سکتے تھے۔ مگر نے سوچا میرے باپ ہیں کس طرح ان پر حملہ کروں تو میں ایک طرف ہو گیا یہ بات بیٹے نے باپ سے کہی:

"حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ اچھا یہ موقعے آئے ہیں کہ میں اور تو آمنے سامنے آگئے تھے۔ بیٹے نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ مجھے خبر نہ ہوئی اگر تو میری زد پر آتا تو میں سب سے پہلے تجھے قتل کرتا۔ اس واسطے کہ تو دشمن تھا نبی کریم ﷺ کا اور رسول کی محبت کے مقابلے میں اولاد کی محبت کوئی چیز نہیں ہے"۔

غلبۂ محبت

معلوم ہوا ہے کہ ایمان جب کسی کے دل میں گھر کر جاتا ہے اور محبت غالب آجاتی ہے تو اپنے کو اس محبت کے بدلے فروخت کر دیتا ہے۔ پھر محبوب کی ہر ادا سے محبت ہو جاتی ہے اس کے مقابل میں نہ اولاد سے محبت رہتی ہے اور نہ ماں باپ کی محبت کوئی حیثیت رکھتی ہے۔ سب کی محبتیں ختم ہو جاتی ہیں اور ایک ہی محبت غالب آتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے ہجرتیں کیں۔ جائیدادیں چھوڑیں تجارتیں ترک کیں، یہ سب رسول ﷺ کی محبت کا نتیجہ تھا۔ ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہ کی اس لئے کہ رسول کی محبت غالب تھی۔

تو پہلا حق نبی کریم ﷺ کا یہ ہے کہ محبت ہو۔ محبت نہیں تو ایمان نہیں۔ ایمان نہیں تو پھر اسلام ہی نہیں۔ تو بنیادی چیز محبت ہے۔ اسی واسطے محبت پر زور دیا گیا ہے۔ یہی صحابہؓ کا طریق تھا اور یہی بعد میں اہل اللہ کا طریق رہا ہے۔ یہ قاعدے کی بات ہے کہ جس شخص کی محبت غالب ہوتی ہے اس کی ساری ادائیں محبوب بن جاتی ہیں۔ اس کا چلنا پھرنا بھی محبوب بن جاتا ہے اور اس کا لباس بھی محبوب بن جاتا ہے اور اس کا ذکر اور چرچا بھی محبوب بن جاتا ہے۔ فقط محبوب سے ہی محبت نہیں ہوتی بلکہ اس کے نام سے جو چیز منسوب ہو جاتی ہے اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔

کسی نے مجنوں کو دیکھا کہ لیلیٰ کے مکانوں کی اینٹ اینٹ کو چومتا پھر رہا ہے کسی نے کہا۔ احمق! تو یہ کیا کر رہا ہے اینٹوں میں کیا رکھا ہوا ہے اور اینٹوں کو چومنے سے کیا فائدہ ہے؟ اس نے دو شعر میں جواب دیا۔

امرّ علی الدّیار دیار لیلےٰ
اقّبل ذا الجدار وذاالجدارا

کہ میں لیلیٰ کے مکان پر جب گزرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس اینٹ کو چومتا ہوں۔ کبھی اس دہلیز کو چومتا ہوں اور کیوں چومتا ہوں۔

وما حبّ الدّیار شغفن قلبی
ولکن حب من نزل الدیارا

مجھے ان اینٹوں سے محبت نہیں ہے وہ جوان اینٹوں میں بیٹھی ہوئی ہے اس سے محبت ہے اس کی وجہ سے ان اینٹوں سے محبت ہو گئی ہے اس کے کتے سے محبت ہو گئی ہے۔ اس کی بلائیں لینے کو بھی تیار ہوں۔ تو جب محبت ہوتی ہے تو ایک محبوب ہی سے محبت نہیں ہوتی بلکہ جو چیز اس کے نام سے لگ جاتی ہے وہ بھی محبوب بن جاتی ہے۔

چونکہ آپ کو محبت ہے نبی کریم ﷺ سے تو گنبد اخضراء بھی محبوب ہوگا۔ اس کی زیارت کو آپ عبادت سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ایک آنکھ گنبد پر پڑ جائے تو دنیا و آخرت کی سعادت مل

جائے گی۔ وہ کیوں؟ اس لئے کہ گنبد خضرا خود محبوب نہیں بلکہ اس میں جو آرام فرما ہیں اصل میں وہ محبوب ہیں۔ چونکہ اس گنبد پر نام لگ گیا ہے ان کا اس لئے وہ بھی محبوب ہو گیا گنبد تو پھر قریب ہے، مدینہ سے محبت ہے، شہر اء کو دیکھو تو مدینہ تو صرف ایک شہر ہے جیسے ہمارے یہاں شہر ہیں۔ یہ شہر زیادہ خوبصورت ہیں، وہ شہر اتنا خوبصورت بھی نہیں مگر پھر بھی محبت ہے اصل میں محبت ہے اللہ و رسول ﷺ سے اس وجہ سے گنبد خضراء بھی محبوب ہوا۔

اس محبت کی وجہ سے مسجد نبوی ﷺ بھی محبوب ہوئی اسی محبت کی وجہ سے مدینہ بھی محبوب ہوا۔ تو سلسلہ بسلسلہ ہر چیز تک محبت پہنچ جاتی ہے۔

آپ بیت اللہ شریف کی اینٹ اینٹ کو چومتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ بیت اللہ کے مقام پر تجلی ربانی اتری ہوئی ہے۔ اصل میں محبت اللہ سے ہے چونکہ بیت اللہ تعالی کی تجلی گاہ ہے اس لئے اس سے بھی محبث ہوئی ہے اور جب خانہ کعبہ محبوب ہوا تو پوری مسجد حرام بھی محبوب ہو گئی اور اس کی محبت ظاہر ہوئی اس طرح پر کہ آپ اس کی عظمت کرتے ہیں۔ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں جب مسجد حرام محبوب ہوئی تو مکہ محبوب بن گیا کہ وہ شہر پناہ ہے اس مسجد حرام کا 'لہذا وہ شہر بھی محبوب بن گیا۔ اور چونکہ حجاز میں واقع ہے تو ہم حجاز مقدس کہتے ہیں کیونکہ سارے حجاز سے محبت ہو گئی ہے۔ تو حجاز کے جتنے باشندے ہیں ان سب سے محبت ہو گئی۔ یہ پڑوسی ہے اس کا لہذا یہ بھی محبوب ہے تو جب آدمی کے دل میں محبت آتی ہے تو فقط ایک محبوب ہی محبوب نہیں رہتا بلکہ محبوب کی ساری ادائیں محبوب بن جاتی ہیں، چال ڈھال بھی محبوب، لباس بھی محبوب، کھانے کا طرز بھی محبوب، رہن سہن کا طرز بھی محبوب، وہ تمام چیزیں محبوب بن جاتی ہیں جو محبوب کی پسندیدہ اور محبوب ہیں۔

آثارِ محبت

بہر حال یہیں سے اتباع سنت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ یہ محبت کا اثر ہے اگر محبت ہے تو اتباع سنت اختیار کرے گا ورنہ نہیں۔ محبت ہی آمادہ کرتی ہے نبی کریم ﷺ کی سنتوں کی پیروی کرنے پر کہ جس طرح آپ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اسی طرح بیٹھ کر کھانا کھائیے۔ جس طرح آپ آرام فرماتے تھے اسی ڈھنگ سے آرام ہو۔ جس ڈھنگ سے دشمنوں سے برتاؤ کرتے تھے وہی ڈھنگ تم بھی اختیار کرو۔ ان چیزوں سے اتباع سنت کا جذبہ غالب ہو جائے گا۔

اگر محبت نبوی ﷺ کا جذبہ غالب ہے تو بدعات سے نفرت ہو جائے گی سنت کی پیروی سے محبت ہو گی کیونکہ محبوب کی ذات محبوب ہے اور جب ذات محبوب ہے تو ذات کی ادا بھی محبوب ہوں گی۔ آپ کا طرز سلام و کلام بھی محبوب ہو گا۔ ہر چیز محبت کے نیچے آتی چلی گئی اس کا نام اتباع سنت ہے کہ ہر شعبہ میں پیروی ہو سرکار دو عالم ﷺ کی اور آپ ﷺ کے افعال کی اس میں

خیر و برکت ہے حتیٰ کہ معاملات و معاشرت میں بھی جب پیروی کریں گے تو صدیق بن جائیں گے۔

سونے کا مسنون طریق اور قوت ارادی

میں کہتا ہوں۔ مثال کے طور پر ہم سوتے ہیں اس میں بھی ہم آزاد نہیں ہیں پابند ہیں سنت کے کہ اس طرح سے سوئیں جس طرح سے حضور ﷺ سوتے تھے۔ سونا تو ہے لیکن حضور کے طریقے پر سوئیں گے تو عبادت بن جائے گا۔

اور آدمی چار طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر سوئے گا۔ چت لیٹ کر سوئے آیا اوندھا لیٹ کر یا دائیں کروٹ، یا بائیں کروٹ پر سوئے گا۔ بس یہی چار طریقے سونے کے ہیں۔ کوئی الٹا لٹک کر تو سونے سے رہا۔ ان چار طریقوں میں ہم آزاد نہیں بنائے گئے بلکہ پابند ہیں سنت کے۔

اوندھا لیٹنے کو شریعت میں مکروہ سمجھا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ مسجد میں اوندھے لیٹے ہوئے سو رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پیروں سے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اے ابوہریرہ اوندھے لیٹ کر مت سوؤ اس لئے کہ یہ دوزخیوں کی ہیئت ہے کہ ان کو اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ اس لئے مومن کا کام نہیں کہ وہ جہنمیوں کی ہیئت اختیار کرنے اور جہنمیوں سے مشابہت اختیار کرے۔

اور پھر اوندھا لیٹنا صحت کے لئے مضر ہوتا ہے۔ اس سے انتڑیاں الٹ پلٹ ہو جاتی ہیں ممکن ہے کہ کسی انتڑی میں گرہ لگ جائے اور پیٹ میں درد شروع ہو جائے یا کوئی تکلیف ہو جائے اس لئے شریعت نے مکروہ سمجھا ہے۔ اگر سوتے سوتے اوندھا ہو جائے وہ دوسری بات ہے وہ اس کے اختیار سے باہر ہے اپنے ارادے سے آدمی اوندھا نہ لیٹے۔

اب رہ گیا چت لیٹنا تو چت لیٹ کر سونا جائز تو ہے۔ شرعاً ممنوع نہیں حرام نہیں مگر شریعت کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ اس واسطے کہ چت لیٹنا بے قابو ہو جانے کی علامت ہے۔ اور جب آدمی بے بس ہو جاتا ہے تو چت لیٹ جاتا ہے اسی واسطے اگر کوئی پہلوان کسی کو پچھاڑ دے تو کہتے ہیں کہ چاروں شانے چت گرا۔ کوئی نہیں کہتا کہ چاروں شانے پٹ گرا کیونکہ جو پٹ ہوتا ہے وہ اندھا ہوتا ہے اسے کچھ قابو ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو جائے۔ مگر چت لیٹنے والا بالکل بے قابو ہوتا ہے اور مسلمانوں کے لئے ضعیفوں کی ہیئت پسند نہیں کی گئی، مومن کا کام ہے مضبوط ہونا، مومن کا کام بیماروں کی طرح پڑنا نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے:

الموٴمن القوی خیر من الموٴمن الضعیف

قومی مسلمان ضعیف مسلمان سے بہتر ہے؛ قوت ہوگی تو جہاد کرے گا قوت ہوگی تو مجاہدہ کرے گا اور ضعیف بیچارہ چارپائی پر بس پڑا ہوا ہے۔ نہ جہاد کے کام کا نہ جنگ وجدل کے کام کا' نہ مجاہدے کے کام کا کسی کام کا نہیں یہ شریعت نے پسند نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہ پسند کیا ہے کہ ہر معاملہ میں بہادرانہ افعال صادر ہونے چاہئیں۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے:

آدمی مریلوں اور ضعیفوں کی چال نہ چلے بلکہ اس طرح چلے بلکہ اس طرح چلے کہ دیکھنے والا دیکھے کہ اس کے بدن میں کچھ جان ہے؛ کچھ قوت ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب آپ ﷺ گھوڑے پر سوار ہوتے تو رکاب میں پیر رکھ کر سوار نہیں ہوتے تھے کہ یہ بھی ایک قسم کی محتاجگی ہے کہ آدمی بغیر رکاب کے سوار نہ ہو سکے بلکہ کود اور اچھل کر سوار ہوتے تھے تاکہ شجاعت اور بہادری ظاہر ہو۔

بہرحال اسلام نے مومن کے لئے کوئی ایسی حرکت پسند نہیں کی جس سے ضعف ٹپکتا ہو۔ مجبوری ظاہر ہوتی ہے اور چونکہ چت لیٹنا بے قابو ہونے کی علامت ہے۔ ضعیفوں اور بیماروں کی علامت ہے اس لئے جائز تو ہے۔ شریعت نے اس کی ممانعت نہیں کی مگر اس کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔

اب رہ گیا بائیں کروٹ سونا تو مخالفت تو اس کی بھی نہیں؛ جائز ہے مگر پسندیدہ یہ بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی گئی کہ بائیں جانب قلب ہے۔ جب بائیں کروٹ پر سوئے گا تو آدمی کے قلب کو راحت زیادہ ملے گی اور جب راحت زیادہ ملے گی تو نیند گہری آئے گی اور جب نیند گہری آئے گی تو اندیشہ ہے کہ تہجد قضا ہو جائے اور صبح کی نماز بھی قضا ہو جائے۔ اور دوسرے معمولات قضا ہو جائیں۔ اس لئے شریعت نے پسند نہیں کیا کہ آدمی اتنی زیادہ راحت کرے کہ گھوڑے بیچ کر سو جائے اور مردوں سے شرط باندھ کر سو جائے۔ آدمی کو چوکنا ہو کر سونا چاہئے تاکہ جس وقت چاہے آنکھ کھلے ۔ آدمی کا قلب مضبوط ہو۔ راحت میں غرق ہو کر بے قابو نہ بنے۔

اسی واسطے عزم پیدا کیا کہ اگر آدمی سوتے وقت یہ ارادہ کر کے سوئے کہ ہماری آنکھ صبح کو چھ بجے کھلنی چاہئے تاکہ جماعت قضا نہ ہو تو ٹھیک چھ بجے آنکھ کھلے گی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نہ کھلے۔ اٹھنا نہ اٹھنا تو آدمی کے نفس کی بات ہے۔ سستی سے نہ اٹھے مگر آنکھ ضرور کھل جائے گی۔ تو مضبوط عزم و ارادہ ضرور کام کرتا ہے اس کے لئے شریعت نے طریقہ یہ بھی رکھا ہے کہ سورۂ کہف کی جو آخری آیتیں ہیں وہ پڑھ کر سویا کریں اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلاً ... تاآخر سورۃ۔

ان آیتوں کا اثر یہ ہے کہ اگر ان آیتوں کو پڑھ کر ارادہ کرے کہ فلاں وقت اٹھنا ہے تو ضرور آنکھ کھلے گی۔ مگر پہلی چیز عزم اور عزیمت ہے کہ ارادہ کر کے سوئے کہ مجھے اٹھنا ہے اور اگر ارادہ کر کے سوئے کہ مجھے تو سونا ہے چاہے اٹھے نہ اٹھے تو آٹھ بجے سے پہلے آنکھ نہ کھلے گی۔ انسان کے ارادے کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قوت دی ہے انسان کی عزیمت کو بڑی طاقت بخشی ہے۔ ارادے پر ان آیتوں کو بھی پڑھ لے تو زیادہ مدد ہو گی۔

بہرحال شریعت کا منشاء یہ ہے کہ گہری نیند مت سوؤ کہ سارے اذکار ' سارے اعمال ' ساری نمازیں نیند کی نذر ہو جائیں اس لئے شریعت نے پسند نہیں کیا کہ انسان بائیں کروٹ پر سوئے اور گہری نیند سوئے۔

اب دائیں کروٹ رہ جاتی ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ میرا طریقہ ہے اور یہی سارے انبیاء علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے۔ آپ دایاں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر سوتے تھے۔ جب آدمی دائیں کروٹ سوئے گا تو قلب معلق رہے گا اور جب دل لٹک گیا تو زیادہ راحت نہیں ملے گی قلب چوکنا رہے گا۔ ایسی نیند نہیں آئے گی کہ جس میں آدمی غرق ہو جائے اس لئے دائیں کروٹ پر لیٹنے کو آپ ﷺ کی سنت قرار دیا ہے اور دوسری ہیئتوں کو ممنوع قرار تو نہیں فرمایا مگر پسندیدہ نہیں فرمایا کیونکہ دوسری ہیئتوں میں مومن کا مقصد اصلی فوت ہو جاتا ہے۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نماز روزہ تو بجائے خود عبادت ہے مگر عام زندگی میں بھی آپ آزاد نہیں پیدا کئے گئے بلکہ قانون خداوندی کے پابند بنائے گئے ہیں کہ سوؤ تو اسی ہیئت سے سوؤ جس ہیئت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ سوتے تھے کھانے بیٹھو تو اسی ہیئت سے کھاؤ جس ہیئت سے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ جب آپ کوئی کام کریں تو اسی ہیئت سے کریں جس ہیئت سے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ اس کام کو کرتے تھے۔

اِبتدا بالتیمن

چنانچہ آپ ﷺ کی عادت کریمہ تھی جیسے کہ روایت میں ہے:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يحب التيمّن

آپ ﷺ اچھے کاموں میں ہمیشہ دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے۔ اگر کنگھا کرتے تو پہلے دائیں جانب پھر بائیں جانب ' اگر جوتا پہنتے تو پہلے دائیں پیر میں پھر بائیں پیر میں اگر کرتہ پہنتے تو پہلے آستین میں دایاں ہاتھ ڈالتے پھر بایاں۔ دانتوں میں اگر مسواک کرتے تو پہلے دائیں جانب لے جاتے پھر بائیں جانب۔ ہر اچھی چیز میں آپ ﷺ دائیں جانب کو پہلے اختیار فرماتے تھے۔ یہی کام مومن کا ہونا چاہئے کہ ہر اچھے کام میں دائیں جانب کو پہلے اختیار کرے گا۔ اگر آپ ﷺ کی مجلس

مبارک میں کوئی چیز آتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تقسیم فرماتے تو دائیں جانب سے شروع فرماتے۔ دائیں جانب تقسیم فرما کر پھر بائیں جانب متوجہ ہوتے۔۔۔۔ اور ہر بری اور خسیس ترین شئے بتداء بائیں جانب سے فرماتے ناک صاف کرتے تو بایاں ہاتھ استعمال کرتے استنجا کرتے تو بایاں ہاتھ استعمال کرتے۔ یہ سنت اگر آپ سنت پر عمل کریں تو آپ کی ساری دنیا دین بن جائے گی یہ کھانا پینا' رہنا سہنا اتباع سنت کی وجہ سے دین بنتا چلا جائے گا۔ اور اتباع سنت کب ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے محبت کے غلبے کی وجہ سے اگر محبت غالب نہ ہو تو آدمی کبھی بھی اتباع سنت نہ کرے بس یہ سوچے گا کہ مطلب نکل جانا چاہئے کہاں کی محبت اور کہاں کا اتباع محبت غالب رہے گی تو قدم قدم پر خیال رہے گا۔

معیار عقل

حضرت تھانویؒ کے ایک خلیفہ تھے وہ سہارنپور سے سوار ہوئے۔ جانا تھا ان کو کانپور' پہلے سہارنپور کے گنے بہت مشہور تھے۔ اب وہ گنا نہیں ہوتا وہ گنے بہت ملائم۔ بہت میٹھے اور بڑے ہی عمدہ ہوتے تھے' تحفے کے طور پر لوگ بہت دور دور تک لے جاتے تھے تو انہوں نے بھی گنے خریدے کہ کانپور جا کر احباب میں تحفے کے طور پر تقسیم کردوں گا۔ مگر گنوں کا وزن چالیس سیر سے بھی زیادہ تھا اور ایک ٹکٹ سے اتنا وزن نہیں لے جاسکتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ زائد محصول دے دوں گا۔ بابو سے انہوں نے ذکر کیا تو بابو نے ایک نیک صورت دیکھ کر کہ بھولا بھالا ہے۔ بڑا مقدس آدمی ہے' کہا کہ آپ لے جائیں۔ کوئی محصول وغیرہ نہیں ہے۔ گویا اس نے اپنے نزدیک بڑی عقیدت سے کام لیا کہ نیک صالح آدمی ہے کیا اس سے پیسے لئے جاویں۔ اس نے کہا کہ معاف ہے آپ لے جائیں۔

انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! آپ محصول لے لیں اگر ریل میں چیکر آگیا تو محصول بھی لے گا اور جرمانہ الگ وصول کرے گا۔ وہاں ڈبل دینا پڑے گا۔ اس نے کہا کہ ہم چیکر سے کہدیں گے وہ بھی آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! جب میں غازی آباد اسٹیشن پر دوسری گاڑی بدلوں گا تو دوسرا چیکر آئے گا وہ جرمانہ وصول کرے گا۔ مال زیادہ ہے ٹکٹ میں اتنی گنجائش نہیں۔ سفر جتنا زیادہ لمبا ہوگا اتنا ہی جرمانہ بھی ہوگا تو وہاں مجھے چوگنا دینا پڑے گا۔ آپ مجھ سے یہیں لے لیں اس نے کہا کہ ہم چیکر سے کہدیں گے وہ اس چیکر سے کہ دے گا۔ وہ آپ کو کچھ نہ کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا جب میں کانپور میں اتروں گا اور گیٹ سے پاس ہوں گا تو وہ گیٹ بابو کہے گا کہ بلٹی (BUILETY)؟ وہ میرے پاس ہوگی نہیں وہ مجھ سے چوگنے وصول کرے گا اتنے میری جیب میں ہوں گے بھی نہیں۔ اس بابو نے کہا کہ اس چیکر سے کہلوادیں گے وہ اس گیٹ بابو

سے کہدیں گے وہ آپ کو کچھ نہیں کہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ پھر کیا ہو گا؟ بابو نے کہا پھر تمہارا گھر آجائے گا۔ انہوں نے کہا کہ گھر تو گر جائے گا۔

مگر خداوند عالم نے اگر یوں پوچھ لیا کہ ریلوے کی چوری کیوں کی تھی تو میں کیا جواب دوں گا۔ تو اب وہ بے چارہ خاموش ہوا اس بابو نے کہا کہ یہ بیچارہ مجنوں معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہے اس کو مجنوں ہی کہتے ہیں۔

اہل دنیا عقلمند اس کو کہتے ہیں جو بے ایمانی زیادہ کرے، چالاکیاں زیادہ کرے، دھوکہ زیادہ دے اسے کہتے ہیں کہ بڑا بھائی دانشمند ہے۔ اور اگر بے چارہ بھولا بھالا سیدھا ایمانداری اور امانتداری سے پیش آئے اسے کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔ پہلے زمانہ کی روح اس میں آگئی ہے مگر حقیقت میں عقلمند وہی ہے جو اپنی آخرت کو پیش نظر رکھے۔ وہ عقلمند نہیں جو انجام کو بھلا دے اور بعد میں مصیبتیں اٹھائے جس کو مولانا رومیؒ نے کہا ہے کہ ؎

اوست دیولنہ کہ دیوانہ نہ شدٗ

اوست فرزانہ کہ فزانہ نہ شدٗ

دیوانہ وہی ہے جو کہ دیوانہ نہ بنا اور عقلمند، وہ ہے جو عقلمند بننا نہیں چاہتا۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیوانگی ہی چاہتا ہے۔ حقیقت میں دانشمندی وہی ہے جو شخص اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کا نام زیادہ لے گا وہی لقب پائے گا مجنونوں کا خبطیوں کا۔ اور جو شخص چالاکیاں زیادہ کرے گا وہ لقب پائے گا اہل دنیا کے نزدیک دانشمند اور عقلمند ہونے کا۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

يُقال للرّجال ما اعقلهٗ وما اظرفهٗ وما اجلدهٗ وليس فى قلبه مثقال ذرّة من الا يمان.

"ایک آدمی کو کہا جائے گا کہ کتنا بڑا دانشمند ہے اور کتنا بڑا عقلمند ہے اور یا وسیع الظرف ہے اور کیسا دانا ہے اور کیسا مدبر ہے حالانکہ اس کے قلب میں ذرہ برابر ایمان نہ ہوگا"۔

اور دنیا کہے گی کہ بڑا عقلمند ہے بڑا دانش مند ہے، مگر چونکہ اس میں ایمان کا نشان بھی نہ ہوگا جو کچھ ہوگی وہ خود غرضی ہوگی۔ دنیاداری اور دنیا سازی ہوگی اس لئے وہ عقلمند نہیں ہے۔۔۔ شریعت اسے عقلمند کہتی ہے جو اپنے انجام کو سوچے اور دنیا کے بارے میں خیال کرے کہ بھلی بری جیسی بھی ہوگی گزر جائے گی، وہاں جو مصیبت ہے وہ ابدی ہے وہ ہمیشہ جھیلنی پڑے گی جو کہ قابل برداشت نہیں ہے نہ یہاں کی مصیبت باقی رہنے والی ہے اور نہ یہاں کی نعمت باقی رہنے والی ہے۔ اس لئے جو آدمی

آخرت کے مصائب کی رعایت کر کے دنیا کے مصائب کا تحمل کرے وہ عقلمند ہے۔ فرمایا گیا:

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى۔

"آخرت کا عذاب ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور شدید ہے"۔

اور یہاں کی مصیبت نہ شدید ہے اور نہ دیر تک باقی رہنے والی ہے۔

راستے کا رنج وراحت اور منزلِ مقصود

اکبرؒ نے کیا خوب کہی ہے اور بڑی عمدہ بات کہی ہے لقب ہی اس کا لسان العصر ہے۔ اس بناء پر ان کی بات بڑی حکمت کی بات ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ؂

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

یہ کام تمہیں بھی کرنا ہے اور مجھے بھی کرنا ہے اور سب کو کرنا ہے کیونکہ سب ہی کو جینا اور مرنا ہے۔ آگے کہتا ہے ؂

رہ گئی بحث رنج و راحت کی
وہ فقط وقت، کا گزرنا ہے

رنج بھی گزر جائے گا اور راحت بھی گزر جائے گی بڑی ہی حکیمانہ بات کہی ہے کہ راستہ کے رنج وراحت پر نظر مت رکھو اور انجام پر نظر رکھو۔ منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اگر منزل پر پہنچ کر مصیبت میں مبتلا رہے تو وہ ناقابل برداشت ہے۔ تو اکبرؒ نے کہا ہے کہ راستے کا رنج وراحت فقط وقت کے گزر جانے کا نام ہے۔

یہاں میرے دل میں ایک خلجان یہ پیدا ہوا کہ بات تو بڑی حکیمانہ کہی ہے راستے کے رنج و راحت کا خیال مت کرو مگر منزل مقصود نہیں بتلائی کہ جانا کہاں ہے۔ اسی بناء پر دو تین شعر میں نے اس میں جوڑ دیئے ہیں اپنی طرف سے سے اکبر نے راستہ کا پتہ دیا ہے، میں منزل کا پتہ بتادیتا ہوں میں کوئی شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر کہنا میرا مشغلہ ہے، پھر اکبر جیسا شاعر اور اس کے شعر میں اپنا شعر بلانا ایسا ہے جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگادیں۔ بس ایک تک بندی ہے جو میں نے کردی ہے اور میں نے اکبر کے اشعار پر اضافہ کردیا ہے۔ تو دو ان میں راستے ہی کے بارے میں ہیں ان میں ایک آخری منزل کے بارے میں۔ اکبرؒ نے تو کہا ہے کہ ؂

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

رہ گئی بحث رنج و راحت کی
وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں ۔

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا
یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

یعنی عزت ہم کہتے ہیں یہ فقط خیالی شئے ہے اور خیال بھی دوسرے کا۔ اگر ہمارے خیال سے ہماری عزت ہو تو چوبیس گھنٹے ہم خیال کئے بیٹھے رہیں کہ ہم سے بڑا کوئی نہیں۔ اگر خیال بدل گیا بس جب ہی ذلیل ہو گئے۔ آج خیال یہ ہے کہ فلاں آدمی بہت بڑا ہے اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیتے ہیں لیڈر بن جاتے ہیں اور کل کو خیال بدل گیا تو دوسرے کے گلے میں ڈال دیا۔ پہلے کی ساری عزت ختم ہو گئی۔ بس ذلیل ہو گیا یہ صرف خیالی عزت ہے۔

اصل عزت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو۔ حق تعالیٰ نے فرمایا:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ

تو اصل عزت یہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مہر ثبت کر دی ہے' اس لئے میں نے کہا کہ ۔

رہ گیا عز و جاں کا جھگڑا
یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

اور میں آگے کہتا ہوں ۔

قابلِ ذکر ہی نہیں خورد و نوش
یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے

کھانا پینا یہ کوئی قابل ذکر نہیں اس لئے کہ یہ کوئی کمال کی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ چوپائے بھی کھاتے پیتے ہیں اگر آدمی نے کھا لیا تو کونسا کمال کیا ہے۔ جانور کی حد سے نہیں نکلے گا۔ وہ بھی کھاتے ہیں تو کھانا کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ بہر حال تین چیزیں ہو گئیں اکبر نے کہا تھا کہ راستے کے رنج و راحت کی پرواہ مت کرو' یہ گزر جانے والی ہے' میں کہتا ہوں کہ کھانے پینے کا خیال مت کرو یہ تو جانوروں کی علامت ہے' نہ عزت و ذلت کا خیال کرو کیونکہ وہ خیالی شے ہے بلکہ منزل مقصود تک پہنچنے کا ارادہ کرو اور کوشش کرو۔ آخری شعر میں اسی کا پتہ دیا ہے ۔

مقصدِ زندگی ہے طاعتِ حق
نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

مدارِ نجات

اصل مقصد اطاعتِ خداوندی ہے یہ مل گیا تو سب کچھ مل گیا اگر محنت کر کے دنیا کا جغرافیہ یاد کر لیا اور اس پر عبور بھی ہو گیا کہ بنگلور میں اتنے درخت ہیں، فلاں شہر ایسا ہے، آخرت میں ایک بھی نہ پوچھا جائے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کونسی سنت پر عمل کیا۔ علم دین کیا سیکھا تو آپ کہیں کہ حضور! عبادت تو نہیں کی البتہ دنیا کا جغرافیہ لے کر آیا ہوں یہ کام نہیں دے گا کیونکہ اس سے نجات نہ ہو سکے آپ کہیں گے کہ معلوم کر کے آیا ہوں کہ دنیا میں اتنے پہاڑ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تمہیں دنیا میں پہاڑ گننے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ تم کو طاعت و عبادت کے لئے بھیجا تھا۔ قانونِ خداوندی کی پابندی کے لئے بھیجا گیا تھا وہ بتاؤ کتنی کی ہے۔ نجات کا مدار اسی پر ہے نہ جغرافیہ پر نہ سائنس پر نہ جدید تعلیم پر اس آخری شعر میں مقصد زندگی اور منزل کا پتہ دیا گیا ہے۔

محبت کی تلخیاں

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اصل چیز محبت ہے پھر محبت سے ایمان بنتا ہے پھر اس ایمان ہی کی وجہ سے اعمال ہاتھ پیر پر آتے ہیں اور انسان کی زندگی بنتی ہے۔ محبت سے ہی سارا کام چلتا ہے۔ آدمی اس محبت میں مصائب بھی جھیلتا ہے۔ تکلیفیں بھی اٹھاتا ہے، مگر اللہ و رسول ﷺ کی محبت غالب ہے تو پرواہ بھی نہیں ہوتی کسی چیز کی۔ اہل اللہ جیل خانے میں بھی گئے مگر انہیں پرواہ نہیں ہوئی کیونکہ تعلق مع اللہ قوی ہے۔ فقر و فاقہ آیا مگر انہیں پرواہ تک بھی نہیں اس لئے کہ دل میں تعلق موجود ہے۔ قلب مطمئن ہے اور اگر دل کا تعلق اللہ سے نہ ہو تو انسان ہمیشہ ڈانواں ڈول رہے گا۔ ہمیشہ اس پریشانی اور پراگندگی و تشتت میں ہی رہے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کا سکون صرف اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہے۔ کسی اور چیز میں نہیں۔

کروڑوں کا مالک ہو اس کو بھی سکون نہیں ملے گا۔ بلکہ قلب بے سکون، غیر مطمئن، پریشان، پراگندہ ہی رہے گا کہ اس کی حفاظت کیسے کروں اسے ڈاکو نہ لے جائیں کہیں پہریدار ہیں۔ کہیں چپراسی ہیں کہ چوروں سے حفاظت کرتے ہیں مگر قانونی چوری بھی تو ہوتی ہے اس سے کیسے حفاظت کرے گا؟

بہت سے لوگ قانون کے دائرے میں رہ کر چوری کرتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالتے ہیں مثلاً کہیں فیس کی شکل میں رقم وکلاء کے پاس جا رہی ہے۔ کہیں بیرسٹروں کے پاس جا رہی ہے۔ کہیں ڈاکٹروں کے پاس جا رہی ہے۔ غرض روپیہ کیا ایک وبال جان بنا ہوا ہے ہر وقت پریشانی ہی پریشانی ہے۔ نہ اس سے سکون ملتا ہے نہ بلڈنگ سے سکون ملتا ہے اگر سکون ملتا ہے تو صرف اللہ کے نام میں ملتا ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

"اللہ ہی کے ذکر سے دل چین پاتے ہیں"۔

دنیا کے ذکر سے چین نہیں ملتا وہ تو استعمال کی چیز ہے اسے کھاؤ پیو' استعمال کرو مگر مقصود مت بناؤ۔ اس سے محبت مت کرو۔ اس میں دل مت لگاؤ اس کو جائز طریق پر استعمال کرو۔ اچھا کھانا بھی کھاؤ۔ اچھے مکان میں بھی رہو۔ مگر مکان کو خدا مت سمجھو۔ لباس کو کعبہ مت بناؤ' خادم سمجھو' محبت کے لئے اللہ و رسول علیہ السلام کی ذات کو اختیار کرو۔ ہماری زندگی یہ ہے "کہ دل بیار دست بکار"

ہاتھ اور پاؤں کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اور دل لگا ہوا ہے خالق و مالک کے اندر کہ دنیا میں رہو تجارت بھی کرو' زراعت بھی کرو۔ جب تک انسان دنیا میں رہے گا سب ہی کام کرے گا اور کرنے بھی چاہئیں مگر دل کی توجہ اللہ کی طرف رہنی چاہئے اس سے تجارت بھی بابرکت بنے گی۔ سب چیزیں عبادت بنتی چلی جاویں گی۔

تو اصل چیز ہے قانون کی پیروی اور وہ ہو نہیں سکتی جب تک محبت نہ ہو۔ تو محبت اصل ایمان اور اصل اسلام ہے اور ۔

در محبت تلخہا شیریں بود

یعنی محبت میں تلخیاں بھی شیریں بن جاتی ہیں کیونکہ آدمی کا دھیان محبوب کی طرف رہتا ہے تلخیوں کی طرف نہیں رہتا اس لئے وہ شیریں ہو جاتی ہیں۔ اور محبوب کی ہر ادا محبوب بن جاتی ہے۔

غلبۂ ادب

ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ جو ہماری ساری جماعت دیوبند کے شیخ طریقت ہیں اکابر اولیاء میں سے ہیں سن ۱۸۵۷ء میں انہوں نے جہاد کیا ہے پھر حضرت نے مکہ معظمہ کی طرف ہجرت فرمائی وہیں ان کی وفات ہوئی۔ مکہ معظمہ میں پہنچ کر پوری عمر کبھی سیاہ جوتا نہیں پہنا۔ لوگوں نے شروع شروع میں تو اتفاقی بات سمجھا مگر جب کالے رنگ کا جوتہ لاتے تو ان سے فرماتے کہ دوسرے رنگ کا لاؤ یا سفید لاؤ یہ جوتا نہیں پہنوں گا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ حضرت کا طریقہ ہے تو پوچھا کہ حضرت! سیاہ جوتے میں کیا حرج ہے۔ فرمایا کہ بیت اللہ شریف کا غلاف سیاہ ہے ادب مانع ہوتا ہے کہ وہ رنگ میں اپنے پیروں میں استعمال کروں' حالانکہ سیاہ جوتا پہننا شرعاً جائز ہے کوئی قباحت و نقصان نہیں ہے مگر چونکہ ادب کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو آدمی بعض جائز چیزوں کو بھی ترک دیتا ہے کیونکہ اس جائز چیز کے استعمال کرنے میں ادب مانع ہوتا ہے۔ جیسے حضرت نے فرمایا کہ مجھے حیا آتی ہے۔ ہے کہ وہ رنگ جو بیت اللہ کے غلاف کا ہے اس کو پاؤں میں ڈالوں۔

تو ظاہر بات ہے کہ جائز و ناجائز کی بحث نہیں یہ تو محبت کا غلبہ ہے چونکہ محبت خداوندی اتنی

غالب تھی اسی کے مطابق محبت کعبہ بھی اسی قدر غالب تھی کہ اس رنگ کو پاؤں میں لانا گوارہ نہ کیا۔ کیا ادب کی انتہاء تھی۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ بانی دار العلوم دیو بند کلیر شریف جاتے تھے۔ حضرت صابر کلیریؒ کے مزار کی زیارت کرنے کے واسطے۔ کلیر، رڑکی سے پانچ میل دور ہے نہر کی پٹری پٹری پر چلے جاتے تھے۔ اب تو سواری کا بھی انتظام ہے اس زمانے میں لوگ عموماً پیدل ہی جاتے تھے، تو حضرت جب نہر کی پٹری پر جاتے اور سامنے کلیر ہوتا تو جوتے اتار کر بغل میں دبا لیتے اور ننگے پیروں جاتے۔ تو کیا جوتے پہن کر جانا ناجائز تھا۔۔۔؟ نہیں بلکہ محبت کا غلبہ تھا۔ حضرت صابر کلیریؒ کی محبت دل میں جاگزیں تھی۔ ادب کا غلبہ تھا۔ جب روضہ نظر آتا تھا تو جوتا پہن کر جانا پسند نہیں کرتے تھے ننگے پیروں جاتے تھے۔ چونکہ ادب کا غلبہ تھا۔ اور ادب غالب ہوتا ہے محبت کے غلبہ سے۔

جب حضرت نانوتویؒ نے حج کیا تو بڑے بڑے اکابر ساتھ تھے۔ مثلاً حضرت گنگوہیؒ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ اور دوسرے بڑے بڑے اکابر اور بزرگوں کا ایک مجمع تھا۔ آخری منزل جس کے بعد مدینہ طیبہ بالکل سامنے آجاتا ہے اور حرم شریف کے مینارے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس آخری منزل کا نام ہے "بیرٔ علی" یہاں ایک پہاڑی ہے جہاں اس پر چڑھے اور حرم شریف کے مینارے سامنے آجاتے ہیں۔ تو یہ قافلہ جب "بیرٔ علی" پر پہنچا اور حرم شریف کے مینارے سامنے نظر پڑے تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ایک دم اونٹ سے اچھل کر کر زمین پر گر پڑے جوتے اتار کر رکھے اونٹ کے کجاوے میں اور ننگے پیر چلنا شروع کیا، حضور ﷺ کی محبت غالب تھی اس لئے عاشقانہ اشعار پڑھتے ہوئے اور اپنے حال میں مست اور ننگے سر چلے جا رہے تھے۔ عرب کی کنکریاں جو ہیں وہ نوکیلی ہیں۔ پیروں میں ایسے چبھتی ہیں جیسے کانٹے چبھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے پاؤں لہولہان ہو گئے۔ مگر حضرت محبت و عشق کی وجہ سے اپنے حال میں مست ہیں۔

دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی اونٹوں سے اتر کر پیدل چلنا شروع کر دیا تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ یہ احمق کیوں نیچے اتر کر چلنے لگے ان پر تو محبت اور عشق کی وجہ سے حال طاری ہے۔ یہ نقالی کہاں تک کریں گے۔ اس لئے کوئی بیس قدم پر چل کر رک گیا۔ کوئی سو قدم چل کر رک گیا کیونکہ ان کنکریوں پر چلنا مشکل ہے مگر جو اپنے حال میں مست ہے وہ معذور ہے اسے تو کچھ خبر نہیں رہتی چاہے اس پر تیر پڑیں چاہے تلواریں پڑیں۔ لیکن جن کے ہوش و حواس باقی ہیں وہ اس طریقے سے چلیں وہ پورے نہیں اتر سکتے۔ اسی لئے کوئی پچاس قدم چل کر بیٹھ گیا۔ اور کوئی سو قدم چل کر بیٹھ گیا اور حضرتؒ حرم تک پیدل چلے اور پیروں میں کنکریاں چبھ چبھ کر لہولہان اور خون

خون بھی ہو گئے تو۔۔۔۔ در محبت تلخہا شیریں بود۔ یعنی محبت کی وجہ سے تلخیاں بھی شیریں ہو جاتی ہیں اور آدمی ان کو بخوشی جھیل لیتا ہے۔

اِستغراقِ محبت غزوۂ اُحد میں جنگ شروع ہوئی۔ اُحد کے پہاڑ کی ایک گھاٹی تھی۔ حضور ﷺ نے اس پر چالیس تیر اندازوں کو مقرر کیا اور حکم دیا کہ وہ یہاں بیٹھے رہیں فتح ہو خواہ شکست ہو۔ ہر صورت میں وہاں سے بغیر اجازت نہ ہٹیں۔ چنانچہ صحابہؓ وہاں بیٹھے رہے، جنگ شروع ہو گئی۔ ان حضرات نے سوچا کہ ہم خالی بیٹھے ہیں کچھ کام ہی کر لیں، دوسرے حضرات نے کہا ﷺ کا یہ حکم ہے کہ صرف بیٹھے رہیں۔ بعض نے کہا کہ ایسے بیٹھنے سے تو عبادت میں لگنا اچھا ہو گا۔ یہ سوچ کر نفلوں کی نیت باندھ لی اور نفلیں پڑھنا شروع کر دیں ترکیب یہ کی کہ چار نفلیں پڑھیں اور باقی حفاظت کریں۔ اسی طریقے سے رات گزاری اور نوافل پڑھتے رہے۔

مشرکین مکہ نے تاک لیا کہ یہ صحابہؓ بیٹھے ہوئے ہیں کفار نے ان پر تیروں کی بارش کی، جو لوگ نماز میں مصروف تھے وہ سامنے تھے اسی لئے کسی کی گردن میں لگا کسی کے سینے میں لگا اور کسی کی پیٹھ میں لگا بدن لہولہان ہو گئے اور کپڑے خون میں رنگ گئے مگر ان کو کچھ خبر نہیں وہ اپنی نماز میں مستغرق ہیں۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی تیر یہاں گھسا ہوا ہے۔ کوئی تیر سینے میں۔ کوئی تیر پشت میں پورا بدن چھلنی ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ نے تیر مارے ہیں۔

اتنا استغراق اور غلبہ تھا محبت کا نہ انہیں تیر کا پتا چلا اور نہ انہیں نیزوں کا پتہ چلا نماز کا غلبہ ہوتا ہے پھر نہ زخم کی پرواہ نہ تلواروں کی نہ نیزوں کی پرواہ ہوتی ہے یہی شان اہل اللہ کی بھی ہوتی ہے کہ جب محبت خداوندی اور محبت نبوی ﷺ غالب آجاتی ہے تو نہ عیش کی پرواہ نہ آرام وراحت کی پرواہ ساری چیزوں کو تج دیتے ہیں۔

ظرفِ محبت چنانچہ میں نے عرض کیا تھا کہ بنیادی چیز محبت ہے اور محبت کا ظرف دل ہے جب دل میں اللہ و رسول ﷺ کی محبت آجائے گی تو ہاتھ پاؤں پر بھی اس کے اثرات ظاہر ہوں گے اور اعمالِ صالحہ بھی صادر ہوں گے اور اگر دل میں محبت نہیں تو نہ ایمان بنے گا اور نہ اعمال بنیں گے۔ مسلم نام کے تو ہوں گے مگر کام اسلام کے نہیں ہوں گے۔ جب دل میں ایمان ہو گا جب ہی کام اسلام کا ہو گا۔ اس لئے ہمیں نام کا مسلمان نہیں ہونا چاہئے، دل میں محبت رچی ہو اور ہاتھ پیر پر عمل ہو یہی عمل شہادت دے گا ایمان ایک چیز ہے جو اندر چھپی ہوئی ہے۔

دعویٰ محبت کا ثبوت

جب قیامت میں آدمی اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کرے گا تو اس سے دلیل طلب کی جائے گی کیونکہ کوئی دعویٰ بلا دلیل کے قابل سماعت ہوتا نہیں۔ اس بنا پر اس سے پوچھا جائے گا کہ تیرے ایمان کا ثبوت کیا ہے وہ کہے گا کہ میں نے نمازیں پڑھی ہیں روزے رکھے ہیں۔ زکوٰۃ دی ہے حج کئے ہیں یہ ثبوت ہوگا ایمان کا پھر اسے نجات ہو گئی۔ مگر آپ نے اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کیا اور دلیل طلب کی گئی مگر وہاں نہ نماز ہے نہ روزہ ہے نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے۔ تو یہ دعویٰ بغیر دلیل کے رہ جائے گا وہاں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ اس کی گردن ناپی جائے گی اور اس کے دعوے کی تکذیب کی جائے گی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تمہارے اندر ایمان کہاں ہے اگر ایمان ہوتا تو اس کے آثار ہاتھ پیر پر ظاہر ہوتے، حالانکہ کوئی اثر ظاہر نہیں اس لئے کہ اندر کچھ نہیں۔ لہذا انتہائی ذلیل ہوگا اور کہا جائے گا کہ اپنے کئے کو بھگتو۔ پھر وہاں کی سزائیں دی جائیں گی۔ مصیبتوں میں مبتلا کیا جائے گا۔ اس لئے جب دعویٰ ہو تو اس کی دلیل بھی مہیا ہونی چاہئے۔

طاعت، عبادت، اتباع سنت حضور کی پیروی ہونی چاہئے۔ آگے قبول کرنا نہ کرنا مالک کا کام ہے مگر ہمیں ثبوت مہیا کر دینا چاہئے اور اس ثبوت پر ناز نہ ہو کہ میں نے اتنی عبادت کی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

بڑوں کی بڑی بات

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمتہ اللہ علیہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد ماجد اولیاء کبار میں سے ہیں وہ رات دن طاعت و عبادت میں لگے رہتے ہیں لوگوں نے ان سے عرض کی کہ حضرت آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں کہ راتوں کو ذکر اللہ دن بھر ذکر اللہ۔ کیوں اتنی محنت کر رہے ہیں؟

جب ہم نے یہ سوال پڑھا تو ہم یہ سمجھے کہ حضرت۔ نے یہ جواب دیا ہوگا کہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے تاکہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں اس لئے میں یہ عمل کر رہا ہوں مگر یہ جواب نہیں دیا بلکہ جواب اور ہے۔ یہ تو ہمارے فہم کی رسائی تھی حضرتؒ نے وہ جواب دیا جو ہماری فہم سے بالاتر ہے اور اپنے مرتبے کے مطابق جواب دیا کیونکہ بڑوں کی بات ہی ہوتی ہے۔ حضرتؒ نے ان پوچھنے والوں کو جواب دیا کہ میں رات دن اس لئے عمل کرتا ہوں کہ میں پیدا ہی کیا گیا ہوں عمل کرنے کی خاطر۔ یعنی مقصد زندگی ہی میرا یہ ہے، راضی ہونا نہ ہونا ان کا کام ہے۔

راضی ہونا یا ناراض ہونا یہ فعلِ خداوندی ہے۔ ہم کون ہیں ان کے فعل میں دخل دینے والے۔ ہمارا کام تو ہونا چاہئے جس کے لئے ہم پیدا کئے ہیں اور ہم پیدا کئے گئے ہیں طاعت و عبادت

کے لئے بس ہم اپنا کام کئے جائیں۔ اگر وہ راضی ہوں تو ان کا فضل ہے اگر وہ ناراض ہوں تو ہمارا عمل اس قابل نہیں کہ اس سے فریادی ہوں۔ تم اللہ تعالیٰ کے کاموں میں دخل مت دو۔ صرف اپنا کام کرتے رہو ۔

کار خود کن کارِ بیگانہ مکن

اپنے کاموں میں لگے رہو قبول کرنا نہ کرنا اس کا کام ہے۔

محبت آمیز عمل

یحییٰ بن اکثم بہت بڑے عالم گزرے ہیں امام کے درجے کے عالم ہیں ان کی وفات ہوئی تو بعض اہل اللہ نے انہیں خواب میں دیکھا اور خواب بھی کشف جیسا تھا۔ یہ دیکھا کہ ان کی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوئی ہے۔

”حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے یحییٰ! کیا چیز لے کر آئے ہو ہمارے لئے؟ جواب دیا کہ اے اللہ تعالیٰ میں نے پچپن ۵۵ حج کئے ہیں۔ فرمایا ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ انہوں نے کہا باری تعالیٰ میں نے ایک سو باون ۱۵۲ قرآن ختم کئے ہیں۔ فرمایا ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ پوری زندگی کے اعمال ذکر کئے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک بھی قبول نہیں۔ اور بتاؤ کیا لے کر آئے ہو۔ آپ عاجز ہو گئے۔ آخر میں کہا کہ اے اللہ! بس تری رحمت کا سہارا لے کر آیا ہوں اور کچھ لے کر نہیں آیا۔ فرمایا کہ اب بات تو نے ٹھیک کہی ہے۔ وَجَبَتْ لَكَ رَحْمَتِیْ میری رحمت تیرے لئے واجب ہو گئی ہے جا تیرے لئے جنت اور مغفرت ہے“

تو اس عمل کے ساتھ ساتھ رضاء خداوندی اور رحمت خداوندی کی توقع اور امید بھی ہوتی چاہئے اعمال پر گھمنڈ اور ناز نہیں ہونا چاہئے جس عمل میں محبت کی آمیزش اور رحمت کی امید نہ ہو وہ عمل قابل قبول نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اصل چیز محبت ہے پھر اس کے بعد عمل کا مرتبہ ہے۔ اور اس محبت سے ہی عمل پیدا ہوتا ہے عمل ہی محبت کی علامت ہے جس سے معلوم ہوا جاتا ہے کہ دل میں محبت ہے یا نہیں۔

دوام معیّتِ نبوی کی بشارت

آپ ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:

من احبّنی فقد اطاعنی ومن اطاعنی کان معی فی الجنّة

”جو مجھ سے محبت کرے گا وہ میری اطاعت بھی کرے گا اور میری سنتوں کی پیروی بھی کرے گا اور جو میری سنتوں کی پیروی کرے گا وہ میرے ساتھ بھی

جنت میں وہ میرے سے الگ نہیں رہے گا"۔

آپ ﷺ نے بنیاد قرار دیا ہے محبت کو۔۔۔ کہ مجھ سے محبت کرنا علامت ہے اس بات کی کہ وہ میری اطاعت کر رہا ہے اور میری اطاعت کرنا علامت ہے اس بات کی ہے وہ جنت میں میرا رفیق ہو گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے مگر محبت پہچاننے کی علامت اطاعت اور اتباعِ سنت ہے جب یہ ہو گی تو معلوم ہو گا کہ محبت میں سچا ہے۔اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا:

لا یؤمن احد کم حتیٰ اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین۔

" تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مومن کامل نہیں بن سکتا جب تک کہ میری اس آدمی کو اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی اس کی نہ اپنے ماں باپ سے ہو' نہ اپنی اولاد سے ہو'نہ اپنے سامان سے ہو' نہ اتنی محبت اس کو اپنے عزیز و اقارب سے ہو"۔

جب دو محبتوں کا ٹکراؤ ہو تو ترجیح دے میری محبت کو' تو کہا جائے گا کہ یہ مومنِ کامل ہے کہ اصل شے محبت ہی ہے۔

محبت و خواہش کا ٹکراؤ!

ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

لا یومن احد کم حتیٰ یکون ھواہ تبعا لما جئتُ بہٖ.

"کہ تم میں سے کوئی شخص مومن کامل نہیں بن سکتا اس وقت تک جب تک کہ اس کی خواہشات نفس میرے لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں"۔

ایک طرف شریعت ہے اور ایک طرف خواہش نفس ہے۔اگر خواہش نفس کو ترجیح دی تو معلوم ہوا کہ خواہش کا بندہ ہے۔اللہ تعالیٰ کا بندہ نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی مرضی کو ترجیح دی اللہ تعالیٰ کی مرضی پر اس لئے یہ خواہشات نفس اور ہوائے نفس کا تابع ہے اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی کا تابع ہوتا تو اسی کو ترجیح دیتا۔اسی لئے فرمایا کہ وہ مومن کامل نہیں۔حضور ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کا تابع ہونا چاہئے۔جو کچھ کرے اتباع میں کرے' نماز پڑھے تو اتباع میں پڑھے روزہ رکھے تو اتباع سے۔ سوئے تو اتباع سے۔جاگے تو اتباع سے۔کھائے پیئے تو اتباع میں۔

غرض یہ کہ پوری زندگی پر اتباع چھا جائے جب ہی اس کے ایمان میں کمال آئے گا اور اس کو مؤمن کامل کہیں گے۔

صُدورِ معصیّت اور تقاضائے محبّت

اب رہی بات غلطی سے گناہ کا صادر ہونا تو بندہ بشر ہے۔ معصوم تو صرف انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ ہم تو دن رات سینکڑوں گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں اور گناہ بے شک ہوتے رہتے ہیں مگر اس کا حل یہ فرمایا کہ جب گناہ ہو جائے تو توبہ کرلے پھر اتباع شریعت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ سے عہد کیا۔ پھر اتباع میں مصروف ہوگئے۔

اتباعِ سنت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کبھی بھی غلطی نہ ہو اور گناہ نہ ہو۔ یہ شان تو انبیاء علیہم السلام کی ہے۔ ہم سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور ہم گناہ کرتے بھی ہیں مگر اس کا حل یہ ہے کہ فوراً توبہ کرلے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے:

التائب من الذنب کمن لاذنب لہ۔

گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ توبہ کرتے ہی اس کا ریکارڈ صاف ہو گیا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے گناہ کے بعد توبہ کی وہ گناہ پھر باقی نہیں رکھا جاتا۔۔۔ اسی لئے جب بھی کوئی گناہ ہو جائے فوراً توبہ کر کے پاک ہو جائے۔ یہ مومن کی شان ہے اور یہ محبت اور ایمان کی کمال ہے۔ بس دعاء کیجئے کہ اللہ رب العالمین اپنی رضا نصیب فرمائے اور حضور ﷺ کی محبت اور معیّت عطا فرمائے اور اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان کامل پر فرمائے۔ آمین!

واخر دعوانا اَن الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تعلیم جدید

کالج کے اندر جہاں اس کی ضرورت ہے کہ کائناتی اشیاء کو سمجھا جائے' وہیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا "آخری نقطہ خدا کی معرفت ہو"۔۔۔۔ اسلام نے ان چیزوں کی طرف توجہ محض "عیش وعشرت" کرنے کے لئے نہیں دلائی۔ عیش وعشرت کوئی دوامی چیز نہیں' یہ تو چندروزہ قصہ ہے۔۔۔۔ آدمی دنیا میں آیا ہے مسافر کی طرح سے۔ اس کو ایک "بڑی منزل" تک جانا ہے۔ اگر وہ "اصل منزل" کو گنوا بیٹھا تو اس نے کائنات کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ یہ تو راستہ پر نہیں چل سکتا۔ اور نہ ہی آدمی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے دنیا کے "عجائبات" کا دیکھنا اور سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ؎

"یہ وہی تو راستہ ہے جس پر چل کر آدمی اپنے خدا کی معرفت تک پہنچتا ہے"۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ'

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْراً وَّ نَذِيْراً وَّ دَاعِياً اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجاً مُّنِيْراً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اَمَّابَعْدُ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَابِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَاوَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ٥ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ.

بے انتہا خوشی

بزرگان محترم!

خیال یہ تھا کہ اس وقت کالج کی جو جدید عمارت تیار کرائی جا رہی ہے، اس کو دیکھنا اس سے مستفید ہونا اور مسرور ہونا ہے۔ اسی غرض سے حاضری ہوئی تھی، جلسہ کا کوئی تصور اور اس میں بھی کسی تقریری اور خطاب کا کوئی گمان حاشیہ خیال نہیں تھا۔ بہر حال جب جلسہ کی صورت بن گئی ہے تو اس کے کچھ نہ کچھ لوازم پورے کرنے پڑیں گے اور ذمہ داروں نے اپنے محبت اور خلوص سے جو شکل پیدا کر دی ہے اس کا احترام تو کرنا ہی پڑے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ کالج کی جدید عمارت میں حاضر ہو کر غیر معمولی مسرت ہوئی اور شارم کے زندہ دل مسلمانوں کے حوصلے اور جذبات خیر سامنے آئے اس سے بھی بے انتہا خوشی ہوئی۔

تعمیر معنوی کی علامت ظاہر میں یہ ایک تعمیر ہے جو اینٹ اور پتھر سے کی جا رہی ہے۔ اور سیمنٹ اور چونا ہی میں ڈالا جا رہا ہے لیکن اگر حقیقت پر نگاہ کی جائے تو یہ علم کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔ یہ تعمیر دراصل علم کی ہے۔ درسگاہ کا وجود حقیقۃً علم کے لئے ہے۔ اس لئے یہ حسی تعمیر علامت ہے معنوی تعمیر کی جو اس کے اندر کی جائے گی ظاہر تعمیر سے قوالب کی ایک ہیئت بنائی جا رہی ہے اور معنوی تعمیر سے قلوب کی ایک ہیئت بنائی جا رہی ہے۔ اس ہیئت ظاہری میں نفسانی اخلاق و جذبات کی اصلاح کی جائے گی اس اعتبار سے یہ بہت مستحسن اقدام اور مبارک عمل ہے۔

اقسام علم

امام شافعیؒ کے مشہور مقولہ ہے۔

العلم علمان علم الادیان و علم الابدان

یعنی اللہ کی طرف سے جو علم دنیا کے اندر آئے وہ دو طرح کے ہیں ایک ادیان کا علم۔ جس کا نام شریعت ہے اور ابدان کا علم جس کا تعلق انسان کے ظواہر بدن اور اس کے عوارض بدن سے ہے لیکن حقیقت میں یہ دونوں علم جزء ہیں شریعت کے۔ شریعت اسلامی نے جس طرح سے شریعت اور دین کے علم کی طرف توجہ دلائی ہے اسی طرح سے ابدان کا علم اور ضرورت زندگی کے علوم مثلاً سائنس اور فلسفہ وغیرہ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

فرق صرف اتنا ہے کہ ادیان کا علم اصل مقصود ہے اور ابدان کا علم اس کے لئے ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا گیا ہے اور دونوں کا مقصد ہے معرفت خداوندی۔

حدیث شریف میں ہے۔

راس العلم معرفة الله.

یعنی علم کا راس المال اور خلاصہ خدا کی معرفت اور اس کی پہچان ہے۔

علمے کہ راہ حق نہ نماید جہالت است!

جو علم حق کا راستہ نہ دکھائے وہ حقیقت میں جہالت ہے اس کو صورت علم کہا جائے گا۔ حقیقت علم نہیں کہا جاسکتا۔

علم دین کے ساتھ علم دنیا کی ضرورت

جس طرح حقائق کا علم ضروری ہے اسی طرح معاشیات و معاشرت اور کائنات کے علم کے سلسلہ میں ان علوم کی بھی ضرورت ہے جن کو آج کل علم سائنس' فلسفہ اور ریاضی وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں جو آیت ہے۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا.

اس میں حصر کر دیا گیا ہے کہ علماء ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔ یعنی خوف و خشیت انہیں کے قلوب میں ہے۔ یہاں علماء سے مراد علماء فقہ ہی نہیں ہیں جو جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے مسائل سے واقف ہوں۔ بلکہ قرآن کریم کے ان نشانوں سے بھی واقف ہوں جو ضروریات زندگی کے سلسلے میں دنیوی علوم کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اس میں ستاروں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ اس زمین کے مخفی عجائبات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآن خلاو فضا کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اور ان کی طرف اشارات بھی کئے گئے ہیں۔

نظام محکم کی شہادت

ان سب کا مقصد بھی در حقیقت معرفت الٰہی اور اللہ کو پہچاننا ہے اس کہ آثار کو دیکھ کر ہی ذی اثر کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کہیں دھواں دیکھیں گے تو پہچان جائیں گے کہ وہاں آگ موجود ہے ورنہ دھواں نہ ہوتا۔ کہیں آپ رطوبت اور ٹھنڈک محسوس کریں گے ضرور یقین کریں گے کہ قریب میں کوئی دریا موجود ہے ورنہ برودت نہ ہوتی تو آثار کو دیکھ کر موثر کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔۔۔ اس کائنات کے نظام محکم اور عجیب و غریب انتظامات کو دیکھ کر دل خود بخود شاہد ہوتا ہے اور گواہی دیتا ہے کہ کوئی بہت بڑا صانع اور حکم ہے جس نے یہ نظام کائنات بنایا ہے اور عجائبات قدرت کو نمایاں کیا۔

یہ محض مادہ اور اس کی حرکت کا کام نہیں ہے اس لئے کہ مادہ خود اندھا اور بہرہ ہے نہ اس کو اپنی خبر اور پر نہ دوسرے کی خبر۔ تو ظاہر بات ہے کہ ایک اندھی بہری اور اپاہج چیز کوئی نظام محکم تیار

نہیں کر سکتی۔

اور مادہ کی حرکت بھی وہ ہے کہ بغیر محترک کے وہ واقع نہیں ہو سکتی۔ حرکت ایک وصف ہے وہ اسی وقت پایا جائیگا جب اس کا موصوف موجود ہو اگر وہ ذات موجود نہ ہو جو موصوف ہے تو صفت یعنی وہ حرکت بھی نہیں پائی جائے گی۔ تو چونکہ مادہ اپاہج اور لا یعقل ہے اس لئے اگر حرکت تعلق مادہ سے ہو گا تو عجائبات اور نظام علم کی نئی نئی چیزیں نہیں پیدا ہوں گی جب تک کہ علم اللہ اور قدرت الٰہی اس کے اندر شامل نہ ہو۔ بہر حال عجائب کی طرف بھی قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ روحانی عجائبات ہیں جن کو ارباب حقیقت نے کھولا ہے اور معرفت وبصیرت سے ذات خداوندی کا پتہ چلایا ہے۔

متقدمین کی بنیاد پر متاخرین کی تعمیر

اسی طرح سے مادیات میں عجائبات رکھے ہوئے ہیں وہ تدریجاً کھلتے ہیں اور کھل رہے ہیں۔ جس طرح سے قرآن کے عجائبات دور نبوت میں ظاہر ہوئے وہ سب اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے عقدے صحابہؓ نے کھولے اور ان کے بعد تابعینؒ نے ان کو کھولا اور اس میں شاخیں پیدا ہوئیں۔ تابعین کے بعد تبع تابعینؒ متوجہ ہوئے اور ان عجائبات میں علمی عجائبات نکالے۔ یہاں تک کہ بے شمار تصانیف وجود میں آگئیں جن میں ان علوم کو مدون کیا گیا جنکے اندر یہ عجائبات اور حقائق الٰہیہ تھے اسی طرح سے کائنات کے سلسلے میں بھی ابتداء سادہ سادہ تحقیقات تھیں۔ ان سادہ تحقیقات پر اگلوں نے دوسری تعمیر کھڑی کی کہ اس کے اندر سے اور عجائبات نکلے یہاں تک کہ صدیاں اور قرون گزرنے کے بعد اب اس میں اتنی شاخیں پیدا ہو گئیں کہ انسان زمین میں ہی نہیں بلکہ فضا میں گھوم رہا ہے۔ فضا میں ہی نہیں آسمانوں کے قریب پہنچ رہا ہے اور چاند تک اس کی پرواز ہو چکی ہے تو فضا کے عجائبات بھی قرآن شریف کی روشنی میں سامنے ہیں یہ اتنا جو کچھ ہوا پچھلوں کی تحقیقات پر تعمیر کی گئی ہے۔ اگر پچھلے بنیاد نہ رکھتے تو اگلی تعمیریں نہیں ہو سکتیں تھیں جس طرح سے حقائق الٰہیہ کے بارے میں بھی پچھلوں نے بنیادیں رکھیں اس پر بعد والوں نے تعمیریں کیں اور نئے نئے حقائق کھولے۔

اسی طرح مادی حقائق کے بارے میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ بھی در حقیقت انہیں پچھلوں کا طفیل اور صدقہ ہے۔ اور انہیں کے فکر کا ثمرہ ہے انہوں نے بنیادیں قائم کیں اور اس سے آگے ہم نے دیواریں اٹھائیں اور دیواروں پر چھتیں ڈالیں اور پھر دو منزلہ، سہ منزل تعمیر کی، اگر بنیاد رکھنے والے بنیاد نہ رکھتے تو ہم آج یہ تعمیریں نہیں بنا سکتے تھے۔

دونوں علوم کا حقیقی نقطہ

تو اس پوری گفتگو سے معلوم ہوا کہ دونوں علوم کا حقیقی نقطہ یہ ہے بنانے والے کو پہچانا جائے اور یہ تمام اثرات و آثار دلالت کرتے ہیں اس موثر حقیقی کی معرفت پر تاکہ اس کی طرف جھکا جائے اور اس کے قانون پر چلا جائے۔ اسی لئے قرآن کریم نے دو سو کے قریب آیتیں ذکر کیں جن میں عجائبات کائنات ذکر کئے ہیں۔ کہ زمینوں سے لے کر فضاؤں اور آسمانوں تک اور زمین کی گہرائیوں میں اور آسمان کی بلندیوں میں عجائبات قدرت پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسری قسم کی آیتوں میں حقائق الٰہیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسری قسم کی آیتوں میں احکامات خداوندی کو بیان کیا گیا ہے اور چوتھی قسم کی آیت میں قصص و عبر اور امثال بیان کی گئیں ہیں تاکہ لوگ عبرت پکڑیں نصیحت حاصل کریں۔

حقائق شریعت اور عجائبات کائنات کا باہمی تعلق

بہرحال مقصد یہ ہے کہ کسی سکول یا کالج میں صرف ایک چیز کا ہونا کافی نہیں اس لئے کہ شریعت اسلام اور اس کے حقائق کا تعلق کائنات کے ساتھ چولی اور دامن کا ہے۔ اگر ان عجائبات قدرت کی طرف توجہ نہ کی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان دوسری آیتوں کو نہیں سمجھ سکیں گے جن میں مادی کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی اور علماء نے اس میں تحقیقات کی ہیں۔ علم ابدان اور علم ادیان میں سے ہر ایک کے مختلف گوشے ہیں۔

مثلاً مختلف ضروریات بدن ہیں جن کا ایک علم بن گیا کہ اگر بدن کو بیماری یا کوئی روگ لاحق ہو جائے اس کے علاج کا کیا طریقہ ہے؟ اس کے لئے علم طب ہے تاکہ اصل بدن کی اصلاح کی جائے۔ اگر اس کی اصلاح نہ ہوگی تو ظاہر بات ہے کہ بدن جو روحانیت کا سفر کر رہا ہے وہ نہیں کر سکتا۔ بدن ہی تو اس کے لئے سواری ہے۔ بدن کا یہ گھوڑا اگر چلنے والا نہ ہو تو شرعی اعمال بھی انجام نہیں پا سکتے۔

پھر طب کے سلسلے میں ہزاروں حقائق ہیں جو انسان کی تکوین سے متعلق ہیں کہ کس طرح انسان پیدا ہوا اور باری تعالیٰ نے کن عجائبات میں سے اس کو ظاہر کیا یہ چیزیں سامنے نہ ہوں تو بہت سے حقائق شریعت نہیں کھل سکتے جن کا مدار ان طبی تحقیقات کے کھلنے پر ہے تو انسان میں سب سے پہلے بدن کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ صلاح اور صحت ہے اور وہ موقوف ہے علم طب پر۔ اس بناء پر اس کے لئے علم طب ضروری ہے۔

اور علم طب انبیاء علیہم السلام پر بھی اترا ہے۔ وحی کے ذریعہ اس کے اصول آئے ہیں اور پھر تجربہ کاروں نے اس کو بڑھایا۔ اسی طرح بدن کے دوسرے عوارض ہیں مثلاً تن ڈھانپنے کا قصہ ہے

اس کے لئے کپڑا بُنتا یا بناتا ہے۔ اسی طرح سے اثاث البیت ہے کہ انسان کی بہت سی ضروریات ہیں۔ کھانے پینے سے رہنے سے۔ مکان بنانے سے متعلق قران کریم میں ان چیزوں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے اور احسانات خداوندی کے تحت مکانات کا بھی ذکر ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَناً وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَ نْعَامِ بُيُوْتاً تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ.

یعنی کپڑوں کے گھر اور اینٹ پتھر کے گھر اور پہاڑوں کے گھر دیئے گئے تا کہ ان میں سکونت حاصل کرو تم۔ اسی طرح قرآن کریم نے ہر چیز کی طرف توجہ فرمائی ہے خواہ لباس ہو' خواہ کھانے پینے کی شئے ہو خواہ رہن سہن اور صحت و مرض' اور تمام مستقل فن بن گئی ہیں اور ہر فن ایک مستقل موضوع پر مشتمل ہے اور ان کے احکام الگ ہیں اس کے عوارض الگ ہیں اس کے احوال الگ ہیں۔ تو کالج کے اندر جہاں اس کی ضرورت ہے کہ کائناتی اشیاء کو سمجھا جائے وہیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا آخری نقطہ خدا کی معرفت ہو' اسلام نے ان چیزوں کی طرف توجہ محض عیش کرنے کے لئے نہیں دلائی۔ عیش و عشرت کوئی دوامی چیز نہیں' یہ تو چند روزہ قصہ ہے۔

منزل مقصود اور اس کائنات کی حقیقت

آدمی دنیا میں آیا ہے مسافر کی طرح سے اس کو ایک بڑی منزل تک جانا ہے۔ اگر وہ اصل منزل کو گنوا بیٹھا تو اس نے کائنات کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ یہ تو راستہ اور رہ گزر ہے مگر چونکہ راستے کے نشیب و فراز کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر آدمی راستہ نہیں چل سکتا اور نہ ہی آدمی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے اس دنیا کے عجائبات کا دیکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ وہی تو راستہ ہے کہ جس پر چل کر آدمی اپنے خدا کی معرفت تک پہنچتا ہے۔ تو ہماری منزل بھی آخرت ہے وہ اسی دنیا میں سے بنتی ہے۔ یہ تصور غلط ہو گا کہ آخرت کا کوئی مکان الگ ہے اور دنیا کا مکان الگ ہے۔ بلکہ اسی دنیا میں سے آخرت نکلتی ہے۔ اور اسی میں سے وہ اعمال پیدا ہوتے ہیں کہ جس سے آدمی اپنے خدا تک پہنچتا ہے' مثلاً دولت کمائے گا تو اسی دولت کے ذریعہ وہ زکوٰۃ صدقات دے گا۔ اور دیگر کار خیر انجام دے گا۔ تو دولت میں سے ہی اس کی آخرت نکل رہی ہے۔ اگر دولت سامنے نہ ہوتی تو یہ آخرت کا محل کیسے تعمیر ہوتا۔

اسی طرح سے دوسری چیزیں ہیں۔ بدن کی صحت ہے اگر بدن صحیح نہ ہو گا تو آخرت کے اعمال کیسے انجام پائیں گے۔ اسی لئے دنیا کو گزر فرمایا ہے اسی بناء پر راستہ کے نشیب و فراز سے

واقفیت بھی ضروری ہے۔ رہنے کا طریقہ جاننا بھی ضروری ہے۔

انسانیت کی سب سے پہلی بنیاد

بلڈنگ انسانوں کے لئے بنتی ہے۔ اور انسان اخلاق سے بنتا ہے۔ جب تک انسان کا کردار اور کریکٹر اچھا نہ ہو اور اونچا نہ ہو اور اس کی اخلاقی حالت بلند نہ ہو اس وقت تک وہ انسان نہیں ہے۔ انسان اچھے کپڑوں کا نام نہیں ہے۔ انسان نام ہے اچھے کردار کا اچھے کریکٹر کا اور سب سے پہلی چیز ہے انسانیت اور انسانیت کی سب سے پہلی بنیاد ہے انس و مودۃ اور اخوت کا باہمی سلوک کہ تمام آدمی بھائی بھائی بن کر رہیں اور آدمی ایک دوسرے کی ہمدردی میں غرق ہو اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کے لئے مستعد ہو اس میں ایثار و قربانی کا جذبہ ہو کہ میں خود تکلیف اٹھالوں گا اپنے بھائی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کر کے خود راحت اٹھانا انسانیت نہیں اور نہ حقیقت میں راحت ہے بلکہ اس کا نام خود غرضی ہے۔

معرفت الٰہی

غرض ان تمام چیزوں کا مقصد معرفت الٰہی ہے اور معرفت الٰہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ معرفت نفس نہ ہو اس لئے کہ صوفیاء کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ ؎

من عرف نفسه، فقد عرف ربه.

جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس کو پروردگار کی معرفت حاصل ہو گئی۔

اسی ذیل میں ایک مستقل علم وجود میں آیا جس کا نام علم النفس ہے جس سے نفس کے اتار چڑھاؤ نشیب و فراز کو پہچانا جائے کہ کیا کیا چیزیں اس میں چھپی ہوئی ہیں۔ ان علوم سے نفس کی کمزوریوں اور انسانی طبائع کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لئے اسلامی نقطہ نظر سے ان کا حاصل کرنا مفید ہے اگر نقطہ نظر صحیح ہو اور کسی علم و فن کی اصل بناء میں کوئی فساد نہ ہو تو اس علم کو کار آمد بنایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان علوم کو حاصل کریں اور اصل نقطہ کو سامنے رکھ کر ان علوم کو وہاں تک پہنچنے کا ذریعہ بنائیں!

متاع مشترک

بہر حال اس کی بہت زیادہ مسرت اور خوشی ہوئی کہ مسلمانان میل شارم نے اپنی حوصلہ مندی سے اور اپنے ظرف کی وسعتوں سے ایک اتنی بڑی تعمیر کھڑی کر دی۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ وہ معنوی تعمیر کو بھی اونچا دیکھنا چاہتے ہیں۔ انسانیت اور علم کی تعمیر کو بھی اونچا لے جانا چاہتے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ' ان کے ارادوں میں برکت دے' آمین۔ اور جو جوان

کے مقاصد ہیں ان کی تکمیل فرمائے۔ اس سے نہ صرف میل شارم کے لوگوں کو خواہ وہ کسی بھی قوم سے تعلق رکھتے ہوں بلکہ آس پاس کے علاقہ اور تمام لوگوں کو توفیق دے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ تعلیم گاہ درحقیقت سب کے لئے ہوتی ہے علم کسی خاص قوم کی وراثت نہیں بلکہ علم سارے انسانوں کی ایک مشترک پونجی ہے۔ مسلم ہو غیر مسلم ہو۔ کسی بھی ملت کا ہو علم سب کی ایک مشترک متاع ہے۔ کسی کالج یا سکول کا قیام اسی لئے ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچایا جائے۔ خواہ وہ کسی بھی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ تو ایک بڑی خوشی کی بات ہے کہ میل شارم میں اس قسم کا کالج قائم ہوا۔

اور جہاں تک میرے علم میں آیا اس کا فیضان عام ہے کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بلاامتیاز مذہب وملت ہر قوم کے انسان اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس کی ضرورت بھی ہے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے مقاصد حسنہ میں کامیاب کرے اور ان مقاصد کی تکمیل فرمائے۔ آمین۔

شہ کا مصاحب

میں آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں ذمہ داران کالج کا کہ انہوں نے مجھ جیسے ناچیز کو یاد فرمایا۔ میرا تعارف اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں دارالعلوم دیوبند کا ایک طالب علم ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ میری اصلیت نہیں اور نہ کوئی تعارف ہے۔ اگر کوئی کام بن پڑتا ہے تو وہ درحقیقت اثر ان اکابر اور ان بزرگوں کا ہی ہے۔ بقول غالب کے علماء کے لئے ان کا ایک شعر کافی ہے۔ اس نے کہا ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرا ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

تو حقیقت یہ ہے کہ ہماری ذاتی اور شخصی کوئی آبرو نہیں ہے۔ البتہ بڑوں کی ایک جماعت ہے۔ اور وہ جماعت بین الاقوامی بزرگوں کی ہے۔ ان کی شخصیتیں بہت بلند ہیں۔ ان سے وابستگی اور ان سے نسبت ایک بڑی چیز ہے۔ ذرے کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ہے۔

نسبت کی عظمت لیکن چونکہ اس کو نسبت ہے آفتاب سے اور وہ نسبت بڑی ہے اس لئے اس درجہ کی بھی بڑی حیثیت ہوتی ہے اور وہی ہم بھی کہتے ہیں ؎

اگرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرۂ آفتاب تا بانیم

ہم تو خورد اور لاشی ہیں لیکن نسبت ایک بڑی چیز سے قائم ہے اور وہ نسبت بڑی ہے جو اس کے لپیٹ میں آجائے گا وہ بڑا دکھائی دے گا۔ حقیقت میں بڑائی انہیں بزرگوں کی ہے۔ ہماری کوئی

بڑائی نہیں۔ مخلص بزرگوں کی ایک جماعت ہے وہ بہت سچے لوگ تھے ان کی سچائی آج تک چل رہی ہے۔ اخلاص سے جو روح انہوں نے پھونکی وہ اسی شان سے قائم ہے' اسی کی چمک اور روشنی میں جو آگیا بن گیا۔ اس کے نتیجے میں اہل علم بنے' اہل افضل بنے' اہل کمال بنے۔

تو ہمارا اس سے زیادہ تعارف کچھ نہیں کہ دار العلوم دیوبند سے اور وہاں کے بزرگوں سے ایک تعلق ہے۔ آپ نے جو کچھ بھی قدر دانی اور قدر افزائی فرمائی در حقیقت ان ہی کی قدر فرمائی ہے۔

میں صرف ایک واسطہ ہوں میں سمجھتا ہوں کہ یہ قدر دانی انہیں بزرگوں کی طرف جارہی ہے۔ آپ نے جو کچھ اچھے اور اونچے کلمات فرمائے۔ در حقیقت میں واسطہ ضرور ہوں میرے ذریعہ سے یہ کلمات خیر وہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور میں اخیر میں پھر مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں آپ حضرات کا کہ یاد فرمایا اور کچھ خیالات ظاہر کرنے کا بھی موقع عنایت فرمایا۔

واخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العالمین.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مرکز سعادت

دار العلوم پر ایک وقت وہ بھی گزرا ہے کہ مہتمم سے لے کر دربان تک سب ہی اہل نسبت تھے۔ حاجی عبداللہ صاحبؒ دربان تھے' نوشت وخواند کچھ نہ تھی لیکن صاحب نسبت بزرگ تھے۔ صبح صادق پر جو دار العلوم میں گھنٹہ بجتا ہے۔ اس کے بجانے کا کام انہی کے سپرد تھا۔ پہلی ضرب لگاتے تو زبان پر "سبحان اللہ" ہوتا' دوسری پر "الحمد للہ" اور تیسری پر "اللہ اکبر" کے ایک نعرہ کے ساتھ پر یہ شعر زبان پر عجیب کیفیت سے لاتے ؎

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی

یہ منظر کچھ ایسا ہوتا کہ جو سنتا بے اختیار اس پر بکاء طاری ہو جاتا۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ'

اَلحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْراًوَّ نَذِیْراًوَّ دَاعِیاً اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً............اَمَّابَعْدُ........

عَنْ اَنَسِ بِنْ مَالِکٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہُ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْھُمُوْ مَانِ لَا یَشْبِعَانِ مَنْھُوْمٌ فِی الْعِلْمِ لَا یَشْبَعُ مِنْہُ وَمَنْھُوْمٌ فِی الدُّنْیَا لَا یَشْبَعُ مِنْھَا. (صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ)

فاتحۃ الکلام

بزرگان محترم، برادران عزیز!

آپ حضرات کی دعوت پر میں حاضر تو ہو گیا لیکن سوچتا ہوں کہ آپ کے سامنے کیا کہوں۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ کہوں گا وہ آپ جانتے ہیں۔ ایسی کوئی نئی بات سمجھ میں نہیں آتی جو آپ کے علم میں نہ ہو اور میں اسے علم میں لاؤں۔

آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں علم کی دولت سب سے بڑی دولت ہے اور علم کی روشنی سب سے بڑی روشنی ہے۔ آپ کو سورج کی روشنی سب سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔ پورے عالم میں پھیلی دکھائی دیتی ہے۔ مگر اس کے ذریعہ صرف رنگ اور صورت کا علم ہوتا ہے۔ لیکن علم کی روشنی اسلام اور کفر کا فرق بتلاتی ہے، سنت اور بدعت میں امتیاز سکھاتی ہے۔ حق و باطل کی پہچان کا ذریعہ ہوتی ہے۔۔۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا طفیل ہے۔ ان کی جوتیوں کا صدقہ ہے اور ان حضرات کا لاکھ لاکھ کرم و احسان ہے کہ انہوں نے علم کی روشنی پیش کی جو ہمارے لئے اچھائی برائی بھلے اور برے کے درمیان تمیز کا ذریعہ بنی۔

تحصیل حاصل

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ علم، تعلیم سے آتا ہے اور آپ سب ہی حضرات تعلیم میں مشغول ہیں۔ اسباق میں حاضری ہے، مطالعہ ہے، آپس میں مذاکرہ ہے۔ غرضیکہ رات دن آپ علم ہی کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔ اس لئے اسکی نصیحت کرنا تحصیل حاصل ہے اور اگر عمل کے سلسلے میں کچھ کہا جائے تو آپ کہیں گے کہ سب سے بڑا عمل خود علم کا حصول ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء کے درمیان جب یہ بحث ہوئی کہ کثرت نوافل افضل ہے یا زیادہ علم۔۔۔ تو کثرت سے فقہاء زیادہ علم ہی کی افضلیت کے قائم ہوئے۔ آپ حضرات تحصیل علم میں لگے ہوئے ہیں، جو سب سے بڑا عمل ہے۔ اس کے علاوہ فرائض وغیرہ کی ادائیگی میں بھی آپ کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوتی۔ نماز کے لئے آپ جوق درجوق آتے ہیں ہر وقت مسجد بھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ دارالعلوم کی مسجد تو آپ سے پر رہتی ہی ہے۔ شہر کی مسجدیں بھی آپ لوگوں سے آباد ہیں لہٰذا اگر عمل کے سلسلے میں کچھ عرض کروں تو بھی آپ کہیں گے کہ عمل تو ہم کر ہی رہے ہیں۔

جہاں تک آپ لوگوں کی اخلاقی حیثیت کا تعلق ہے وہ بھی درست ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اگر ہم پچھلوں کے اخلاق سے موازنہ کرتے ہیں تو کچھ کمی محسوس ہوتی ہے لیکن اگر ہم دور حاضر کے دوسرے طبقوں کے اخلاق و کریکٹر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں نہ صرف یہ کہ آپ لوگوں کے اخلاق کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے بلکہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آپ حضرات ہی کا وہ طبقہ ہے جو اس اخلاقی

قحط کے دور میں بھی اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں کچھ لکھنا فائدے سے خالی ہی ہوگا اور اصول و نوعی طور پر یہی کچھ دائرے تھے کہ جن کے متعلق کچھ کہا جا سکتا تھا اور بفضلہ تعالیٰ یہ ساری چیزیں آپ کو حاصل ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسی چیز آپ کے سامنے رکھی جائے جو مفید ہو۔

محروم القسمت کا حال

اس وقت مجھے مولانا گنگوہیؒ کا واقعہ اور مقولہ یاد آیا وہ یہ کہ آپ جب حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بیعت ہو کر واپس ہوئے تو کافی عرصے تک کوئی خط و کتابت نہیں کی۔ آخر کار حضرت حاجی صاحبؒ نے مولانا کے پاس ایک خط لکھا کہ جملہ متوسلین کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں جس سے ان کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ایک مدت گزری آپ کی کوئی حالت معلوم نہ ہو سکی' اپنے حالات لکھئے تا کہ اندازہ ہو سکے۔

مولانا نے جواب دیا اور ابتداء اس طرح کی۔

"حضرت مجھ محروم القسمت کا تو کوئی حال ہی نہیں اگر کوئی حال ہوتا تو عرض کرتا"۔ پھر اخیر میں لکھا کہ البتہ حضرت کی جوتیوں کے طفیل میں تین باتیں اپنے اندر پاتا ہوں۔ ایک یہ کہ امور شرعیہ امور طبعیہ بن گئے ہیں گویا نماز روزہ اور دوسری عبادات ادا کرنے کے لئے ایسا مجبور ہوں جیسے بھوک کے وقت کھانے کے لئے اور پیاس میں پانی کے لئے۔۔۔۔۔دوسری بات یہ کہ مدح وذم یکساں نظر آتے ہیں کوئی ہزار تعریف کرے' ہزار مذمت کرے نفس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ گویا مخلوق کچھ بھی کہتی رہے اس کی نہ کچھ پرواہ ہوتی ہے اور نہ قلب پر کوئی اثر ہوتا ہے۔

اور تیسرے یہ کہ نصوص شرعیہ میں کہیں تعارض نہیں معلوم ہوتا۔ تعارض تو کیا موزونیت اتنی معلوم ہوتی ہے کہ ہر کلی اپنی جگہ پر ٹھیک اور درست دکھائی دیتی ہے۔

مرکز سعادت

امور شرعیہ امور طبعیہ بن جائیں یہ قوت عملیہ سے ہوتا ہے اور لوگوں کی تعریف و برائی کا یکساں معلوم ہونا قوت اخلاقی کا تقاضا ہے۔ قوت عملی کی انتہا یہ ہے کہ آدمی میں طاعت کی رغبت اس درجہ پیدا ہو جائے کہ بغیر اس کے کئے ہوئے چین ہی نہ آئے قوت اخلاقی کی انتہا یہ ہے کہ اس درجہ غنا پیدا ہو جائے کہ لوگوں کی تعریف اور برائی یکساں معلوم ہونے لگے۔

اسی طرح قوت علمی کی انتہا یہ ہے کہ قران وسنت کی ہر چیز اپنی جگہ پر بالکل درست اور ٹھیک معلوم ہو اور شریعت اسلامیہ ایک گلدستہ نظر آتی ہو۔ سعادت انسانی کے لئے انہیں تین چیزوں کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) علمی قوت (۲) عملی قوت (۳) اخلاقی قوت

اور آپ ایسی جگہ میں ہیں جو علمی، عملی، اخلاقی قوتوں کا مرکز ہے۔ جہاں ایسی ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو ہر اعتبار سے کامل و مکمل تھیں۔۔۔۔ میں اپنی بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ ایسی باکمال شخصیتوں کی شکلیں دیکھی ہیں۔ بعض سے کچھ استفادہ کا بھی موقعہ ملا۔ استاذ محترم حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمتہ اللہ علیہ اللہ اکبر چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ اتباع سنت کا یہ حال کہ ان کے عمل کو دیکھ کر مسائل نکالے جاتے تھے۔ ایسے ہی حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ ان تمام حضرات کی زیارت کے شرف کے ساتھ ساتھ ان سے کچھ استفادہ کا بھی موقع ملا۔ استاذ محترم حضرت تھانویؒ کی زیارت بھی نصیب ہوئی اور حسب توفیق استفادہ کا بھی شرف نصیب ہوا۔ یہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں کا ایک ایک شخص پوری پوری قوم کے برابر ہے۔ حضرت تھانویؒ نے ملک کے گوشے گوشے میں مواعظ کہے اور ایک ہزار کے قریب تصانیف کیں۔ بہت سے علماء مل کر بیٹھیں تو بھی اتنا کام مشکل سے ہو سکے گا۔ حق تعالیٰ نے آپ سے ایسے کام لئے جس کا ایک قوم اور ایک جماعت سے ہونا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

جائے بزرگان بجائے بزرگان!

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان بزرگوں کے اثرات اس جگہ اور اس ادارہ میں نہ ہوں ایک پھول کپڑے کو لگ جاتا ہے تو اس پر اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے دیر تک کپڑے سے خوشبو آتی رہتی ہے نبی کریم ﷺ نے شجرۃ الرضوان کے نیچے بیٹھ کر چودہ سو صحابہؓ سے بیعت لی اور آپ ﷺ کے اس تھوڑے سے قیام کی وجہ سے اس جگہ کو آپ سے ایک نسبت حاصل ہوئی تھی اور وہ جگہ مقدس و متبرک ہوگئی تھی چنانچہ حضرات صحابہؓ ان برکات کو محسوس کرتے تھے، اس درخت کے نیچے بیٹھتے تھے دعائیں مانگتے تھے۔

بعد میں حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا، ابھی تو خیر القرون ہے اور اس درخت کے ساتھ امت کی عقیدت کا یہ حال ہے بہت ممکن ہے کہ کل کو ایسی نسلیں آئیں جو عقیدت میں غلو سے کام لیں اور اس کی وجہ سے شرک و بدعت کا دروازہ کھل جائے اس درخت کو کٹوا دیا۔

اس واقعہ سے آپ کو یہ بتانا تھا کہ جائے بزرگان بجائے بزرگان، والا مقولہ بالکل صحیح ہے۔ پس یہ ادارہ جہاں اکابر اولیاء اور اپنے وقت کے مسلم قطب اور ولی رہ چکے ہیں ان کے پاکیزہ اثرات سے اس کی در و دیوار کب خالی رہ سکتے ہیں۔

حاصل یہ کہ آپ ایک ایسے ادارے میں ہیں جسے طرح طرح کی نسبتیں اور تقدس حاصل ہے جو برکات یہاں ملتی ہے وہ دوسری جگہ نظر نہیں آتیں۔ دار العلوم کی ایک ایک جگہ کے بارے میں

اکابرین کے مکاشفات ہیں۔ نودرہ کی عمارت کے بارے میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ علیہ کا مکاشفہ ہے کہ عرش سے ایک مسلسل لڑی ہے جو نودرہ کی درسگاہوں تک پہنچتی ہے چنانچہ تجربہ یہ ہے کہ جتنا یہاں بیٹھ کر کتابیں سمجھ میں آتی ہیں۔ دوسری جگہ نہیں آتیں۔ نودرہ کے سامنے کی جگہ جہاں جنازہ رکھا جاتا ہے اس کے متعلق مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ علیہ کا مکاشفہ ہے کہ جس جنازے کی نماز یہاں ہو جائے وہ مغفور ہوتا ہے۔

الہامی درسگاہ

بھائی! یہ الہامی مدرسہ ہے اس کا آغاز بھی الہام سے ہوا ہے۔ اس کی تعمیر بھی الہام سے ہوئی اور طلباء کا داخلہ بھی الہام سے ہی ہوتا ہے بلکہ بعض واقعات سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس کے اساتذہ کا تقرر اور تعین بھی خاص زاویوں میں ہوتا ہے اور یہاں کی خدمت ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس مدرسہ کا آغاز اور مدرسوں کی طرح کی رسمی مشورے سے نہیں ہوا بلکہ وقت کے اکابر و مشائخ کا ایک اجماع سا ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دارالعلوم کی تاسیس کے وقت میں کسی کو کشف ہوا کہ یہاں پر ایک دینی مدرسے کی بنیاد ڈالنی چاہئے۔۔۔ کسی نے خواب میں دیکھا کہ یہاں پر ایک مدرسہ کا قیام ہونا چاہئے۔۔۔ کسی پر القاء ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام کا تحفظ دینی اداروں سے ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تعمیر کے وقت بنیاد کھودنے کے لئے کچھ نشانات لگا دیئے گئے جتنا اب ہے اس سے آدھے پر نشان لگایا گیا تھا۔

الہامی اہتمام

دارالعلوم کے سب سے پہلے مہتمم حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ تارک الدنیا اور نہایت ہی قوی النسبت بزرگ تھے۔ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ کتاب پڑھ سکتے تھے۔ مولانا نانوتویؒ نے انہیں بلایا اور اہتمام پیش کیا' آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں نہ تو لکھنا جانتا ہوں نہ پڑھنا' مجھے مہتمم بنا کر کیا کیجئے گا۔ حضرتؒ نے فرمایا' نہیں۔ منجانب اللہ یہی مقدر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی اہتمام قبول کریں۔ چنانچہ آپ نے قبول فرمالیا۔

الہامی طلباء

حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ مولسری کے احاطہ میں جو کنواں ہے اس کی منڈیر پر حضور ﷺ تشریف رکھتے ہیں اور دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ دودھ لینے والوں میں سے بعض کے ہاتھ میں پیالہ ہے اور جس کے پاس نہیں ہے وہ ہاتھ پھیلا کر چلو ہی سے پی لیتا ہے۔

حضرت جب بیدار ہوئے تو مراقبہ فرمایا کہ آخر یہ کیا چیز ہے۔ کچھ دیر مراقب رہنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ دودھ صورت مثالی علم کی ہے۔ اور قاسم العلوم نبی اکریم ﷺ ہیں اور آپ علم تقسیم فرمارہے ہیں اور طلباء فرق مراتب کے ساتھ علم حاصل کررہے ہیں۔

اس واقعہ کا علم لوگوں کو اس طرح ہوا کہ ایک بار شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ احاطہ مولسری میں کھڑتے تھے ایک طالب علم شوربہ کا پیالہ آپ کے سامنے لے کر آیا اور اسے پھینک کر کہنے لگا۔

"نہ اس میں گھی ہے اور نہ مصالحہ ہے اور شاید مفتی صاحب اس سے وضو کے جواز کا فتویٰ بھی دیدیں یہ ہے آپ کا اہتمام؟"

جب وہ طالب علم چلا گیا تو آپ نے پوچھا کیا یہ مدرسہ دیوبند ہی کا طالب علم ہے؟ لوگوں نے کہا' ہاں حضرت یہ مدرسہ دیوبند ہی کا طالب علم ہے اور مطبخ سے اس کا کھانا ہے اور مطبخ کے رجسٹر میں اس کا نام درج ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں! یہ مدرسہ کا طالب علم معلوم نہیں ہوتا تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اسی نام کا ایک دوسرا طالب علم ہے۔ اصل میں کھانا اس کا تھا۔ لیکن نام میں اشتراک کی بناء پر غلطی سے ٹکٹ اسے مل گیا تھا۔ طلبہ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا حضرت! بات تو وہ ہوئی جو آپ نے فرمایا تھا۔ مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس پر آپ نے دودھ والا واقعہ بیان فرمایا اور اس کے بعد جو عجیب بات فرمائی وہ یہ کہ جب شوال میں طلباء داخل ہوتے ہیں تو میں ایک ایک کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی اس مجمع میں تھا۔ اس طالب علم پر میں نے تین مرتبہ نگاہ ڈالی تو مجھے یہی معلوم ہوا کہ یہ اس مجمع شریک نہیں تھا۔۔۔۔ بہر حال میں یہ عرض کررہا تھا کہ یہ مدرسہ الہامی مدرسہ ہے اس کا آغاز بھی الہام سے ہوا اور طلباء کا انتخاب بھی الہام سے ہوتا ہے۔

الہامی سنگ بنیاد اور اس کا سنگ بنیاد بھی الہام ہی سے رکھا گیا۔ بنیاد کے لئے لوگوں نے جو نشان لگایا تھا اس پر ابھی کام شروع نہیں ہوا تھا کہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے خواب دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ تشریف لائے ہیں۔ عصائے مبارک ہاتھ میں ہے اور فرماتے ہیں کہ ؎

"یہ احاطہ تنگ رہے گا کافی نہیں ہوگا"۔

چنانچہ آپ نے مولانا نصیر احمد صاحب کی درسگاہ کے پاس نشان لگایا۔

حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نیند سے بیدار ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ لکیریں بالکل اسی طرح موجود ہیں۔ پھر شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بنیاد اسی پر کھودی جائے گی اب مجھے کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔

حقائق وکیفیات کا فرق

آپ حضرات ایک ایسے مقام پر ہیں کہ جسے سینکڑوں بزرگوں کی نسبتیں حاصل ہیں۔ مجموعی اور غیر شعوری طور پر وہ ساری نسبتیں کام کر رہی ہیں۔ اس لئے میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ جو علم اور جو خیر و برکت یہاں ہے دوسری جگہ نظر نہیں آتی کتابیں وہی ہوتی ہیں الفاظ وہی ہوتے ہیں مگر حقائق وکیفیات میں فرق ہو جاتا ہے۔

میں نے مشکوۃ شریف اپنے والد مرحوم مولانا حافظ احمد صاحبؒ سے پڑھی ہے۔ والد صاحبؒ جس وقت برزخ موت' قیامت' حشر ونشر سے متعلق احادیث پر پہنچے اور تقریر شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میدان قیامت سامنے ہے یہ قبر ہے' حساب کتاب ہے عذاب وثواب ہے۔ اس انداز اور ایسی کیفیت سے تعلیم ہوتی کہ ہم محسوس کرتے کہ یہی حالات ہمارے اوپر طاری ہو رہے ہیں۔

نسبتوں کا چمن دار العلوم پر ایک وقت وہ بھی گزرا ہے کہ مہتمم سے لے کر دربان تک سب اہل نسبت بزرگ تھے۔ حاجی عبد اللہ صاحبؒ دربان تھے۔ نوشت وخواند کچھ نہ تھی' لیکن صاحب نسبت بزرگ تھے۔ صبح صادق پر جو دار العلوم میں گھنٹہ بجتا ہے اس کے بجانے کا کام انہی کے سپرد تھا۔ پہلی ضرب لگاتے تو زبان پر سبحان اللہ ہوتا دوسری پر الحمد للہ اور تیسری پر اللہ اکبر کے ایک نعرہ کے ساتھ پھر یہ شعر زبان پر عجیب کیفیت سے لاتے ؎

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی؟

یہ منظر کچھ ایسا ہوتا کہ جو سنتا بے اختیار اس پر بکاء طاری ہو جاتا۔ حاصل یہ کہ یہ ایک مثالی جگہ ہے اسے نہ جانے کیسی کیسی نسبتیں حاصل ہیں۔ یہاں کم سے کم درجے کا طالب علم آتا ہے اس کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے اس جگہ پر رہ کر محروم رہنے کا کوئی سوال نہیں۔

تو بھائی اگر نسبتوں کے بارے میں کچھ بات کی جائے تو بفضلہ تعالیٰ وہ بھی موجود ہے۔

زیادۃ فی العلم مگر ہاں اسی کے ساتھ ساتھ ایک بات اور ہے وہ یہ کہ ایک تو اصل علم اور رأس العلم ہے جسے آپ حاصل کر رہے ہیں اور جو آٹھ دس سال میں حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی پر قناعت نہ کرنا چاہئے بلکہ اضافہ کی برابر کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ جس طرح اصل علم مطلوب ہے ویسے ہی زیادۃ فی العلم بھی مطلوب ہے۔ نبی اکرم ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا حالانکہ آپ کو وہ علوم دیئے گئے تھے جو ساری کائنات میں سے کسی کو نہیں دیئے گئے' چونکہ یہ انسان کی صفت نہیں ہے بلکہ اللہ کی صفت ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ساری

صفات غیر محدود ہیں اس لئے آپ جتنا بھی علم حاصل کرتے جائیں گے جہالت دور ہوتی چلی جائے گی اور آگے میدان مزید نظر آئے گا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ مرض وفات میں ہیں ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ آپ مطالعہ نہ فرمایا کیجئے۔ مگر جب ڈاکٹر چلے جاتے تو آپ فوراً مطالعہ میں مشغول ہو جاتے لوگ کہتے کہ حضرت! ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ تو فرماتے بھائی! کیا کروں یہ مرض مطالعہ کا بالکل لاعلاج مرض لگا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں شاید آپ چند ساعت ہی ترک مطالعہ کرتے۔ اس کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ آپ کی دلالت اولیٰ مطالعہ پر ہی تھی، حضرت کو زیادۃ فی العلم کی ایک دھن لگی ہوئی تھی۔

اسی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے حفظ اتنا قوی دیا تھا کہ جو چیز ایک بار دیکھ لیتے تو عمر بھر کے لئے کافی ہو جاتی۔ خود ایک بار درس میں فرمایا کہ جو چیز نظر سے گزر جاتی ہے پھر فراموش نہیں ہوتی۔ درس میں مشہور و معروف کتب تو در کنار غیر متعارف قلمی نادر کتب کا حوالہ صفحات و سطور اس طرح دیتے کہ محسوس ہوتا کہ شاید گذشتہ رات ہی حضرتؒ ان کتابوں کا مطالعہ فرمایا ہے۔ اس قدر قوت حفظ کے ہوتے ہوئے حضرتؒ نے تیرہ بار فتح الباری کا از اول تا آخر مطالعہ کیا تھا بتایئے کہ جس کے ایک بار کتاب دیکھ لینے کے بعد یہ عالم ہو کہ سالہا سال کے بعد بھی متحضر تو تیرہ بار فتح الباری کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا عالم ہوگا۔

آپ کے یہاں حدیث کا درس ہوتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ سارے ہی فنون کا درس ہوتا تھا۔ افسوس کہ آپ کی بتائی ہوئی باتیں اور تقریر محفوظ نہ رکھ سکا۔

علم کی دھن

تو بھائی! علم آدمی کو محنت سے ملتا ہے، دھن سے ملتا ہے۔ یہ دھن پیدا ہو جانے چائے کہ ہمیں علم حاصل کرنا ہے اور اس کو سود در سود کر کے بڑھاتے ہی چلے جانا ہے۔ جب دھن پیدا ہو جائیگی تو آپ زیادہ سے زیادہ کتب بینی کریں گے اور جب آپ کتب بینی کے عادی ہو جائیں گے تو پھر آپ میں تفقہ پیدا ہوگا اور جب تفقہ پیدا ہو جائے گا تو آپ کسی شے کے محض حکم ہی پر قناعت نہ کریں گے بلکہ اس کی حکمت کو بھی معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور جب حکمت معلوم کرلیں گے تو اس سے بڑھ کر علت معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوگی اور جب علت معلوم ہو جائے گی تو آپ اسی پر قناعت نہیں کریں گے بلکہ اس وقت آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس علت کا رابطہ اللہ تبارک تعالیٰ کی کس صفت سے ہے۔

علم وعمل کی سند

ایک بات آپ حضرات سے کہدوں کہ جس طرح آپ علم حاصل کرنے کے لئے مجاہدہ کرتے ہیں، مشقتیں برداشت کرتے ہیں' اسی طرح آپ کی عملی اور اخلاقی قوت مضبوط نہیں ہوگی، علم کام نہیں دے گا' جب تک سلسلہ عمل کو بھی متصل نہ کیا جائے۔ ایک عالم میں اگر کبر ہو' حسد ہو' بغض ہو' کینہ ہو حب جاہ ہو' تو وہ خود بھی ذلیل ہوگا اور علم کو بھی ذلیل کرے گا۔ اسلاف جب علم سیکھ لیتے تھے تو اس کے بعد مستقل طور پر عمل بھی سیکھتے تھے۔ خود دارالعلوم پر نصف صدی ایسی گزری تاوقتیکہ شیخ کامل سے اجازت نہ ہوتی دارالعلوم اپنی علمی سند نہ دیتا گویا علم وعمل کی تکمیل کا نام سند تھا۔

علم وخشیت

میں نے آپ کے سامنے جو حدیث پڑھی تھی۔ یعنی نہ تو کوئی طالبعلم کبھی سیر ہوتا ہے' اور نہ طالب دنیا سیر ہوتا ہے۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ کسی طالب مال کو کسی حد پر قناعت ہوتی ہے اور نہ طالب علم کو بلکہ حرص بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اگر کسی کے پاس سو روپیہ ہے تو وہ دوسو کی خواہش میں لگا ہوتا ہے۔ اگر دوسو ہیں تو چار سو کی خواہش ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی عالم کو اگر سو مسئلے معلوم ہو گئے تو دوسو معلوم کرنے کی کوشش میں رہتا ہے جب علم کی طلب اس درجہ تک پہنچ جائے گی تو علم خود ہی عمل کو دعوت دے گا' اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا.

جس قدر علم بڑھتا جائے گا خشیت بڑھتی جائے گی۔ اور جب خشیت بڑھے گی تو آپ یقیناً طاعت کی جانب مائل ہوں گے۔ اس لئے کہ علم کے لوازم میں عمل ہے۔

راہنمائی کی تیاری کا زمانہ

اب تو آپ حضرات کا طالب علمی کا زمانہ ہے ابھی آپ دوسروں کی نگرانی میں رہتے ہیں اور یہاں رہ کر آپ صالح بن رہے ہیں مگر یہاں سے جانے کے بعد آپ خود نگران بنیں گے اور آپ کو مصلح بننا ہوگا پھر آپ کے سامنے مختلف قسم کے مسائل آئیں گے اور اس کے مطابق آپ کو تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی' آپ کے سامنے ملک وقوم کے حالات ہوں گے اور آپکو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت قوم میں کون سی بیماریاں ہیں؟ کیا کوتاہیاں ہیں۔؟ ان کے اسباب کیا ہیں؟ اور ازالہ کی تدابیر کیا ہوں گی؟

ایسے ہی یہاں سے نکلنے کے بعد آپکے سامنے شرک وبدعت کا میدان ہوگا' اور عیسائیت ویہودیت سے بھی مقابلہ رہے گا۔ اگر آپ نے ان کاموں کے لئے ابھی سے تیاری نہ کی اور محنت ومشقت کر کے میدان کو ہموار نہ کر لیا تو آگے چل کر آپ کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا وہ ظاہر ہے۔

میری خواہش ہے کہ آپ یہاں سے صرف عالم اور صالح بن کر نہ نکلیں بلکہ معلم اور مصلح بن کر نکلنے کی کوشش کریں۔ اس لئے کہ قوم منتظر ہے کہ ہمارے نونہال دارالعلوم میں پڑھے گئے ہیں وہ آئیں گے ہماری اصلاح کریں گے۔ ہمیں غلط راستے سے ہٹا کر صحیح راستے پر لگائیں گے اور ہماری پریشانیوں کا حل ہوں گے۔ لہٰذا پہلے ان چیزوں کے سلسلے میں خود بھی سوچیں۔ اس کا حل نکالیں۔ اپنے اساتذہ سے سوالات کریں پھر نہ آپ کو ایسا وقت ملنے گا نہ ایسے اساتذہ ملیں گے۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ ہم یہ سب کرتے رہتے ہیں تو خیر کوئی حرج نہیں اس لئے میں نے یہ چند باتیں آپ لوگوں سے عرض کردیں۔

خلوص ومحبت کا شکریہ

آپ نے جس محبت وخلوص سے یاد فرمایا میں اس کا شکر گزار ہوں اور صرف شکر گزار ہی نہیں اس لئے کہ یہ تو ایک وقتی اور رسمی چیز ہوگئی ہے۔ میں آپ حضرات کے لئے خلوص قلب سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو علم نافع اور عمل صالح کی توفیق دے۔۔۔۔ میں کیا ہوں کچھ بھی تو نہیں۔ بس ایک نام ایک نسبت لگ گئی ہے ان بزرگوں کے ساتھ جن کے طفیل میں ہم اور آپ آج یہاں موجود ہیں۔ غالب نے کہا ہے ۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ہمارا تو جو کچھ بھی ہے انہیں بزرگوں کی وجہ سے ہے۔ ہمیں تو روٹیاں بھی مل رہی ہیں۔ تو انہوں بزرگوں کے طفیل میں' سپاسنامے اور تعارف میں تو اکثر مبالغے ہی سے کام لیا جاتا ہے اور اس میں ایران توران کی باتیں کہی جاتی ہیں۔

آپ لوگوں کی جانب سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا ہے اس میں بھی مجھے ہر طرح سے اچھا اور لائق دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر کیا عجب ہے کہ جب اتنے لائق لوگ ایک نالائق کو لائق کہہ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ اتنے لائقوں کی لاج رکھ لیں اور یہی میری بخشش کا ذریعہ بن جائے۔

واخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العالمین.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اِمتیاز دار العلوم

عدم اِعتناء دین کے اس دور میں جبکہ علوم دینیہ سے شدید بعد پیدا ہو چکا ہے' اس دار العلوم کا قائم رہنا اور ترقی کرتے رہنا' یہ اس کی علامت ہے کہ یہ منجاب اللہ قائم ہے۔ چنانچہ جب کبھی مخالفین کی جانب سے ایسی سعی کی گئی کہ چندہ نہ آئے تو اس سال میں چندہ نسبتاً زیادہ ہی آیا۔ اور مخالفین کو اپنے مقصد میں شرمندگی اٹھانی پڑی۔۔۔۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دور پر فتن میں دار العلوم کا قائم رہنا' اسباب کے درجہ میں نہیں ہے' بلکہ غیبی امداد و اعانت ہے جو اس کو چلا رہی ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ'

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہ' وَ نَسْتَعِیْنُہ' وَنَسْتَغْفِرُہ' وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہ' وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہ' وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہ' لَاشَرِیْکَ لَہ' وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُہ' وَرَسُوْلُہ' اَرْسَلَہ' اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْراً وَّ نَذِیْراً وَّ دَاعِیاً اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً...............اَمَّابَعْدُ.........

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ . بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. وَمَا کَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا کَآفَّۃً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَۃٍ مِّنْھُمْ طَآئِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ وَلِیُنْذِرُوْا قَوْمَھُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَیْھِمْ لَعَلَّھُمْ یَحْذَرُوْنَ ٥

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ.

ایک بڑی کمی

بزرگانِ محترم اور برادران عزیز طلبہ!

پروگرام میں عربی تقریروں اور نظموں کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا نمبر

تھا۔ افسوس ہے کہ وہ اس وقت یہاں موجود نہیں ورنہ ارشادات گرامی سے مستفیض فرماتے۔ اگر حضرت موجود ہوتے تو ہم سب کے لئے کار آمد اور مفید ہوتا۔ میں نے حضرت مولاناؒ سے عرض کیا تھا کہ اگر آپ جلسہ انعام کی تاریخوں میں شرکت نہ فرما سکیں تو جلسہ کو موخر کیا جائے۔ مگر حضرت نے پسند نہ فرمایا اور وعدہ کیا کہ حتی الامکان شرکت کی سعی فرمائیں گے۔ اس وقت ہمیں ایک بڑی کمی محسوس ہو رہی ہے جلسہ کی غرض و غایت تقسیم انعام اور طلباء کی حوصلہ افزائی ہے۔ اور جس شعبہ کے طلبہ کو یہ انعام دیا جاتا ہے اس شعبہ کے صدر حضرت مولاناؒ ہیں۔

مہمانوں کا شکریہ

جلسہ کے واجبات کے متعلق چند ضروری باتیں بھی مجھے عرض کرنا ہیں۔ دارالعلوم کی جانب سے باہر سے تشریف لانے والے مہمانوں کا شکر گزار ہوں کہ اس سخت اور تکلیف دہ گرمی کے موسم میں انہوں نے شرکت کے لئے زحمت گوارہ فرمائی۔ بالخصوص دہلی سے آنیوالے حضرات کاروباری لوگ ہیں۔ وہ اپنے کاروبار کو چھوڑ کر ہماری طلب پر تشریف لائے ہیں۔ اس لئے یہ حضرات ہمارے شکریہ کے بہت زیادہ مستحق ہیں۔ ان حضرات کا یہاں آنا کسی مالی غرض کی بناء پر نہیں ہے بلکہ در حقیقت اس کا سبب وہ محبت ہے جو انہیں دارالعلوم سے ہے۔

امسال جلسہ کے انعقاد میں کچھ موانع تھے اور خیال تھا کہ جلسہ نہ ہو سکے گا مگر ابھی چند دن ہوئے کہ یہ ارادہ ہوا۔ اس لئے بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ وقت بہت کم ہے اس لئے دعوت مختصر دی جائے۔ مجھے آپ حضرات سے دارالعلوم کا تعارف کرانا نہیں ہے اور نہ آج دارالعلوم کسی تعارف کا محتاج ہے۔

تاسیس دارالعلوم کا امتیاز

مگر اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ دارالعلوم کی تاسیس دوسرے اداروں سے بالکل مختلف ہے۔

جو ادارہ قائم ہوتا ہے اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ چند اہل الرائے ایک جگہ جمع ہو کر باہمی مشورہ سے سوچ کر ایک چیز طے کرتے ہیں۔۔۔۔۔ مگر دارالعلوم کی تاسیس اس سے مختلف ہے۔ دارالعلوم الہام غیب اور اہل اللہ کے قلوب پر انکشاف واردات کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے تواتر کے ساتھ سنا ہے کہ اس زمانہ میں جس قدر اہل اللہ اور بزرگ تھے ان سب کے قلوب پر یہ منکشف ہوا۔ غرض یہ کہ اس طور پر ان حضرات میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے انکشاف اور منجانب اللہ الہام کا اظہار فرمایا۔ اس طرح پر یہ ادارہ قائم ہوا ہے۔ دارالعلوم کی بنا الہامی طور پر ہے رسمی اور

حسی طور پر نہیں ہے۔ دار العلوم کے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ تھے جو اگرچہ امی محض تھے مگر نہایت باکمال اور صاحب حال بزرگ تھے۔ دار العلوم کے لئے جب بنیادیں کھودی گئیں تو وہ احاطہ جو اس کے لئے مخصوص کیا گیا تھا بہت مختصر تھا۔ رات کو حضرت مولانا خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے۔ یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے احاطہ کا طویل و عریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے۔ مولانا نے صبح اٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے۔ بلا کسی مشورہ کے ان ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر تعمیر کا کام شروع کرادیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جس ادارہ کی بنیاد الہامات پر قائم ہو اس کی کیفیت یقیناً دوسرے اداروں سے مختلف ہوگی۔

طلباءِ کرام کا امتیاز

یہاں سے جو طلباء فارغ ہو کر جاتے ہیں ان کا تعین بھی منجانب اللہ ہوتا ہے اور جو طلباء یہاں پڑھتے ہیں وہ بھی منجانب اللہ منتخب ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک طالب علم مطبخ سے کھانا لیکر آیا اور شوربہ کا پیالہ مولانا کے سامنے اوندھا کر کے کہنے لگا کہ "یہ شوربا کھانے کے لئے ہے یا وضو کے لئے؟" اس طرح تند و تیز باتیں کر کے چلا گیا۔

مولاناؒ نے دریافت فرمایا یہ کون تھا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ فلاں طالب علم ہے۔ مولاناؒ نے وثوق کے لہجے میں فرمایا کہ یہ طالب علم نہیں ہے اور نہ یہ طالب علم ہو سکتا ہے چنانچہ تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ اس شخص نے فرضی طالب علم ظاہر کر کے دھوکہ سے کسی طرح مطبخ کے رجسٹر میں اپنا نام لکھوالیا ہے اور فی الحقیقت طالب علم نہیں ہے۔

اس واقعہ کے بعد لوگوں نے مولاناؒ سے دریافت کیا کہ آپ نے وثوق کے ساتھ کس طرح اس کے طالب علم ہونے سے انکار کیا تھا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ یہاں جس قدر طالب علم پڑھنے کے لئے آتے ہیں ان سب کی شکلیں مجھے دکھلادی گئی ہیں۔ چنانچہ جب میں نے اس شخص کو بغور دیکھا تو دکھلائی ہوئی شکلوں میں اس صورت کا کوئی شخص نہیں تھا۔ اس لئے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ہرگز طالب علم نہیں ہے۔

حصولِ علم کا امتیاز

احاطہ مولسری میں جو کنواں ہے اس کے متعلق مولاناؒ نے خواب میں دیکھا کہ کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیالہ سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ بعض کے پاس چھوٹے برتن میں اور بعض کے پاس بڑے برتن ہیں۔ ہر

شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھروا کر لے جاتا ہے۔

مولاناؒ نے برتنوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی تعبیر یہ فرمائی کہ اس ہر شخص کا ظرف علم مراد ہے۔ جس شخص کا جس قدر ظرف ہے اس مقدار میں علم اس کے نصیب و حصہ میں آئے گا۔

دار العلوم کے انتظام وانصرام کا امتیاز

اس ادارہ کے اصول وفروع بھی الہامی طور پر واقع ہوئے ہیں۔ مجھے اپنے ۲۵۔۲۶ سال کے زمانہ اہتمام کا تجربہ ہے۔ اس دوران یہ چیز نہایت شدت سے محسوس ہوتی رہی ہے کہ کوئی غیبی طاقت ہے جو اس ادارہ کو چلا رہی ہے اور اس کا دارومدار ظاہری جدوجہد سے بالاتر کوئی باطنی قوت ہے جو اس کو تھامے ہوئے ہے، ہمارے اندر بہت سی خامیاں ہیں مگر اکابر کا فیض ہے کہ کام برابر چل رہا ہے ورنہ آج کے دور میں علوم دینیہ کا ذوق رکھنا ایسا ہی ہے جیسے پہلے زمانہ میں ملامتیہ فرقہ تھا۔ اسی طرح آج جس کو ملامت سننی ہو وہ مولوی ہو جائے۔ عدم اعتناء دین کے اس دور جب کہ علوم دینیہ سے شدید بعد پیدا ہو چکا ہے۔ اس دار العلوم کا قائم رہنا اور ترقی کرتے رہنا یہ اس کی علامت ہے کہ یہ منجانب اللہ قائم ہے۔ چنانچہ جب بھی مخالفین کی جانب سے ایسی سعی کی گئی کہ چندہ نہ آئے تو اس سال نسبتاً زیادہ آیا اور مخالفین کو اپنے مقصد میں شرمندگی اٹھانی پڑی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دور پر فتن میں دار العلوم کا قائم رہنا اسباب کے درجہ میں نہیں ہے بلکہ غیبی امداد واعانت ہے جو اس کو چلا رہی ہے۔

غالباً سن ۹۴ ہجری کا واقعہ ہے اور یہ پہلا سال ہے میرے اہتمام کا' مولوی گل محمد خان صاحبؒ جو خزانہ کے تحویلدار اور تقسیم تنخواہ کے ذمہ دار تھے۔ رجب کی آخری تاریخ میں میرے پاس آئے اور بتلایا کہ خزانہ میں ایک پائی نہیں ہے اور کل پرسوں کو ڈھائی ہزار روپیہ تنخواہ کی صورت میں تقسیم کرنا ہے۔ میں نے کہا فکر کی کیا بات ہے جس کا کام ہے وہ خود چلائے گا۔۔۔۔ ان کی رخصت کر کے حضرات مدرسین کو میں نے کوٹھی پر بلا کر دریافت کیا کہ آپ دار العلوم میں کیوں پڑے ہوئے ہیں اور کیا مقصد ہے؟ آیا دین کی خدمت مقصود ہے یا تنخواہ حاصل کرنا۔

مُدرّسین کرام کا امتیاز

سب نے بیک زبان ہو کر جواب دیا کہ ہمارا مقصد اس مقدس امانت کی خدمت ہے جو اکابر نے ہمیں سونپی ہے۔ حاشا وکلا تنخواہ پر کبھی ہماری نظر نہیں رہی۔ میں نے کہا اگر تنخواہ نہ ملے تو آپ کیا کریں گے؟ جواب دیا کہ فاقہ کریں گے اور پڑھائیں گے۔ میں نے کہا الحمد للہ اب آپ مطمئن رہیں۔ دار العلوم بھی انشاء اللہ چلے گا اور آپ کی تنخواہیں بھی ملتی رہیں گی خزانہ میں اس وقت ایک پیسہ نہیں ہے۔ دعاء کیجئے کہ اکابر کی اس امانت

کے باقی رکھنے میں اللہ تعالیٰ ہمیں رسوائی سے بچائے۔ سب نے مل کر خشوع خضوع سا تھ دعا کی جس کا اگلے دن یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ ابھی تنخواہ کا وقت نہ آیا کہ حق تعالیٰ نے ڈھائی ہزار روپیہ بھیج دیئے۔ دو ہزار روپے کلکتہ کے ایک تاجر کی طرف سے تھے اور پانچ سو میرٹھ کے مشہور رئیس خان صاحب شیخ رشید خان صاحب آرمی کنٹر کٹر کے جو اتفاقیہ دہرہ دون جاتے ہوئے دیوبند تشریف لائے اور پانچ سو کا عطیہ دے گئے۔ غرض یہ کہ دار العلوم کی بناء بھی غیبی امور کے اوپر ہے اور کاموں کا انصرام بھی منجانب اللہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور اس طرح اپنی ترقیات کے ساتھ روز بروز دار العلوم آگے بڑھ رہا ہے۔

عرصہ سے یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ جلسہ انعام عظیم الشان پیانہ پر کیا جائے اور ملک کے تمام بہی خواہوں کو دعوت دی جائے اور قدیم طلبہ کو بھی بلایا جائے۔ مگر ملک کے ہنگامی موانع نے ہمیں باز رہنے پر مجبور رکھا۔ بہت ممکن ہے کہ سال آئندہ ہم اس میں کامیاب ہو جائیں۔

روح دار العلوم

تعلیمی اداروں کی اصل قابل اعتناء چیز روح ہے عمارات نہیں ہیں۔ یہاں کی اصل روح تعلیم ہے۔ اگر دار العلوم تعلیمی مقاصد میں کامیاب ہے تو اس نے اپنے مقصد کو پورا کر دیا اور اس روپیہ کو ٹھکانے لگا دیا جو قوم نے اس کو دیا تھا۔ اس کا اندازہ امتحانات کے نتائج سے ہو سکے گا جو ابھی آپ کے سامنے بیان کئے جانے والے ہیں۔ اس سال دار العلوم میں تین مزید شعبوں کا اضافہ ہوا ہے

ایک شعبہ صنائع کا ہے جو طلبہ کو صنائع سکھلائے گا۔ عام طور پر علماء کا نفقہ قوم پر ہے۔ جو لوگ فی سبیل اللہ کار خیر میں محبوس ہیں قوم کا فرض ہے کہ وہ ان کی امداد کرے۔ مگر حالات کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کو ان کی معاش سے مطمئن کر دیا جائے۔ اس شعبہ میں ۷ افراد کام کر رہے ہیں۔ اس کا دوسرا جز فن کتابت ہے۔ اس کی بنیاد سن ۶۴ ہجری میں ڈالدی گئی تھی۔ اس شعبہ میں اس وقت ۴ آدمی کتابت کا فن سکھلا رہے ہیں۔

دوسرا شعبہ ورزش کا ہے روحانی غذا کے ساتھ جسمانی غذا کے لئے شعبہ ورزش کھولا گیا اس شعبہ میں دو استاد کام کر رہے ہیں۔ آج صبح اس شعبہ کے معائنہ میں دہلی کے حاجی محمد یوسف صاحب نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے تیس روپے بطور انعام کے طلبہ کو دیئے ہیں۔

تیسرا شعبہ جمعیت الطلبہ کا ہے۔ یہ سلسلہ تو بہت قدیم ہے مگر اس سال اس کو باضابطہ بنا دیا گیا ہے۔ سال آئندہ اس کی کارگذاری تفصیل کے ساتھ معائنہ کرائی جا سکے گی۔ اس کے چار شعبے ہیں۔ ۱۔ عربی تحریر' ۲۔ اردو تحریر' ۳۔ عربی تقریر' ۴۔ اردو تقریر۔

طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے اب انعام تقسیم کیا جائے گا۔ تا کہ کامیاب طلبہ میں شوق اور ترغیب پیدا ہو اور جو لوگ ناکام رہے وہ شرمندہ اور خجل ہو کر آئندہ محنت سے تعلیمی امور میں منہمک ہوں۔ اگر چہ یہ سلسلہ نہایت غیر دلچسپ اور خشک ہے مگر اصل میں یہی تعلیم کے نتائج کا نچوڑ اور معیار ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ پوری توجہ سے اسے ملاحظہ فرمائیں گے۔

واخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آزادی ہند کا خاموش راہنما

اس سے اندازہ کر لیا جائے کہ اس دار العلوم کی تحریک کا مرکزی نصب العین صرف تعلیم ہی کی حد تک محدود نہ تھا' بلکہ اس کے ضمن میں آزادی پسندی' غلام شکنی' اسلامی اتحاد' وطنی اتحاد' قومی خود مختاری' حق خود ارادیت' معاشی استغناء و سائل قوت کی فراہمی' رابطہ عوام' تالیف خواص وغیرہ کے ملے جلے کار فرما تھے۔۔۔ اور دار العلوم کی تاسیس ایک "خاص مکتب فکر" کی تاسیس تھی۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ'

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَ نَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا............ اَمَّابَعْدُ............

آزادی کی خوشی کی تکمیل

آج ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء ہے جو ہندوستان کا یوم آزادی ہے۔ ملک کا ہر ایک باشندہ خوشیاں منا رہا ہے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ آزادی سے بڑھ کر خوشی منانے کی اور کوئی چیز ہو بھی نہیں سکتی جبکہ آزادی ہی ہر خوشی کا سرچشمہ ہے لیکن یہ آزادی ہمیں اچانک نہیں مل گئی۔ اور آسمان سے بارش کی طرح ایک دم برس نہیں گئی' بلکہ کتنے ہی صبر آزما دِنوں' مہینوں اور سالوں' کتنے ہی دار ورسن کے ہنگاموں۔۔۔ اور قید و بند کے ہیبت ناک کٹہروں بلکہ کتنی ہی تڑپتی ہوئی لاشوں سے گزر گزر کر یہ آزادی کی دولت ہم تک پہنچی ہے۔ گو آج کی تاریخ میں آزادی کا پارسل سمندروں سے گزرتا ہوا ہندوستان پہنچا' کتنے طوفانوں میں سے نکلا اور کتنی خطرناک خلیجیں اس کی راہ میں حائل ہوئیں جن کا

آہنی قسم کے انسانوں نے مقابلہ کیا۔ ایسے اہم سوالات ہیں جن سے ہماری تاریخ وابستہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے آزادی کی خوشی کے ساتھ اگر ان غموں کی اور غم سہنے والی عظیم المرتبت شخصیتوں کی داستان سامنے نہ لائی جائے جو آزادی کے اولین علم بردار تھے تو نہ آزادی کی خوشی۔۔۔ ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ اور نہ یوم آزادی کوئی روشن دن ہی بن سکتا ہے کیونکہ ہماری خوشی کی تعمیر ان ہی کے غموں اور غم خواریوں کی اساس پر کھڑی ہوئی ہے۔ اگر وہ قید و بند اور دار و رسن کا غم نہ کھاتے تو یہ آزادی کی خوشبو ہمارے دماغ تک نہ پہنچتی۔۔۔ اس لئے ہماری خوشی ان کی آزادی خواہانہ روشوں کا تذکرہ کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

آزادی کا ہیرو

ایسی بلند پایہ شخصیتیں کافی تعداد رکھتی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے موقعہ پر سر فروشی کے جوہر دکھلائے اور ایثار قربانی سے گو اپنے کو ختم کر لیا۔

مگر آنے والے نسلوں کے لئے آزادی کی خوشیاں منانے کی فضائیں ہموار کر گئے ان میں متعدد شخصیتیں آزادی کے ہیرو کی حیثیت رکھتی ہیں جن کے تذکروں سے تاریخ کا دامن بھرپور ہے۔

میں اس موقعہ پر اس نامور اور عظیم القدر شخصیت اور اس کی اُصولی شاہراہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نہ صرف ذاتی طور پر حصہ ہی لیا اور نہ صرف ایک ہیرو بلکہ امیر لشکر و سپہ سالار فوج کی حیثیت سے شاملی کے میدان جنگ میں پیش قدمی کی کہ اس میں اور شخصیتیں بھی پیچھے نظر نہیں آتیں بلکہ جنگ کی فتح و شکست کو آنکھوں میں رکھ کر آزادی پسندی اور آزادی خواہی کی ایک ایسی اصولی شاہراہ ڈال دی جس سے جماعتیں آزادی ضمیر، آزادی زبان و قلم اور آزادی ملک و ملت کے جذبات کی اساس راہ پر پڑ گئیں اور جو فتح شاملی کا میدان کارزار تیغ و سناں سے نہیں پا سکا تھا وہ ان اصولوں کے ہتھیاروں سے قلم و زبان کے میدان میں نظر آگئی اور نظر بازوں سے ہمکنار ہو گئی۔

میری مراد اس سے حضرت اقدس حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ بانی دارالعلوم دیوبند کی ذات گرامی ہے جو اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ کے دل و دماغ کے علماً و عملاً امداد الٰہی لسان کی حیثیت سے اولاً شاملی کے ۵۷ء کے میدان میں سامنے آئے اور اس ہنگامہ رست و خیز کے خاتمہ پر انہوں نے علم کی رونمائیوں کے لئے دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی۔

شاملی کے میدان کی تلافی

گویا شاملی کا میدان اور دار العلوم کی زمین ایک ہی حقیقت کے دو رخ تھے فرق تیغ و سناں اور قلم و زبان کا تھا وہاں تشدد کے ساتھ آزادی ملک و ملت اور آزادی مذہب و دین کا نصب العین سامنے تھا اور یہاں عدم تشدد کے ساتھ علمی ، اخلاقی اور آئنی رنگ میں وہی منصوبہ پیش نظر تھا وہاں اس نصب العین کے لئے افراد استعمال کئے جارہے تھے اور یہاں اس کے افراد بنائے جانے لگے وہاں نام میدان جنگ کا تھا اور یہاں نام مدرسہ ، مکتب امن و صلح کا تھا۔ وہاں قلب و دماغ کے اشاروں پر ہاتھ پیر کام کر رہے تھے اور یہاں براہ راست دل و دماغ نے خود اپنے تصرفات دکھلائے۔

غرض حضرت والا نے میدان شاملی کے نتائج پیش نظر رکھ کر دار العلوم دیوبند کی تاسیس کی اور اس کے اصول اور نظام کار کو ایسے انداز میں اٹھایا کہ شاملی کے میدان کی تلافی ہو اور جو منصوبہ اس وقت کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا تھا وہ اب ہو جائے۔

سیاسی محکومیت کے ازالہ کی واحد تدبیر

حضرت والا نے دار العلوم دیوبند بلکہ ۵۷ کے بعد تمام دینی مدارس کے لئے آٹھ اصول کا ایک دستور اساسی مرتب فرمایا جو دار العلوم کی معنوی تاسیس تھی۔ اس کی ہشت گانہ دفعات میں اپنے ذہن کا وہ جمہوری نظام جس کو آپ وقت کی پکار سمجھ رہے تھے۔ جو ایک طرف اگر علاقہ کے خواص پر مشتمل تھا تو دوسری طرف اس کی روح رابطہ عوام سے تھی ذہن سے نکال کر کاغذ پر رکھ دیا۔

حضرت والا ان اصول کے راستہ سے قوم کو حکومت وقت اور امراء عصر سے بے نیاز کر کے حق خود ارادیت اور حق خود اختیاری کے ساتھ اپنے قدموں پر کھڑا کرنا چاہتے تھے کیونکہ جو قوم خود اپنی قدرت سے قادر نہ ہو وہ ہمیشہ دوسروں کے رحم و کرم پر جیتی ہے اور وہ جینا زندگی نہیں موت بصورت حیات ہے۔

حضرت نے ۱۸۵۷ء کے بعد بھانپ لیا تھا کہ اگر قوم میں ملک و سیاست کے ساتھ علم و اخلاق اور ذہن و فکر میں بھی حق خود ارادیت باقی نہ رہا تو اس قوم کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی۔ اور وہ کبھی بھی اجتماعی طور پر خود اختیار بن کر نہ ابھر سکے گی۔ اس لئے حضرت والا کے نزدیک قوم کی سیاسی محکومی اور اجتماعی غلامی کے ازالہ کی واحد تدبیر ہی یہ تھی اور واقعۃً یہی تھی کہ قوم کو علم و دین کے راستے سے اجتماعیت کی لائنوں پر ڈال دیا جائے۔

اور یہ جب ہی ممکن تھا کہ تعلیم و تربیت کے نظام کو شخصیاتی لائن کی بجائے جماعتی اصول پر قائم کیا جائے تاکہ ایک طرف تو عوام کی قوت اس کے ساتھ ہو جائے اور دوسری طرف اس تعلیم اور

نظام تعلیم کے پروردوں میں دینی حدود کے ساتھ جمہوری تنظیم کا مذاق پیدا ہو جائے۔

حضرت والا دل کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے کہ زمانہ عوام کو ابھارنے والا ہے۔ حکمرانی کی قوتیں عوام کی طرف منتقل ہونے والی ہیں۔ اگر یہ صورت حال خودرو طریق پر ہوئی تو اس عوامیت میں لادینی کجراثیم کار فرما ہو جائیں گے جس سے اس دین شعار قوم کی حقیقی بنیادیں ہی ختم ہو جائیں گی اور اس کا قومی وجود ہی سرے سے باقی نہ رہے گا۔

اس لئے آپ نے اس ادارہ میں تعلیم تو خالص دین کی جاری فرمائی اور نظام تعلیم یعنی نظم ادارہ کے اصول اجتماعی اور جمہوری رنگ کے رکھے تاکہ دین اور نظم دونوں کے مجموعہ سے قوم میں دینی خود اختیاری قوت پیدا ہو جائے کہ اَلْمُلْکُ وَالدِّیْنُ تَوْاَمَانِ (ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں) ایک سے دوسرا جدا نہیں ہو سکتا۔

جہادِ شاملی کے رُخ کی تبدیلی حضرت والا کے ان اصول میں ہشت گانہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اصول لکھتے وقت آپ گویا شاملی کے میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ قوم کی ہزیمت و شکست کا منظر آپ کے سامنے ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت مسلطہ شکست خوردہ قوم کے حقوق آزادی کو کچل رہی ہے اور اس کے بنیادی تشخص اور حق خودارادیت کو ساتھ ہی اس کے مذہب اور قومی بنیادوں جن پر اس کی قومی شخصیت کی عمارت کھڑی ہوئی ہے پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے جیساکہ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی میں ملیں گی جن کا سلسلہ ۵۷ء سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔

حضرت والا نے ۵۷ء کی شکست کے بعد محسوس کیا کہ اب تلوار سے مقابلے کا وقت نہیں ہے تو آپ لوہے کی تلوار میان میں کر لیتے ہیں اور تعلیمی لائن کے ہتھیار میان سے نکال کر میدان مقابلہ میں آجاتے ہیں گویا شاملی کا جہاد ابھی ختم نہیں ہوا صرف رخ بدلا ہے۔ اور ہتھیاروں کی نوعیت تبدیل ہوئی ہے۔

اس ٹھنڈے مقابلہ کا پہلا قدم قوم کی سنبھال اور رکھوالی تھی جبکہ اسے ناتربیتی اور لاتعلیمی ہی کی وجہ سے شکست اور ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس لئے اس جدید اقدام میں تعلیم و تربیت کے راستے سے قدیم ناتربیتی اور لاتعلیمی کے اثرات زائل کرنے تھے احساس کمتری کو دلوں سے دور رکھنا تھا تاکہ حوصلوں میں فرق نہ آجائے۔

آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ دوسرا قدم دین کی اخلاقی تربیت، پاکیزگی نفس اور جذبات حب فی اللہ اور بغض فی اللہ سے قوم کی تعمیر تھی تاکہ آزادی

ضمیر کی روح اس میں مستحکم ہو جائے۔

تیسرا قدم علم و عمل اور اخلاق کے ان سانچوں میں حریت نفس اور آزادی ملک و ملت کے ایسے جذبات کا رنگ بھرنا تھا جن میں فکر و بصیرت کے ساتھ اخلاص و ایثار اور قوم پروری کی روح دوڑ رہی ہو۔

دارالعلوم کے یہ بنیادی اصول اجتماعی روح کے ساتھ حضرت نے اس وقت واضح فرمائے جبکہ نئے تسلط و اقتدار کے زیر اثر سر برآوردگان ملک عوام کے جذبات سے الگ ہو کر طاقت متسلطہ کی گود میں اپنے کو ڈال رہے تھے "حریت کاری" کے بجائے "وفاداری" کا خمار خود سروں کے سروں میں بھر چکا تھا اور قومی رشتے حکومتی رشتوں پر بھینٹ چڑھائے جا رہے تھے حضرت نے اس وقت ان آٹھ اصولوں کے راستہ سے استغنائی رنگ میں اس ادارہ کی بنیاد رکھی اور اس علمی تنظیم سے خواص کے ذریعہ عوام کو ابھارنے اور مضبوط بنانے کا پرواز ڈالا۔ اور ملک کے اونچے طبقہ سے ہٹ کر جو حکومت کی گود کی طرف بڑھ رہا تھا ایک آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ ان اصول کے راستہ سے کر لیا۔

ان اصول اور ان کے بنائے ہوئے علمی اداروں یعنی دارالعلوم دیوبند اور اس کی فروعات سے ملک کی علمی اور دینی خدمات کیا ہوئیں؟ اور ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے ایک ایک کونے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں علم اور اخلاق اور قال اللہ و قال الرسول کی روشنی کس حد تک پہنچی اور پھیلی؟

اس تحریر میں میرا موضوع بحث نہیں۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ اس کے علاوہ اجتماعی رجحانات اور ان کے علمی نتائج کس حد تک ظاہر ہوئے؟

خاموش راہنمائی کے آٹھ اُصول

سوان کا اجمالی خاکہ سامنے لانے کے لئے پہلے ان اُصولِ ہشت گانہ کا متن پڑھیے اور پھر ان کے پیدا کردہ ذوق اور ذوق سے پیدا شدہ عملی آثار کو دیکھئے!

اُصول کا متن جو حضرت والا کے قلم کا لکھا ہوا خزانہ دارالعلوم میں محفوظ ہے حسب ذیل عنوان سے شروع ہوتا ہے:

وہ اُصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں

اس عنوان کے نیچے حسب ذیل آٹھ اُصول قلم بند فرمائے گئے ہیں۔

۱۔ اصل اوّل یہ ہے کہ تا مقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲۔ اِبقاءِ طعام طلبہ مل کر افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی تر رہیں۔

۳۔ مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اُسلوبی ہو۔ اپنی بات کو پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنا پر تزلزل آجائے گا۔

القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کی سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہماری مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے۔ اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم اُمورِ مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں۔۔۔یا کوئی وارد صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہلِ مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقداری معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ کو کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

۴۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

۵۔ خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہو گا اور اگر ہو گا تو بے فائدہ ہو گا۔

۶۔ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ'
تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع اِلی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامان ملحوظ رہے۔

۷۔ سرکار کی شرکت اور اُمرا کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸۔ تامقدور ایسے لوگوں کا چندزیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

جمہور کا ادارہ اور عوام سے رابطہ ان اصول ہشت گانہ کی رو سے حضرت والا نے:

ا۔ سب سے پہلے اس ادارہ کو عوامی اور جمہوری قرار دیا اور اس کی کفالت کا بار عوامی چندوں پر رکھا تاکہ یہ ادارہ سرکاری یا کسی مخصوص پارٹی کا کہلانے کی بجائے جمہوری اور عوامی کہلائے پھر اس کی ضروریات کی اپیل بھی براہ راست عوام ہی سے رکھی جس کا سلسلہ واسطہ بلاواسطہ قائم رکھنے کی ہدایت فرمائی تاکہ کسی وقت بھی ادارہ عوام اور جمہور سے مستغنی نہ ہو اور عوام کی توجہ کسی آن ادارہ سے ہٹنے نہ پائے۔ ساتھ ہی تکثیرِ چندہ کی مساعی جاری رکھنے کی بھی تلقین فرمائی جس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تاکہ جس رفتار سے چندہ بڑھے اسی رفتار سے ادارہ کا حلقہ اثر بھی وسیع ہوتا چلا جائے اور زیادہ سے زیادہ عوام کا رابطہ اس سے قائم ہوتا رہے۔

چنانچہ اسی اصول کی روشنی میں اس ادارہ کی مجلس شوریٰ کو (جو اس نظم ونسق کی ذمہ دار ہے) وکیل اہل چندہ اور مالیات میں نمائندہ عوام قرار دیا گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ عوام نہ صرف چندہ بلکہ بواسطہ مجلسِ شوریٰ اس کے مالی مصارف کے نگران اور مجوزّ بھی ہیں اور اوّل سے آخر تک ادارہ میں انہی کا عمل داخل ہے۔

آج کی دنیا میں سیاسی انقلاب لانے والی یا حکومت چلانے والی جماعتوں کا بنیادی اصول کیا اس سے مختلف ہے؟ ان کے یہاں آج کے جمہوری دور میں انقلاب لانے کا بنیادی اصول رابطہ عوام کے سوا اور کیا ہے؟

اور اس رابطہ کی صورت آخر اس کے سوا کیا باقی ہے کہ عوام کو مرکز سے وابستہ کر کے ان کی قوت سے کام لیا جائے اور انہی کے حصہ رسد سرمایہ سے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ خلافت کمیٹی قائم ہوئی تو اس نے بھی عوام کو ممبر بنا کر رکنیت کی فیس رکھ دی کانگریس کمیٹی رونما ہوئی تو اس نے بھی عوام کی ۴ آنہ ممبری سے کام چلایا۔ دوسری سیاسی پارٹیاں ابھریں تو انہوں نے بھی عوامی ممبر سازی اور رکنیت کی فیس رکھ کر ہی عوام سے رابطہ قائم کیا جس سے انقلابی کام آگے بڑھا۔

حضرت والا نے آج سے سو برس پہلے جب کہ رابطہ عوام کا سسٹم عام نگاہوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ عوام کا ادارہ قائم کر کے عوام کو فیس رکنیت کے عنوان کی بجائے عوامی چندہ کے نام پر ادارہ سے وابستہ کیا۔

کیا اسی طریق کار کو بعد کے مبصروں نے مدارس کی بجائے انجمنوں اور کمیٹیوں کی صورت سے نہیں اپنایا؟ فرق یہ رہا کہ سیاسی انجمنوں کا مقصد کوری سیاست تھی اور اس ادارہ کا مقصد سیاست اور دیانت کا مرکب نصب العین تھا۔ سیاسی کمیٹیوں نے سیاسی عنوان سے کام کیا اور اس ادارہ نے اپنی سیاست کو تعلیمی لائنوں سے آگے بڑھایا۔ جس میں آزادی وطن کے ساتھ آزادی مذہب وملت کی

روح بھی قائم کر دی۔

بہر حال اس اولین اصول کی روح اس عوامی چندہ کی جدوجہد سے ملک کے عوام اور غرباء سے زیادہ سے زیادہ رابطہ کرنا تھا۔ تا کہ ادھر تو عوام اس ادارہ کو اپنی چیز سمجھیں اور ادھر اس علمی ادارہ سے وابستگی کے راستہ سے ان میں علمی شعور پیدا ہو۔

ظاہر ہے کہ جب ہر قوم میں اکثریت عوام اور غرباء ہی کی ہوتی ہے اور وہی قوم کی قوت اور ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں اور اسی لئے ہر اجتماعی کام کا مدار اس رائے عامہ پر ہوتا ہے۔ اس لئے اصول مذکور کی رو سے عوام یا رائے عامہ کو پشت پر لے کر در حقیقت آزادی ملک وملت کی ایک بنیادی قسط حاصل کر لی گئی اور یہ اجتماعیت کی لائن کا پہلا قدم تھا جو اس ادارہ نے جنم لیتے ہی اٹھایا۔

سرکاری اِمداد کا بدل

۲۔ اسی کے ساتھ دوسرے اُصول میں قوم کے غریب بچوں یعنی طلبہ کی امداد طعام وغیرہ اور اس کی افزائش و تکثیر ضروری قرار دی تا کہ ان کی دلجمعی اور وابستگی کے واسطہ سے قوم اور ملک کی اس ادارہ سے وابستگی روز بروز بڑھتی رہے گویا پہلا اُصول اگر رابطۂ عوام کا رکھنا مقرر کیا جو پچاس برس بعد کے انقلاب اور جمہوری حکمرانیوں کی اساس بننے والا تھا تو دوسرے اُصول میں عوام کو خود بھی ادارہ کی طرف بڑھنے کا موقع دیا۔ تا کہ اس دوطرفہ رابطہ سے اتحاد باہمی کی بنیادیں مضبوط تر ہوتی رہیں۔

گو اس دور کے سرکاری لائنوں کے افراد کی طرف اس عوامی چندہ کی تحصیل ووصول اور غریب طلبہ کی امداد کو بھیک مانگنے اور بھیک منگے تیار کرنے سے تعبیر کیا گیا کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے لئے چندہ کے ادارہ کا قیام ایک نئی چیز تھی اور سب سے پہلا چندہ کا مدرسہ دار العلوم ہی تھا جو ۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ۶۷ء میں قائم ہوا۔ لیکن حضرت والا اپنے نورِ فراست سے محسوس کر چکے تھے کہ سرکاری ایڈ کے ساتھ قومی روح کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی اور اس سرکاری امداد کا بدل بجز قومی چندہ کے دوسرا نہیں اس لئے ان مطاعن کی پرواہ کئے بغیر آپ نے انگریزی سرکار کے علی الرغم ادارہ کو اس لائن سے آگے بڑھایا مگر زمانہ کی رفتار نے بہت جلد اس رابطہ عوام کی ضرورت و اہمیت سمجھا دی اور بھیک مانگنے اور بھیک منگے بنانے کا سسٹم بالآخر ہر قوم پرور کو اختیار کرنا پڑا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس بارہ میں دار العلوم نے ملک کی قیادت کی اور قومی اداروں کے قیام کی لائن سے حریت طلبی کا یہ اولین اصول عملی طور پر دنیا کے سامنے لا رکھا۔

تالیف خواص

۳۔ رابطہ عوام کے ساتھ اجتماعی لائنوں میں علاقہ خواص بھی ناگزیر تھا۔ تو حضرت والا نے تیسرا اصول تالیفِ خواص کا رکھا جس کی رو سے اس ادارہ کو شخصیاتی یا انفرادی رکھنے کی بجائے شورائی قرار دیا تاکہ اس کے کام شخصی ہونے کی بجائے جماعتی رنگ سے انجام پائیں کیونکہ شخصیتوں پر مبنی کام شخصیتوں کے اٹھ جانے سے ختم ہو جاتے ہیں لیکن جماعتی کام افراد کے اٹھتے رہنے کے باوجود بقاپذیر رہتا ہے۔

ساتھ ہی ان مخصوص افراد کے رد و قبول کا معیار بھی کھول دیا کہ شورائی ارکان مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ صداقت و ایثار لئے ہوئے ہوں اجتماعیت کا مذاق رکھتے ہوں۔ بات کی پچ اور سخن پروری کی خو نہ ہو کہ اگر کسی کی شخصی رائے نہ چلے تو اس میں واک آوٹ کا جذبہ اُبھر آئے بلکہ حق پسندی کا جذبہ رکھتے ہوں کہ اپنی رائے کے اظہار میں بھی حق نظر آئے تو گردن جھکا دیں۔

پس آزادئ ضمیر تو ایسی ہو کہ اپنی سچی رائے کے اظہار میں جھجک محسوس نہ کریں اور حق پسندی یہ ہو کہ دوسرے کی رائے سمجھ میں آجانے کے بعد مان لینے میں تامل تک نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اس آزادی ضمیر کے ساتھ آزادانہ دستوری فرائض ادا کرنے والوں سے آزاد فضا پیدا ہو سکتی ہے اور ایسی آزاد فضا میں تعلیم بھی ہوگی تو آزاد نظم و نسق بھی ہوگا تو آزاد اور اس سے تربیت پا کر نکلنے والے بھی ہوں گے تو آزاد ضمیر، جو آزاد ہی ماحول پیدا کر دینے کی صلاحیتیں رکھتے ہوں گے۔

پس اس اصول سے حضرت والا نے ذہنی آزادی کی بنیاد ڈال دی جو خارجی آزادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور اس طرح گویا آزادی کی ایک اور قسط حاصل ہو گئی۔

پھر اس تالیفِ خواص کا دائرہ بھی محدود یا تنگ نہیں رکھا بلکہ رائے اور مشورہ کا دروازہ ہر وارد و صادر، ہر ذی عقل اور فہیم آدمی کے لئے کھلا رکھا جو اس قسم کے تعلیمی اداروں اور ان کے مقاصد سے ہمدردی رکھتا ہو۔ گویا علاقہ خواص میں رابطہ عوام کو فکری حد تک بھی نہیں چھوڑا گیا تاکہ ادارہ چند مخصوص اہل الرائے کی آراء میں محدود ہو کر ملک کے عام ذی رائے اور زیرک طبقہ کی فکری اعانتوں سے محروم اور منقطع نہ ہو جائے جو انجام کار کاموں کے نقصان اور جماعتی نظم میں ضعف و اختلال کا سبب ہوتا ہے۔ اور بالآخر نظم میں محدودیت و استبداد پیدا ہو کر جماعتی تعصب اور گروہ بندی کے جراثیم رونما ہو جاتے ہیں جو آزادی کے حق میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ پس اس اصول سے راہ آزادی کا ایک بھاری پتھر ہٹا دیا گیا جو اصول آزادی کی ایک اہم قسط ہے۔

اِتحادِ مشرب

۴۔ مرکز میں مربیّوں کا کارکنوں کا اتحاد مشرب لازمی قرار دیا تاکہ اتحاد خیال

سے جماعت کا نظم متحد اور مستحکم رہے ورنہ در صورت اختلاف مشرب تقابل باہمی پھر اس سے خود بینی و خود ستائی اور اس سے دوسروں کی توہین و آزار رسانی کے جراثیم ابھر کر جماعتی نظم اور داخلی دلجمعی اور جماؤ کو تہ و بالا کر دیتے ہیں انتظامات کی پارٹی فلینگ شروع ہو جاتی ہے جو انجام کار غلامی کی جڑوں کو زیادہ مستحکم کر دیتی ہے جو ایک آزادی پسند اور حریت طلب جماعت کے لئے سم قاتل ہے۔

اس لئے حضرت والا نے اس غلامی شکن اصول سے آزادی کا ایک اور مانع مرتفع فرمادیا یا جماعتی آزادی کے پروگرام کی ایک اور اہم قسط حاصل کرلی جس سے آزادی کی منزل قریب اور یقینی ہو جاتی ہے۔

ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی اِستعداد

۵۔ تجویز نصاب، مقدارِ خواندگی اور اندازِ تعلیم کو اس اصول کی رو سے نہ تو شخصی محض رکھا جس میں وسعت نہ ہو اور نہ عامتہ الناس کے عامیانہ آراء و قیاسیات کے تابع کیا جو عقلی تقاضوں اور مقتضیاتِ وقت سے معرّی ہو۔ بلکہ مشورۂ خاص اور انہی اہلِ علم اور اہلِ تجربہ کی رائے پر مبنی رکھا جو مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے آزاد نہ ہوں تاکہ تعلیم آزاد بھی رہے اور اس میں عامئہ مسلمین کے حالات اور وقت کے تقاضوں کی رعایت بھی ملحوظ نظر رہے،

ظاہر ہے کہ ایسی آزاد مگر مطابق حالات ومقتضیاتِ تعلیم سے دل و دماغ بھی آزاد مگر پابند حدود ہی پیدا ہو سکتے تھے جو اور ایسے ہی معتدل افراد سے ایک ایسے درمیانی قسم کے انقلاب کی توقع باندھی جاسکتی تھی ملک کی ساری قوموں کے لئے قابلِ قبول اور اپنے اپنے دائرہ میں نفع بخش ہو۔ جو نہ بے قید قسم کے انسانوں سے ممکن تھا نہ غلامی پسند اور محدود الخیال افراد سے متوقع تھا۔

پس اس پانچویں اصول نے عمومی آزادی اور ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد پیدا کر دی گئی جس سے آزادی کی منزل قریب سے قریب تر لائی گئی۔

یہ اس سے کچھ مختلف نہیں ہے کہ ہر انقلاب پسند ادارہ اپنے مطلوبہ رنگ کے انقلاب کے مطابق ہی کانسٹی ٹیوشن بنا کر افراد تیار کرتا ہے۔ تنگ دل طبقہ تنگ دلانہ لٹریچر دماغوں میں ٹھونستا ہے۔ اور متعصب آمیز کورس سے دل و دماغ کو تنگ نظر بناتا ہے۔ انجام کار جو طبقہ بھی انقلاب میں غالب آجاتا ہے، انقلاب و تعمیر میں تعصب و تنگ دلی کے مظاہرے ہونے لگتے ہیں اور فرقہ پرستی کے۔۔۔ اس لئے حضرت والاؒ نے نصاب کو کوری آزادی و بے باکی اور خالص بستگی و غلامی دونوں ذہنیتوں سے الگ رکھ کر درمیان میں رکھا جو دل و دماغ میں ہر طبقہ کے لئے گنجائش اور وسعت پیدا کر سکے کہ اسی سے درمیانی قسم کا انقلاب پیدا ہو سکتا تھا۔

روحانیت واخلاق کے ذریعہ سے آزادی کی منزل

۶۔ عطیات اور چندوں کے سلسلہ میں اُمراء پر نظر اور ان کے وعدوں یا جاگیروں یا کارخانہ ہائے تجارت وغیرہ کے مستقل ذرائع آمدنی پر بھروسہ رکھنے سے اس چھٹے اصول میں کافی طور پر ڈرایا گیا ہے؛ تا کہ مرعوبیت اور اسیری دل ودماغ کے جراثیم پرورش نہ پاسکیں اور اداروں یا خود غرض سرمایہ داروں کی نفسانی اغراض کی آمیزش سے پاک رہے، جو ذہنی ہی نہیں خارجی آزادی کے حق میں بھی زبردست رکاوٹ ہیں۔

کیا آج کے دور میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے ختم کرنے کے دعووں سے فضاء عالم گونج نہیں رہی ہے؟ اور کیا ہر انقلابی پارٹی سرمایہ داروں کو راہ سے ہٹانے کی کوشش میں لگی ہوئی نہیں ہے جب کہ وہ دیکھتی ہے کہ مطلوبہ انقلاب میں یہی سرمایہ دار پارٹی اپنے سرمایہ اور عیش پسندانہ وسائل کی حفاظت کی خاطر انقلاب میں حارج ہوتی ہے۔ حضرت والاؒ نے اسے اس وقت محسوس کیا جب مزدور اور سرمایہ دار کا کوئی رسمی سوال دنیا میں پیدا نہیں ہوا تھا مگر پیدا ہونے والا تھا۔

حضرت والاؒ اپنے نورِ فراست اور اپنے مذہب کے اصول کی روشنی میں دیکھ رہے تھے کہ انقلاب لانا کبھی سرمایہ داروں کا کام نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ جفاکش مزدور قسم ہی کے لوگ اس میدان میں آگے آئے ہیں اور اب بھی وہی آگے آئیں گے اس لئے آپ نے اپنے غریب اور متوکل طبقہ کو جس کو اس ادارہ میں تیار کرنا چاہتے تھے، سرمایہ دار طبقہ سے بے نیاز بنا کر الگ کر دیا تا کہ ادھر تو یہ غریب طبقہ اس بیماری سے محفوظ اور ادھر وہ روگ زدہ طبقہ بھی کسی حد تک شفا پا جائے کیونکہ ایک صورت تو اسے بدکا کر اور اس سے رقیبانہ تقابل ڈال کر اسے ختم کرانے کی تھی اور ایک صورت اس سے مستغنی بن کر اسے مفلوج کر دینے کی تھی جس سے وہ خود ہی اپنے روگ کو پہچان کر اسے زائل کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صورت میں کامیابی موہوم اور فساد یقینی تھا اور دوسری صورت میں کامیابی یقینی اور امن واصلاح ے ساتھ، نیز پہلی صورت میں شور وشر اور ڈھونگ زیادہ ہے اور عمل کم اور دوسری صورت میں اس کے برعکس کام اور کار برآری زیادہ ہے اور دعووں کا شور کم۔ نیز پہلی صورت میں سرمایہ داروں کو چونکانا اور مقابلہ کی دعوت دینا ہے اور دوسری صورت میں اسے ایک طرف چھوڑ کر خاموشی سے اس کی راہیں مسدود کر دینا ہے۔ حضرت والاؒ نے اس اصول میں دوسری صورت اختیار فرمائی جو امن وسلامتی کے ساتھ سرمایہ داری کا جنازہ سامنے لے آتی ہے کیونکہ اس میں استغنائی رنگ سے سرمایہ داری کے جذبات کی حقارت دل میں اُتاری گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ استغناء سے سرمایہ داری کو مٹانے والا خود سرمایہ دار بننے کی کبھی آرزو نہیں

کر سکتا۔ لیکن سرمایہ کی محبت سے سرمایہ داری کو مٹانے کا خواہش مند در حقیقت سرمایہ کا خواہش مند ہے جو اپنے رقیب کو راستہ سے ہٹا کر اس کی جگہ لینا چاہتا ہے جس سے سرمایہ دار تو مٹ سکتا ہے مگر سرمایہ داری نہیں مٹ سکتی' ظاہر ہے کہ جب ملک کی اکثریت (جو غیر سرمایہ دار غرباء ہی کی ہوتی ہے) سرمایہ داری سے بے نیاز ہو گئی تو قوم کی اکثریت سے سرمایہ دارانہ جذبات ختم ہو گئے۔ اور غنی کے آگے محتاج خود ہی جھک جاتا ہے۔

اس لئے حضرت والاؒ نے ادارہ کی آمدنی تعمیر اور دوسرے کاموں میں ایک گونہ بے سرد سامانی توکل اور اِستغناء کا اصول رکھ کر ادارہ کو غریبانہ اور متوکلانہ انداز میں چلانا چاہا ہے تاکہ کارکنوں میں تو سرمایہ اور سرمایہ کا غرور پیدا نہ ہونے پائے اور جن کو یہ روگ لگا ہوا ہے وہ ادھر جھک جائیں جس سے ان کے غرور میں کمی آجائے اور اس طرح یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے قریب آجائیں اور ان میں رقابتوں کے جوش سے باہمی نزاعات نہ پیدا ہوں جس سے اولاً ذہنی آزادی اور ضمیر کی حریت ختم ہو جائے اوور پھر خارجی آزادی کے مکانات بعید سے بعید ہو جائیں۔

پس حضرت والاؒ نے اس اصول کے ذریعہ حصول آزادی کی ایک اور منزل قریب کہ دی مگر مادیت کے راستہ سے نہیں بلکہ روحانیت واخلاق کے راستہ سے۔

سرکاری امداد سے اِحتراز کی حکمت

۷۔ ادارہ کے لئے گورنمنٹ کی امداد کو مضر بتلا کر اس سے بچتے رہنے کی ہدایت فرمائی اور اس طرح ادارہ کو سرکار کی مداخلت سے بچا کر تعلیمی آزادی کو برقرار رکھا گیا ہے' جو حقیقی آزادی کی اصلی منزل ہے کیونکہ اقتصادی غلامی ہی بالآخر سیاسی اور انتظامی غلامی پر منتج ہوتی ہے اس لئے اس ساتویں اصول سے اقتصادی آزادی حاصل کی گئی ہے۔

کیا اسی کو ترک موالات نہیں کہتے؟ جس کو سیاسی پارٹیاں مختلف اندازوں سے استعمال کرتی ہیں ۱۹۲۰ء میں بسلسلہ تحریک خلافت اور پھر بسلسلہ تحریک آزادی وطن کھدر پوشی کو رواج دے کر بدیشی کپڑے کا نکاس بند نہیں کیا گیا۔ جس سے مانچسٹر وغیرہ کے کارخانے کافی متاثر ہوئے۔ نیز دیسی صنعتوں کو رواج دے کر بدیشی کپڑے سامانوں کا عملاً بائیکاٹ نہیں کیا گیا اور کیا آج بھی ملکی اور قومی حکومتیں غیر ملکی سامانوں کی در آمد پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر کے ان کا نکاس نہیں روک رہی ہیں تاکہ خود اپنے ملک کی تجارت وصنعت ترقی پائے اور ملک ہر سامان میں غیر ملکوں کا اقتصادی محتاج و غلام رہنے کے بجائے خود کفیل ہو جائے کہ اس کے بغیر ملک کی اپنی بنیادیں مستحکم نہیں ہوتیں ٹھیک اسی طرح اس اصول کی رو سے اس اجنبی حکومت کی در آمد بند رکھی گئی جو ملک کی آزادی کی پامال کنندہ

تھی تاکہ یہ قومی رنگ کے سرمایہ کا دست نگر بن کر اقتصادی غلام کا شکار نہ ہونا پڑے۔ جس سے وہ ہمیشہ سرکاری مداخلتوں کا نشانہ بنا رہا ہے، بہر حال جو مالی عدم تعاون کھدر پوشی اور بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ میں مضمر تھا وہی اس سرکاری ایڈ سے احتراز اور قومی سرمایہ میں محدود رہنے میں مخفی تھا۔ صرف صورت اور مالی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔

اس لئے حضرت والا کی دور بین آنکھ سو سال پہلے وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو دوسروں کی آنکھوں نے بہت بعد میں دیکھا اور پھر بھی پورا نہیں دیکھا۔

سرمایہ داری پر ضرب کاری

۸۔ اس آٹھویں اُصول میں کارکنان اِدارہ کو غریب منش رہنے اور سرمایہ دار بننے سے روکا گیا ہے جیسا کہ چھٹے اُصول میں سرمایہ داری کے خاتمہ کی تدبیر بتلائی گئی تھی۔ کیونکہ اس دفع کا حاصل یہ ہے کہ ادارہ کے سلسلہ میں غرباء کے تعاون اور موالات کو اصل رکھا جائے اور انہیں کے انداز پر غریبانہ انداز میں کام چلایا جائے کہ ادارہ کے لئے یہی پائیداری اور پختگی کا سامان ہے۔

گویا اس دفع کا مفاد تعلیمی لائن سے غیر سرمایہ داروں کی ایک مستقل برداری کا قیام ہے مگر غیر رسمی طور پر بلا انداز تقابل ور قابت جو ظاہر ہے کہ سرمایہ داروں کے مقابلہ میں اقلیت ہی میں رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ان سے بعد اور تنفر کی ہوتی ہے کہ وہ اکثریت کو ضرورت کی حد تک بھی سرمایہ سے محروم کئے رہتے ہیں۔ اس کا ثمرہ یہ نکل سکتا ہے کہ جب اکثریت اپنے کمال قناعت و توکل سے سرمایہ داروں سے مستغنی ہو جائے تو قدرتاً سرمایہ دار اس کے محتاج ہو جائیں گے اور بشوق ورغبت اپنا سرمایہ ایسے انسانوں اور کاموں پر نثار کرنے کے آرزومند ہو جائیں گے جس سے سرمایہ خود بخود باہر آجائے اور غیر سرمایہ داروں کے حقوق قدرتی طور پر وصول ہوتے رہیں۔

اس طرح یہ دفعہ سرمایہ داری کے سر پر ایک ضرب کاری ہے مگر موافقت اور مدارات کے پیرایہ میں جس سے ان دو طبقوں میں منافرت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ آزادی کی راہ کی دراڑ بنے۔ اس لئے اس دفعہ سے بھی اقتصادی آزادی کا ایک اہم مورچہ فتح ہو جاتا ہے۔

تنظیم مدارس آزادی کی خشتِ اوّل

۹۔ یہ حضرتؒ کے آٹھ حکیمانہ اُصول کی تشریح تھی لیکن غور کیا جائے تو ایک نواں اُصول ان کے عنوان سے نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ تنظیم مدارس کا اصول ہے کیونکہ عنوان بالا میں دارالعلوم اور دوسرے مدارس چندہ کو ان ہی اصول ہشت گاہ کے نیچے جمع کر کے انہیں ایک دوسرے کا شریک

ٹھہرلیا گیا ہے جو رابطہ مدارس کی ایک معقول اور موثر صورت ہے اور ظاہر ہے کہ مدارس کا رابطہ مدارس کے فضلاء کا قدرتی رابطہ ہے اس لئے اس اصول میں تنظیم مدارس کے راستہ سے علمی فضلا اور ان کے حلقہ ارادت کی تنظیم کر دی گئی ہے۔ جو انقلاب اور آزادی کے لئے خشت اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

پھر حضرت والاؒ نے صرف نظری ہی طور پر یہ اصول نہیں بتلادیا بلکہ عملی طور پر ان ہی اصول ہشت گانہ کی روشنی میں بہت سے مدارس خود قائم فرمائے اور بہت سے مدارس اپنے متوسلین کے ذریعہ قائم کرائے۔

گویا ۵۷ء کے بعد آپ کی مستقل سیاست ہی یہ تھی کہ جگہ جگہ آزاد قومی مدارس قائم کئے جائیں اور ان میں آزاد ضمیر نوجوان تیار کئے جائیں۔ اگر لارڈ میکالے یہ دعویٰ لے کر اٹھے کہ :

"ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل ودماغ اور طرز فکر سے لحاظ سے انگلستانی ہوں"۔

توان مدارس سے عملی طور پر یہ صدا بلند ہو کہ :

"ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نونہال تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل ودماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے عربستانی اور ہندوستانی ہوں"۔

چنانچہ ایسے ہی نوجوان تیار کرنے کے لئے اگر دیوبند میں دارالعلوم قائم فرمایا تو مراد آباد میں مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا' سنبھل میں مدرسہ عربیہ الگ قائم کیا امروہہ میں مدرسہ جامع مسجد قائم فرمایا۔ گلاوٹھی میں مدرسہ قائم فرمایا۔ انبہٹہ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسہ قائم فرمایا۔

غرض جہاں جہاں حضرت والاؒ خود پہنچے وہاں خود اور جہاں ان کے خدام اور متوسلین پہنچے وہاں ان کے واسطے سے بتاکید تمام آزاد مدرسے قائم فرمائے جس سے اطراف میں بکثرت مدارس قائم ہوئے پھر ان مدارس کے نقش قدم پر اور سینکڑوں مدارس کی بنیادیں رکھی گئیں' جس سے آپ صرف بانی دارالعلوم دیوبند ہی ثابت نہیں ہوتے بلکہ اس نوعیت خاص کے لحاظ سے بانی مدارس ثابت ہوتے ہیں۔ اور پھر آپ نے ان مدارس کو ان ہی اصولِ ہشت گانہ سے وابستہ کر کے جن کی صراحت عنوان بالا میں ہے ان مدارس کی روحانی تنظیم بھی فرمائی جس سے ان کے پروردہ افراد خود ہی منظم ہو گئے اور ایک تنظیمی مذاق لے کر ابھرے۔

جمعیت علماء کا پس منظر | چنانچہ آزادی کی تحریکات شروع ہوتے ہی یہ مدارس کی بے شمار

جماعتیں رسمی طور پر بھی منظم ہو گئیں اور انہوں نے جمعیت العلماء کے نام سے جنگ آزادی میں حصہ لے کر ملک کی جو شاندار سیاسی خدمات انجام دیں اور جو جو بے نظیر قربانیاں پیش کیں تاریخ اس سے انکار نہیں کر سکتی۔

جمعیت العلماء کے افراد پر شخصی حیثیت سے نکتہ چینی ہر وقت ممکن ہے۔۔۔ لیکن اس کے اصول و مقاصد اور اس کے تحت مجموعی حیثیت سے اس تنظیم مدارس کی لائن سے میدان میں نہ آتی تو عوام کا اس طرح جوق در جوق آوازہ آزادی کا خیر مقدم کرنا عادۃً مشکل تھا۔

اس ملک کا مزاج ہی مذہبی ہے اور اس کے لئے مذہبی آواز ہی میں جذب وکشش ہے۔ وہ کوری سیاسی آواز پر گوش بر آواز نہیں ہوتا۔ اسی لئے علماء کے میدان میں آنے سے پہلے یہاں کے عوام سے میدان خالی تھا۔ اللہ ورسول ﷺ کے نام کی صدا بلند ہوتے ہی عوام سے میدان پٹ پڑے اور یہ ظاہر ہے کہ مذہبی صدا مذہبی حلقوں ہی سے اٹھی جو مدارس کی صورت میں اس وقت منظم تھے جب عوام اس قسم کی رسمی تنظیموں کے تصورات سے خالی تھے۔

ملت کا وقار بازیافت کرنے اُصول

یہ غیر رسمی مگر رسمی سے زیادہ پائیدار تنظیم حضرت والاؒ ہی کے ان اصول ہشت گانہ اور طرز عمل سے ہوئی جس میں سیاسی مقاصد کے ساتھ دینی اور مذہبی جذبات بنیاد بنے ہوئے تھے اور جوں ہی اس مدارسی تنظیم کو رسمی انداز میں لایا گیا یعنی جمعیت کے پلیٹ فارم جگہ جگہ کھولے گئے وہیں عوام سے سیاسی میدان بھر گئے اور جوش و خروش کے حیرت ناک منظر سامنے آگئے جس کی شہادت تحریک خلافت اور پھر تحریک آزادی وطن دے سکتی ہے۔

بہر حال حضرت والاؒ نے ۱۸۵۷ء کی شکست پر میدان شاملی میں مسلمانوں کی ہر جہتی آزادی مٹ جانے کے جو مظاہر اپنی آنکھوں سے دیکھے ان کا تیر بہدف علاج آزادی کے انہی بنیادی اصولوں اور ان کی عملی تشکیل سے ہو سکتا تھا جو بناءِ مدارس اور تعلیمی نظام کی لائن سے بروئے کار لائی گئی۔

سوانح مخطوطہ عبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف آج ہی اس نظام کے نتائج کا مشاہدہ کرنے والے اس کے قائل اور اس سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اس ابتدائی دور کے لوگ بھی حتی کہ مخالفین تک بھی اس وقت جب کہ یہ نظام ایک مخالف ماحول میں قائم کیا جا رہا تھا۔ اس کے اعتراف پر مجبور تھے کہ ملت کے گئے ہوئے وقار کی بازیابی کے لئے ان اصول سے بہتر تیر بہدف نسخہ دوسرا نہیں ہو سکتا جن کے سامنے دلی کی ویرانی اور اس کے مرکزی حیثیت کے تباہ ہو جانے سے پور

ے ملک کے حال و مال کی تباہی عیاں تھی، صاحب سوانح مخطوطہ نظام مدرسہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اور جو فوائد معاش و معاد کے مسلمانوں کو اس سے (ان اساسی اصول کے نظام تعلیم سے) حاصل ہوئے اور ہوں گے وہ مثل آفتاب کے روشن ہیں یہاں تک کہ مخالفین بھی مانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی اصلاح کے لئے اور غیر قوموں پر غالب ہونے کے لئے (جنہوں نے انہیں مغلوب کیا) اس سے بہتر اور مجرب نسخہ کوئی نہیں“۔

گویا اس دور میں بھی جبکہ حکومت حاکمانہ رنگ سے چلتی اور ملتی تھی محض حکیمانہ رنگ سے انقلاب لانے کے ڈھنگوں سے دنیا ناواقف تھی، ان اصولوں کی معنویت اور نتیجہ خیزی کو تسلیم کی جا چکا تھا اور مخالفین تک کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔

آج اجتماعی مساعی کے سلسلہ میں نصف صدی کے پیہم تجربات کے بعد ملک جن اصول تک پہنچا ہے اور جن پر چل کر اسی نے بدیشی غلامی سے نجات پائی۔ وہ سر مون ان اصول سے متجاوز نہیں ہیں جو حضرت والاؒ تقریباً ایک صدی پیشتر ۱۸۵۷ء کے بعد اجرا مدرسہ کے وقت اپنے قلم سے لکھ چکے تھے۔ اور عین اس وقت جبکہ ملک اور قوم کے بارسوخ افراد و طبقات اپنی زندگی حکومت مسلطہ کے رحم و کرم پر ڈال دینے اور اس کی حمایت و وفاداری ہی کو سب سے بڑی ترقی اور معراج کمال سمجھے ہوئے تھے اور اس میں سرگرم عمل تھے۔

عوامی قوت کا پرواز

پھر حضرت والاؒ نے ان اُصول پر اس وقت اس ادارہ (دارالعلوم) کی بنیاد رکھی جبکہ ملک کے بارسوخ طبقات، بہت سے معاشرتی اور معاشی اداروں کی بنیاد نہ صرف منشاء حکومت کی تکمیل اس کی پوری پوری وفاداری اور اشتراک عمل کے اصول ہی پر رکھ رہے تھے بلکہ ان بنیادوں میں ان مجاہد و سربکف علماء و مفکرین کے ساتھ تحقیر و تمسخر کا برتاؤ اور عوام کو ان سے نفرت دلانے کا جذبہ بھی پیوست کیا جا رہا تھا۔

گویا ”اینٹی مُلّا ازم“ کا پروانہ بھی ساتھ ہی ساتھ ڈالا جا رہا تھا لیکن حضرت والاؒ نے نتائج تھے وہیں ان میں اس تحقیر و تمسخر کے اکھاڑ پھینکنے کی قوت بھی مضمر تھی کیونکہ ان اصول کا حاصل رابطۂ حکومت نہ تھا بلکہ رابطۂ عوام کا استحکام تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد مسلط اقتدار کے خلاف مشینی قوت کی بجائے عوامی قوت ہی موثر ثابت ہو سکتی ہے جسے حضرت والاؒ نے پرکھ لیا تھا۔ جس کو اس زمانہ ہی میں مخالفین تک بھی مان چکے تھے اور جب کہ یہ عوامی قوت براہ راست انہیں علماء کے ہاتھ میں تھی اور

ہے، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ عوامی قوت کی بیداری کے وقت ہر طبقہ ان لوگوں کی طرف نہ جھکتا جو اس عوامی قوت پر قابض اور جائز طریق پر استعمال کرنے کے ڈھنگ سے واقف تھے۔

نتیجہ یہ ہوا اور ہونا بھی چاہئے تھا کہ جن علماء کو نکما اور بیکار یا قوم پر ناحق بار باور کر لیا جا رہا تھا جونہی عوامی تحریکات شروع ہوئیں یا عوام کی قوت سے حکومت متسلطہ کے اقتدار کے خلاف عصبیاتی جنگ کا آغاز ہوا۔ تو وہی "اینٹی مُلاازم" والے طبقات ملاؤں کی طرف جھکنے پر مجبور نظر آنے لگے۔ اور اسٹیجوں پر وہی تمسخر و نفرت اظہار عقیدت و نیاز میں تبدیل ہونے لگے۔

یہی علماء جو ۱۸۵۷ء کے بعد ان اصول کے زیر سایہ مدارس کی خلوت گاہوں میں برائے چندے خاموش بیٹھ گئے تھے وہ بالآخر اسٹیجوں کی جلوت گاہوں میں اس شان سے اچانک نمایاں ہوئے کہ چار و ناچار ان کے کار آمد ہونے کو تسلیم کر لیا گیا اور پھر عوامی تحریکات اکثر و بیشتر انہی کی قوت کے ہاتھوں چلیں اور آگے بڑھیں۔

عدم تشدد کے راستہ سے انقلاب کا ذہنی خاکہ

ان اصول کے زیر اثر تربیت پانے والے علماء بالآخر آزادی ملک کا جھنڈا لے کر سب سے پہلے سامنے آئے اور جو کام شاملی کے میدان میں تلواروں سے پورا نہ ہو سکا تھا وہ امن کی زبان و قلم سے پورا ہو گیا۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرس اول دارالعلوم دیوبند نے جو مسجد چھتہ کے عناصر اربعہ میں سے ایک عنصر تھے، حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس خلجان کے ذکر پر کہ "اب ہندوستان کی حکومت انگریزوں جیسی مدبر اور قوی قوم کے ہاتھ میں آگئی ہے اور ان کے پنجے ایسے جم گئے ہیں کہ اب وطن کا استخلاص بظاہر ممکن نظر نہیں آتا"۔

ارشاد فرمایا۔

"حاجی صاحب! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔ لوگ سوئیں گے انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کو جاگیں گے دوسری حکومت میں"۔

یعنی تشدد اور تلوار کے راستہ سے نہیں جو حکومتوں کے لوٹنے کا متعارف اور واحد طریقہ سمجھا جاتا ہے بلکہ امن اور عدم تشدد کے راستہ سے یہ لوٹ پوٹ عمل میں آئے گی جس سے واضح ہے کہ یہ بزرگ ۵۷ء کے بعد ہی سے عدم تشدد کی راہ سے انقلاب کا خاکہ ذہنوں میں لئے ہوئے تھے اور حضرت نانوتویؒ نے اس خاکہ کو ان اصول ہشتگانہ کی دفعات کے تعلیمی رنگ سے بھر دیا جس کو اس وقت کے ماحول میں اپنے سمجھے ہوئے تھے اور بقول صاحب سوانح مخطوطہ مخالف بھی معقول اور موثر

تسلیم کر چکے تھے۔

یورپ کے مشاہدات میں حضرت نانوتویؒ کے اصول کی قدر و قیمت

اس مختصر مضمون کی حد تک میرا یہ موضوع نہیں ہے کہ ملک کی آزادی میں ان علمائے آخرت کا کتنا اور کیا حصہ تھا؟ اسے پوری بالغ نظری کیساتھ مولانا محمد میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ' ناظم جمعیت علماء ہند نے اپنی مشہور تصنیف "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں تاریخی حوالوں سے کھول دیا ہے۔ نیز دوسرے اہل قلم بھی اس موضوع پر کافی تحریری سرمایہ فراہم کر چکے ہیں۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ ملک کیا استخلاص اور آزادی کا یہ نیا نقشہ انہی مجاہدین شاملی نے بنایا اور ۵۷ء کے بعد ان کے پیشر و حضرت اقدس مولانا نانوتویؒ تھے جن میں یہ جوش امتیازی شان سے ابھرا ہوا تھا اور انہوں نے اپنے اس جوش کو ہوش کی شکل دے کر آئینی رنگ سے ان اصول ہشت گانہ کے اساسی نظام میں بھر دیا تھا۔ جو اس اقامتی تربیت گاہ "دارالعلوم دیوبند" کے لئے آپ نے وضع فرمائے۔

دارالعلوم کے ان فضلاء کے ذریعہ جنہوں نے ان اصول کے زیر سایہ تربیت پائی یہ رنگ ملک میں پھیلنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ملک کے ایک بڑے طبقہ کا جو عوام پر اثر رکھتا تھا ذہن ہی یہ بن گیا اور عوامی رابطہ کی وہ عمومیت یا جمہوریت جو ان اصول میں پنہاں تھی ان تربیت یافتوں کے راستہ سے سو برس پہلے کی ہنڈیا کا ابال چھلکا تو چولہے کے گرد و پیش چاروں ہی سمتوں کو تر کر کے رہا۔

مولانا عبید اللہؒ مرحوم سندھی فرمایا کرتے تھے جس کو احقر نے خود بلاواسطہ سنا کہ

> "میں نے حضرت نانوتویؒ کے اصول کی قدر و قیمت یورپ جا کر سمجھی' بالخصوص یورپ وایشیا کے متعدد انقلاب کی بنیادوں کو میں صرف انہی اصول کی روشنی میں پاسکا ہوں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں ان اصول کی شرح لکھنے بیٹھ جاؤں تو دو ضخیم جلدیں تیار کر دوں گا"۔

رئیس الاحرارؒ کا غایت تاثر

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم ۱۹۲۴ء میں جب بسلسلہ تحریک خلافت دیوبند تشریف لائے اور احقر ہی کے مکان پر حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے مہمان کی حیثیت سے فروکش ہوئے تو حضرت کے ان اصول ہشت گانہ کو دیکھ کر جو دارالعلوم کا سنگ بنیاد ہیں رو پڑے۔ اور غایت تاثر سے بیساختہ فرمایا کہ:-

"یہ اصول تو الہامی معلوم ہوتے ہیں ان کا عقل محض سے کیا واسطہ"؟

چنانچہ ان اصول کی دفعات میں نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت نانوتوی کے قلم سے بھی باوجود ذوق اخفاء کے جگہ جگہ یہ الفاظ نکل نکل گئے ہیں کہ "یوں معلوم ہوتا ہے" اور "یوں

نظر آتا ہے" اور "ایسا ہو جائے گا" وغیرہ جو ان اصول کے الہامی ہونے کی گویا خود صاحب اصول کی طرف سے بھی شہادت ہے۔

انقلاب ۱۹۴۷ء کے اولین ہیرو

بہر ان اُصول کی روشنی میں جو کچھ ہوا اس پر ۱۹۴۷ء شاہد ہے اور اس انقلاب ۱۹۴۷ء کے اولین ہیرو قدرتاً وہی سمجھے جا سکتے ہیں جو ۱۸۵۷ء میں بھی اسی اسٹیج پر تھے۔ جس پر آزادی خواہ' طبقے بعد میں آئے اور ۱۹۵۷ء کے بعد بھی اپنے اساسی اصول و عمل کی راہ سے اسی اسٹیج پر ہے۔

بہر حال حضرت نانوتویؒ نے اگر ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لئے یہ دار العلوم قائم کیا تھا جیسا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ اس بارہ میں معروف ہے اور رسالہ دار العلوم میں شائع ہو چکا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اس ادارہ اور اس کے اصول تربیت نے یہ تلافی کر دکھائی اور زیادہ نہیں صرف نوے سال کی مدت میں جو ایک ملک کی نہیں بلکہ ایک فرد کی عمر ہوتی ہے ایک عظیم ترین طاقت کو جو ۱۸۵۷ء میں ایک ملک کے جائز حقدار کو پامال کر چکی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں مسکینانہ' ضعف اور مظلومانہ فروتنی سے نیچا دکھایا۔ صف کی طرح ہندوستان لوٹ گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں لوگ سوئے انگریزوں کی حکومت میں صبح کو جاگے قومی حکومت میں اسی طرح ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی گئی۔ گو مسلطہ طاقت نے جاتے جاتے بھی آزادی کے نقشہ کو بگاڑ دینے کے کافی سامان فراہم کر دیئے جن کا بگاڑ کافی نمایاں ہوا۔ اور ابھی تک ہے لیکن جن اصول کی صداقت نے اصل نصب العین کو رونما کیا تھا انہیں اصول کی صداقت اس بگاڑ کے دفعیہ کی بھی کفیل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ان اصول پر اسی سابقہ رنگ سے عمل کیا جائے۔

پھر اصول ہی نہیں مدرسہ کے عملی پروگرام کی تشکیل میں بھی حضرت والاؒ نے وہی تلافی والا نصب العین پیش نظر رکھا۔ آپ نے ایک طرف فن سپہ گری کی مشق کا شعبہ طلبہ کے لئے بہ تقاضائے وقت ضروری سمجھا۔ جس سے طلبہ میں جہاد کی قوت قائم رہے۔ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ پائیدار ہوتا رہے۔ اس میں بعض لوگوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ یہ مدرسہ عربیہ کیا ہوا۔ مدرسہ حربیہ ہو گیا تو حضرت والاؒ نے بقول صاحب سوانح مخطوطہ اس پر مبسوط تقریر فرمائی اور عصری اور شرعی تقاضوں کو جواب میں پیش کیا۔

عدالت شرعیہ کا قیام

دوسری طرف قومی محکمہ قضا قائم فرمایا کہ تاکہ متعلقین مدرسہ اپنے متعلقین اور حلقہ اثر میں عدل و قسط اور انصاف پسندی قائم رکھنے کے

ساتھ ان میں اپنے باہمی جھگڑوں کو خود نمٹانے اور شرعی اصول کو ہر معاملہ میں حکم بنانے کا سلیقہ اور جذبہ ابھرا رہے چنانچہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس تحریری معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے جس میں اہل دیوبند سے آپ نے مختلف معاشرتی امور کے بارہ میں عہد کرایا۔ ایک دفعہ یہ بھی ذکر کی ہے کہ۔

> ”کوئی مقدمہ جس میں فریقین مسلمان ہوں سرکاری کچہری میں نہ جاوے اور اس کے حاکم مولانا محمد قاسمؒ صاحب تھے“۔

چنانچہ سینکڑوں مقدمات جو برسہا برس سے کچہریوں کی دفتری طوالتوں میں الجھے پڑے تھے۔ منٹوں میں فیصل ہونے لگے۔ یہ شرعی کچہری چھتہ کی مسجد میں قائم ہوئی۔ معاملات اور مقدمات کی تعداد جب زیادہ ہونے لگی تو فصل خصومات کا یہ کام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ صدر مدرس دارالعلوم کے سپرد فرمایا گیا۔ اور انہیں کو مستقل قومی قاضی قرار دیا گیا۔ جب اس سلسلہ کا کام بڑھا تو اسی نسبت سے دیوبند کی سرکاری منصفی کی رونق گھٹنی شروع ہو گئی۔ اور یہی مقصد بھی تھا کہ تسلط قوت کا اثر ورسوخ ہر سمت سے کم اور کمزور ہوتا چلا جائے۔

دارالعلوم میں صنعت وحرفت کے شعبہ کا مقصد

اسی کے ساتھ حضرت والاؒ نے دارالعلوم میں صنعت وحرفت کا شعبہ بھی قائم فرمایا جیسا کہ سوانح مخطوطہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ تاکہ ادارہ کے فضلا معاشی ضروریات میں خود کفیل بنا سیکھیں۔

بظاہر یہ مقابلہ تھا اس رو کا کہ اس وقت کی تعلیم کا انتہائی نقطہ نظر ملازمت تھا اور وہ بھی سرکاری جس کا مال اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا تھا کہ اسکولی اور کالجی تعلیم سے لوگ سرکاری ملازمت کرنا سیکھیں اور اس ملازمت سے اپنی غلامی کی جڑوں کو مضبوط بنائیں۔ اس کا ردعمل صحیح معنی میں یہی ہو سکتا تھا کہ لوگ اس غلامی امور تعلیم سے ہٹ کر اس تعلیم میں لگیں جو غناء واستغناء کا جوہر پیدا کرے اور جہاں تک معاش کا تعلق ہے سرکاری ملازمتوں سے الگ رہ کر صنعت وحرفت یا قومی ملازمت سے اپنے گزر بسر کا سامان کریں۔

دارالعلوم کے ذریعے ”ہندو مسلم“

کا پرداز ایک طرف دارالعلوم کے چندوں کا دائرہ اتنا وسیع رکھا گیا کہ ان میں غیر مسلم بھی شریک ہو سکیں۔ چنانچہ دارالعلوم کی ابتدائی روداد میں بہت سے ہندوؤں کے چندے بھی لکھے ہوئے ہیں۔

حضرت والاؒ کی تجویز پر یہ بھی تحریک کی گئی کہ ملک کے تمام مطابع اور پریس بلا تفریق مذہب وملت اپنی مطبوعات کا ایک ایک نسخہ کتب خانہ دار العلوم کو عنایت کریں۔

چنانچہ سب سے پہلے اس صدا پر لبیک کہنے والی شخصیت ایک ہندو کی تھی اور وہ منشی نول کشور مالک مطبع نول کشور لکھنؤ تھے جنہوں نے اپنے پریس کی تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ دار العلوم میں بھیجا۔ جس پر دار العلوم کی جانب سے ان کے حق میں شکریہ ودعا کا ہدیہ پیش کرنے کے لئے دار العلوم کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس میں حضرت نانوتوی قدس سرہ بھی شریک تھے اور شکریہ کی ایک مستقل تجویز پاس کر کے ان کے پاس بھیجی گئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ اس ادارہ کو عوامی نہیں بلکہ ایسا ہمہ گیر ادارہ بنانا چاہتے تھے جس میں غیر اقوام کی ہمدردیاں بھی شامل رہیں۔ گویا ہندو مسلم اتفاق کا پروانہ بھی ڈال دیا گیا۔

دار العلوم میں بین الاقوامیت کا عنصر

بلکہ سوانح مخطوطہ کی تصریحات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ اس دار العلومی تحریک کو نہ صرف ملک گیر ہی بنانا چاہتے تھے جس میں اس ملک کی ہر قوم کی ہمدردیاں اس ادارہ اور اس کی تحریک کے لئے حاصل ہوں بلکہ اسے عالمگیر بھی دیکھنا چاہتے تھے اور اس علمی حلقہ کا رشتہ بیرونی ممالک کے مسلمانوں اور ان کی حکومتوں سے بھی جوڑنا چاہتے تھے چنانچہ ترکی کی خلافت جو اس وقت پورے عالم اسلامی پر اثر رکھتی تھی سے انتہائی شدومد سے اپنے تعلقات کو دینی اور علمی حیثیت سے وابستہ فرمایا۔ سلطان عبدالحمید خان والی ترکی کی جنگ روس سے ہوئی تو حضرت والاؒ نے ترکی کے لئے چندہ شروع کیا اور اپنے گھر کا سارا اثاثہ، اپنی اہلیہ محترمہؒ کا تمام جہیز، کپڑا، زیور برتن سب کچھ ترکوں کی حمایت کے لئے قربان کر دیا۔

تنظیم ملت کا نیا خاکہ

اس سے اندازہ کر لیا جائے کہ اس دار العلوم کی تحریک کا مرکب نصب العین صرف تعلیم ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ اس کے ضمن میں آزادی پسندی، غلامی شکنی، اسلامی اتحاد، وطنی اتحاد، قومی خود مختاری، حق خود ارادیت، معاشی استغناء، وسائل قوت کی فراہمی، رابطہ عوام، تالیف خواص وغیرہ کے ملے جلے جذبات کار فرما تھے۔

اور دار العلوم کی تاسیس ایک خاص مکتب فکر کی تاسیس تھی جیسا کہ حضرت والاؒ کے اصول ہشت گانہ اور جاری کردہ نظام کار سے واضح ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ اس مدرسہ کے کارکنوں اور پروردوں میں استغناء کی روح پھونکتے

ہوئے انہیں حکومت وقت سے بے پرواہ اور قوم کے غریب افراد اور عوام سے زیادہ سے زیادہ مربوط فرمانے کی راہ ڈال رہے تھے ورنہ تکثیر چندہ اور وہ بھی زیادہ تر غرباء سے پھر افزائش طعام طلبہ کی سعی جو قوم کے غریب بچے ہی ہو سکتے تھے اور ادھر حکومت وقت کی امداد سے کلی استغناء بلکہ ممانعت اور امراء اور جاگیرداروں پر تکیہ کر کے ان کے فخورانہ عطیات سے اعراض کا مطلب آخر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ حکومت وقت کے علی الرغم رابطہ عوام کو مستحکم اور مضبوط کیا جائے تاکہ ملک کے عوام اس مدرسہ کو اپنی چیز سمجھیں اور اس کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو کر اپنی عوامی طاقت سے انہیں آگے بڑھائیں ورنہ محض درس و تدریس کی حد تک تنظیم ملت کے اس نئے خاکہ کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟

پھر اگر محض مذہبی تعلیم تعلم ہی نصب العین کی آخری حد تھی تو مدرسہ میں فن سپہ گری کے شعبہ کے قیام کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی جسے حضرت والاؒ نے اہتمام کے ساتھ خود قائم فرمایا۔ نیز محض مذہبی تعلیم ہی پیش نظر ہوتی تو حضرت والاؒ صنعت و حرفت کا شعبہ اس مدرسہ میں قائم نہ فرماتے جو خالص معاشی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر اگر یہ محض ایک مذہبی مکتب تھا تو حضرت والاؒ شرعی محکمہ قضا قائم فرما کر اعضا مدرسہ کو اس کا جج مقرر نہ فرماتے جو خالص ایک سیاسی مسئلہ تھا۔ اسی طرح صرف مذہبی تعلیم ہی کا خاکہ مدرسے کے کاروبار کی آخری حد ہوتی تو مدرسہ کے چندہ دہندوں میں غیر مذہب کے لوگوں کے عطیات شامل کئے جانے کا کوئی تصور سامنے نہ آنا چاہئے۔ نہ ہندو مسلمانوں کے بلا تخصیص مذہب و ملت چندے قبول کئے جاتے اور نہ ہندو چندہ دہندگان کی دعا و شکریہ سے ہمت افزائی کی جاتی۔ پھر اگر کاروبار مدرسہ کی انتہائی غرض محض کتابی درس و تدریس تھی تو حضرت والاؒ اس مدرسہ کے سرپرست اور ہمہ اوست ہوتے ہوئے سلطانی چندہ کی بنیاد ڈال کر اور خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خان والی ترکی کی مدح میں قصائد لکھ کر خلافت ترکی سے رشتہ ارتباط قائم کرنے کی صورتیں پیدا نہ فرماتے۔ گویا آپ نہ صرف ملک کی اندرونی اقوام ہی سے رشتہ یگانگت قائم فرمانے کے داعی تھے بلکہ بیرون ملک سے بھی رشتہ اتحاد کا سلسلہ پھیلانا چاہتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدرسہ محض کتب درسی کی تعلیم کا مدرسہ نہ تھا بلکہ حضرت اسے ایک ملی جلی تحریک کے مرکز کی حیثیت سے قائم فرما رہے تھے جن کے نظام کار میں علم و عمل، معاش و معاد، قوم و وطن اور دین و مذہب کی حمایت و نصرت کے ملے جلے جذبات ایک دم پیش نظر تھے جو حضرت والاؒ کے وسیع اور ہمہ گیر ذہن سے نکل کر اس مدرسہ کی بنیادوں میں پیوست ہوئے اور اس کے اثرات تعلیمی راہوں سے اس ادارہ کے تربیت یافتہ فضلا متوسلین میں حسب استعداد و قابلیت نفوذ پذیر ہوتے رہے۔

قیام دار العلوم کا بنیادی محرک!

بہر حال دار العلوم کے یہ اساسی اصول اور اس کا نظام کا اس ہمہ گیر حکمت عملی اور وسیع نظام کی غمازی کر رہا ہے جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد شاملی کے میدان سے لیکر آئے اور اس کی ناکامی کی تلافی کے لئے بقول حضرت شیخ الہند یہ مدرسہ قائم فرمایا۔ غور کیا جائے تو یہ اس امانت کی ادائیگی تھی جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ سے حضرت شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ میں اور ان سے بواسطہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمہ اللہ، حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ تک منتقل ہوئی اور حاجی صاحبؒ کے لوگوں میں بالآخر پوری قوت کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے قلب و دماغ کا جوہر بن گئی جنہیں حاجی صاحبؒ نے اپنی زبان اور اپنے مقاصد کا ترجمان فرمایا تھا جیسا کہ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کے ترجمان خاص ہی سے ان جذبات کے بقاو ترویج اور اظہار و اعلان کی توقع ہو سکتی تھی اور وہی ایسے ہمہ گیر ادارہ کے اصول و نظم کا تصور باندھ سکتے تھے۔

اصول آزادی کی امین شخصیت

بہر حال ان اصول ہشت گانہ کے مرکب نصب العین کی یہی وہ اصولی اور عملی خصوصیات ہیں جن کی مادی اور معنوی شکل کا نام دار العلوم دیوبند ہے اور جس نے بالآخر ۱۸۵۷ء کی پسپائی کی تلافی کر دکھائی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ بالآخر دنیا اس کے نصب العین پر آکر رہی اور آزادی ملک و ملت کے لئے جو خاموش راہنمائی اس نے کی وہ اشتہاروں، پوسٹروں، رسالوں اور اخباروں اور عمومی پروپگنڈوں کے شور محشر میں نظر نہیں آتی۔

اس لئے اس یوم آزادی کے موقع پر جب کہ دنیا مختلف اندازوں سے اس کی یاد منا رہی ہے اور مختلف انداز کی یادگاریں قائم کرنے کے مشورے دیئے جا رہے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ ان اصول کے تذکرہ سے یاد منائیں جن پر چل کر دنیا، آزادی کی منزل پر پہنچی اور اس شخصیت کا ذکر خیر کریں جن کا وسیع اور ہمہ گیر ذہن ان دواعی آزادی کا نہ صرف جذبات بلکہ اصول کے درجہ میں بھی امین تھا اور جو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو کر ملک کا ذہن آزادی پسند اور حریت طلب بناتے رہے تاآنکہ آزادی سامنے آکھڑی ہوئی اور آج ہر ایک کو اس کی خوشی منانے کا موقعہ ملا۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

محمد طیب غفرلہ

مدیر دار العلوم دیوبند

۱۵ اگست ۱۹۵۷ء

اکابر دیوبند اور آزادی ہند

اس پوری جماعت کی سرپرستی کے ساتھ تحریک آزادی اس وقت جاری رکھی، جب انگریز کی مخالفت کا تصور بھی گھروں کے کونوں تک میں نہ تھا نہ صرف قلم یا زبان کی حد تک بلکہ عمل کے پردوں میں اور عمل بھی معمولی نہیں بلکہ ایسے ہمہ گیر عمل کے ساتھ جس کی لپیٹ میں ہندوستان کی متعدد ریاستیں، اسلامی ممالک، متعدد فرمان روا اور انگریزی فوجوں کے کتنے ہی افسر بھی آگئے۔ اس عمل کا حال ہندوستان سے گزر کر روس کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔ مدینہ کے گورنر پاشا کے قول کے مطابق

''شیخ الہند کی مٹھی بھر ہڈیوں اور مختصر سے جثے میں کیا حرارت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دنیائے اسلام کی اپنی لپیٹ میں لے لیا''۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِيْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَہٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہٗ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْراًو نَذِيْراًو دَاعِياً اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجاً مُّنِيْراً.............. اَمَّابَعْدُ..............

شیریں ثمر کے حصول[1] پر تبریک

بزرگان ملت! علمائے کرام اور عزیز طلبائے دار العلوم!

یہ آج کا مبارک دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ایک عظیم الشان سلطنت جس کے متعلق مسلم تھا کہ اس میں کسی وقت آفتاب غروب نہیں ہوتا اور جس کے بارے میں خود

[1] ہندوستان کی آزادی کے موقع پر ۱۵، ۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب میں نماز تراویح کے بعد علماء وطلباء دار العلوم اور اہل شہر سے خطاب۔

اس سلطنت کے ایک مغرور اور متکبر نمائندہ گلید سلون نے اپنے ایام زندگی میں کہا تھا کہ ہماری سلطنت آج اس قدر طاقت ور ہے کہ اگر آسمان بھی اس پر گرنا چاہے تو ہم اسے بھی اپنی سنگینوں کی نوک پر روک لیں گے اور وہ ہماری سلطنت کا کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔ وہی سلطنت آسمان کے گرنے سے نہیں محض زمین کے چند ذروں کے اڑنے سے اس سہولت سے ختم ہو رہی ہے۔ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ ہم اس انقلاب پر پورے ملک کو مبارکباد دیتے ہیں۔ پورا ملک عموماً اور خصوصیت سے وہ جوان اور بوڑھے اس مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی قربانی اور مساعی نے یہ شیریں ثمر ہندوستان کے سامنے لا رکھا۔

اکابر ملت اور جہاد آزادی

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقعہ پر ہم ان اکابر ملت کی مساعی کا تذکرہ نہ کریں جنہوں نے حقیقتاً اس آزادی کا سنگ بنیاد رکھا اور اس وقت رکھا جب کہ آزادی کے تصور سے بھی اس ملک کے دل ودماغ خالی تھے وہ شاہ ولی اللہ کے جانباز شاگردوں کی جماعت ہے جو دو سو برس سے اس سعی میں نہ صرف قلم اور روشنائی سے بلکہ شمشیر اور خون سے اس کی راہ نوردی کر رہے تھے۔ آخر میں ۵۷ء کے بعد جب انگریزی اقتدار مکمل ہو کر پوری طرح اس ملک پر چھا گیا تو صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی کے تصور کو اس ملک میں زندہ رکھا اور بالآخر اسی تصور کا سب کو دیوانہ بنا کر چھوڑا۔

۵۷ء میں بانی دار العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ، بقول مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اس تصور کے سب سے بڑے حامل اور اس جوش کے سب سے بڑے امین تھے۔ انہوں نے اپنے شیخ حضرت امداد اللہ قدس سرہ کی قیادت میں تلوار اٹھائی اور آزادی کی راہ میں سرفروشی کے ساتھ میدان میں اترے۔ لیکن وقت مقررہ نہیں آپہنچا تھا اس لئے فتح کا سلسلہ شاملی کی تحصیل تک رہ گیا اور دہلی کے تخت تک نہ پہنچ سکا۔ ملک آزاد نہ ہوا۔۔۔ لیکن یہ جماعت اپنے تصور سے الگ نہ ہوئی یہ وہ زمانہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی دنیا وفاداری کے جذبہ سے سرشار تھی۔ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قرآن سے آیات جہاد کو خارج کر دینے کے مشورے اور منصوبے قائم کئے جا رہے تھے۔ دیوبند کے لمبے کرتے والے مولویوں کو باغی کا نام رکھ کر مطعون کیا جا رہا تھا لیکن یہ جماعت اپنی دھن میں تھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اس دنیا سے گئے تو ان کے صحیح اور سچے جانشین حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ نے جو ان کے علم اور نظریات کے جائز وارث تھے۔ اس پوری جماعت کی سرپرستی کے ساتھ تحریک آزادی اس وقت جاری رکھی جب کہ انگریزوں کی مخالفت کا تصور بھی گھروں کے کونوں تک میں نہ تھا۔ نہ صرف قلم یا

زبان کی حد تک بلکہ عمل کے پردوں میں اور عمل بھی معمولی نہیں بلکہ ایسے ہمہ گیر عمل کے ساتھ جس کی لپیٹ میں ہندوستان کی متعدد ریاستیں، اسلامی ممالک، متعدد فرماں روا اور انگریزی فوجوں کے کتنے ہی افسر بھی آگئے اس عمل کا حال ہندوستان سے گزر کر روس کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔ مدینہ کے گورنر جمال پاشا کے قول کے مطابق ۔

"شیخ الہند کی مٹھی بھر ہڈیوں اور مختصر سے جثہ میں کیا حرارت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا"۔

بہر حال ان بزرگوں کا جذبہ انگریزوں کے اقتدار کے خلاف نہ جاہ و منصب کے لئے تھا نہ وزارت کی کرسیوں کے لئے تھا نہ کسی ایک پارٹی کے اقتدار کے لئے تھا بلکہ صرف اس لئے تھا کہ ایک جابر قوم کی گرفت سے مظلوم ملک کو نکالا جائے اور حق بحقدار کے طور پر جس کی امانت ہو اسے سپرد کیا جائے۔

شیخ الحدیث دار العلوم کی پیشین گوئی

ان بزرگوں کا ہر وقت یہی ذکر تھا اور یہی فکر، اسی کے بارے میں پیشین گوئیاں اور مکاشفات تھے اور اسی کے بارے میں عام نظم اور انتظام چھتہ کی مسجد میں یہ سب بزرگ جمع تھے اور انگریزوں کے تسلط اور غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں نے گہرے پنجے جمائے ہیں دیکھئے کس طرح اکھڑیں گے ؟

اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے۔ فرمایا ۔

"حاجی صاحب آپ کس خیال میں ہیں ؟ وہ وقت دور نہیں جب کہ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔ کوئی جنگ نہ ہو گی بلکہ بحالت امن و سکون یہ ملک صف کی طرح پلٹ جائے گا اور انقلاب ہو جائے گا۔ رات کو سوئیں گے ان کی عملداری میں اور صبح کریں گے دوسری عملداری میں !"۔

لیکن آج دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ پندرہ اگست کی رات لوگ حسب معمول دس گیارہ بجے سوئے تو انگریزوں کی عملداری میں تھے۔ اور جب پندرہ اگست کی تاریخ شروع ہوئی تو ٹھیک بارہ بج کر ایک منٹ پر دوسری عملداری تھی۔ سوئے ایک عملداری میں اور جاگے دوسری عملداری میں۔

آزادی ہند کی جدوجہد کی ابتداء صرف مسلمانوں نے کی

میں آج کے جانبازوں کی ناقدری نہیں کرتا لیکن اس

سے کسی حالت میں بھی نہیں ہٹ سکتا کہ آج کی آزادی کی تمام مساعی ایک عمارت ہے جس کی بنیاد یہ بزرگ رکھ گئے تھے اور اس لئے میں بیانگ دہل کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی کی یہ جدوجہد صرف مسلمانوں نے شروع کی انہوں نے اسے پروان چڑھایا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا کہ "ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا"۔ حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی نے اس فتویٰ کو استعمال کیا اور اس نسخہ شفا کو خاص ترکیب سے پیا اور پلایا۔ شیخ الہندؒ نے اسی نسخہ کو معجون مرکب کی صورت میں محفوظ کیا اور اس قابل کر دیا کہ ہر کس و ناکس اسے استعمال کر سکے۔ چنانچہ وہ استعمال عام شروع ہو کر عام ہو گیا۔ تحریک خلافت میں بھی نسخہ گو تلخ تھا مگر سب نے استعمال کیا اور بہر حال استعمال عام شروع ہو کر آزادی کا جذبہ مسلمانوں سے گزر کر ابناء وطن تک پہنچا وہ بھی سرگرم ہو گئے اور ہندو مسلمانوں کی انتھک مساعی اور قربانیوں کا ثمرہ شیریں آج ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جس پر ہم ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اور ان بزرگان مرحومین کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں، جن کی تخم ریزی اور تردد سے یہ درخت تناور ہوا اور آج اس کا پھل سب کھا رہے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات

ہندوستان کی آزادی تمام دنیائے اسلام کی آزادی ہے اس لئے ہماری مبارکباد کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہے۔ ملک کی آزادی کی یہ پہلی قسط ہے۔ اس کی دوسری قسط جون اڑتالیس میں سامنے آنے والی ہے۔ لیکن ان اکابر مرحومین کا مقصد اس سے بھی آگے ہے۔ ہمیں آزادی کی دوسری قسط اور پاک نصب العین کی تکمیل کا انتظار بھی کرنا چاہئے اور اس لئے تیار رہنا چاہئے۔ ابھی کمر کھولنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ہماری مبارک باد کی مستحق ہندوستان و پاکستان دونوں سلطنتیں ہیں۔

"ہم پاکستان کو مسلمان کی حیثیت سے اور ہندوستان کو وطن کی حیثیت سے مبارکباد دیتے ہیں"۔

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل

میں اس تصور کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان میں مسلمان اب ایک معمولی اقلیت کی صورت میں رہ گئے ہیں اور آج کی آزادی میں جہاں ان کے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ انگریز کا دو سو سالہ اقتدار ختم ہو گیا جس کے لئے وہ بے چین تھے۔

ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات

وہیں اس فکر کا موقعہ بھی ہے کہ ان کی حیات اجتماعی کی اس ملک میں اب کیا صورت ہے کہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم کرنے کے لئے اپنے میں سے کسی امام اور متدین امیر کا انتخاب کر کے ہندوستان کی مسلم جماعتیں منتشر رہنے کے بجائے متحد ہو جائیں اور اسلام کے کلمہ پر ایک ہوں ایک امیر کے ماتحت شرعی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں۔ صرف ظاہری طور پر ایک نہ ہوں بلکہ حقیقی طور پر ایک ہوں۔ اسی ایک جملہ میں ان کی حیات اجتماعی کی لمبی چوڑی داستان پنہاں ہے۔ ان کے لئے سب سے مقدم یہ چیز ہے کہ ماضی کے واقعات فراموش کر دیئے جائیں طعن وطنز کا سلسلہ ترک کر دیا جائے ایک دوسرے پر الزام رکھنے کی فکر نہ رکھیں بلکہ صرف مستقبل کو سامنے رکھ کر اس پر غور کریں کہ انہیں متحد ہو جانے کے لئے اخوت و مساوات کی کتنی تدابیر ہو سکتی ہیں جو وہ آج عمل میں لا سکتے ہیں۔

نئے ہندوستان میں وحدت جماعت کی ضرورت

میرے خیال میں پہلے سے زیادہ اب وقت ہے کہ ہم متحد ہوں پہلے سے زیادہ اب امکانات ہیں کہ ہم متحد ہو سکیں۔ وہ پارٹیاں جن پر آویزشوں کی بنیادیں ہیں۔ اس انقلاب سے منقلب ہو چکی ہیں اور حقیقتاً ہندوستان کے بدلنے سے وہ بھی بدل گئی ہیں۔ اس لئے اب بجائے اس کے کہ ہم نئی پارٹیوں کی بنیادیں رکھ کر اختلافات کی تخم ریزی کریں یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ وحدت جماعت کا سنگ بنیاد رکھ کر ان تمام مسائل کو حل کریں جو نئے ہندوستان میں پیدا ہو گئے ہیں۔

میں آخر میں مکرر مبارک باد پر جو مسلمانوں کے لئے اور پورے ایشیاء کے لئے ہے اس تقریر کو دعا پر ختم کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پس منظر

حضرت مولانا مدنی مدظلہ کی تحریک اور نائب مفتی احمد علی صاحب سعید کی تائید سے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب صدر جلسہ قرار پائے۔

قاری حفظ الرحمٰن صاحب کی قرات سے جلسہ کا آغاز ہوا۔

حافظ اخلاق احمد صاحب محرر دار الافتاء نے حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کی جانب سے فارسی کا قصیدہ خیر مقدم پڑھ کر سنایا۔ محمد حبیب دیوبندی طالب علم نے اردو نعت اور فضل الرحمٰن ابن قاری حفظ الرحمٰن نے عربی قصیدہ سنایا۔

حضرت مولانا مدنی مدظلہ نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو

تو کجا بہر تماشا مے روی

نہایت خوشی کا مقام ہے جس جگہ ہم سب جمع ہیں یہ کوئی معمولی نہیں ہے۔ تذکرۃ الرشید میں ہے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ نے خواب میں دیکھا تھا کہ

"میں خانہ کعبہ کے در پر کھڑا ہوں اور میرے پیروں کے نیچے سے نہریں نکل کر تمام عالم میں پھیل رہی ہیں"۔

اس خواب کا مصداق دار العلوم اور اس کی شاخوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کے خلیفہ اعظم تھے۔ شاہ عبدالغنی صاحبؒ تلامیذ میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ پر اور خلفاء میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ پر فخر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ تصوف میں مولانا رفیع الدین صاحبؒ کا بڑا درجہ تھا۔

انہوں نے ہی یہ خواب دیکھا تھا کہ علم کی کنجیاں میرے ہاتھ میں دی گئیں وہ تعجب کرتے تھے کہ میرا علم میں کوئی بڑا درجہ نہیں ہے پھر ایسا کیوں ہوا؟ مگر جب وہ دار العلوم کے مہتمم بنائے گئے تو معلوم ہوا کہ ان کے ذریعہ سے علم دنیا میں پھیلا۔

ایک دوسرا خواب انہوں نے ہی یہ دیکھا تھا کہ

"مدرسہ کے چمن میں خانہ کعبہ ہے اور لوگ اس کا طواف کر رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی معنوی حیثیت اسلام میں وہ شان رکھتی ہے جو عالم میں خانہ کعبہ کے انوار و برکات لئے ہوئے ہیں"۔

ہماری عملی حالت گو بہت گری ہوئی ہے مگر خدا کا یہ عظیم الشان احسان ہے کہ اس نے ہم

سے اس مرکز کی خدمت لی۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ' کے ان مکاتیب میں جو ابھی چھپے نہیں ہیں میں نے لکھا دیکھا ہے کہ جب جہانگیر نے ان کو قید کر کے دہلی بلایا تو ان کا دیو بند سے گزر ہوا تو فرمایا کہ ۔

"اس جگہ سے علم نبوت کی بو آتی ہے"۔

چنانچہ اس جگہ کو اللہ تعالیٰ نے علم شریعت و علم نبوت کا مظہر قرار دیا۔

حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے جب ہمارے مہتمم صاحب کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مدرسہ کے لئے دعا فرمائیں تو بگڑ کر فرمایا کہ ۔

"کیا خوب! تمہارے مدرسہ کے لئے؟ نہ معلوم ہماری کتنی راتیں اس دعا کی نذر ہوئی ہیں۔ اور اب مدرسہ اپ کا ہو گیا۔۔۔ فرمایا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارا خیال تھا کہ علم شریعت کا کوئی مرکز بنا چاہئے مگر ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دیو بند کو اس کام کے لئے منتخب کیا ہے"۔

بہر حال یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے ہم سب سے یہ خدمت لی۔ دار العلوم کو جو فضیلت ان بزرگوں کے ذریعہ سے حاصل ہے وہ کسی دوسری جگہ کو نصیب نہیں ہے۔

علم کے اللہ نے بڑے بڑے مرکز مقرر فرمائے۔ مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ' عراق' شام' مصر' خراسان' بخارا اور سمر قند وغیرہ۔ پھر دیو بند کے حصہ میں یہ دولت آئی۔ دینی علوم کی ترقی جس قدر آپ کو یہاں ملے گی وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ٥

یہاں کے دیہات میں علم کا جو اثر ہے وہ دوسری جگہ کے شہروں تک میں نہیں ہے۔

ہمارے محترم بزرگ حضرت مہتمم صاحب گو عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں مگر ان کو خاندانی جو نسبت حاصل ہے اور ان کا جو منصب ہے۔ اس کے اعتبار سے وہ ہمارے سب کے سردار ہیں۔ ہمارے لئے افسوس کا موقع تھا کہ وہ دوسری جگہ پاکستان رہ جاتے۔ اگرچہ جانا عارضی تھا مگر یہ افواہیں سن سن کر اب واپسی نہیں ہو گی ہم کو تکلیف ہوتی تھی مگر ۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور

الحمد للہ! ہمارے صدر مہتمم صاحب حضرت نانوتوی کی آنکھوں کے تارے تشریف لے آئے ہیں۔ ہم جس قدر بھی خوشی کا اظہار کریں کم ہے۔ ان کا قیام اگر پاکستان میں ہوتا تو بھی فیض سے خالی نہ ہوتا مگر ہمارے لئے قلق کا باعث ہوتا۔ آپ کے لئے سر چشمہ فیض خانہ کعبہ کی حیثیت رکھتا

ہے۔

آخر میں ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اپنے سفر کے تاثرات سے بھی مستفیض فرمائیں گے تاکہ وہ مستقبل میں ہمارے کام آئیں۔

حضرت مولانا کی تقریر کے بعد مولوی غلام حیدر اور مولوی عبدالاحد صاحبان کی دستار بندی ہوئی۔

اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے خطبہ مسنونہ کے بعد ذیل کا شعر پڑھ کر اپنے تاثرات بیان فرمائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حدیث پاکستان

جب عام دنیا اس وقت اصلاح طلب ہے۔ اسی طرح پاکستان بھی دینی حیثیت سے کافی حد تک محتاج اصلاح ہے۔ جو علماء حقانی ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ ملک کی تقسیم سے اصلاحی کاموں میں خصوصیت سے رکاوٹ پیش آگئی ہے۔ اور اصلاح کے راستے کچھ بند ہو گئے ہیں طلباء کا ادھر آنا منقطع ہو گیا ہے۔۔۔۔اور دارالعلوم کا علمی فیضان وہاں پہنچنا مشکل ہو گیا ہے۔
دارالعلوم کی سعی پر حکومت ھند نے راستہ کھول دیا ہے۔ اور اب حکومت پاکستان کے سامنے بھی دارالعلوم کی طرف سے درخواست پیش کی گئی ہے کہ وہ بھی طلباء علم کے لئے ہندوستان آنے کے راستے کھول دے۔ امید ہے کہ یہ سعی کامیاب ہو جائے گی۔
حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ‘

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْراًوَّ نَذِیْراًوَّ دَاعِیاً اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً............ اَمَّابَعْدُ............

عظیم الشان نفع

بزرگان محترم!

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

میں حیران ہوں کہ بیان تاثرات کے اس بوجھ کو کس طرح اٹھاؤں مجمع اکابر کا ہے۔ اساتذہ کا اجتماع ہے۔ بزرگوں کے اجتماع میں قوت گویائی یارا نہیں دیتی اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔

ارشاد ہے کہ اپنے ان تاثرات کا اظہار کروں جو ہر شخص کچھ نہ کچھ سفر سے لے کر آتا ہے۔

اول تو پاکستان جانے میں جو عظیم الشان نفع حاصل ہوا وہ دعائیں ہیں جو بزرگوں نے فرمائیں۔ اگر میں پاکستان نہ جاتا تو یہ دعائیں حاصل نہ ہوتیں۔ پھر بزرگوں کے حوصلہ افزا کلمات میسر نہ ہوتے۔ حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب نے اپنی نظم میں جس تاثر کا اظہار فرمایا وہ میرے لئے باعث فخر ہے۔ اور حضرت شیخ مدظلہ' العالی کے بارے میں تو میں کیا عرض کروں وہ تو ہم سب کے لئے انشاء اللہ وسیلہ نجات ہیں۔ حضرت نے اس ناکارہ کے بارے میں جو کلمات فرمائے ہیں۔

"میرے درخواست یہ ہے کہ وہ انہیں یاد رکھیں اور قیامت میں انہی الفاظ میں گواہی دے دیں تاکہ میرے لئے وہاں نجات کا باعث ہوں کہ یہ کلمات ہی میرے لئے دستاویز نجات ہیں"۔

(اس موقع پر وفور جذبات سے حضرت مہتمم صاحب پر رقت وگریہ طاری تھی۔ ممدوح کی اس حالت کا مجمع پر بھی زبردست اثر پڑا اور لوگوں کے بے ساختہ آنسو نکل آئے) چند لمحے خاموش رہنے کے بعد فرمایا۔

پاکستان جانے کا مقصد

میں یہاں سے پاکستان تین مقصد لے کر گیا تھا۔ ایک عزیز اقرباء سے ملاقات تھی' جن کا عرصہ سے تقاضا تھا' وہاں کے مدارس سے بھی طلب تھی اور جلسوں میں شرکت کے کے خطوط بھی برابر آرہے تھے۔ اس مرتبہ کوشش کی کہ ہو آؤں۔ چنانچہ سفر کا یہ مقصد میں نے حکومت کے سامنے بھی ظاہر کر دیا تھا۔

دنیا کا عمومی دینی انحطاط

دینی حالت پاکستان وہندوستان کیا' ساری دنیا کی یکساں ہے۔ آج حقیقی طمانیت تمام دنیا سے مفقود ہے۔ دنیا اس وقت ایک بے لوڈھک کرہ کی طرح اضطراب اور حرکت میں ہے۔ ساری دنیا کی یہی کیفیت ہے۔ آج جہاں سے بھی خبریں آتی ہیں وہ عام بدامنی' عام طور سے بے چینی' بے سکونی' لڑائیوں اور فسادات کی تو آتی ہیں۔ صلاح ورشد کی اطلاعات کہیں سے نہیں آتیں حجاز سب سے بڑا مرکز دین ہے۔ خود وہاں کی حالت بھی دینی اور اخلاقی حیثیت سے بلند پایہ نہیں۔

تیسرے سال جب مجھے وہاں حاضری کا موقع ہوا تو میں نے دیکھا کہ عصر کے بعد ہزاروں آدمی جبکہ طواف بیت اللہ اور ذکر اللہ میں مشغول تھے۔ مکہ کے چند نوجوان جو لباس فاخرہ پہنے ہوئے تھے اور اونچے طبقے کے معلوم ہوتے تھے۔ حرم محترم میں انگریزی اخبار ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ جس میں عریاں تصویریں تھیں۔ ان تصویروں کی خوبیاں بیان کرنے اور یورپ ولندن کے تمدنی

مسائل کی بحث میں مشغول تھے۔ گویا وہ ان طواف وذکر کرنے والوں کو احمق سمجھ رہے تھے۔ اور ان کے نزدیک ان عریاں تصاویر کی دید بیت اللہ کی دید کے مقابلہ میں زیادہ باوقعت تھی۔۔۔ مجھے بڑی ضیق ہوئی۔ حرم محترم میں بیٹھ کر بیت اللہ کے سامنے قبولیت کے اوقات میں تصاویر پر بحث کرنا بہت ہی ناگوار گزرا۔ میں چپ رہا۔ یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہوئی اور لوگ نماز مین مشغول ہوگئے۔ نماز کے بعد دیکھا تو انہوں نے پھر یہ مصور اخبار سنبھالے اور پھر وہی بحث چھیڑی تنگ ہو کر میں نے عرض کیا کہ :-

"عزیزو! مشرق و مغرب کے لوگ جو آپ کی تقلید کرنے یہاں آتے ہیں جب آپ عمل کا یہ نمونہ پیش کریں گے تو ہماری کیا حالت ہوگی؟ آپ کو اپنا مقام خود سمجھنا چاہئے۔ آنے والے آپ سے اسلام کا نمونہ سمجھنا اور سیکھنا چاہتے ہیں"۔

حاصل یہ ہے کہ اخلاقی حالت آج ہر جگہ یہ ہے تو ہندوستان اور پاکستان تو پھر بعد کی چیز ہے۔ بہر حال ہر ملک کی طرح پاکستان بھی دین کے لحاظ سے بہت زیادہ محتاج اصلاح ہے۔

اصلاح کی ذمہ داری

اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہے؟ حقیقت میں مسلمانوں پر، مسلم کو خیر الامم کہا گیا ہے جس طرح جناب رسول ﷺ امام الانبیاء ہیں۔ اسی طرح آپ کی امت بھی امام الامم ہے۔ اگر امام کا وضو ٹوٹ جائے تو مقتدیوں کی تو نماز بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ پھر مسلمانوں میں سب سے زیادہ اصلاح خلق اللہ کی ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنی ذمہ داری بھلادی ہے۔ اگر وہ خود خلیق ہوں تب دوسرے بااخلاق بن سکتے ہیں۔

پاکستان میں سر اٹھانے والے فتنے

وہاں اس وقت دینی حیثیت سے تین فتنے مسلمانوں کے لئے خطرناک ثابت ہورہے ہیں۔

ایک قادیانی فتنہ
دوسرا شیعیت کا فتنہ
اور تیسرا مغربیت کا فتنہ

قادیانیوں نے اپنا مرکز کوئٹہ بلوچستان کو بنالیا ہے۔ مرزا بشیر الدین نے اعلان کر دیا ہے کہ قادیانی بلوچستان کو سنبھالیں۔ چنانچہ انہوں نے کوئٹہ میں اپنا مرکزی دفتر کھول دیا ہے۔ جو ایران، مصر اور دوسرے ممالک اسلامیہ کا دہانہ ہے۔ انہوں نے ملتان مین ایک عظیم جلسہ کا اعلان کیا ہے جس میں ان کے نزدیک پچاس ہزار قادیانیوں کے جمع ہونے کا امکان ہے۔ جلسہ کا مقصد یہ ہے کہ

تمام دنیامیں پھیل کر قادیانی مسلک کی اشاعت کی جائے۔

انہوں نے اپنے چند افراد مصر وغیرہ بھیج کر انہیں عربی بول چال کا ماہر بنالیا ہے۔اور بطور شو کے ان کی عربی تقریریں پبلک کے سامنے کراتے ہیں۔ تبلیغ کا نظم سامنے لاتے ہیں اور اپنی مساعی کی روداد پیش کرتے ہیں۔اس طرح سے اہل حق اس باطل کا شکار ہوتے چلے جارہے ہیں۔ادھر ان عربی دانوں کے ذریعہ ممالک اسلامیہ میں اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

دوسری طرف شیعوں نے ملک میں مختلف انداز سے شیعیت کا پروپیگنڈا کررکھا ہے۔جس سے سادہ لوح عوام شیعیت کا شکار ہورہے ہیں اور اس طرح یہ فتنہ بھی فروغ پارہا ہے۔

تیسرا فتنہ مغربیت یا آزادی اور بے قیدی کا ہے جس کے راستہ سے بے دینی اور بے حیائی کی تخم ریزی ہورہی ہے۔اس جماعت کے نزدیک سرے سے مذہب ہی کی اہمیت نہیں۔ مغربیت کے اس فتنہ سے الحاد اور بے دینی بڑھ رہی ہے۔ گویہ فتنہ اس وقت پوری دنیا پر مسلط ہے۔ تاہم ہمیں اور جگہ سے بحث نہیں۔

فتنوں کا سدباب ایک زمانہ میں ان فتنوں کا دارالعلوم نے سدباب کیا تھا اور آج بھی دارالعلوم ہی کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔اس کے ذیل میں کمیونزم اور کیپٹل ازم وغیرہ کے سیاسی فتنے پھر سر ابھار رہے ہیں۔ جن کا سدباب علمائے حق کا کام ہے۔

میں نے تو وہاں کے علماء کو توجہ دلائی کہ اگر مسلمانوں کی اخلاقی حالت درست ہوجائے تو دوسری اقوام کی حالت درست ہوجائے گی بلکہ اخلاق درست کرلئے جائیں تو پاکستان وہندوستان دونوں کے درمیانی معاملات کی حالت بھی درست ہوسکتی ہے۔

ایک حدیث قدسی میں یہ فرمایا گیا ہے۔

”حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں جب کسی قوم کی بدعملی پر ناخوش ہوتا ہوں تو دوسری اقوام کے دل میں اس بدعمل قوم کی طرف سے بغض وعداوت بٹھادیتا ہوں اور وہ جلاد بن کر مجرم قوم پر مسلط ہوجاتی ہیں۔اور قتل وغارت کے ذریعہ اسے سزادیتی ہیں۔ پس اگر تمہیں یہ سزا اور بے کسی اور مغلوبیت ناگوار ہے تو تم کسی قوم کو برامت کہو۔ میرے ساتھ معاملہ درست کرو' میں اقوام کے قلوب میں پھر تمہاری محبت ڈال دوں گا“۔

اس لئے میں تو دوسری اقوام کی بدحالی کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر ہی عائد کرتا ہوں۔اگر یہ قوم درست ہوجائے تو سب اقوام درست ہوجائیں۔

اصلاحی کاموں پر تقسیم ہند کے اثرات

بہر حال جیسے عام دنیا اس وقت اصلاح طلب ہے اسی طرح پاکستان بھی دینی حیثیت سے کافی حد تک محتاج اصلاح ہے۔ جو علمائے حقانی ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ملک کی تقسیم سے اصلاحی کاموں میں خصوصیت سے رکاوٹ پیش آگئی ہے اور اصلاح کے راستے کچھ بند سے ہو گئے ہیں۔ طلباء کا ادھر سے آنا منقطع ہو گیا ہے اور دار العلوم کا علمی فیضان وہاں پہنچنا مشکل ہو گیا ہے۔ دار العلوم کی سعی پر حکومتِ ہند نے طلباء کے لئے راستہ کھول دیا ہے۔

اور اب حکومت پاکستان کے سامنے بھی دار العلوم کی طرف سے درخواست پیش کی گئی ہے کہ وہ بھی طلبائے علم کے لئے ہندوستان آنے کے راستے کھول دے امید ہے کہ یہ سعی کامیاب ہو جائے گی۔ بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ نہ صرف وہاں سے سے طلبہ کی آمد پر ہی سے پابندی ہٹا لینے کی ضرورت ہے بلکہ یہاں سے وہاں مبلغین کی آمد و رفت کو بھی آزاد کر دیا جائے تو یہ دونوں ملکوں کے تعلقات کے لئے خیر سگالی کے وفود سے زیادہ مفید اور موثر ثابت ہو گا۔ کیونکہ مبلغین ان کی اخلاقی حالت کی اصلاح کریں گے اور اخلاق جس حد تک درست ہوں گے اور کردار جس حد تک کسی ملک کا اونچا ہو گا۔ اسی حد تک دوسرے ممالک اس سے مطمئن ہو کر اس کا اعتماد حاصل کر لیں گے۔

بڑی امید افزاء خوبی

آج کل اخلاقی حالات کے بگڑ جانے سے ہی عموماً بگاڑ آیا ہوا ہے۔ ہاں! مگر جہاں عام دنیا کی حالت ہے وہاں دینی حیثیت سے یہ خرابیاں ہیں وہیں ایک بڑی امید افزاء خوبی بھی ہے جو اور جگہ کم پائی جاتی ہے اور وہ ہے طلب اصلاح اور حسن قبول یعنی وہاں پر ہر بڑے چھوٹے میں اصلاح کی طلب اور خواہش پائی جاتی ہے۔ مگر اصلاح کے لئے ہر قسم کے علماء کی ضرورت ہے۔ ایک خالی الذہن کے لئے خطابات سے سمجھا دینا کافی ہو گا۔ ایک عقلیت پسند کے لئے حکمت واستدلال کی ضرورت ہو گی اور ایک کٹ حجت کے لئے الزامی جوابات اور خود اس کے مسلمات سے اس پر حجت قائم کرنا ضروری ہو گا۔

قرآن نے ان ہی تین مقامات کی طرف اشارہ فرمایا کہ ؎

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

پس جیسے لوگ ہوں گے ویسی ہی زبان میں انہیں سمجھانا ہو گا۔ اس لئے تقسیم عمل کی ضرورت ہے۔

اعلان استغناء

ہاں! پھر اسی کے ساتھ ساتھ ایک مصلح کو قلبی استغناء کی بھی حاجت ہے۔ اصلاح میں جس قدر بھی رکاوٹ یا تاثیر میں جتنی بھی روک ہوتی ہے وہ مصلح کی

طمع سے ہوتی ہے۔ مخاطب پہلے یہ دیکھتا ہے کہ مصلح غرض مند تو نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی غرض مندی کا شبہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا' اس لئے جہاں قلبی استغناء درکار ہے وہیں اعلان استغناء بھی ضروری ہے تا کہ اصلاح محض توجہ اللہ ہونے سے قلوب پر اثر انداز ہو گویا تبلیغ کی تاثیر کے لئے استغناء بالخاصہ ضروری ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے بتلایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام موعظت و اصلاح کے وقت خصوصیت سے اعلان استغناء فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلاَّ عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اگر اس طرف سے طلباء آنے لگیں اور اس طرف سے مبلغین جانے لگیں تو دونوں حکومتوں کے کردار پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے جیسا کہ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

دیانت عمل کی تاثیر

تقریباً آٹھ سال ہوئے کہ جمعیت علماء صوبہ سندھ کے جلسہ کی صدارت کے لئے میرا حیدر آباد سندھ جانا ہوا تھا' جلسہ کے بعد وہاں کے ہندوؤں نے ہم لوگوں کو چائے پر مدعو کرنا چاہا جس کو مان لیا گیا۔ عصر کے بعد موٹریں آئیں۔ شہر سے باہر ان کی کوٹھی پر پہنچے۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا اس لئے طبیعت نماز کے لئے بے چین ہوئی۔ جس کو انہوں نے بھی محسوس کیا اور کہا کہ غالباً آپ لوگ نماز کی وجہ سے مضطرب ہیں تو مسجد یہاں سے ڈیڑھ میل دور ہے۔ مسجد تک جاتے جاتے نماز کا وقت جاتا رہے گا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو نماز ہمارے مکان ہی میں پڑھ لیجئے۔ ہم نے کہا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ساری زمین ہمارے لئے مسجد ہے۔

اس قرارداد کے بعد کا منظر دیکھنے کے قابل تھا کہ وہ لوگ پانی وغیرہ لا رہے تھے سفید تولئے لا رہے تھے' چادریں بچھا رہے تھے۔ قبلہ کی سمت بھی انہوں نے تشخیص کر کے بتلائی ہم نے اذان دی اور نماز ادا کی۔ اور وہ سب مرد' بچے' بڑے ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔

جب ہم لوگ نماز اور معمولات سے فارغ ہو چکے تو وہ آگے آئے اور کہ کہ

"ہماری قسمت ایسی کہاں تھی کہ ہمارے گھر پر بھگوان کا نام لیا جائے"

مجھے ان کے ان الفاظ کی قدر ہوئی اور میں نے کہا کہ یہ آپ کی نیکی کی بات ہے مگر عام طور سے تو لوگ نماز کے بارے میں اور مسجدوں کے معاملہ میں تعصب کا برتاؤ کرتے ہیں۔ مسجد اور باجہ وغیرہ کا جھگڑا روزانہ ہوتا رہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا' جیسے آدمی ہوتے ہیں ویسا ہی ان کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ہمارے چڑانے کو نماز پڑھیں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کریں گے۔ بہر حال اگر مسلمان دیانت عمل کا مجسمہ بن جائیں تو خود بخود لوگوں کے دل میں کشش پیدا ہو جائے۔ غلط نمونہ پیش کر کے خود ہم نے لوگوں کو دین سے دور کر دیا ہے۔ گویا ہم مبلغ بننے کی بجائے

تبلیغ دین کے حق میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا نمونہ عمل دیکھ کر لوگ کہتے ہیں کہ اگر اسلام کے یہی معنی ہیں تو ہمارا اسلام کو سلام ہے۔

بہر حال دار العلوم اپنی بنیادوں کے لحاظ سے مصلح ہے اور لوگ اس کی اصلاحی مساعی سے اثر لیتے ہیں۔ اس وقت اسے اخلاقی اور دینی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ اصلاحی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

قدر دار العلوم

ہم کو دار العلوم کی قدر یہاں بیٹھ کر محسوس نہیں ہوتی۔ دار العلوم سے باہر جا کر قدر ہوتی ہے کہ وہ کیا نعمت ہے؟ جب مجھے واپسی کی راہ کچھ مسدود سی نظر آئی تو اس وقت دار العلوم کی فضا ہر وقت نظروں کے سامنے رہنے لگی کیونکہ یہ ماحول ہر جگہ میسر نہیں۔

مجھے عید الاضحیٰ کراچی ہیں میں پڑھنے کی نوبت آئی اور ظاہر ہے کہ چودہ لاکھ کے شہر میں عید کے اجتماع کا منظر کتنا اعلیٰ ہوتا ہوگا۔ لاکھوں کے مجمع میں ایک جگہ عید پڑھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے تلاش طلباء و علماء کے ماحول کی رہی۔ اور میں اس عید کا متلاشی تھا جس میں دار العلوم جیسا ماحول ہو۔ میں نے مولانا محمد صادق صاحب کے مدرسہ کے مجمع کے ساتھ نماز عید پڑھی کہ وہاں کا ماحول کچھ طلباء اور علماء کا تھا مگر پھر بھی کمال تسکین واطمینان حاصل نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگوں نے مدارات میں کمی نہیں کی۔ قدم قدم پر وسائل راحت تھے۔ پبلک نے مجھے دار العلوم قائم کرنے کو کہا اور تین لاکھ کا فنڈ بھی پیش کیا۔ لوگ وہاں کے قیام کے لئے مضبوط دلائل بھی بیان کرتے تھے مگر اس کے باوجود قلبی رجحان اور وجدان دار العلوم کے ماحول کا متلاشی تھا۔

حضرت مدنیؒ کا تصرف

میرے اصرار واپسی کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے قلب میں قیام سے توحش کی بنا در حقیقت حضرت شیخ مدنیؒ کا تصرف ہے جو وہاں بیٹھ کر وہ کر رہے ہیں اور اس لئے آپ یہاں سے اکھڑ رہے ہیں۔ بہر حال میرا قلبی رخ کسی بھی وجہ سے ہو یہی تھا کہ میں حاضر ہوں۔ الحمد للہ کی حاضری ہو گئی۔ اور آپ بزرگوں اور دوستوں کی زیارت کا حق تعالیٰ نے موقع میسر فرمادیا۔ پھر بھی وہاں کے بزرگوں اور دوستوں کی محبانہ مہمان نوازی اور غرباء پروری کے نقوش دل میں نقش رہیں گے۔

باقی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت کی حاضری حضرت شیخ کی ظاہری و باطنی توجہ بلکہ تصرف سے ہوئی اور دار العلوم کی خدمت کا دوبارہ موقع ملا۔

قمیص عثمانی

میرے محترم بھائی مولانا عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی نبیرۂ حضرت اقدس مولانا گنگوہی رحمہ' اللہ نے اس خدمت دارالعلوم کو قمیص عثمانی سے تشبیہ دیتے ہوئے مجھے وہاں لکھا تھا کہ آپ کو اپنے ارادہ اختیار سے اس قمیص عثمانی کو نہ اتارنا چاہئے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ قمیص عثمانی کو اتارا نہیں ہے بلکہ تھوڑے وقفے کے لئے۔ جیسے غسل کے لئے کپڑے اتارے جاتے ہیں اور پھر پہن لئے جاتے ہیں۔ ایسے ہی میں نے برائے تطہیر کچھ وقفہ کے لئے یہ لباس اتار کر رکھا ہے۔ عنقریب پہن لیا جائے گا۔

جذبات تشکر

آخر میں مجھے یہ گزارش کرنا ہے کہ آپ حضرات نے کل سے اب تک جن پر خلوص جذبات محبت کو ظاہر فرمایا اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں اور اس کو اپنے لئے وسیلہ نجات تصور کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کی توفیق مزید نصیب فرمائے۔

واخر دعوانا ان الحمدللہ ربِّ العالمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

امارت شرعیہ

امارت شرعیہ کا قیام ضروری ہے--- اور فقہاء لکھتے ہیں کہ جب حکومت اسلامی نہ ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنا ایک امیر مقرر کر لیں اپنے معاملات میں ان کی طرف رجوع کریں اور سمع وطاعت کے ساتھ اس پر چلیں۔ اس کا فائدہ پوری قوم کو پہنچے گا۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ'

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًاوَّ نَذِيْرًاوَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا...............اَمَّابَعْدُ........

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا. (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

روز مسرت

بزرگان محترم!

میرے لئے خصوصیت سے آج بہت ہی مسرت وخوشی کا دن ہے کہ اس مقدس مجمع میں کہ جس میں اس نواح کے امیر شریعت اور دوسرے بزرگان تشریف فرما ہیں۔ مجھے ان کی معیت کا بھی شرف حاصل ہوا ہے۔ اور ان کی برکات سے مستفیض ہونے کا بھی موقع ملا اور دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ ان کی رعیت ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ اس لئے کہ امیر شریعت کے سامنے تو سب

رعایا ہی ہوتی ہے وہ باہر کے ہوں یا اندر کے ہوں۔

بہر حال ایک رعایا کی حیثیت سے اپنے امیر کی خدمت میں حاضر ہونا ایک مستقل سعادت اور برکت ہے۔۔۔۔اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس امارت کے سلسلہ میں چند طالب علمانہ باتیں آپ کی خدمت میں گزارش کروں زیادہ دیر تک تو عرض نہیں کر سکوں گا اس لئے کہ کچھ تو علیل ہوں اور باعتبار علم کے قلیل ہوں اور اسی کے ساتھ ساتھ صبح سے دماغی کاوش کا بار بھی اوپر پڑا ہوا ہے جس وجہ سے تعب اور تکان بھی پیدا ہو گیا۔

معالجوں کی طرف سے بھی مجھے ہدایت ہے کہ عشاء کے بعد نہ کسی جلسے میں تقریر کروں اور نہ شرکت کروں لیکن بہر حال بزرگوں کا حکم ڈاکٹروں کے حکم سے زیادہ اونچا ہے کیونکہ ڈاکٹر معالج جسمانی ہیں اور یہ بزرگان دین معالج روحانی ہیں اور روح کو جسم پر قدرتی طور پر فضیلت حاصل ہے اس لئے معالجین روح کا حکم زیادہ واجب الاطاعت ہے بہ نسبت معالجین جسم کے اس لئے تعمیل حکم کے طور پر بھی کچھ عرض کرنا ضروری تھا۔ مگر میں زیادہ وقت نہیں لے سکوں گا صرف تھوڑی دیر چند طالب علمانہ باتیں مختصر طور پر گزارش کروں گا۔

اسلام کی بنیاد

اسلام وسیع ترین اور عالمگیر دین ہے اور ساری دنیا کی اقوام کے لئے پیغام ہے۔ اور اس کی عمارت پانچ شعبوں پر قائم ہے۔ گویا اسلام کی پانچ بنیادیں ہیں کہ جس پر اسلام کی تعمیر کھڑی ہے۔

(1) اعتقادات

(2) عبادات

(3) اخلاقیات

(4) معاملات

(5) اجتماعیات

عقائد پہلا شعبہ اعتقادات کا ہے کہ آدمی کے عقائد درست ہونے چاہئیں اور عقیدے کی تین بنیادیں ہیں۔ ا۔ مبداء ۲۔ معاد ۳۔ نبوت

مبداء کے معنی یہ ہیں کہ ہم کہاں سے کہاں آئے ہیں۔ ہماری اصل کیا ہے۔ ہم کس طرح دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں۔ معاد کا حاصل یہ ہے کہ ہم یہ عمر گزار کر جائیں گے کہاں؟ اور نبوت کا حاصل یہ ہے کہ اس آمد و شد کے درمیان ہم زندگی کیسے گزاریں۔ یہ تین بنیادیں ہوئیں عقائد کی۔ مبداء ظاہر بات ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے کہ جس سے ہمیں ہستی ملی ہے اور وجود ملا ہے۔ اور

وہ ہمارے وجود کی اصل ہے اور معاد بھی وہی ہے کہ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تو مبداء بھی وہی ہے اور معاد بھی وہی ہے اور ہدایت کرنے والا بھی وہی ہے کہ ہم زندگی کیسے گزاریں۔ تو سب سے پہلی چیز عقائد ہے کہ جس سے قلب انسانی صحیح ہو جائے۔ کیونکہ تمام اعمال عقائد ہی کے تابع ہیں۔ عقیدہ اگر غلط ہے تو عمل خود بخود غلط ہو جائے گا خواہ آدمی اچھی نیت ہی سے کرے۔ اگر عقیدہ درست ہے تو سارے اعمال خود بخود صحیح ہو جائیں گے۔ جب اعمال صحیح ہوں گے تو احوال بھی صحیح ہوں گے۔ اور جب احوال صحیح ہوں گے تو انجام بھی صحیح ہو جائے گا۔ تو ابتداء سے انتہاء تک انسان عقائد کی صحت کی بناء پر صحیح ہوگا۔ اس لئے سب سے بڑی بنیادی چیز اسلام میں عقائد کا درجہ ہے جو قلب کے اندر پیوست کیا جاتا ہے۔

عبادات دوسرا شعبہ عبادات کا ہے کہ ان عقائد کے تحت اللہ تعالیٰ کو کس طرح سے یاد کیا جائے' عبادت کس طرح سے کی جائے۔ عبادت کے معنی ہیں غایت تذلل یعنی معبود کے سامنے ایسے ذلت اختیار کر لینا جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ' کی عزت لامحدود ہے۔ کوئی عزت کا درجہ نہیں جو اس کی ذات میں موجود نہ ہو۔ اس کے یہاں عزت کامل ہے اس لئے اس کے یہاں ذلت کامل یعنی ایسی ذلت پیش کرنی چاہئے کہ اس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے کہ آدمی اس کے سامنے ذلیل نہ ہو جائے۔

تو عبادت کا مطلب یہ ہے کہ اس عزیز مطلق کے سامنے ذلیل مطلق بن جائے۔ اس کی عزت کسی حد تک رکی ہوئی نہیں۔ ہماری ذلت کسی حد پر رکی ہوئی نہ ہو اور یہ غایت تذلل اور انتہائی ذلت' اللہ کے سامنے اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ آدمی میں انتہائی محتاجگی ہو کیونکہ غنی کسی کے سامنے نہیں جھک سکتا۔

آنکہ شیراں راکند روباہ مزاج
احتیاج است و احتیاج است و احتیاج

جو شیروں کو بھی لومڑی بنا دے وہ حاجت مندی ہے۔ غنا کے ساتھ کوئی کسی کے آگے نہیں جھک سکتا۔ حق تعالیٰ شانہ' غنی مطلق ہیں' رفیع المرتبت ہیں' انسان ان کے سامنے ذلیل مطلق ہے اس کا کام ان کے سامنے ہر وقت جھکنا ہے کہ دل سے بھی جھکے' روح سے بھی جھکے' بدن سے بھی جھکے' قول سے بھی جھکے' فعل سے بھی جھکے ہر اعتبار سے اپنی ذلت و پستی کا اظہار کر دے۔ یہ ہے عبادت۔

عبادت کے معنی فقط نماز روزہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ قانون اسلام کے تحت ذلت کے ساتھ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے وہ اگر کہیں کہ گھر میں فلاں کام کرو تو یہ ہمارا فرض ہے کہ اسی طرح

کریں۔ اگر وہ فرمائیں کہ مسجد میں جاؤ تو ہمارا فرض ہے کہ مسجد میں جائیں اگر وہ کہیں کہ تخت سلطان پر امیر شریعت بن کر بیٹھ جاؤ۔ ہمارا فرض ہے کہ امیر بن کر بیٹھ جائیں اگر وہ کہیں کہ غلام بن جاؤ' فلاں کے تو ہم غلام بننے کو تیار ہوں تو اظہار ذلت کے یہ معنی ہیں کہ عمل سے قول سے' فعل سے' حال سے' چال سے ہر اعتبار سے آدمی اپنی پستی' اپنی احتیاج اور اپنی حاجت مندی کا اظہار کر دے۔ اسی کا نام عبادت ہے۔

اخلاقیات

تیسرا شعبہ اخلاقیات کا ہے۔ عبادات اور عقیدہ درست نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ قلب کی حالت درست نہ ہو اور قلب محل اخلاقیات ہے۔ لہذا جب تک اخلاق انسانی صحیح نہ ہوں گے یعنی جب تک صبر نہ پیدا ہو' حیا نہ پیدا ہو' شکر نہ پیدا ہو۔ سخاوت نہ پیدا ہو' شجاعت نہ پیدا ہو' توکل علی اللہ نہ پیدا ہو۔ انابت الی اللہ نہ پیدا ہو۔ یہ ملکات جب تک ذہن میں نہ جمیں گے عقیدہ درست نہ ہو گا۔ عقیدہ درست نہ ہو گا تو عمل درست نہ ہو گا اور عبادت درست نہ ہو گی تو مدار آکر ٹھہر جاتا ہے اخلاق پر۔ اس لئے اسلام میں اہم ترین شعبہ اخلاق کا ہے۔ لہٰذا اخلاق کی تربیت کی جائے۔ اخلاق کو بلندی پر پہنچایا جائے۔ اور انسان کو جبلی طور پر جو بداخلاقیوں کے روگ لگے ہوئے ہیں یہ دور کر کے پاکیزہ اخلاق سے بدلا جائے۔ جبلی طور پر انسان میں حرص بھی ہے بخل بھی ہے۔ حسد بھی ہے۔ کبر و رعونت بھی ہے۔ یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کو مخلوق کے آگے ذلیل کرتی ہیں۔ ان کو نکال کر کبر کی بجائے تواضع پیدا کی جائے۔ بخل کی بجائے سخاوت پیدا کی جائے' خود غرضی کی بجائے ایثار پیدا کیا جائے ہوس رانی کی بجائے قناعت کا جذبہ پیدا کیا جائے جب یہ اخلاق درست ہوں گے تو عقائد درست ہوں گے پھر اعمال درست ہوں گے اور جب اعمال درست ہوں گے تو انجام درست ہو گا۔ پھر زندگی بھی صحیح ہو جائے گی اور موت بھی صحیح ہو جائے گی۔ اس لئے اسلام میں اہم ترین شعبہ اخلاقیات کا ہے۔

معاملات

چوتھا شعبہ معاملات کا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کس طرح کا برتاؤ کریں معاملات میں نزاع ہو' جھگڑا ہو' اس کا سلجھاؤ کس طرح سے کریں۔ ہم ایک دوسرے سے جھگڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کا فیصلہ کس طرح سے کریں' لین دین کس طرح سے ہو' قرض ادھار کے طریقے کیا ہوں گے' امانت رکھنے کے طریقے کیا ہیں اور ادائیگی کے طریقے کیا ہیں اجارہ کے احکام کیا ہیں' اور زمین کے احکامات کیا ہیں تو معاملات کا شعبہ بھی اہم شعبہ ہے جس میں ایک انسان کو دوسرے انسان سے واسطہ پڑتا ہے' اگر دیانت نہ ہو' امانت نہ ہو۔ لازمی طور پر دنیا میں

فساد پیدا ہو گا اور جب فساد پیدا ہو گا تو بدامنی پیدا ہوگی جب بدامنی پیدا ہو گی تو نہ جان کی خیر رہے گی نہ مال کی خیر رہے گی۔ ہر شخص غیر مطمئن رہے گا۔ پریشان رہے گا۔ اضطراب اور بے چینی قلب کا جو ہر بن کر رہ جائے گا۔ اسی لئے معاملات کی صحت اور خوبی یہ بھی اسلام کا اہم ترین شعبہ ہے۔

اجتماعیات

پانچویں چیز اپنی قومیت کو سنبھالنا ہے، یعنی اجتماعی حالت کو درست کرنا ہے قوم میں اجتماعی طور پر ایک تنظیم ہو، قوم ایک نظم کے تحت زندگی گزارے، بدامنی نہ ہو کہ ایک کا رخ ادھر کو ہو اور ایک کا رخ ادھر کو ہو' ایک مشرق کو جارہا ہے، اور ایک مغرب کو جارہا ہے۔۔۔ یا ایک ادھر سے آرہا اور ایک ادھر سے دونوں ٹکرائیں آپس میں اور جھگڑیں اور خونم خون ہوں بلکہ ایک نظم کے اندر پوری قوم جڑی ہوئی ہو۔ ایک نظام کے تحت چل رہی ہو۔ ہر ہر چیز اپنے محل کے اوپر قائم ہو۔

یہ پانچ شعبے ہو گئے ہیں۔ اعتقادات، عبادات، اخلاقیات، معاملات اور اجتماعیات۔ ان پانچ شعبوں کو علماء کے ایک ایک طبقہ نے سنبھالا ہے اور لاکھوں علماء ایک ایک شعبے کو سنبھالنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے سنبھالا اور اپنا فرض منصبی پورا کیا۔

متکلمین اسلام کی خدمات

اعتقادات کو سنبھالنے اور ان کو ثابت کرنے کے لئے حکماء اسلام کا ایک طبقہ کھڑا ہوا جنہیں متکلمین کہتے ہیں، انہوں نے عقلی اور نقلی انداز سے عقائد کو حق ثابت کیا، استدلالات سے عقائد کا فطری ہونا ثابت کیا سب عقیدے فطرت کے مطابق ہیں، کوئی عقیدہ فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ عقل کے خلاف ہو اور اسلام میں اس کو زبردستی ٹھونس دیا گیا ہو بلکہ فطرت تقاضہ کرتی ہے کہ یہ ہی عقیدہ ہونا چاہئے۔

فطرتیں مطمئن ہیں کہ یہی عقیدہ درست ہے۔ ان حکماء اسلام نے حسی، عقلی، نقلی، فطری۔ ہر طریقے سے ثابت کر دکھایا، ایک ایک عقیدے کے لئے ہزارہا دلائل قائم کئے اور اس سلسلے بڑی بڑی، ضخیم ضخیم، عظیم عظیم کتابیں لکھی گئیں اور حجت و برہان سے عقائد مضبوط ہو گئے۔ اس لئے کوئی قوم کامیاب نہیں ہو سکتی ہے نہ مسلمانوں کے سامنے اور ان کے عقائد کے سامنے' اللہ جزائے خیر دے متکلمین حکماء اسلام کو کہ انہوں نے اس سلسلہ میں خدمت کی اور اس دائرہ اعتقادات کو سنبھالا اور ثابت کر دکھایا کہ حق یہ ہی ہے جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔

ائمہ اجتہاد کی خدمات

دوسرا شعبہ عبادات کا ہے اس کو سنبھالا ہے فقہائے اسلام نے اور ائمہ مجتہدین نے اور پھر ان کے نیچے دوسرے ائمہ کھڑے ہوئے اور فقہ کے بڑے بڑے اکابر نے اس کو مدون کیا اور مرتب کیا۔ باب وار فصل وار مسائل مقرر کئے اپنی ترتیب کے ساتھ مسائل کو ترتیب دیا ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھی گئیں مستقل ایک فن بن گیا جس کے اندر ہزار ہا فروع داخل ہوئیں ائمہ اجتہاد نے اپنے تفقہ کے اصول سے قرآن و حدیث سے مسائل کا استخراج کیا خود مسائل کو نکال کر پیش کیا اگر کہیں اصولِ فقہ میں اختلاف ہوا تو فروعی مسائل میں بھی اختلاف ہوا مگر سب ائمہ ہیں دین حق پر ہیں اور حق ان میں دائرو سائر ہے۔

اگر امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک و امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ میں اختلافات ہیں تو وہ حق و باطل کے نہیں کہ ایک سمت حق ہو اور ایک سمت باطل ہو ایسا ہرگز نہیں بلکہ وہ خطاء اور صواب کے اختلافات ہیں کہ ایک طرف صواب ہے اور ایک طرف خطاء، لیکن ساتھ میں یہ قید بھی لگی ہوئی ہے کہ یہ صواب ہے مگر احتمال ہے کہ خطا بھی ہو اور یہ خطا ہے مگر احتمال ہے کہ صواب بھی ہو۔ اسی لئے حق دائرو سائر ہے تمام ائمہ کے اندر اور تمام کے تمام نجوم ہدایت ہیں جس کا دامن آپ تھام لیں گے انشاء اللہ نجات ہو جائے گی اگر کوئی شافعی المسلک ہے تو وہ بھی نجات یافتہ ہے۔ اگر کوئی حنفی ہے تو وہ بھی نجات کے مراتب طے کر رہا ہے اور اگر کوئی مالکی یا حنبلی ہے تو وہ بھی نجات کے راستے پر جا رہا ہے اور سب اللہ ورسول کی طرف دوڑ رہے ہیں اس لئے کہ بنیاد سب کی ایک ہے وہ ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ البتہ استخراج مسائل میں اصول الگ الگ ہو گئے ہیں۔

اختلافِ مشرب

اور یہ خود شریعت کی عین حکمت ہے اس لئے کہ ائمہ کے اختلاف سے امت کے اندر آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں اتنے راستے نکل آئے ہیں کہ جو جس ذوق کا ہے اسی راستے پر چل کر حق کو پا سکتا ہے، اگر ایک عظیم دریا ہو اور بہت بڑا لمبا چوڑا اتھاہ سمندر ہو لیکن پانی پینے کا گھاٹ ایک ہی ہو تو لوگ ہزاروں میل سے سفر کر کے آئیں گے جب ہی پانی مل سکتا ہے ورنہ وہ پانی سے محروم رہیں گے لیکن دریا اگر ایسا ہے کہ ہزاروں مشرب اور گھاٹ موجود ہیں جس سمت سے آئے وہی پانی وہی مزہ، وہی ذائقہ ہے۔ صرف سمت بدلی ہوئی ہے۔ ایک مشرق کی طرف ہے ایک مغرب کی طرف ہے تو کچھ آسانی ہو گی کہ دریا بڑا ہے اور مشرب اور گھاٹ بہت ہیں۔ ہر طرف سے پانی مل سکتا ہے تو اسلام ایک اتھاہ سمندر ہے اس کے مشارب بہت ہیں۔ ایک مشرب حنفی ہے اور ایک مشرب مالکی ہے۔ ایک مشرب حنبلی ہے اور ایک مشرب شافعی ہے۔ اور یہ چار ائمہ وہ ہیں کہ حسن تدبیر کہئے یا تقدیر خداوندی کہئے کہ یہ چار مذہب دنیا کے اندر رائج ہو گئے۔

ورنہ ائمہ اجتہاد سینکڑوں پیدا ہوئے امام بخاریؒ خود مجتہد ہیں۔ عبداللہ بن مبارکؒ خود مجتہد ہیں۔ حماد بن سلمہؒ خود مجتہد ہیں۔ سفیان ثوریؒ مجتہد ہیں۔ سفیان بن عیینہؒ ہیں۔ ہر ایک کی فقہ الگ الگ ہے۔ لیکن یہ خدا کی طرف سے بات ہے کہ بقیہ فقہیں مندلس ہو گئے اور باقی نہ رہے اور یہ چار فقہیں دنیا کے اندر رائج ہو گئے۔

فقہائے اسلام اور ان کا تادب

امام ابو حنیفہؒ کوفہ میں پیدا ہوئے خراسان کی طرف ان کا فقہ چلا تو پورا خراسان حنفی پورا افغانستان حنفی، ہندوستان کا اکثر حصہ حنفی، پورا ترکستان حنفی۔ جہاں جہاں ان کا فقہ پھیلا وہاں وہاں حنفی ہو گئے۔ چونکہ اللہ و رسول کی محبت انتہائی پر تھی اسی لئے ادب بھی بے حد تھا۔ چنانچہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حج کو تشریف لے گئےؒ مدینہ منورہ روضہ اقدس پر بھی حاضری دی تو سات دن کے بعد واپسی کا ارادہ کیا مگر تمام اہل مدینہ سر ہو گئے کہ ہم نہیں جانے دیں گے۔ جب سارے مصر ہو گئے تو ٹھہر گئےؒ دس دن ہو گئے تو پھر اجازت چاہی۔ مگر اہل مدینہ نے پھر گھیر اڈال لیا کہ ہم ابھی اجازت نہیں دیں گے گیارہویں دن آپ نے فرمایا کہ اب مجھ میں طاقت نہیں ہے۔۔۔ اس پر اہل مدینہ نے معلوم کیا کہ ناطاقتی کی کیا بات ہے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ جب سے مدینہ میں آئے ہیں۔ استنجاء نہیں فرمایا ہے۔ نہ پیشاب نہ پاخانہ کہ مناسب نہیں۔ مدینہ کی ارضِ مقدس کو نجاست سے آلودہ کرنا اس لئے اب میرے اندر طاقت نہیں تو پھر اہل مدینہ نے خود باعزت واحترام رخصت کیا۔

یہ تھا ائمہ کا ادب واحترام کہ جتنی محبت غالب تھی ان حضرات میں اتنا ہی ادب واحترام تھا۔

اِمام شافعیؒ

آپ کی پیدائش ہوئی مصر میں قیام غزا میں ابتدائی زمانہ مصر میں گزرا اور عمر کا اکثر حصہ حجاز میں گزرا اور عمر کا آخری حصہ بھی مصر میں گزرا۔ مصر تقریباً سب کا سب شافعی المسلک ہے۔ حجاز میں بھی تقریباً سب فقہ شافعی پر چل رہے ہیں۔ محبت وادب میں ان کا بھی وہی حال تھا۔ جو دیگر ائمہ کا ہے۔ خوف وخشیت غالب اور تقویٰ اونچے درجے کا۔

اِمام مالکؒ

امام مالک، امام دار الہجرہ کے لقب سے ملقب ہیں۔ مدینہ سے ان کو شغف تھا اور مدینہ شہر میں کبھی جوتے پہن کر نہ چلے اس لئے کہ معلوم نہیں کہاں حضورؐ کا قدم مبارک پڑا ہو اور وہاں میرا جوتا گزرے اور مدینہ منورہ میں کبھی پاخانہ پیشاب بھی نہیں کیا بلکہ اس کے لئے مدینہ منورہ سے کئی میل دور نکل جاتے تھے۔

یہ ادب تھا اور تمام ائمہ میں اسی طرح س ادب کی انتہا تھی۔ امام مالکؒ نے مدینہ منورہ کو ہی اپنا

وطن قرار دیا اور وہیں ہجرت فرمائی۔ ان کی تمنا یہ تھی کہ مجھے مدینہ کی زمین قبول کرلے اور میں وہیں دفن ہو جاؤں۔ نفلی حج بھی نہیں کرتے تھے اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں باہر میری وفات نہ ہو جائے اور میں مدینہ کی زمین سے الگ نہ ہو جاؤں۔

امام مالک نے ایک روز خواب دیکھا نبی کریم ﷺ کا دربار مبارک قائم ہے اور امام مالک حاضر ہیں، عرض کیا یارسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ مدینہ کی زمین مجھے قبول کرلے اور مجھے معلوم ہو جائے کہ میری عمر کے کتنے دن باقی ہیں۔ سال ہے یا دو سال ہیں تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے اور میں عمرہ کر آؤں اور حج کر آؤں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ حضورؐ نے اس طرح سے ہاتھ اٹھایا کہ پانچویں انگلیاں کھلی ہوئی ہیں۔ اب امام مالک حیران ہیں کہ پانچ انگلیاں آپؐ نے اٹھائی ہیں تو آیا یہ مطلب ہے کہ پانچ دن باقی ہیں میری عمر کے۔ یا پانچ مہینے یا پانچ برس ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

امام مالک کے ہم عصر امام محمد بن سیرین ہیں جو تعبیر خواب کے امام ہیں اور خواب کی تعبیر پر انہوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ جلیل القدر امام ہیں اور ایسی تعبیر دیتے تھے کہ ہاتھ کے ہاتھ تعبیر واقعات کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی۔ ان کو یہ مناسب تعبیر سے تھی۔ اس قسم کے ان کے بہت سے واقعات ہیں۔ تو امام مالک نے ایک شخص سے کہا کہ تم جا کر ابن سیرین سے میرا خواب بیان کرو مگر میرا نام مت لینا۔ یہ کہنا کہ مدینہ میں رہنے والے ایک شخص نے یہ خواب دیکھا ہے۔ اس کی تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ شخص حاضر ہوا اور اس نے ابن سیرین سے کہا کہ مدینے کے ایک شخص نے یہ خواب دیکھا کہ اس نے حضورؐ سے یہ دریافت کیا کہ میری عمر کے کتنے دن باقی ہیں تو حضورؐ نے ہاتھ اٹھا دیا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ دن مراد ہیں یا پانچ مہینے یا پانچ برس مراد ہیں؟

ابن سیرین نے فرمایا کہ یہ خواب تو بہت بڑا عالم دیکھ سکتا ہے۔ جاہل کا کام نہیں کہ اس قسم کا خواب دیکھے اور نہ جاہل کو حضورؐ یہ جواب دے سکتے ہیں۔

یہ جواب تو بڑے عالم کو ہی دے سکتے ہیں۔ اور مدینہ میں اس وقت امام مالک سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ تو کہیں یہ خواب امام مالک نے تو نہیں دیکھا؟

اب وہ شخص خاموش کیونکہ اسے تو روک دیا گیا تھا کہ میرا نام مت لینا اس نے کہا کہ اچھا مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان سے اجازت لے آؤں۔ فرمایا ہاں اجازت لے کر آ داؤ۔ پھر ہم خواب کی تعبیر بتلائیں گے۔

وہ گیا اور جا کر عرض کیا کہ حضرات! وہ تو پہچان گئے کہ یہ خواب دیکھنے والے آپ ہیں اور نام بھی لے دیا مگر یہ کہا کہ پوچھ کر آجاؤ پھر تعبیر بتاؤں گا۔ فرمایا اچھا جاؤ میرا نام لے دینا کہ مالک بن انس

نے یہ خواب دیکھا ہے۔

اس شخص نے جا کر عرض کیا کہ حضرت! امام مالک نے ہی یہ خواب دیکھا ہے ابن سیرین نے فرمایا کہ ہاں امام مالک ہی یہ خواب دیکھ سکتے ہیں۔ دوسرے کی مجال نہیں کہ وہ یہ خواب دیکھے فرمایا کہ :

"حضورؐ نے پانچ انگلیاں اٹھائیں اس سے نہ پانچ دن مراد ہیں نہ پانچ مہینے نہ پانچ برس مراد ہیں بلکہ اشارہ ہے کہ اس طرف کہ هِیَ خَمْسٌ لَا یَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ یعنی پانچ چیزیں وہ ہیں جن کا علم اللہ کے سوا کسی نہیں ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ کسی کو پتہ نہیں کہ میرا انتقال کس زمین پر ہو گا اور میں کہاں دفن ہوں گا اور کیا وقت ہے میرے انتقال کا۔ قرآن کریم کے اندر فرمایا گیا کہ اصول غیب کے پانچ ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا فرمایا گیا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اس کے نظام کو صرف اللہ جانتا ہے قیامت کب آئے گی۔ کسی کو پتہ نہیں حالانکہ قیامت کا عقیدہ قطعی ہے، قرآن سے ثابت ہے ہر مسلمان کا ایمان ہے مگر وقت کا پتہ کسی کو نہیں حتی کہ نبی کریم ﷺ کو بھی پتہ نہیں۔ چنانچہ جبرئیل امین نے آپؐ سے پوچھا متی الساعۃ یارسول اللہ قیامت کب آئے گی فرمایا مَاالْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ آپؐ نے فرمایا کہ اس بارے میں سوال کرنے والے سے زیادہ مجھے علم نہیں ہے۔ ہاں یہ مجھے معلوم ہے کہ قیامت آئے گی مگر یہ مجھے معلوم نہیں کہ کب آئے گی۔ یہ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ تو امام ابن سیرین نے فرمایا کہ یہ خواب امام مالک ہی دیکھ سکتے تھے، خواب بھی علمی ہے جواب بھی علمی ہے اور حدیث کی طرف اشارہ ہے، امام مالک ہی اس کے مخاطب بن سکتے ہیں۔ ابن سیرین نے اس آدمی سے فرمایا کہ امام مالک سے کہہ دینا کہ حضورؐ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ موت کہاں آئے گی کس زمین میں آئے گی۔ اس کا علم ان پانچ چیزوں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے"۔

امام مالک یہ جواب سن کر مطمئن ہو گئے اور پھر گھر سے نہیں نکلے یہاں تک کہ وفات ہو گئی اور مدینہ کی زمین نے قبول کیا اور جنت البقیع میں مزار ہے جو ہر مسلمان کے لئے زیارت گاہ بنا ہوا

ہے۔۔۔ تو بہر حال امام مالک امام دار الہجرہ ہیں اور ان کا زیادہ تر فقہ مغربی ممالک میں پھیلا ہوا ہے جو عرب کے مغربی حصے ہیں ان میں زیادہ تر مالکی ہی آباد ہیں۔

اِمام احمد بن حنبلؒ

امام احمد بن حنبلؒ کا قیام نجد میں رہا ہے۔ اسی لئے نجد اور یمن کے لوگ بکثرت حنبلی ہیں اور فقہ حنبلی پر عمل پیرا ہیں۔

احسانِ عظیم

تمام ائمہ برحق ہیں جس کا دامن تھام لو گئے انشاء اللہ نجات ہو جائے گی یہ سب حضرات حقانی ہیں۔ ان بزرگوں نے اپنے اصولِ فقہ اور اپنے اجتہاد سے کتاب و سنت سے مسائل اخذ کئے اور مسائل نکال کر دین کو باغ و بہار بنادیا اور ایک لاء اور ایک قانون کی صورت میں فقہ کو مرتب کیا۔ جن کے ابواب الگ الگ ہیں۔ باب الافاضات، باب المعاملات، باب المساقات، باب المزارعۃ، باب الاراضی وغیرہ۔ سارے مسائل ان ابواب کے نیچے جمع ہیں۔ ساری چیزیں استخراج کر کے جمع کر دی ہیں۔ ان کا بھی امت پر احسان عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ان کے مقابر کو نور سے منور فرمادے اگر یہ استخراج نہ کرتے تو اتنی جزئیات ہمارے پاس فقہ میں موجود نہ ہوتیں۔ بڑی دقت اور دشواری پیش آتی۔

عُرفاءِ اسلام کی خدمات

عرفاء اسلام جن کا دوسرا نام صوفیاء کرام ہے۔ ان حضرات کے اخلاقیات کو سنبھالا ہے اس طرح پر کہ بال کی کھال نکال کر انسانوں کے سامنے پیش کر دی روح کی حکمت بیان کی اور بتایا کہ نفس میں اتنی مکاریاں ہیں ان کا توڑ یہ ہے کہ اگر نفس میں یہ کید پیدا ہو تو اس کی کاٹ یہ ہے اور نفس میں یہ خواہش پیدا ہو تو اس کا دفعیہ یہ ہے اور کوئی رغبت اور تمنا پیدا ہو تو اس کی کاٹ یہ ہے۔ یہ ان حضرات صوفیاء ہی کا طفیل ہے کہ حکمت قلب کی انہوں نے تعلیم دی اور انہوں نے دلوں کو منور کیا اخلاق سے اور ان ہی اخلاق کے ذریعہ تزکیہ نفس کیا اور انسان کو انسان بنایا۔ فَجزَاَھُمُ اللّٰہُ خَیرَ الجزَاءِ

اُمراءِ اسلام کی خدِمات

اُمراء اسلام انہوں نے شعبہ معاملات کو سنبھالا۔ لین دین اور جھگڑوں کے فیصلوں پر امراء اسلام مقرر ہوئے دنیا بھر کے جھگڑے نمٹائے۔ لوگوں کے مقدمات فیصل کئے فوجداری کے الگ، دیوانی کے الگ، ہر ہر دائرے کے مقدمات سنبھالے اور مستقل کتابیں لکھیں گئیں حافظ ابن تیمیہؒ کی کتاب ہے "السیاسۃ الشرعیۃ" اور اسی طرح بہت سے ائمہ علوم نے کتابیں لکھیں کسی نے سیاست کے اصول واضح کئے ہیں فصل

خصومات اور مقدمات کا فیصلہ کرتے کے لئے اس لئے ان امرا نے بہت اونچا کام کیا ہے کہ اس شعبہ کے حقائق کو واضح کیا ہے۔ فَجزَاَ ھُمُ اللّٰہُ خَیْرَ الجزَاءِ

خُلفاءِ اسلام کی خدمات

اس پانچوں شعبہ کو سنبھالا ہے خلفاء اسلام نے جیسے صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ وغیرہ یہ حضرات در حقیقت ذمہ دار تھے ملک کے نظام کے تنظیم ملت اور تنظیم امت کے ان حضرات نے پوری امت کو اور مغرب و مشرق کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا کہ نہ آپس میں لڑیں نہ جھگڑیں۔ نہ تعصبات برتیں نہ آپس میں گالم گلوچ کریں نہ سب و شمت کریں۔ اگر کسی کو شبہ ہو تو محبت سے پیش کر دیں، دوسرا محبت سے جواب دے۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تو اسے معذور سمجھے اور یہ خیال کرے کہ ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں۔ دوسرا حق یہ ہو۔ یہ کہنا کہ میں ہی حق پر ہوں، دوسرا غلطی پر ہے۔ رائے دہی کے معاملہ میں بالکل غلط چیز ہے۔

خلفاء کیلئے طریق عمل

سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے اپنے ایک خلیفہ کو خلافت عنایت فرمائی اس زمانے کے دستور کے مطابق پگڑی باندھی اور کچھ وصیتیں کیں اور کہہ دیا کہ تم میری طرف سے نائب اور خلیفہ ہو جا کر لوگوں کی تربیت کرو، اصلاح کرو، ان خلیفہ نے رخصت کے وقت عرض کیا کہ حضرت! کچھ نصیحت فرمائیے تا کہ میں اس نصیحت پر کاربند ہوں۔ حضرت نے دو باتوں کی نصیحت فرمائی اور فرمایا کہ:

'نہ تو نبوت کا دعویٰ کرنا اور نہ خدائی کا دعویٰ کرنا'۔

خلیفہ یہ سن کر حیران و پریشان ہوئے کہ حضرت! آپ کا خادم غلام برسوں آپ کی صحبت میں رہا کیا مجھ سے یہ ممکن ہے کہ میں خدائی کا دعویٰ کروں۔ جو نبی ﷺ کے غلاموں کا غلام ہو وہ کب نبوت کا دعویٰ کرے گا؟ تو حضرت نے یہ کیسی نصیحت فرمائی۔ نصیحت فرماتے کہ بھائی عبادت میں ثابت قدم رہنا، اخلاق کی حفاظت کرنا، مخلوق کی اصلاح کرنا اور یہ کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا یہ تو ہم لوگوں سے ممکن ہی نہیں اس نصیحت سے کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی فرمایا کہ اس کے معنی سمجھ لو پھر بات سمجھ میں آجائے گی۔

فرمایا کہ خدا کی ذات وہ ہے کہ جو کہہ دے وہ اٹل ہو اگر وہ چاہے کہ زمین بنے تو زمین بن کر رہے۔ ناممکن ہے کہ نہ بنے۔ ارادہ خداوندی پر مراد کا مرتب ہونا قطعی اور لازمی ہے یہ ناممکن ہے کہ حق تعالیٰ ارادہ فرمائیں اور وہ پورا نہ ہو وہ تو قادر مطلق ہیں۔ اِذَا اَرَادَ شَیْئاً یَقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ اگر وہ ارادہ کرے کہ جہان بنے تو اسے محنت کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اسباب فراہم کریں، وہ

اسباب کے محتاج نہیں۔ اسباب کے تو وہ خالق ہیں وہاں تو منشاء ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے تو اللہ کی ذات وہ ہے کہ جو وہ ارادہ کرے اور کہہ دے وہ اٹل ہو' ٹلنے والی چیز نہ ہو۔

اور دعویٰ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ نبی علیہ السلام کی شان یہ ہے کہ جو فرمادے وہ حق ہو۔ یوں ممکن ہی نہیں کہ نبی کی زبان سے کوئی ناحق چیز نکلے جو نبی علیہ السلام فرمائیں گے وہ حق ہوگا اور جو کر کے دکھائیں گے وہ بھی حق ہوگا۔ ناحق کا وجود نبی علیہ السلام کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ نبی جو کہے گا وہ حق ہوگا اور اس کے خلاف باطل ہوگا۔ نبی علیہ السلام کی جانب کبھی خلاف حق نہیں ہو سکتی ہے' اگر تم نے جا کر یہ کہا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اور میری رائے اتنی حق ہے کہ دوسرا سامنے نہیں آسکتا۔ تو یہ در پردہ نبوت کا دعویٰ ہوگا۔ میں تم کو اسی کی نصیحت کرتا ہوں کہ یہ دعویٰ نہ کرنا۔ نبوت کا دعویٰ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم یوں کہو کہ میں نبی ہوں بلکہ اپنے اندر خاص وہ شان پیدا کر کے جو نبی کے اندر ہوتی ہے یوں کہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اس کیخلاف سب باطل ہے۔ اس چیز کا مدعی بننا در پردہ نبوت کا دعویٰ ہے اور جو یوں کہے کہ میں نے ارادہ کر لیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے مخلوق کٹ جائے' خون بہہ جائے مگر یہ ہو۔ یہ در پردہ خدائی کا دعویٰ کرنا اس کا یہ مطلب ہے کہ اپنے ارادے کو یوں مت سمجھنا کہ یہ اٹل ہے اور ہونا ہی چاہئے اور اس کیخلاف ممکن نہیں حالانکہ ہر چیز میں تمہارا اخلاف ممکن ہے' یہ تو ہوا دعویٰ خدائی کا حاصل۔

اور دعویٰ نبوت کا حاصل یہ کہ جو تمہاری زبان سے نکل جائے اس پر جمے رہو گویا کہ اس کیخلاف باطل ہے حالانکہ یہ ناممکن ہے وہ خدا کا مقام ہے اور یہ نبی کا مقام ہے۔

تو حضرت شیخ نے بڑے بلیغ پیرائے میں نصیحت فرمائی۔ ظاہر میں تو بڑی وحشت ناک نصیحت تھی کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا نبوت کا دعویٰ مت کرنا مگر جب معنی بیان کئے خدائی اور نبوت کے تو سمجھ میں آگیا۔ معلوم ہوا کہ بہت سے آدمی در پردہ خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ جو جمود کرتے ہیں کہ وہی صحیح ہے جو ہم کہہ رہے ہیں وہ در پردہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں ورنہ ان پر کوئی وحی یا الہام آرہا ہے کہ وہی حق کہہ رہے ہیں دوسرا حق کہہ ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ مسئلہ جو قرآن و حدیث سے ثابت شدہ ہے اس کے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہی حق ہے اس کیخلاف ہرگز نہیں۔ ہاں اپنی رائے اور فکر کے بارے میں یہ کہیں کہ یہ ہی حق ہے یہ نہیں ہونا چاہئے۔

ان جھگڑوں کا فیصلہ جب ہی ہو سکتا ہے جب امت کا نظام بنا ہوا ہو پھر اس قسم کے مدعی مغلوب ہو جائیں گے اور واقعی جو حقانی لوگ ہیں وہ غالب آجائیں گے۔ یہ کام ہے نظام و تنظیم کا جب تک تنظیم نہ ہو' نظام نہ ہو اس وقت تک معاملہ نہیں سلجھ سکتا ہے'۔ اس خدمت کو انجام دیا ہے خلفاء اسلام نے' یہ ہی در حقیقت ملک کے نظام اور تنظیم ملت کے ذمہ دار تھے۔ ان ہی حضرات نے امت کو

جوڑا ہے اور ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا ہے۔

محافظین شئون نبوت تعظیم ضروری ہے

خلفاء اسلام نے تنظیم ملت کی ذمہ داری قبول کی۔ امراء اسلام نے جھگڑوں اور فیصلوں کو نمٹایا عرفاء اسلام نے اخلاق درست کئے فقہاء اسلام نے عبادات کو صحیح کیا اور حکماء اسلام نے عقائد کو درست کیا۔ یہ پانچ طبقے اکابر اہل اللہ کے ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئے جنہوں نے ان پانچ شعبوں کو مضبوط کیا اور مضبوط بنیادوں پر قائم کیا اور امت کے سامنے پیش کیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے وہ یہ کہ ایک مقدمہ ہوا تفصیل اس میں بہت ہے مگر میں زیادہ تفصیل نہیں کر سکتا اسی لئے میں نے ایک لفظ کہا تھا کہ طالب علمانہ انداز میں کہوں گا یہ تو محض طالب علمانہ انداز ہے جو درس و تدریس میں طالب علموں کے سامنے کہا جا سکتا ہے اگر چہ آپ عرفی طور پر طالب علم نہیں ہیں مگر حقیقتا تو طالب علم ہیں ورنہ جلسوں میں کیوں آتے علم کی طلب ہی تو آپ کو لے کر آئی ہے۔ آپ بھی طالب علم ہیں اور میں بھی ایک طالب علم ہوں اور آپ سے کم رتبہ ہوں درس و تدریس نہ سہی مگر کچھ تو سمجھ جائیں گے۔

میرا اندازہ تو یہ ہے کہ اتنی بات تو آپ سمجھ گئے ہوں گے جو میں نے کہی ہے کہ پانچ شعبے ہیں اور ان پانچوں شعبوں کو پانچ طبقات نے اٹھایا ہے اور وہ طبقے سب کے نزدیک معظم و مکرم ہیں اس لئے امراء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔ اسی طرف عرفاء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں اور خلفاء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں تو آدمی اپنی کس آنکھ کو چھوڑ لے سب کو یکساں طور پر ہم کو اپنے سر پر رکھنا پڑے گا اسی بنا پر سب ہمارے نزدیک معظم و مکرم ہیں سب کے آگے گردن جھکانا ہمارا کام ہے۔

اگر کوئی شخص محدث کے آگے گردن جھکا دے اور فقیہ کیخلاف کرے وہ درحقیقت امتی ہونے کا ثبوت نہیں دے رہا ہے امت کا صحیح فرد وہ ہے کہ حکماء، فقہاء، صوفیاء، عرفاء، امرا خلفاء سب کو واجب التعظیم سمجھ کر سب کے آگے گردن جھکا دے اس لئے کہ یہ پانچویں طبقے وہ ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک ایک شان کو سنبھالا ہے آپ کی ایک شان عقیدے کی ہے ایک شان عبادت کی ہے ایک شان اخلاق کی ہے ایک شان معاملات کی ہے ایک شان خلافت و تنظیم ملت کی ہے۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پانچ شانیں ہیں انہیں ٹکرانے کا یہ مطلب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شانوں میں تعارض پیدا کر رہے ہیں جو لوگ ان میں باہم ٹکر دے رہے ہیں یہ سوائے جہل کے اور کیا ہو سکتا ہے شئون نبوت میں ٹکراؤ پیدا کرنا علم والے کا کام نہیں ہے اور نہ علم

والے کا کام یہ ہے کہ طبقات امت میں ٹکراؤ پیدا کرے، حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے گردن جھکادے اور ہر ایک تعظیم و تکریم ضروری سمجھے۔

نظم مسائل

ایک دوسری بات اور سمجھ لیجئے وہ طالب علمانہ ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر طبقے نے کتاب و سنت سے نظم قائم کیا ہے یعنی اسلامی مسائل بے تکے نہیں ہیں ہر مسئلہ ایک لڑی کے اندر پرویا ہوا ہے اور مسائل کا ایک نظام ہے اور پورے مسائل منظم ہو کر ایسے ہیں جیسے موتیوں کا ایک ہار ہوتا ہے، اگر ایک موتی بیچ سے نکال دو تو ہار ناقص ہو جائے گا اور چونکہ ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے للہٰذا ہر شعبہ نہایت منظم ہے۔

تنظیم بلا امام ممکن نہیں

آپ جانتے ہیں کہ نظم و تنظیم بغیر امام کے نہیں ہوتی مثلاً اگر تسبیح میں ایک ہزار دانے ہیں مگر امام نہ ہو جسے القند کہتے ہیں۔ وہ ایک لمبا دانہ ہوتا ہے تسبیح کے درمیان وہ اگر بیچ میں نہ ہو تو وہ تسبیح نہ ہو گی بلکہ مالا کہلائے گی۔ اگر تسبیح ہی بنانی ہے تو ایک گرہ بیچ میں ضرور ہونی چاہئے جسے آپ امام کہیں اسی سے سارے دانے جڑے ہوئے ہوں گے۔ وہ گرہ آپ اگر کھول دیں تو سارے دانے بکھر جائیں گے۔

جھاڑو میں ہزاروں سینکیں ہوتی ہیں ایک سینک کو آپ چٹکی سے مسل دیں تو وہ ٹوٹ جائے گی لیکن اگر بندھن باندھ کر جھاڑو بنائیں تو گھر کا کوڑا کباڑ آدھ گھنٹے میں صاف کر دیں گی۔ ایک سینک یہ کام نہیں کر سکتی ہے ساری سینکیں مل کر پھینکیں گی۔

اور ملنے کی شرط یہ ہے کہ ان میں بندھن بندھے وہی بندھن ان کا امام ہے اگر ان میں بندھن نہ ہو تو وہ منتشر ہو جائیں گی۔ بکھر جائیں گی کوڑا کباڑ تو کیا صاف کرتیں وہ خود کباڑ بن جائیں گی۔ لیکن اگر بندھن باندھ دیا اور ایک ڈوڑے کے تابع کر دیا ان کو تو سارے گھر کا کوڑا صاف ہو جائے اور جھاڑو ایک جگہ رکھی ہوئی موزوں نظر آئے گی۔ گویا کہ صاف کرنے کا آلہ موجود ہے۔ جو بڑے سلیقہ سے رکھا ہوا ہے۔ بغیر امام و بندھن کے نظام قائم نہیں ہو سکتا ہے۔

اسلام ایک اجتماعی مذہب ہے ہر چیز میں اس نے نظم قائم کیا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھوں اور جماعت کے اندر بھی پھر ترتیب قائم کی ہے کہ امام کیا کرے گا اور تم کیا کرو گے۔ امام کیا پڑھے گا اور تم کیا پڑھو گے اس میں تمہیں آزادی نہیں بلکہ ایک نظم کے تحت نماز پوری کرنی ہو گی۔

حدیث شریف میں ہے:

اذا قال الامام و الضّالین قولو ا امین

یہ حدیث کا آخری ٹکڑا ہے مطلب یہ ہے جب امام اللہ اکبر کہے سب اللہ اکبر کہو جب وہ رکوع کرے تم بھی رکوع کرو وہ سجدے کرے تم بھی سجدہ کرو وہ قیام کرے تم سب قیام کرو اور جب امام ولا الضالین کہے تم آمین کہو اور جب وہ سلام پھیرے تو تم بھی سلام پھیرو۔

تو تم کلیۃً امام کے تابع ہو ہر نقل و حرکت میں اگر تابع نہ ہوئے اور اطاعت نہ کی تو آپ جماعت سے الگ ہو جائیں گے۔ اگر آپ نے امام سے پہلے سلام پھیر دیا تو بس گئی آپ کی نماز اس لئے کہ آپ امام سے منحرف ہو گئے۔ جماعت کی نماز بن نہیں سکتی جب تک آپ اطاعتِ کامل نہ کریں۔ لیکن انفرادی طور پر بھی اللہ نے اجازت دی ہے کہ پڑھ لیا کرو جتنی چاہے پڑھو لیکن جماعت سنتِ موکدہ ہے اور بعض ائمہ کے یہاں واجب قرار دی گئی ہے اور بعض کے یہاں فرض ہے کہ اگر نماز باجماعت ترک کر دی تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو قتل کر دو یا جیل میں ڈال دو۔ امام ابو حنیفہؒ کے یہاں یہ سہولت ہے کہ وہ جماعت کو سنت موکدہ کہتے ہیں جو قریب قریب واجب کے ہوتی ہے تو جماعت بن نہیں سکتی جب تک امام نہ ہو اور امام، امام نہیں ہو سکتا جب تک کہ سب مطیع نہ ہوں امام بنا دیا اور مقتدی کھڑے ہو گئے لیکن کوئی تکبیر کہتا ہے تو کوئی تکبیر کے بجائے السلام علیکم ورحمتہ اللہ کہتا ہے۔ کسی نے سجدہ کیا تو کسی نے رکوع کیا۔ کسی نے مغرب کی طرف منہ کیا تو کسی نے مشرق کی طرف منہ کیا تو امام ہوا نہ ہوا برابر ہے۔ امام جب ہی بنتا ہے جب سب مطیع ہوں۔

سمع و طاعت نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ :

اسمعوا واطیعوا ولو امر علیکم عبد حبشی مجدع الاطراف.

"سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر امیر مقرر کر دیا جائے کسی ایسے حبشی غلام کو جس کے ہاتھ پیر بھی کٹے ہوئے ہوں"۔

کوئی صورت وجاہت کی نہ ہو اور قوم مل کر اسے امیر بنا دے تو مامورین پر سمع و طاعت فرض ہے اس کے خلاف مت کرو امت کا نظم جب ہی باقی رہ سکتا ہے، نماز فرض کی تو اس میں جماعت کا حکم دیا اور جماعت کے لئے امام بنانے کی لازمی طور پر ضرورت پڑے گی۔

فرائضِ امیر نبی کریم ﷺ دنیا میں تشریف فرما ہیں اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے چند صحابہؓ کو ساتھ لے کر سفر کیا حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ بھائی کسی کو امیر مقرر کر لو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ سے زیادہ افضل ہم میں کون ہے کہ جس امیر بنا دیں، آپ افضل الصحابہؓ ہیں، فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں، کوئی اور بن جائے۔ عرض کیا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آخر کار سب نے مل کر حضرت صدیق اکبرؓ کو ہی امیر بنا دیا۔

حضرتؓ نے فرمایا کہ جب میں امیر بن گیا تو اطاعت کرو گے۔ عرض کیا کہ لازمی طور پر کریں گے عہد و پیمان لیا کہ منحرف تو نہیں ہو گے۔ عرض کیا کہ قطعاً نہیں۔۔۔جب منزل پر پہنچے تو سب کے بستر کھول کر بچھانے شروع کئے لوگوں نے کہا حضرت ہم بچھائیں گے فرمایا کہ امیر کے کام میں دخل مت دو امیر کی اطاعت واجب ہے کسی کو بسترہ نہیں بچھانے دیا کبھی جگہ صاف کر رہے ہیں کبھی کپڑا بچھا رہے ہیں جہاں کوئی آیا کہ حضرت میں کروں گا یہ کام، فرماتے کہ میں امیر ہوں امیر واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

لوگ عاجز آ گئے کھانا پکانے کا وقت آتا۔ تو جنگل سے لکڑیاں لا رہے ہیں کبھی بازار میں گوشت خریدنے جا رہے ہیں لوگوں نے عرض کیا حضرت! ہم یہ کام کریں گے۔ فرمایا کہ امیر کے کام میں دخل مت دو لوگ عاجز آ گئے کہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے کہ ہمارے امام مقتدا بڑے اور ساری خدمات انجام دے رہے ہیں ہمارے جوتے بھی سیدھے کر رہے ہیں بستر بھی بچھا رہے ہیں، کھانا بھی پکا رہے ہیں اور کوئی بول بھی نہیں سکتا اور جہاں کوئی بولا تو انہوں نے کہا کہ میں امیر ہوں واجب الاطاعت ہوں اس لئے لوگ عاجز آ گئے۔

عجیب لطیفہ

اس سفر میں ایک لطیفہ بھی پیش آیا وہ بھی سنا دوں گو مضمون سے متعلق نہیں مگر اس واقعہ کا جز ہے کہ ایک روز حضرت صدیق اکبرؓ نے کھانا وغیرہ پکا دیا مگر کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیا کسی کام سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک صحابیؓ کو بھوک بے تحاشہ لگی۔ انہوں نے کھانے کے نگران سے کہا کہ بھائی، کم از کم مجھے ایک روٹی دے دو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ مجھ سے تو اٹھا بھی نہیں جاتا۔ نگران نے کہا جب تک امیر نہیں آئیں گے اور ان کی اجازت نہیں ہو گی تو میں کھانا نہیں دوں گا۔

انہوں نے بہت منت سماجت کی کہ بھائی مجھے ضعف طاری ہو رہا ہے۔ بھوک ستا رہی ہے۔ ایک آدھ روٹی دے دو کچھ سہارا ہو گا۔ انہوں نے پھر انکار کیا اور ان کو روٹی نہیں دی۔

تو صحابہؓ جیسے مقدس ہی ویسے ہیں اندر خوش طبعی بھی ہے۔ فرمایا کہ اچھا میں تجھے سمجھوں گا نہ دے تو روٹی۔۔۔ اسی حال میں بھوکے بیٹھے رہے، کچھ دیر کے بعد وہ جنگل کی طرف اٹھ کر چلے اچانک دیکھا کہ ایک دیہاتی اونٹ پر بیٹھا ہوا آ رہا ہے۔ وہ گاؤں کا مکھیا تھا۔ لباس سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی گاؤں کا بڑا آدمی ہے اور اچھی خاصی عمدہ اونٹنی پر سوار ہو کر آ رہا ہے۔ ان صحابیؓ نے کہا کہ چودھری صاحب کہاں جا رہے ہو۔ انہوں نے کہا مجھے ایک غلام خریدنا ہے کھیتی باڑی کے کام کے لئے انہوں نے کہا کہ میرے پاس غلام موجود ہے اور پانچ سو درہم میں بیچ سکتا ہوں۔ چودھری

صاحب نے کہا کہ پانچ سو درہم کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر غلام اچھا ہے انہوں نے کہا کہ بہت سمجھ دار ہے معاملہ طے ہو گیا اور پانچ سو درہم لے کر اشارہ ان کی طرف کیا جنہوں نے روٹی نہیں دی تھی کہ وہ بیٹھا ہوا ہے اس کو جا کر پکڑ لو اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے دماغ میں تھوڑی سی سنک ہے جب کوئی پکڑنے جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میں غلام کب ہوں؟ میں تو آزاد ہوں اس کا خیال نہ کیجیو انہوں نے کہ میں سمجھ گیا بعض کے دماغ میں ہوا ہی کرتی ہے۔ ایسے میں انہوں نے کہا کہ چلائے گا بھی کہ میں غلام کب ہوں؟۔۔۔ میں تو حر ہوں۔ آزاد ہوں اس کا بھی خیال نہ کیجیو یہ اس کی عادت ہے۔ انہوں نے کہ میں سمجھ گیا ہوں۔

چودھری صاحب نے جا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا چل میرے ساتھ' اس نے کہا کہ کہاں چلوں' چودھری صاحب نے کہا کہ میرے گھر۔ اس نے کہا کہ کیوں' کہنے لگے میں نے تجھے خریدا ہے۔ اس نے کہا کہ واللہ میں غلام نہیں ہوں میں تو آزاد ہوں اس نے کہا مجھے معلوم ہے کہ تیری عادت یہی ہے۔ اب یہ چلا رہا ہے کہ میں آزاد ہوں۔ حر ہوں۔ مگر چودھری صاحب نے ایک نہ سنی۔ چودھری صاحب چونکہ طاقت ور تھے' زبردستی اٹھا کر اونٹ پر سوار کیا اور لے جانا شروع کیا اور اس نے ہائے وائے شروع کہ مجھے غلام بنا دیا' میں تو آزاد ہوں۔ اس نے کہا کہ میں تیری ساری داستان سن چکا ہوں۔ تیری عادت ہی یہ ہے۔

ادھر سے صدیق اکبرؓ چلے آ رہے تھے دیکھ کر یہ چلائے کہ امیر المومنین میرا تو ناطقہ بند کر دیا ہے اور مجھے غلام بنا دیا ہے اور یہ چودھری مجھے لئے جا رہا ہے۔ صدیق اکبرؓ کا سبھی لوگ احترام کرتے تھے۔ چودھری اترا سواری سے اور سلام عرض کیا' حضرت نے فرمایا کہ بھائی یہ تو میرا ساتھی ہے اسے تو کہاں لئے جا رہا ہے۔ کہنے لگا حضرت جی میں نے تو اسے پانچ سو درہم میں خریدا ہے۔ فرمایا کہ یہ غلام نہیں' یہ آزاد ہے یہ کس نے بیچا ہے۔ اشارہ کیا کہ فلاں صاحب نے بیچا ہے۔ میں نے رقم بھی ان کو ہی دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ غلام موجود ہے لے جاؤ' حضرت صدیق اکبرؓ سمجھ گئے کہ کسی نے مذاق کیا ہے ان کے ساتھ جب واپس آئے تو جنہیں روٹی نہیں ملی تھی انہوں نے آنکھ سے اشارہ کر کے کہا کہ اب کہو کیا حال ہے۔ تو نے مجھے روٹی سے عاجز کر رکھا۔ اب بتا۔ صدیق اکبرؓ جب پہنچے تو فرمایا' کیا واقعہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت!۔۔۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی میں نے اس کی بہت منت کی کہ بھائی آدھ ہی روٹی دے دو' کچھ سہارا ہو جائے گا۔ اس نے کہا جب تک امیر نہیں آئیں گے میں نہیں دوں گا تو میں نے بھی ایک مذاق کیا کہ اس کو پانچ سو درہم میں بیچ دیا۔ تو حضرت صدیق اکبرؓ بہت ہنسے وہ پانچ سو درہم واپس کئے گئے' جب اس کو گلو خلاصی ہوئی۔۔۔ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سنایا گیا تو آپ مسکرائے اور منہ پر رومال رکھ لیا جب بھی اس واقعہ کا ذکر آتا تو حضور ﷺ

مسکراتے اور منہ پر رومال رکھ لیتے۔ گویا یہ عجیب لطیفہ بن گیا۔

نظم اجتماعیت

یہ واقعہ اس پر یاد آیا تھا کہ نماز کے اندر بھی جماعت رکھی ہے اور اس جماعت کا ایک امام مقرر کیا ہے اور وہ بھی مطاع جس کی اطاعت کی جائے، سفر پیش آئے تو اس میں ایک امام بنالیا جائے تاکہ سفر منظم ہو گھر میں اگر ہو تو ایک کو بڑا سمجھ لو اور اس کے احکام کی تعمیل کرو گھر میں نظام پیدا ہوگا۔ حج رکھا تو اس میں امام الحج مقرر کیا کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ زکوٰۃ رکھی تو بیت المال۔۔۔ میں ایک کو امام مقرر کیا کہ وہ ہر چیز کی زکوٰۃ وصول کیا کرے تو ہر چیز میں ایک جماعتی اور اجتماعی نظم قائم کیا اور اس کا ایک ایک امیر مقرر کیا اور اس کی سمع وطاعت واجب قرار دی کہ اس کی اطاعت کرو۔

اس طرح ہر فن کا ایک امام مقرر ہے عقیدہ میں مرکز حق تعالیٰ شانہ، کی ذات ہے اس میں امام مقرر کیے گئے۔ چنانچہ عقائد میں دو بڑے بڑے امام ہیں۔ ایک امام ابو منصور ماتریدی ہیں اور ایک امام ابوالحسن اشعری ہیں یہ دو امام ایسے سمجھے جاتے ہیں کہ جن کی رائے فن عقائد میں فن کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لئے بعض لوگ اشعری ہیں اور بعض لوگ اپنی نسبت دوسرے امام کی طرف کر کے اپنے آپ کو ماتریدی کہتے ہیں ان میں آپس میں کچھ تھوڑے بہت اختلافات بھی ہیں مگر وہ اختلافات لفظی کے قریب قریب ہیں۔ عقائد سب کے ایک ہی ہیں، جب اس فن کا کوئی بڑا مسئلہ پیش آوے تو رجوع کرو اس کی طرف کہ امام ابوالحسن نے یہ کہا ہے۔

فقہ کا مسئلہ ہو تو اس میں ایک امام مقرر کرو امام شافعیؒ ہوں، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ ہوں جب کوئی مسئلہ اختلافیہ آئے تو کسی ایک کی اطاعت کر لو تاکہ تمہارے اندر نزاع نہ پیدا ہو۔

مبنی بر حجت اختلاف مذموم نہیں

اس لئے کہ مسئلہ میں نزاع نہیں۔ مسئلہ میں اگر اختلاف ہو تو اختلاف حجت کا ہوتا ہے۔

اور نزاع وجدال جو ہوتا ہے وہ نفسانی جذبے کے تحت ہوتا ہے اور وہ برا ہوتا ہے۔ اور حجت سے جو اختلاف ہوتا ہے وہ برا نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ ہر اختلاف برا نہیں ہے۔

مثلاً چور اور ڈاکو اتفاق کر لیں تو یہ اتفاق اچھا نہیں ہے۔ برائی میں اگر لوگ متحد ہو جائیں تو وہ اتحاد بھی برا ہوگا اور اگر بھلائی کے اوپر لوگ جمع ہو جائیں تو وہ اتحاد اچھا ہوگا۔

اب اختلاف کو لے لو اگر اختلاف حجت سے ہو اور اللہ ورسول کا حوالہ دیانت سے ہو تو وہ ایک پہلو ہوگا دین کا۔ وہ اختلاف ہوگا مگر جھگڑا نہ ہوگا۔ کیونکہ حجت اس میں موجود ہے۔ یہ جھگڑے اصل

میں ہم اپنے جذبات سے کرتے ہیں اور مسئلوں کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ مسئلے کی خاصیت لڑنا نہیں ہے اگر مسئلوں کی خاصیت لڑنا ہوتا تو پہلے تو صحابہؓ میں لاٹھی چلتی کہ کوئی رفع یدین کر رہا ہے کوئی نہیں کر رہا ہے۔ کوئی امین بالجہر کر رہا ہے کوئی امین بالسر کر رہا ہے۔ کوئی فاتحہ کو امام کے پیچھے واجب قرار دیتا ہے اور کوئی ناجائز قرار دے رہا ہے تو سب سے پہلے تو صحابہؓ میں لاٹھی چلتی اگر مسئلہ کی خاصیت لڑنا ہوتا۔ مگر سب اپنے اپنے مسلک پر عمل کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کی عظمت بھی قلب میں لئے ہوئے ہیں۔ پھر اس کے بعد آئمہ مجتہدین میں ڈنڈا چلتا جن میں اختلاف ہے۔ خوب لڑائی ہوتی مگر سارے آئمہ باہم متحد ہیں اس لئے کہ وہ اختلافات فروعی ہیں اور بنیادیں سب کی ایک ہیں۔ اس لئے قلوب میں سب ایک دوسرے کی عظمت لئے ہوئے ہیں۔۔۔ حتی کہ امام شافعیؒ بغداد میں امام ابو حنیفہؒ کے مزار پر حاضر ہوئے تو فاتحہ پڑھی اور ایصال ثواب کیا۔ وہیں مسجد تھی جب نماز کا وقت آیا تو نماز پڑھی اور اپنا مسلک ترک کر کے امام اعظمؒ کے مسلک کے مطابق نماز پڑھی اور امام شافعیؒ کا مسلک جو کہ مستحب کے درجہ میں تھا یعنی رفع دین نہیں کیا اور آمین زور سے نہیں کہی۔ پوچھنے پر امام شافعیؒ نے فرمایا کہ:

> ”مجھے صاحب مزار سے حیاء آتی ہے کہ ان کے قریب ہو کر ان کے مسلک کے خلاف عمل کروں۔ جس جس مسئلہ میں گنجائش تھی اس میں فقہ حنفی کے مطابق نماز پڑھی اور جہاں جہاں جائز و ناجائز کا اختلاف تھا اس میں وہ معذور تھے“۔

چونکہ ان کی عظمت قلب میں موجود تھی اس لئے ایسا کیا تو معلوم ہوا کہ مسئلہ کہ خاصیت لڑائی نہیں بلکہ اپنے نفسانی جذبات سے لڑتے ہیں اور مسائل کو آڑ بنا رکھا ہے۔

آمین بالشر

ہمارے بچپن کا زمانہ تھا ہمارے ہاں سہارنپور میں مارچ نام کا ایک کلکٹر تھا۔ تھائی لینڈ کا رہنے والا نسلاً یورپین تھا۔ مگر مذاق وذوق اس کا ایشیائیت کا تھا کیونکہ اس کی پیدائش ہندوستان کی تھی۔ اس کے زمانے میں ایک جھگڑا پیش آیا کہ ایک حنفی کہیں اہل حدیث کی مسجد میں چلا گیا۔ انہوں نے زور سے آمین کہی۔ اس نے آہستہ سے کہی۔ وہاں سب جہلا جمع تھے انہوں نے اس کی مار پٹائی کی کہ اس نے زور سے آمین نہیں کہی۔

پٹتے پٹتے وہ چلایا کہ حنفیو! دوڑو، دوڑو، تمام حنفی جمع ہو گئے انہوں نے اہل حدیث پر حملہ کر دیا۔ اب اہل حدیث چلائے کہ اے اہلحدیث دوڑو! ادھر سے اہل حدیث آ گئے۔ غرض لاٹھی چلی کتنوں کے ہی سر پھٹے۔ بلوہ عام ہو گیا فریقین سے رپورٹ درج کرائی۔

مارچ کا زمانہ تھا اس کے یہاں مقدمہ پیش ہوا۔ فریقین کے وکلاء نے بحث کی آمین کے مسئلہ

میں۔۔۔ اب اس کی سمجھ میں نہ آئی اس نے کہ کہ بھائی کیا آمین کسی جائیداد کا نام ہے یا کوئی جاگیر ہے یا کوئی بلڈنگ ہے۔ آخر تم کس چیز پر لڑ رہے ہو۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! مسئلہ ہے۔ اس نے کہا کہ مسئلے پر کیوں لڑتے ہو۔ لڑائی عورت پر ہوتی ہے دولت پر ہوتی ہے۔ جائیداد پر ہوتی ہے۔ مسئلہ پر کیوں لڑتے ہو۔ آخر یہ لڑائی کی کیا وجہ ہے۔ انہوں نے کہ صاحب ایک حدیث میں آیا ہے کہ آمین زور سے کہو اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ آہستہ سے پڑھو۔ اس نے کہا بھائی' جسے زور سے پڑھنے کی حدیث پہنچی ہے وہ زور سے پڑھے اور جسے آہستہ پڑھنے کی حدیث پہنچی ہے وہ آہستہ سے پڑھے۔ آپس میں لڑتے کیوں ہو۔ اپنی اپنی حجت پر عمل کرو۔ اس کی سمجھ میں بات نہ آئی کہ آمین پر لڑائی کیسے ہو سکتی ہے۔ بات بھی ایسی ہی سمجھ میں نہ آنے کی تھی۔ اس نے تحقیق کر کے فیصلہ لکھا اور فیصلہ بڑا دانش مندانہ لکھا۔ اس نے لکھا کہ میں روداد مسل کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ۔

> "مسلمانوں کے یہاں آمین کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) آمین بالجہر یعنی زور سے امین پڑھنا۔ (۲) آمین بالسر یعنی آمین آہستہ سے پڑھنا (۳) امین بالشر یعنی جھگڑا اٹھانے کے لئے آمین پڑھنا۔ یہ جتنا جھگڑا ہے نہ آمین بالجہر کا ہے اور نہ آمین بالسر کا کیونکہ دونوں کے بارے میں پیغمبرؐ سے حدیث وارد ہے اور یہ جھگڑے کی چیز نہیں۔ یہ سارا جھگڑا آمین بالشر کا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں فریق مفسد ہیں۔ میں دونوں کو سزا کرتا ہوں"۔

مسائل کی آڑ میں اندرونی بخار نکالنا

مطلب یہ کہ ہم لوگ آپس میں نفسانی جذبے کے تحت لڑتے ہیں اور مسائل کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ مسئلے کی خاصیت لڑائی نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ میں کتاب وسنت کی حجت ہے اس پر عمل کریں۔ لڑائی کے کیا معنی اور نفرت کے کیا معنی؟ آپس میں مل کر رہو اگر کوئی نہیں مانتا ہے تو جبر تھوڑا ہی ہے۔ ان کے پاس بھی حجت ہے وہ اس پر عمل کر رہا ہے۔ یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ وہ فاسق ہے۔ کافر ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ لہٰذا میری بات مانو۔ دوسرا باطل محض ہے۔ اس لئے وہ حق پر نہیں۔ یہ کہنا غلط بات۔ یہ مسائل صرف آڑ ہیں ورنہ حقیقی لڑائی تو نفسانی جذبات کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ لڑ لڑ کر مسلمانوں نے حکومتیں برباد کیں اپنی جائیدادیں تباہ کر دیں اپنی بلڈنگیں برباد کر دیں' جب یہ دنیا چلی گئی تو رہ گیا دین اور لڑنا ضروری تھا۔ اس سے ہٹ نہیں سکتے تھے۔ کہا کہ اب دین کو آڑ بناؤ۔ اب جائیدادیں نہیں تو مسئلوں پر لڑو۔ فروعات پر لڑو۔ یہ صرف نفسانی جھگڑے ہیں۔ اگر حجت ہاتھ میں ہے تو اس میں جھگڑا ہی نہیں۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ چونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اس لئے زور سے آمین کہتا ہوں۔ امام

ابو حنیفہؒ کہیں گے کہ آپ معذور ہیں کیونکہ آپ کے پاس حجت ہے۔ میرے پاس حدیث ہے۔ میں آہستہ سے آمین کہتا ہوں چونکہ میرے پاس حجت ہے امام شافعیؒ کہیں گے آپ بھی معذور ہیں چونکہ آپکے پاس بھی حجت ہے آپ بھی حق پر عمل کر رہے ہیں۔ میں بھی حق پر عمل کر رہا ہوں۔ معاملہ ختم ہوا نہ دوستی گئی، نہ نفرت پیدا ہوئی۔ نہ جھگڑا پیدا ہوا اس لئے کہ حجت ہے۔ جہاں اختلاف بلا حجت ہوتا ہے۔ تعصب سے 'عناد سے' پارٹی بندی سے وہاں اصل میں لڑائیاں نفسانی جذبے کے تحت ہوتی ہیں۔ وہ مسئلے کی لڑائی نہیں ہوتی۔ وہ تو مسئلہ کو آڑ بنا کر اپنا اندرونی بخار نکالنا مقصود ہوتا ہے۔

توحید مقصد

میں عرض کر رہا تھا کہ فقہ کے مسئلے میں بہر حال کسی کو امام بنانا پڑے گا' جہاں اختلافی مسئلہ آوے کسی امام کی طرف رجوع کرے اور یہ فطری چیز ہے مثلاً آپ علاج کرائیں اور چار طبیبوں کی چار رائیں ہو جائیں۔ ایک کہے کہ میں گرم دوائیں دوں گا۔ ایک کہے کہ میں ٹھنڈی دوائیں دوں گا۔ ایک کہے میں خشک دوائیں دوں گا۔ ایک کہے کہ میں تر دوا دوں۔ کیا کبھی آپ نے یہ کیا ہے کہ چونکہ طبیب آپس میں لڑ رہے ہیں۔ لہذا مجھے انتقال کر کے قبر میں چلا جانا چاہئے۔ میں علاج نہیں کراؤں گا۔ چونکہ جان عزیز ہے اس لئے ان اطباء میں سے آپ انتخاب کرتے ہیں کہ کسی ایک کی طرف رجوع کریں خواہ انتخاب کی کوئی بھی وجہ ہو۔ خواہ یہ وجہ ہو کہ یہ جامعہ طبیہ کا پڑھا ہوا ہے جو بہت بڑا طبی ادارہ ہے۔ لہذا یہ طبیب حاذق ہو گا۔ اس لئے اس کا علاج کراؤں گا۔

یا اس وجہ سے کہ اس کے مطلب سے شفاء پانے والے بہت ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نسخے تیر بہدف ہیں لہذا اس کا علاج کراؤں گا یا یہ وجہ ہو کہ یہ طبیب خاندانی طور پر طبیب ہے اس کے یہاں جدی طب چلی آرہی ہے۔ لہذا طب سے جو مناسبت اسے ہے وہ دوسروں کو نہیں ہے۔ اس بنا پر میں اس کا علاج کراؤں گا کہ کوئی بھی وجہ ہو مگر آپ انتخاب کریں گے اس لئے کہ جان عزیز ہے محض اس بناء پر کہ اطباء میں اختلاف رائے ہے۔ آپ موت کو ترجیح نہیں دیتے زندگی پر کہتے ہیں کہ زندگی رہنی چاہئے اور علاج ہونا چاہئے تو۔ ان اطباء میں سے کسی کو بھی منتخب کر لو۔

اگر علماء میں اختلاف رائے ہو اور آپ یہ کہیں کہ علماء تو لڑ رہے ہیں لہذا ہم دین اسلام کو چھوڑ دیتے ہیں اور ابدی موت کو ترجیح دیتے ہیں اور موت کو قبول کرتے ہیں۔ یہ آج تک کسی نے کیا ہے؟ انتخاب کرنا پڑے گا۔ جس کی طرف آپ جائیں یہ دیکھیں کہ اس کا علم مستند ہے۔ اس کے مشائخ سند صحیح کے ساتھ نبی کریمؐ تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اور جو احکام یہ بیان کرتے ہیں ان کی سند کا سلسلہ پیغمبرؐ تک پہنچا ہوا ہے۔ لہذا ہم ان کے مسائل پر عمل کریں گے۔ دوسروں کے مسئلے پر عمل نہیں کریں گے۔ کوئی بھی وجہ ہو مگر انتخاب کرنا پڑے گا۔

اطباء میں اختلاف رائے ہو تو ان میں سے انتخاب کرتے ہیں اگر علماء میں اختلاف ہو تو دین سے بد ظن ہو جاتے ہیں کہ صاحب! کسی کی مانیں مولوی تو آپس میں لڑ رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جان زیادہ عزیز ہے ایمان زیادہ عزیز نہیں ہے۔ وہاں چونکہ جان عزیز ہے اس لئے ڈاکٹروں میں کتنے ہیں شدید اختلافات ہوں کسی کا انتخاب ضرور کریں گے۔ یہاں اگر ایمان عزیز ہوتا تو کتنا ہی اختلاف ہوتا علماء میں کسی نہ کسی کا انتخاب ضرور کرتے اور اس کی پیروی کرتے چونکہ ایسا نہیں ہے معلوم ہوا کہ جان تو عزیز ہے مگر ایمان عزیز نہیں ہے۔

بہر حال اپنا مال ضرور بنانا پڑے گا اور اشخاص میں سے انتخاب ضرور کرنا پڑے گا اور ایک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ طب کے اندر ہو تو رجوع کرنا پڑے گا کسی طبیب کی طرف ایک دم چار کا علاج جاری کریں تو آپ کا مزاج فاسد ہو کر رہ جائے گا اور جلد ہی آپ قبر میں تشریف لے جائیں گے۔ اس لئے کہ ایک طبیب صبح کو ٹھنڈی دوا دے گا تو دوسرا شام کو گرم دوا دے گا' تیسرا تر دوا دے گا' چوتھا خشک دوا سے علاج کرے گا تو مریض تختہ مشق بن جائے گا اور وہ قبر میں جانے کی تیاری شروع کر دے گا۔ اس لئے ایک ہی کا علاج کریں۔

توحید مطلب طریقت میں آپ نے بیعت کی تو وہاں بھی توحید مطلب ہے کہ جس شیخ کے ہاتھ پر بیعت کریں یہ سمجھیں کہ میری دنیا و آخرت کی خوبی اسی شیخ میں ہے دوسرے کی طرف رجوع مت کرو۔ ہاں عظمت سب کی کرو۔ احترام سب کا کرو مگر کا علاج ایک ہی سے کراؤ۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اس کا نام توحید مطلب ہے۔ یہ ہے کہ وحدت ہونی چاہئے اس شخص کے لئے جس کو آپ نے شیخ بنا لیا ہے۔ شیخ دو یا تین نہیں ہوں گے بلکہ ایک ہی ہوگا اور ایک ہی کے طریق پر چلنا پڑے گا۔

ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ شیخ واقعی اہل سنت میں سے نہیں ہے بلکہ مبتدع ہے تو ترک کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد پھر حضرات صوفیاء لکھتے ہی کہ ترک کر کے دوسرے کا ہاتھ پر بیعت کرو مگر اس پہلے کی شان میں بے ادبی مت کرو' چاہے وہ اپنی ذات میں کیسا ہی ہو گستاخی مت کرو۔ ادب سے پیش آؤ۔ تو طریقت کے اندر توحید مطلب ہے اور طب کے اندر توحید مطب ہے۔ تو آخر علم کے اندر توحید مقصد کیوں نہیں ہونا چاہئے اور کسی ایک امام کو کیوں مقرر نہیں کرتے کہ آپ اس کے فقہ پر عمل کریں۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو آپ ڈانواں ڈول رہیں گے' کبھی ادھر' کبھی ادھر اور یہ نفس کی اتباع بالکل نہ ہو گا اور شریعت میں نفس کا اتباع مطلوب نہیں۔

تو شریعت نے ہر معاملے میں نظم قائم کیا' عقائد میں الگ نظم ہے اور فقہ کے مسائل میں

الگ نظم ہے۔ مقصد یہ کہ امت جڑ جائے۔ چاہے اختلاف رائے بھی ہو مگر باہم متفق و متحد ہو جائیں۔

اسی طرح سے جب آپ حضرات صوفیاء کے پاس جائیں گے اور اپنے اخلاق کی تربیت کرائیں گے تو ان کے بھی مختلف طرق پائیں گے۔ چشتیہ کا اور طریق تربیت ہے۔ سہروردیہ کا اور طریق تربیت ہے۔ قادریہ کے وظائف اور ہیں مگر ہیں سب حضرات اہل اللہ اور سب حضرات اہل حق ہیں۔ لیکن چاروں میں آپ ایک دم بیعت کر کے چاروں سے علاج کرائیں تو دین فاسد ہو کر رہ جائے گا اس لئے کہ متضاد چیزوں پر عمل کیسے کریں۔ لہذا ایک ہی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ ہاں عظمت واحترام سب کا کرنا پڑے گا اور خادم سب کا بننا پڑے گا مگر علاج ایک سے کرائیں۔

تو تصوف کے اندر بھی توحید مطلب ہے جیسے طب کے اندر توحید مطب ہے۔ اور فقہ کے اندر توحید مقصد ہے۔

امیر معاملات اسی طرح سے جب معاملات پیش آئیں تو کسی نہ کسی کو امیر تو بنانا پڑے گا مثلاً کوئی جھگڑا ہو' اب راستہ چلتے ہوئے پوچھ رہے ہیں کہ بھائی کیسے فیصلہ کروں' ایک نے کہا کہ یوں کرو' دوسرے نے کہا کہ یوں کرو' تیسرے نے کہا کہ یوں کرو۔ اگر تینوں کی رائے پر عمل کیا تو وہ جھگڑا تو یوں ہی رہ جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ گھر بھی فاسد ہو جائے گا۔ لیکن اگر کسی ایک متدین شخص کو اپنا امیر بنالیا کہ بھائی! ہم تم سے فیصلہ چاہتے ہیں جو تم فیصلہ کرو گے ہمیں منظور ہے۔ اگر صحیح کرو گے۔ تب بھی عمل کریں گے۔

اور اگر کوئی فکری غلطی بھی واقع ہو گئی تب بھی عمل کریں گے۔ مگر کرائیں گے فیصلہ آپ سے ہی۔ تو ایک قسم کا اطمینان و سکون ہو جائے گا۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جائے گی۔ قاضی جب حکم کر دے کہ یہ ہے مسئلہ تو وہ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی نافذ ہو جاتا ہے یعنی اس کے خلاف پھر کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر بعد میں یہ بھی ثابت ہو کہ رائے کی غلطی تھی تو یہ بات نہیں کہ فیصلہ ٹوٹے گا' ایسا نہیں بلکہ جو فیصلہ ہو چکا وہ نافذ ہو کر رہے گا۔ چونکہ وہ فیصلہ من جانب اللہ ہے اور اس کے بغیر سکون و اطمینان قلبی اور یکسوئی نہیں ہو سکتی اس بنا پر قاضی کی قضا ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتی ہے اور اس کا ماننا لازم ہو جاتا ہے تو امراء اسلام اس لئے مقرر کئے گئے تاکہ وہ جھگڑوں کے فیصلے کر سکیں۔

حق امارت اگر خلیفۃ المسلمین اور بادشاہ اسلام موجود ہے تو اصل امیر وہ ہے پھر جن کو وہ امیر مقرر کریں وہ امیر بن جائیں گے۔ اگر اسلام کی حکومت نہیں ہے تو فقہاء لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ سب مل کر اپنا ایک امیر مقرر کر لیں۔ اگر سارے ملک کے مسلمان

ایک امیر پر جمع نہ ہو تو خطوں کے امیر بنالئے جائیں۔ ہر صوبہ کا الگ امیر ہو اور تمام مامورین پر اپنے اپنے امام کی اطاعت کرنا واجب ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ

یہاں پر تین اطاعتیں واجب اور فرض قرار دیں۔

اللہ کی اطاعت، رسول ﷺ کی اطاعت، اولی الامر یعنی امیر کی اطاعت۔

اطاعت ذاتی اور وصفی

قرآن تو قرآن ہی ہے وہ تو سرچشمہ ہے بلاغت وفصاحت کا اور معجزہ ہے اس نے جہاں اللہ کی اطاعت فرض کی وہاں تو اللہ کا نام ذکر کیا کہ اطیعو اللہ یعنی اللہ کی اطاعت کرو۔ اسکے معنی یہ ہیں اللہ بذاتہ واجب الاطاعت ہیں کسی وصف کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت نہیں ہے کہ جب اللہ کا نام آئے تو گردن جھک جانی چاہئے اطیعو اللہ علم ذات کا ہے۔ اس لئے کہ وہ بالذات واجب الاطاعت ہیں۔ ہم اور آپ کسی وصف سے واجب الاطاعت بنتے ہیں۔ آپ میں اگر علم آگیا تو علم کی وجہ سے آپ کی اطاعت ہوگی ورنہ آپ کی اطاعت نہ ہوگی۔ مثلاً کوئی جاہل ہے اس کی کوئی بھی اطاعت نہیں کرتا ہاں علم کا وصف اگر آجائے تو اطاعت کرنے لگیں گے۔

اگر کوئی باپ ہے تو باپ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی استاد ہے تو استاد ہونے کی حیثیت سے اس کی اطاعت ہوگی کوئی شیخ ہے۔ تو شیخ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت ہوگی تو انسان بذاتہ واجب الاطاعت نہیں بلکہ بالاوصاف واجب الاطاعت ہے۔ جب کوئی وصف کمال پیدا ہوگا اس کی وجہ سے اس کی اطاعت ہوگی۔

لیکن حق تعالیٰ شانہ' بذاتہ واجب الاطاعت ہیں۔ صفات تو ذات کے تابع ہوا کرتی ہیں کیوں کہ وہ ذات کا پرتو ہیں۔ دراصل سرچشمہ کمالات کا ذات ہے اور صفات اس لئے مقبول ہوئیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں مگر اصل ان سب کی ذات ہی ہے اور جب آگے کی اطاعت بتلائی گئی تو یوں نہیں فرمایا گیا کہ۔

اطیعوا عیسٰی یا اطیعوا موسیٰ یا اطیعوا محمداً.

بلکہ فرمایا اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ

یعنی رسول وصف رسالت کی وجہ سے واجبُ اُلاطاعت ہیں۔۔۔ اسی وجہ سے اگر وہ کوئی ذاتی مشورہ دیں تو واجبُ اُلاطاعت نہیں ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اپنی محبت کی وجہ سے اس کی منشاء کی بھی اطاعت کریں۔ لیکن قانون شریعت یہ ہے کہ اگر رسول کوئی ذاتی رائے دیں تو واجبُ

اُلاطاعت نہیں البتہ جب یہ فرمائیں کہ میں حکم خداوندی پہنچارہاہوں تووہ واجبُ اُلاطاعت ہے جب رسالت پہنچائیں گے تواطاعت کرنا فرض ہے ور جب یوں فرمائیں کہ میراذاتی مشورہ ہے توآپ مختار ہیں۔اور معذرت بھی کرسکتے ہیں'ادباچاہے آپ عمل کرلیں مگر آپ کے ذمے واجب نہیں ہے۔

جیسے کہ حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہا کاواقعہ ہوا۔یہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی باندی تھیں اور ان کا نکاح حضور ﷺ نے حضرت مغیثؓ سے کر دیا تھا۔ حضرت بریرۃؓ حسین و جمیل اور بہت خوبصورت تھیں اور حضرت مغیثؓ کالے کلوٹے اور بدصورت تھے۔اس لئے آپس میں بنتی نہ تھی۔ رات دن آپس میں کھٹ پٹ رہتی تھی اور رات دن لڑائی ہوتی رہتی تھی اور حضور ﷺ فیصلہ فرماتے تھے مگر بہر حال قصہ چل رہاتھا۔

حضرت عائشہؓ نے ان کو آزاد کردیااب وہ باندی نہیں رہیں اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ منکوحہ باندی جب آزاد ہوتی ہے تو نکاح اس کے قبضے میں آجاتا ہے۔چاہے توباقی رکھے چاہے توفسخ کردے۔ اب جب کہ آزاد ہو گئیں توانہوں نے ارادہ کرلیاکہ میں نکاح کوباقی نہیں رکھوں گی بلکہ فسخ کردوں گی کیونکہ حضرت مغیثؓ سے ان کی موافقت نہیں ہوتی۔پکاارادہ کرلیاکہ اب میں ان کے نکاح میں نہیں رہوں گی۔

اور حضرت مغیثؓ ان پر سو جان سے عاشق تھے جب انہیں معلوم ہواتو پریشان ہو گئے۔ کبھی صدیق اکبرؓ سے سفارش کراتے ہیں کبھی حضرت عمر فاروقؓ کے پاس جاتے ہیں کہ آپ ان کو سمجھا دیں کہ وہ نکاح باقی رکھیں۔ انہوں نے سب کو جواب دے دیا کہ نہیں میں نکاح باقی نہیں رکھتی۔۔۔۔ آخر میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ نے ہی یہ نکاح باندھاتھا۔اب بریرۃؓ اس نکاح کو توڑ رہی ہیں۔ آپ ان سے فرمادیں کہ اس نکاح کو باقی رکھو۔اور حضرت مغیثؓ بے حد پریشان حال ہیں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ وہ وقت دیکھنے کے قابل تھاکہ حضرت مغیثؓ مدینے کی گلیوں میں روتے ہوئے پھر رہے تھے۔آنکھوں میں آنسو ہیں۔داڑھی پر آنسوٹپ ٹپ گر رہے ہیں کہ ہائے بریرۃؓ جداہو گئیں۔اس درجہ عشق تھا۔تو حضور ﷺ سے جاکر عرض کیاکہ آپ فرمادیں نکاح باقی رکھنے کو۔حضورؐ تشریف لے گئے اور فرمایابریرۃ نکاح مت توڑو مغیث سے۔میں نے ہی وہ نکاح قائم کیاتھاتم اب بھی قائم رکھو۔وہ بھی بڑی ذہین تھیں۔انہوں نے کہا۔

"یارسول اللہ ﷺ!یہ حکم شرعی ہے یاآپ کاذاتی مشورہ؟

آپؐ نے فرمایاکہ نہیں حکم شرعی نہیں شرعاًتوتم آزاد ہو۔نکاح رکھوچاہے توڑدو یہ میراذاتی مشورہ ہے"۔

بریرہؓ نے کہا پھر تو میں نہیں مانتی۔۔۔۔ آخر کار نہیں مانا اور نکاح توڑ دیا تو معلوم ہوا کہ اگر نبی اپنی ذات سے کوئی مشورہ دیں تو وہ قانون واجب الاطاعت نہیں ہوتا' اگر رسالت پیش کریں کہ یہ حکم خداوندی ہے تو اس کی اطاعت فرض ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب انبیاء بھی ذاتی طور پر واجب الاطاعت نہیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے اور میں ذاتی بات کہوں اور اس پر ضد کروں کہ نہیں اس کو ماننا ضروری ہے۔ قطعاً ضروری نہیں ہے۔ صرف ایک رائے ہے آپ کی' میری بھی ایک رائے ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جو حق ہو اس پر عمل کریں۔ تو اللہ نے جہاں اپنی اطاعت کا حکم دیا وہاں اپنا نام لیا ہے اور فرمایا اَطِیْعُوا اللّٰہَ کہ اللہ کی ذات واجب الاطاعت ہے۔ آگے رسول کا نام نہیں لیا بلکہ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ فرمایا یعنی وصفِ رسالت کا تذکرہ کیا کہ اسی وصفِ رسالت کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت ہیں کہ جب رسالت خداوندی پیش کریں تو گردن تسلیم خم کر دو۔

اطاعتِ امیر کا معیار

وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ یہاں اَطِیْعُوْا کا لفظ بھی خصوصیت سے ذکر نہیں کیا جیسا کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ میں ذکر کیا تھا یہ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ پچھلے اَطِیْعُوْا کے نیچے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اولی الامر ہو گا وہ تابع ہو گا۔ نبی کریم ﷺ کے چونکہ آپؐ کا نائب بن کر آیا ہے۔ اس لئے واجب الاطاعت ہے۔ مستقلاً اس کی اطاعت نہیں۔ اللہ کے رسول کا فرمان نافذ کرے گا تو واجب الاطاعت ہو گی ورنہ محض ذاتی مشورہ ہو گا کہ واجب الاطاعت نہیں اور اولی الامر کا لفظ آخر میں ہے۔ اس کے بعد کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اس بناء پر تین اطاعتیں ہو گئیں۔ اللہ کی اطاعت۔ رسولؐ کی اطاعت۔ اولی الامر کی اطاعت۔

ہاں اگر اولی الامر کوئی غلط حکم دے۔۔۔ تو اس کی اصلاح کی جائے۔ اس لئے ذاتی حکم واجب الاطاعت نہیں۔ جب وہ یوں کہے کہ قرآن شریف میں یوں آیا ہے تو پھر وہ واجب الاطاعت ہے چاہے وہ استنباط ہی سے کہتا ہو۔ نص صریح نہ ہو کیونکہ وہ قرآن ہی سے کہہ رہا ہے۔ وہ قرآن ہی کا مصداق ہے۔ اس لئے اس سے گردن پھیرنا جائز نہیں ہے۔

صلاحیت کی بنیاد پر چیف جسٹس کی تقرری

حضرت عمر رضی اللہ عنہ' جب امیر المومنین تھے تو دربار خلافت میں ایک عورت حاضر ہوئی۔ اس نے عرض کیا کہ امیر المومنین! میرے خاوند کی آپ کیا بات پوچھتے ہیں۔ صائم الدہر ہے۔ قائم اللیل ہے۔ تمام راتیں عبادتیں کرتے ہے اور تمام دن روزے رکھتا ہے۔ فرمایا کہ ماشاء اللہ اللہ مبارک کرے بڑا اچھا خاوند ہے کہ عبادت گزار ہے' راتوں کو تہجد

پڑھتا ہے۔ دنوں کو روزے رکھتا ہے مبارک ہو۔

وہ بچاری چپکی ہو کر چلی گئی۔ دربار میں ایک صحابیؓ موجود تھے جن کا نام اکثمؓ تھا وہ اٹھے اور انہوں نے کہا کہ امیر المومنین! آپ سمجھے بھی! یہ کیا کہہ کر گئی ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خاوند کی تعریف کر کے گئی ہے اور کیا کہتی ہے؟

انہوں نے کہا کہ حضرت! اسے کیا مصیبت آئی تھی کہ وہ دربار خلافت میں آکر خاوند کی تعریف کرے کہ نمازیں اتنی پڑھتا ہے۔ روزے اتنے رکھتا ہے۔

کہنے لگے پھر کیا کہہ کر گئی ہے۔ اکثمؓ نے کہا' خاوند کی تعریف کرنے نہیں آئی تھی بلکہ استغاثہ اور دعویٰ دائر کر کے گئی ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دعویٰ کیا کر کے گئی ہے۔ اکثمؓ نے کہا کہ دعویٰ یہ کیا ہے کہ ساری رات تو رہتا ہے عبادت میں اور سارے دن رہتا ہے روزے میں یہ اللہ میاں کے کام کا تو ہے میرے کام کا نہیں ہے۔ یہ ہے اس کا منشاء وہ استغاثہ دائر کر کے گئی ہے۔

حضرت عمرؓ چپ ہو گئے اور فرمایا کہ مجھ جیسے کو امیر بنادیا ہے معاملہ سمجھنے کی بھی طاقت نہیں۔ میں اس قابل نہیں تھا کہ امیر بنایا جاتا۔

پھر فرمایا کہ اچھا اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی سمجھ دی ہے تو تو ہی فیصلہ کر اس مقدمے کا جب اس نے استغاثہ دائر کیا ہے اور خاوند کی شکایت کی ہے تو کیا حکم شرعی ہونا چاہئے؟

انہوں نے فوراً ہاتھ کے ہاتھ فیصلہ کیا کہ "امیر المومنین! اس کے خاوند کو حکم دیا جائے کہ چار دن میں سے ایک دن ضرور افطار کیا کرے اور خوب کھانا کھایا کرے اور چار راتوں میں سے ایک رات بالکل نہ جاگے۔ بیوی کے پاس سویا کرے۔ تین راتوں میں اسے اختیار ہے کہ خوب تہجد پڑھے اور تین دنوں میں اسے اختیار ہے کہ خوب روزہ رکھے۔ تو ہر چار دن میں سے ایک دن اور ہر چار راتوں میں سے ایک رات خالی چھوڑے"۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے اکثمؓ! یہ حکم تم نے کہاں سے نکالا ہے۔ انہوں نے کہا قرآن سے۔۔۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ قرآن میں کہاں موجود ہے؟ کہ اگر کسی بیوی کا خاوند رات دن عبادت کرے تو وہ چار رات دن میں سے ایک رات دن بیوی کے پاس گزارے۔ عرض کیا قرآن میں حکم ہے۔

فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ اگر چار بیویاں ہوں تو چار راتیں انکے گھر جائیں گے۔ اگر چار میں سے ایک بیوی ہو تو تین راتیں خدا کی اور ایک رات بیوی کی۔

فرمایا' سبحان اللہ کتنا اچھا فیصلہ ہے۔ مجھ جیسے کو امیر بنادیا جس نے قرآن سے اتنا فیصلہ نہیں کیا۔ اس دن حضرت عمرؓ نے ان کو چیف جسٹس یعنی قاضی القضاۃ بنادیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری سمجھ کو تیز کیا ہے۔ اس لئے تم ہی فیصلے کرو آج سے مسلمانوں کے مقدموں کے۔ ایک چاول سے پوری دیگ پرکھی جاتی ہے جب ایک فیصلہ کیا کہ جو کہ معمولی مسئلہ تھا قرآن سے پیش کیا۔ فرمایا کہ تیری سمجھ اس قابل ہے کہ آج سے تو مسلمانوں کے فیصلے کرے۔ اس بناء پر ان کو قاضی القضاۃ بنادیا۔

انحراف اطاعت موجب تفریق ہے

بہر حال اطاعتیں تین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت' رسولؐ کی اطاعت اور رسولؐ کے جو نمائندے اور نائب ہیں ان کی اطاعت جب کہ وہ رسول کی رسالت کو جاری کریں اور ان کے پر اعتماد ہو تو وہ واجبُ اُلاطاعت بن جاتے ہیں۔ پھر ان سے اور ان کی اطاعت سے انحراف کرنا قوم کے اندر تفریق ڈالنا ہے اس لئے مامورین کے ذمہ ہے کہ ہر صورت میں جب کہ وہ حکم شرعی بیان کریں تو ان کی اطاعت کریں۔ لہٰذا جب ہم نے اپنا امیر شریعت بنالیا ہے اور بحمد اللہ ان میں امیر شریعت کے اوصاف بھی موجود ہیں جو اوصاف کہ واقعی طور پر ایک امیر کے اندر ہونے چاہئیں۔ خدا نے ان کو اہل بنایا ہے۔ جب آپ کو ایک اہل ملا تو آپ کا فرض ہے کہ ان کی اطاعت کریں۔ اب ایسے اشخاص تو آنے سے رہے جو کبھی بھی غلطی نہ کریں۔ ہمیں اپنے ہی میں سے ہر ایک کو بنانا پڑے گا اور اس کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ ہاں اتنا دیکھ لو کہ وہ بشر عمدہ ہو جس کی تمام زندگی تقویٰ وطہارت سے گزری ہو۔ جس کی زندگی میں صلح اور رشد پایا جاتا وہ بے شک اس قابل ہے کہ وہ ہمارا مطاع بن جائے اور غلطی سے تو کوئی بشر خالی نہیں ہر ایک انسان غلطی بھی کرتا ہے مگر اس کے باوجود واجب الاطاعت ہے تو بہر حال اللہ تعالیٰ نے ایک امیر بنادیا آپ کے لئے جو اہل ہے امامت کا۔ ہم سب کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ اب اگر ان سے کوئی اور افضل ہو تو یہ ضروری نہیں کہ امیر سب سے افضل ہو۔ اگر دوسرا کوئی افضل بھی ہو تو اطاعت اسے بھی کرنی پڑے گی۔ اس لئے کہ قوم نے مل کر ان کو امیر مقرر کردیا ہے۔

امارت کی بنیادی شرط

اگر کوئی یوں کہے کہ صاحب! میں ان سے زیادہ کامل ہوں۔ اس لئے امیر میں بنوں گا۔ تو مدعی کو امیر بنانے کے لئے کوئی تیار نہیں۔۔۔ خود شریعت میں مسئلہ موجود ہے لَانُوَلِّی اَمْرَنَا هٰذَا مَنْ طَلَبَهٗ' جو خود عہدے کی طلب کرے اسے کبھی عہدہ نہیں دیں گے۔

جو شخص عہدے سے بچے اور الگ رہے وہ اس قابل ہے کہ عہدہ اس کے ذمے ڈالا جائے۔

اس واسطے کہ جب مسلمانوں نے عہدہ ڈال دیا اس کے ذمے اور امیر بنادیا اور امیر نے پھر ایک قاضی مقرر کردیا تو قوم کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرے۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات سامنے آئے کہ صریح قرآن وحدیث کے خلاف فیصلہ دیا اور تخریب کردی تو بھائی اس وقت غور کرنا! کہ ایسے کو امیر کیوں بنایا، لیکن قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کررہا ہے۔ تو اس بیچارے سے کیوں انحراف کریں؟

اسلامی حکومت نہ ہو تو مسلمانوں کی ذمہ داری

امارت شرعیہ کا قیام ضروری ہے اور فقہاء لکھتے ہیں کہ جب حکومت اسلامی نہ ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنا ایک امیر مقرر کرلیں۔ اپنے معاملات مین ان کی طرف رجوع کریں اور سمع وطاعت کے ساتھ اس پر چلیں۔ اس کا فائدہ پوری قوم کو پہنچے گا۔ وہ یہ کہ جب پوری قوم منظم ہوگی اور ایک کے تابع ہوگی تو اغیار پر اثر پڑے گا کہ یہ ہے متحد و منظم قوم۔

جب عید کی نماز ہوتی ہے اور ایک امام کے پیچھے پچاس پچاس ہزار آدمی ہوتے ہیں تو بہت سے غیر مسلموں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ یہ نظام کسی قوم کو نصیب نہیں ہے جو اس قوم کو دیا گیا ہے کہ ایک کے اشارے پر لاکھوں آدمی جھک رہے ہیں۔ حرم محترم میں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ایک امام کے پیچھے تیس لاکھ آدمی نماز پڑھ رہے ہیں۔ ایک امام زکوٰۃ کے پیچھے سارے اپنی زکاتیں پیش کررہے ہیں۔ تو اسلام نے ہر ہر جزئی میں ایک نظم قائم کیا ہے اور نظام ہو ہی نہیں سکتا جب تک جماعت نہ ہو اور جماعت ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ امام نہ ہو اور امیر نہ ہو اور امیر ہو ہی نہیں سکتا ہے جب تک کہ سمع وطاعت نہ ہو۔ تو سمع وطاعت ہم سب کا فرض ہے ہمیں اور آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی توفیق دی کہ ہم نے اپنا ایک امیر مقرر کیا اور امیر بحمد للہ ایسا کہ قابل اعتراض نہیں ہے۔

انتخاب امیر کے لئے مجموعی زندگی کی پیش نظر رکھا جائے

دنیا میں کوئی ایسی ذات نہیں ہے جو اعتراض سے بچی ہوئی ہو۔ اعتراض سے کوئی خالی نہیں۔ اعتراض جس پر چاہو کردو۔ حتی کہ اعتراض کرنے والوں نے اللہ ورسول پر بھی اعتراض کردیئے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

قَدْقِيْلَ اِنَّ اللّٰهَ ذُوْ وَلَدٍ
وَقِيْلَ اِنَّ الرَّسُوْلَ قَدْ كَهَنَ
مَانَجَا اللّٰهُ وَالرَّسُوْلُ مِنْ
لِسَانِ الْوَرٰى فَكَيْفَ اَنَا

کہنے والے نے کہ کہ اللہ صاحب اولاد ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے بیٹے ہیں اور باپ ہیں۔ اور حضرت مریم بیوی ہیں۔

رسول کے بارے میں کسی نے کہا کہ کاہن ہیں۔ کسی نے کہا کہ ساحر ہیں، کسی نے کہا کہ مجنون ہیں۔ تو شاعر کہتا ہے کہ جب اعتراض کرنے والوں نے اللہ ورسول کو بھی نہیں چھوڑا تو میں کون ہو۔ میں بیچارہ کیا چیز ہوں۔ دنیا میں کون ہے ایسا جس پر اعتراض نہ ہوا ہو۔ بھائی تھوڑا بہت تو اعتراض سب پر ہوتا ہے۔ مجموعی زندگی کو دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی زندگی سچائی سے گزر رہی ہے یا مکروفریب سے۔ صلاح وتقویٰ پر گزر رہی ہے یا جہالت پر اس لئے اگر تھوڑی بہت غلطی بھی ہو جائے تو وہ قابل عفو ہے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُه، فَاولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

جن کی نیکیاں غالب ہیں وہ اللہ کے یہاں بھی نجات پا جائیں گے۔ معصوم تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذوات گرامی ہیں۔ لیکن انبیاء کے بعد اولیاء محفوظ ہیں۔ پھر اولیاء کے بعد جتنے ہم اور آپ ہیں نہ محفوظ ہیں نہ معصوم ہیں۔ کبھی نہ کبھی نہ کوئی غلطی ہو ہی جائے گی مجموعی زندگی کو دیکھ کر حکم لگے گا۔ ایک ایک غلطی نہیں پکڑی جائے گی۔ یہ بدنیتی ہو گی کہ ساری زندگی کی اچھائیوں میں سے ایک برائی پر نظر پڑی تو اس کو آپ نے اچھال دیا یہ تو عناد کی بات ہے۔ یہ کوئی آدمیت نہیں ہے۔ یہ ہے خِلّتْ مَاکَرِہَ نبی کریمؐ نے اس سے پناہ مانگی ہے۔ فرمایا کہ ؎

اللّٰھم انیّ اعوذبك من خلیل ماکر عیناہ تریانی و قلبه یرعانی ان رایٰ حسنةً دفنها وان رایٰ سیئة افشاها.

"اے اللہ! میں ایسے مکار دوست سے تیری پناہ لیتا ہوں جس کی آنکھیں مجھے دیکھیں اور اس کا دل میری ٹوہ میں لگا رہے اگر نیکی دیکھے تو اسے چھپالے اور اگر برائی دیکھے تو اس کو پھیلاتا پھرے"۔

ایسا دوست پسندیدہ نہیں ہے بلکہ اگر کسی کی برائی آپ کے سامنے ہو تو اس کی اچھائیوں کو بھی دیکھنا چاہئے اور ان اچھائیوں کی وجہ سے اس کی برائی نظر انداز کر دینی چاہئے۔ یہی قرآن کا فیصلہ بھی ہے۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّئَات کہ نیکیاں تمام برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

جب ختم ہو گئی پھر برائی رہ ہی کہاں گئی جس کو اچھالا جائے۔ لیکن کہنے والے اور اعتراض کرنے والے تو ہر وقت اور ہر زمانہ میں رہتے ہیں۔ کام کرنے والے اگر اس کی پرواہ کریں تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔۔۔۔ قیامت میں جب باری تعالیٰ کے سامنے پیشی ہو گی تو اعتراض کرنے والے بھی سامنے کھڑے ہوں گے اور کام کرنے والے بھی کھڑے ہوں گے۔ مگر کامیاب وسرخرو کام کرنے

والے ہوں گے، تو شکرا یہ ادا کرنا چاہئے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے ہمیں اپنا امیر بنانے کی توفیق دی اور آگے ہم اس کی توفیق بھی بارگاہ صمدی سے چاہتے ہیں کہ ہم اپنے امیر کی سمع وطاعت کریں اور ہم کو راہ راست پر چلائے۔ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔ ہمیں اسلام پر قائم ودائم رکھے ' ایمان پر خاتمہ فرمائے۔

آمین یا ربّ العالمین

واخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العالمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اَلواعظ

اگر انسان آفاق وانفس اور اس مادی عالم پر نظر ڈالے اس کے حوادث وواقعات کو امعان کی نظر سے دیکھے۔ عقل وبصیرت، تدبر اور تفکر سے کام لے تو یہ چیز اس کے لئے بڑے سے بڑے واعظ اور مقرر کا کام دے گی اور انسان ہر وقت وعظ کہہ سکتا ہے اور اس سے پند ونصیحت حاصل کر سکتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْراًوَّ نَذِيْراًوَّ دَاعِياً اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجاً مُّنِيْراً.................. اَمَّابَعْدُ..........

فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْفَازَ وَمَاالْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ٥

(صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

فائدہ صرف عمل سے ہوتا ہے

بزرگان محترم!

آج بعض ضروری کام کی وجہ سے وعظ کرنے کا ارادہ نہیں تھا مگر چونکہ موذن صاحب نے اعلان کر دیا اس لئے موذن صاحب کے اور دوسرے حضرات کے اس جذبہ اور شوق کے پیش نظر کہ آپ لوگوں کو وعظ سننے کا شوق ہے اور اس خیال سے اپ لوگ جمع ہوئے ہی کہ خدا کی، دین کی اور شریعت کی کوئی بات کان میں پڑ جائے۔ آج میں آپ لوگوں کو ایسی بات بتلا دوں کہ کوئی واعظ ہو یا نہ ہو۔ مقرر ہو یا نہ ہو آپ لوگ وقت صرف کر کے کہیں جمع ہوں یا نہ ہوں جس حال میں بھی ہوں خود

وعظ کہہ لیں اور خود سن لیں۔ خدا اور رسول کی بات کہہ اور سن کر اس پر عمل کر لیں کہ مقصود عمل ہے۔ فائدہ نہ صرف کہنے سے ہوتا ہے اور نہ سننے سے ہوتا ہے فائدہ صرف عمل سے ہوتا ہے۔ فرمایا۔

عقل، فکر و نظر کا واعظ

انسان کے لئے سب سے بڑا واعظ اس کی عقل ہے۔ اگر انسان عقل و تدبر اور تفکر سے کام لے' انقلابات زمانہ اور لیل و نہار کی گردش پر غور کرے اور سوچے تو اس سے اس جہان کے خالق اور اس کی مخلوقات' عجیب و غریب کرشمہ سازیوں اور بوقلموں ایجادات کی طرف رہنمائی ہوگی۔ علوم و حقائق کا انکشاف ہوگا۔ رشد و ہدایت کی راہ کھلے گی۔ حیات' زندگی اور دنیا کی ناپائیداری اور ناثباتی کا پتہ چلے گا۔ موت اور بعد الموت پیش آنے والے واقعات کا علم الیقین حاصل ہوگا۔ خدا اور آخرت کی طرف طبیعت رجوع کرے گی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

آفاق اور انفس میں خدائے برتر و بزرگ کی ہزار ہا نشانیاں اور علامات موجود ہیں اگر چشم بصیرت سے کام لیا جائے دھیان دیا جائے۔ قلب کو متوجہ کیا جائے۔ عالم کی ایک ایک جزئی سے خدا کی قدرت' اس کی حکمت اور بالغ النظری نمایاں ہوگی۔ مگر شرط دھیان اور توجہ ہے' جب تک دھیان اور توجہ سے دیکھا نہ جائے اور غور نہ کیا جائے' اس وقت تک نہ کوئی حکمت ظاہر ہوگی اور نہ کسی مصلحت و دانائی کا پتہ چلے گا۔ دن رات کا مشاہدہ ہے۔ بازار میں میں' مدرسہ میں گھر میں جب تک آپ دھیان نہ دیں کسی کام یا چیز کو خیال اور توجہ سے نہ کریں اور نہ دیکھیں۔ اس وقت تک آپ کو اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ حالانکہ وہ واقعات آپ کی نظروں کے سامنے گزر رہے ہیں۔ آپ کے کان آپ کی آنکھیں اسے سن اور دیکھ رہی ہیں۔ لیکن پوچھنے پر آپ انہیں بتلا نہیں سکتے اس واسطے کہ آپ نے اسے دھیان اور توجہ سے نہیں دیکھا۔ قلب کو متوجہ نہیں کیا۔ تو اصل قلب ہے۔۔۔ قلب اگر متوجہ نہ ہو تو نہ کوئی دکھائی دے اور نہ کان کچھ سن سکے۔

یہ آنکھ اور کان قلب کی عینک اور چشمہ ہیں۔ انسان اگر صرف اپنے نفس' اس کے عدم' پھر وجود اور پھر عدم پر غور کرے اور دیکھے کہ دن اور رات میں' صبح اور شام میں اس خاک کے پتلے پر کیسے کیسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اور کن کن حالات سے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کوئی پیدا ہوتا ہے کوئی مرتا ہے۔ کوئی امیر ہے کوئی غریب' کوئی صحت مند ہے کوئی بیمار و مریض' کسی کی زندگی عیش و عشرت سے گزر رہی ہے اور کسی کی تنگی اور عسرت سے۔ بہرحال اگر انسان آفاق و انفس اور اس مادی عالم پر نظر ڈالے' اس کے حوادث و واقعات کو امعان کی نظر سے دیکھے۔ عقل و بصیرت' تدبر اور تفکر سے کام لے۔ تو یہ چیز اس کے لئے بڑے سے بڑے واعظ اور مقرر کا کام دے گی۔ اور انسان ہر وقت وعظ کہہ سکتا ہے اور اس سے پند و نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ اس عالم کو کون و فساد' اس کے حوادث' واقعات' انقلابات اور صبح و شام کے تغیرات پر نظر ڈالو' غور کرو' دھیان اور توجہ سے سوچو۔ یہ

انقلابات تمہیں خالق کا' صانع کا اور مالک کا پتہ دیں گے' خالق کے اقرار کے بعد اس کی قدرت' حکمت' علم اور ملوکیت کا نشان ملے گا۔ اس کے بعد اس سے محبت عقیدت اور تعلق پیدا ہوگا۔ پھر اس کی اطاعت و فرمانبرداری اور عبادت کی طرف میلان پیدا ہوگا۔ آخرت' دین اور خدا اور رسول کی طرف طبیعت رجوع کرے گی اور یہی حاصل ہے وعظ کا' نصیحت کا اور تقریر کا۔ غرض عقل اس عالم میں غور و فکر انسان کے لئے سب سے بڑا واعظ اور مفت کا واعظ ہے۔

موت ایک خاموش واعظ

دوسرا بڑا واعظ موت ہے۔ اگر انسان موت پر اس کے احوال پر اور یہ کہ موت کے بعد کیا پیش آنے والا ہے۔ اور یہ کہ ہمارا معاملہ اللہ کے ساتھ کیا اور موت کے بعد خدا ہم سے کیا معاملہ کرے گا ان احوال پر غور کرنا خود دین اور منشاء شریعت ہے۔ موت کی یاد سے خدا یاد آتا ہے' آخرت کی یاد آتی ہے' دنیاوی لذات سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی حاصل ہوئے وعظ کا اور نصیحت کا حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظاً۔

انسان کے لئے بڑا واعظ موت ہے۔۔۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہے۔

اَكْثِرُوْا ذِكْرَهَا ذِمِ اللَّذَّاتِ

لذتوں کو مٹانے والی (موت) کا ذکر زیادہ کیا کرو۔ موت سے غافل نہ ہو۔ موت کا دھیان ہر وقت رکھا کرو۔ اس سے دنیا میں اس کی لذات اور آرائشوں میں انہماک کم رہے گا۔ آخرت کی توجہ ہوگی۔ عبادت اور اطاعت میں جی لگے گا اور یہی اصل ہے وعظ کا۔ غفلت بہت بری چیز ہے۔ غفلت سے انسان خسارہ اور نقصان میں رہتا ہے' دنیاوی معاملات میں رات دن کا مشاہدہ ہے' بارش کے وقت اگر کاشتکار آرام میں رہے۔ ٹھنڈی ہوا اور سہانے وقت کے عیش میں پڑا رہے' نہ کھیت پر جاوے اور نہ بیج ڈالے نہ نولائی کرے اور نہ کھیت کی دیکھ بھال کرے تو ظاہر ہے کہ جب دوسرے کاشت کار اپنی لہلہاتی ہوئی کھیتی دیکھ کر خوش ہوں گے اسے کاٹیں گے۔ غلہ اور اناج گھر لائیں گے تو یہ غافل کاشت کار کف افسوس ملے گا اور شرمندہ ہوگا لیکن اس نے وقت کھو دیا وقت کو ضائع کر دیا۔ غفلت اور لاپرواہی برتی۔ افسوس اور پچھتانا اب کچھ کام نہیں دے گا۔ بعینہٖ یہی حال آخرت کا ہے۔ حدیث میں ہے۔

اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔

دنیا میں اگر انسان توجہ سے دھیان سے کام کرتا رہے۔ غفلت نہ برتے' وقت کو ضائع نہ کرے' قلب میں ایمان کا بیج ڈالے' اعمال سے اس کی آبپاشی کرے' خیر خیرات اور صدقات سے اس کی دیکھ بھال اور نولائی کرتا رہے' موت کو یاد رکھے' اعمال کا محاسبہ اور نفس کا مراقبہ کرتا رہے تو آخرت میں سرخرو ہوگا۔ کامیاب ہوگا اور فائز المرام ہوگا ورنہ نقصان میں رہے گا۔

حدیث میں فرمایا گیا۔

اَلنَّاسُ نِیَام" اِذَا مَاتُوْا انْتَبَهُوْا

لوگ سو رہے ہیں۔ غفلت میں ہیں۔ جب مریں گے حساب و کتاب دیں گے۔ سوال و جواب ہو گا۔ اس وقت چونکیں گے، غفلت سے بیدار ہوں گے لیکن دور اندیش اور عاقبت میں وہ انسان ہے جو سوال و جواب، حساب و کتاب اور محاسبہ سے پہلے ہی اپنا حساب پاک وصاف رکھے نفس کا مراقبہ کرتا ہے۔

روزمرہ کے واعظ

فرمایا گیا۔

مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا

مرنے سے پہلے اپنے کو مرا ہوا سمجھو۔ محاسبہ سے پہلے اپنے اعمال اور احوال کا حساب کر لو، پاک وصاف ہو کر جاؤ۔ خدا کے دربار میں سرخرو پاک وصاف ہو کر حاضر ہو۔ غرض موت بھی انسان کے لئے بہت بڑا واعظ ہے۔ موت سے پہلے مرض، بیماری، بڑھاپا، مصائب اور تکالیف بھی کم از کم مسلمان کے لئے واعظ اور مذکر کا درجہ رکھتے ہیں۔ انسان کو غور و خوض، دھیان اور توجہ کی ضرورت ہے۔ غفلت اور سستی چھوڑو۔ ہمت اور عزم واستقلال سے کام لو۔ تم تھوڑا کرو۔ خدا زیادہ توجہ کرے گا۔ تم خدا کی طرف ایک قدم بڑھو گے تو خدا دو قدم بڑھے گا۔

من اتٰی الیّ شبرًا اتیته، ذراعًا و من اتی الیّ ذراعاً اتیته، باعاً ومن اتی الیّ مشیاً اتیته، هرولةً. (الحدیث)

"جو میری طرف ایک بالشت آوے میں اس کی طرف ایک ہاتھ آتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ آوے میں اس کی طرف ایک قدم یا ایک گز آتا ہوں اور جو میری طرف متوسط رفتار سے چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں"۔

کیا ٹھکانا ہے اس کی رحیمی اور کریمی کا۔ البتہ اس کی رحمت اور کرم لینے کو لینے کی اہلیت کے ساتھ ساتھ سعی اور کوشش کو بھی دخل ہے۔ تمہاری ادنی توجہ سے خدا کی زیادہ توجہ ہو گی اور تم انشاء اللہ کامیاب اور فائز المرام ہو کر دنیا سے جاؤ گے۔

نصیحت اور دعا پر تقریر ختم فرمائی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اظہار تعزیت

اُذْکُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ اپنی میت کی خوبیاں بیان کیا کرو۔ تاکہ ان خوبیوں کے تذکرہ سے ایک طرف تو میت کی طرف سے قلوب میں محبت پیدا ہو، اور محبت کے داعیہ سے لوگ اسے ثواب و دعا سے یاد رکھیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس کی خوبیوں کے تذکرے سے خود ہم میں ان خوبیوں کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور ہم بھی اس کے نقش قدم پر چل کر وہی مقام حاصل کریں جو مرنے والے نے حاصل کیا تھا۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْراًوَّ نَذِیْراًوَّ دَاعِیاً اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً.................اَمَّابَعْدُ.........

کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ (صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ)

موت کا جام

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

بزرگان محترم!

دنیا میں موت و حیات کا سلسلہ ابتدائے آفرینش عالم سے جاری ہے، ولادتیں بھی ہو رہی ہیں اور موتیں بھی آ رہی ہیں، ولادت کے بعد موت سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔ عالم میں ہر کلیہ میں کچھ نہ کچھ مستثنیات نکلتے ہیں۔ مگر جس کلیہ سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں وہ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ کا کلیہ ہے، جب انبیاء اور اولیاء اور دنیا کے بڑوں میں امراء و سلاطین مستثنیٰ نہیں رہے تو کون

ہے کہ موت کے پنجے سے اسے بچا ہوا باور کر لیا جائے۔ پس جو بھی پیدا ہوتا ہے اس کی آخری منزل موت ہی ہے ؎

ہر آں کہ زاد بنا چار بایدش نوشید
زجام دہر مئے کل مَنْ عَلَيْهَا فَانْ

یعنی جو بھی پیدا ہوا ہے اسے بہر حال موت کا جام نوش کرنا ہے۔

فِاِنَّ الْمَوْتَ غَايَةُ كُلِّ حَيٍّ

"موت ہی ہر زندہ کی آخری منزل ہے"۔

اسی لئے ولادتوں کے ساتھ موت کا سلسلہ بھی دنیا میں قائم ہے اور رہے گا ؎

کسی کا کندہ نگینہ پر نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ' کسی کا مقام ہوتا ہے

فرق مراتب

لیکن ولادت و موت سب کی یکساں نہیں ہوتی بلکہ جیسے پیدا ہونے اور مرنے والے مختلف مراتب کے لوگ ہوتے ہیں ایسے ہی ان کی ولادتوں اور موتوں میں تفاوت اور فرق مراتب ہوتا ہے کس کی پیدائش صرف ماں باپ کے لئے خوش کن ہوتی ہے۔ کسی کی خاندان بھر کے لئے باعث مسرت ہوتی ہے۔ کسی کی ولادت پر پورا شہر خوشی کرتا ہے اور کسی کی پیدائش پر ملک بھر اور دنیا میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ ایسے ہی موت بھی برابر نہیں۔ کسی کے مرنے پر کوئی بھی رونے والا' اور میراث بانٹنے والا نہیں ہوتا۔ جیسے حدیث شریف میں ارشاد ہے ؎

قَلَّتْ تُرَاثُه' وَقَلَّتْ بَوَاكِيهِ.

"نہ اس کے رونے والے نہ میراث لینے والے"۔

کسی کی موت پر صرف اس کے ماں باپ یا قریبی عزیز غم کر لیتے ہیں۔ کسی کی موت صرف خاندان کے لئے غم ساتھ لاتی ہے' کسی کی موت سے شہر کا شہر سوگوار ہو جاتا ہے اور کسی کی موت پر شہر ہی نہیں ضلع اور صوبہ روتا ہے۔

خان بہادر مرحوم انہیں لوگوں میں سے تھے کہ جن کی ولادت بھی صرف ایک گھر کی خوشی نہ تھی بلکہ کئی خاندانوں اور ایک پورے علاقہ کی خوشی تھی۔

احسانات کا غم

اور آج جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کا غم بھی صرف ان کے گھر کا غم نہیں بلکہ خاندانوں پورے شہر والوں پورے ضلع والوں

بلکہ بعض حیثیات سے پورے صوبے کا غم ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی کسی کی ذات کو نہیں روتا' بلکہ اس کے اوصاف کو' اس کے احسانات کو اور اس کی خوبیوں کو روتا ہے۔ ٹھیک اس وقت جب کہ اچھے اوصاف کا انسان مرنے کے وقت ہنستا ہو اور خوش ہوتا ہوا اپنے اللہ سے ملتا ہے اس وقت دنیا روتی ہوتی ہے۔

کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو
ہمہ خنداں شوند تو گریاں
آں چناں زی کہ وقت مردن تو
ہمہ گریاں شوند تو خنداں

تجھے یاد بھی ہے کہ تیری پیدائش کے وقت تو تو رو رہا تھا اور سب خوشی سے ہنس رہے تھے۔ بس زندگی ایسے گزار کہ مرنے کے وقت تو تو خوشی سے ہنستا ہوا ہو' اور سب روتے ہوئے ہوں۔" تو یہ واقعہ ہے کہ خان بہادر مرحوم اسی شعر کے مصداق تھے کہ وہ تو انشاء اللہ اپنے نیک کردار کے سبب ہنستے ہوئے اپنے مالک سے جا ملے اور دنیا آج ان کے ماتم میں رو رہی ہے تو یہ رونا ان کی ذات کا نہیں بلکہ ان کے اوصاف اور خوبیوں کا ہے جو آج ہم سے چھن گئی ہیں۔

سلامتی فطرت

خان بہادر مرحوم کی جوانی اور پیری میرے سامنے گزری ہے۔ میر الڑکپن تھا اور وہ جوان تھے ان کی زندگی کا ایک عجیب اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن ہی میں ہو گئی تھی اور وہ لڑکپن میں بلا مربی کے رہ گئے تھے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ ایک نونہال جو خاندانوں کی آنکھ کا تارا ہو اور دولت سے گھر بھرپور ہو تمام وسائل زندگی اور مال و جاہ خاندانی طور پر ورثہ میں ملا ہو اور اوپر سے کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہ ہو تو ایسی حالت میں مال و دولت کی فراوانی کی جو بری لت بھی پڑ جائے وہ حیرت انگیز نہیں ہوتی۔ ہزاروں رئیس زادے اس طرح بگڑتے دیکھے گئے کہ سر پر بڑا اور مربی نہ رہا اور خاندانی دولت بلا محنت ہاتھ لگ گئی تو بدکاریوں اور برائیوں میں مبتلا ہو کر دولت بھی برباد کر دی' جائیداد بھی ضائع کر دی اور خاندانی وجاہت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ لیکن یہ خان بہادر کی ہستی تھی کہ گھر کی ریاست ہاتھ میں ہے سر پر کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں لیکن اپنی سلامتی فطرت سے وہ کسی بری لت کے شکار نہیں ہوئے' کسی عیاشی کسی تعیش، کسی فضول خرچی، کسی نمود و نمائش کے چکر میں نہیں پھنسے ان کی جائیداد نہ صرف یہ کہ محفوظ ہی رہی' بلکہ باغ و راغ کا اس میں بھی اضافہ ہوا۔

یہ بلاشبہ ان کے قلب کی سلامتی اور فطرت کی خوبی تھی کہ وہ خود بخود اسی راہ پر چلے جس پر نیک دل رئیس کو چلنا چاہئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خدا نے انہیں دولت کے ساتھ عزت کے خزانے بھی بخشے' وہ آنریری مجسٹریٹ بھی ہوئے' چیئرمین بھی ہوئے اور برسہا برس رہے۔ صوبائی کونسل کے

ممبر بھی ہوئے۔ اونچی سوسائٹی میں ان کا مقام بھی بنا اور شہر یا ضلع ہی کے نہیں صوبہ کے نمائندہ کی حیثیت سے وہ صوبہ بھر کے بڑوں میں شمار ہوئے، دوسرے لفظوں میں انہوں نے پوری صوبائی ملت کا اعتماد حاصل کر لیا جو ہر ایک کو میسر نہیں آتا۔

ضمیر کی سچائی

ساتھ ہی اس سے بھی زیادہ حیرت ناک امر یہ ہے کہ وہ جس حالت میں قوم کے معتمد علیہ تھے اسی حالت میں گورنمنٹ کے بھی معتمد علیہ تھے۔ اعتماد کا آخری ڈپلومہ سرکاری خطاب ہے۔ سو وہ بھی گورنمنٹ کی جانب سے انہیں عطاء ہوا، اور پھر عجیب تر یہ ہے کہ قوم اور گورنمنٹ کا ان پر اعتماد بیک وقت اس وقت بھی بدستور قائم رہا جب کہ قوم اور حکومت میں کشمکش اور مقابلہ ٹھن گیا اور جو لوگ قوم میں معتمد تھے ان کا اینٹی گورنمنٹ ہونا لازمی تھا اور جو گورنمنٹ و قوم دونوں ہی کے معتمد علیہ رہے۔ کس طرح رہے؟ بعض لوگ دور خا اعتماد نفاق سے حاصل کرتے ہیں کہ جدھر جاتے ہیں ادھر ہی کی کہہ کر آتے ہیں۔ لیکن یہ اعتماد وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ اس نتیجہ میں انسان دونوں جانب سے دھتکار دیا جاتا ہے۔ خان بہادر نے ان دونوں متضاد جانبوں کا اعتماد اپنے ضمیر کی سچائی سے حاصل کیا۔ وہ گورنمنٹ اور قوم کے سامنے سچائی سے وہی بات کہتے تھے جو ان کے ضمیر کی آواز ہوتی تھی۔ بے غرض کہتے تھے، وہ کسی لالچ یا طمع سے کبھی بھی کسی کے سامنے نہیں آئے۔ وہ گورنمنٹ پر تو قوم کے اثرات کا دباؤ ڈال کر گورنمنٹ کو قوم کی بھلائی کے لئے ہموار کرتے تھے اور قوم کو سچائی کے ساتھ اس کی موافقت و مخالفت کی پرواہ کئے بغیر اپنے ضمیر کی بات پہنچا دیتے تھے جس میں ان کے نزدیک قوم کی بھلائی و بہبودی ہوتی تھی، ان کی یہ سب باتیں اس قدر سلجھی ہوئی اور با اصول ہوتی تھیں کہ انہیں ماننے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا تھا، اس لئے قوم اور حکومت دونوں ان پر اعتماد کرنے میں مجبور تھے۔

بہر حال انکے پیچھے جاہ و مال کی کوئی بری لت نہ تھی، جس سے ان کی دنیوی جاہ و عزت بڑھی، دولت نے ترقی کی اور اونچی سوسائٹی نے انہیں قبول کیا اور دنیاوی حیثیت سے وہ کبھی کسی تنزل سے دو چار نہیں ہوئے۔

دینی مقبولیت

ہاں! جوانی میں اگر ان کے پیچھے کوئی دولت لگی تو وہ بزرگان دین کی طرف رجوع ان کی مجلسوں میں بیٹھنا ان کی عادت بنی۔ یہ بھی ان کے ضمیر کی خوبی اور دل کی ہدایت کی بات تھی کہ لت بھی لگی تو وہ جو دنیا و آخرت میں مقبولیت کا ذریعہ بنے اور ان کی عزت کو چار چاند لگا دیئے۔ مجھے یاد ہے کہ ہر دوسرے تیسرے روز حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس نشینی۔ میرے والد صاحب قبلہ کی مجلس مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی مجالس میں بیٹھنا ان کی زندگی کا ایک جزو بن گیا تھا۔ اکثر و بیشتر والد مرحوم کے ساتھ ان کے گھر پر آنا مجالس میں بیٹھ کر کچھ حاصل کرنا ان کا امتیاز بن گیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ نیکوں میں بیٹھ کر آدمی نیک اور بدوں میں بیٹھ کر بد ہوتا ہے۔ خان بہادر جیسے سلیم الطبع انسان کو دل کی سلامتی کے ساتھ جب مجلسیں بھی اہل خیر

کی ملیں تو ان کی طبعی نیکی اور زیادہ دوبالا ہو گئی۔

ماہ رمضان میں مجھے یاد ہے کہ کئی کئی بار میرا قرآن شریف سننے مسجد دار العلوم میں آتے اور تراویح کے بعد ان بزرگوں کی مجلس میں بیٹھ کر طویل صحبت حاصل کرتے تھے جس سے دنیوی مقبولیت کے ساتھ انہیں دینی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

اعتماد اکابر

اور وہ جس طرح گورنمنٹ اور قوم میں معتمد علیہ تھے اس طرح دینی طبقہ اور جماعت علماء میں بھی معتمد علیہ بن گئے' ان کی زندگی کا عنوان ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ جس طبقہ میں بھی پہنچ جاتے تھے اس کا اعتماد لے کر واپس ہوتے تھے۔ جو ان کی طبیعت کے بے لوث اور صاف ہونے کی دلیل ہے۔ گورنمنٹ کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ خطاب یافتہ ہوئے۔ قوم کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ کونسل کے نمائندہ (ممبر) منتخب ہوئے' شہر کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ دیو بند کے چیئرمین ہوئے تو علماء کا اعتماد حاصل کر کے وہ دار العلوم دیو بند کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۳۵۲ء سے ۱۳۷۳ء تک اکیس برس انہوں نے رکنیت کی یہ خدمات اس خوبی اور دیانتداری سے انجام دیں کہ ان کے دوست اور مخالف سب ان سے خوش رہے' جس کی بڑی وجہ وہی تھی کہ وہ ہر اقدام اپنے ضمیر کی سچائی سے کرتے تھے۔ کسی رورعایت سے ان کے یہاں کام کی انجام دہی نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ ان کے بڑے اور چھوٹے سب ان کے مداح تھے۔ کوئی بھی ان سے نالاں اور گریاں بریاں نہ تھا کیوں کہ نہ وہ خود غرضی سے کام کرتے تھے نہ انتقامی جذبات سے کام لیتے تھے' بلکہ اصول پسندی سے ان کی رائے اور عمل کا کام انجام پاتا تھا۔ اس دینی سلسلہ کی رکنیت اور علماء کی صحبت ومعیت کا انجام دنیوی بہبود وفلاح کے ساتھ اخروی کامیابی کی صورت میں نمایاں ہوا' نماز روزہ کی پابندی' زکوٰۃ کا حساب کتاب' حج کی توفیق' مسلمانوں کی اخلاقی اور مالی امداد کے کام ان سے بے تکلف سرزد ہوتے تھے۔ مدینہ منورہ کے غرباء کی امداد گھر بیٹھ کر کرتے تھے۔ دو مرتبہ ان کے عطیات کا امین میں خود بنا' اور ان کے منشاء کے مطابق ان کی رقم مدینہ منورہ میں تقسیم کی گئی۔ پس مرحوم ان خوش نصیب افراد میں سے تھے جنہیں دنیا کے ساتھ دین اور جائز عیش کے ساتھ طاعات وعبادت کی توفیق بھی بخشی گئی۔

انفرادی اعتماد

آج اگر یہ شہر اور ضلع خان بہادر کو رورہا تھا تو وہ ان کی ذات کو نہیں بلکہ ان کے اوصاف کو رورہا ہے' جن کی بدولت وہ ہر طبقہ میں مقبول' ہر طبقہ کے معتمد علیہ تھے اس پر مزید خوبی ان کی بے تکلفی تھی بڑے ہی نہیں چھوٹوں کے ساتھ بھی ایسے اخلاق سے پیش آتے تھے کہ چھوٹا انہیں بڑا سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کیونکہ وہ خود اپنی نگاہ میں اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ برادری میں برابر کے بھائی کی طرح' بزرگوں میں نیک سرشت خوردوں کی طرح اور خوردوں میں مشفق بزرگوں کی طرح پیش آتے تھے جس سے انفرادی اعتماد بھی ان کا افراد میں قائم تھا۔

بہر حال یہی وہ اوصاف اور خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے شہر اور ضلع سوگوار ہے اور غم میں

گریاں ہے۔ چنانچہ آج کی مجلس میں بھی وہی مجلس غم اور تعزیت کی مجلس ہے جو شہر کی طرف سے منعقد ہوئی ہے۔ اس مجلس کا موضوع یہی ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کے غم کو جو چھپایا نہیں جاسکتا اور دل میں اس کی سمائی مشکل نظر آرہی ہے کھول دیں۔ اور آنکھیں اگر روتے روتے تھک گئی ہیں تو دل کو ہی گریہ وبکا سے ہلکا کرلیں۔

لیکن میں اپنے بزرگوں کی خدمت میں ادب سے عرض کروں گا کہ رونا اور غم کرنا نہ کوئی فائدہ مندبات ہے نہ اس سے دنیاو آخرت کا کوئی نفع متعلق ہے اگر رونے اور غم کرنے سے جانے والا واپس ہو جایا کرتا تو سو برس تک بھی رونا بند نہ کیا کرتے۔ بقول عرفی کے ؎

عرفی گر بر گریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

"اے عرفی اگر رونے سے مرنے والا مل جایا کرتا تو سو سال بھی ہم رونے سے نہ تھکتے اور روتے رہتے"۔

رسمی نوحہ وبکاء

لیکن رونا اور غم کرنا کسی کو واپس نہیں لاسکتا اسی لئے شریعت کے نزدیک غم لے کر بیٹھنا اور بہ تکلف اسے نمایاں کرنا جاہلیت کی رسم قرار دیا گیا ہے زمانہ جاہلیت کا دستور تھا کہ بڑے لوگ مرتے وقت وصیت کر جایا کرتے تھے کہ ہمیں برس دن رویا جائے تاکہ دنیا پر واضح ہو کہ کوئی بڑا شخص دنیا سے اٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ برس دو برس کون ہے کہ دل سے روئے کیونکہ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں رونے والیاں کرایہ پر رکھی جاتی تھیں اور انہیں اجرت دے دے کر رلایا جاتا تھا' جب کوئی تعزیت اور پرسہ کے لئے آتا تو وہ جلدی سے حلقہ باندھ کر بیٹھتیں اور آوازیں ملا کر نوحہ وبکاء کرنا شروع کر دیتیں۔ موثر اشعار اور غم افزا کلمات سے دلوں کو پگھلاتیں اور لوگ آنسو پونچھ کر یہ کہتے ہوئے چلے جاتے کہ حقیقتاً ایک بڑا آدمی دنیا سے اٹھ گیا جس کا یہ سوگ کیا جارہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس رسمی رونے میں نہ رونے والیوں کا دل شریک ہوتا نہ رونا دیکھنے والوں کا۔ دونوں سازی سے روتے تھے برادری یا شہر کو دکھلانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے۔

میت کی راحت رسانی

اس لئے ہماری مجلس اور ہماری انفرادی نشست کا موضوع غم وماتم نہ ہونا چاہئے کہ یہ رسم جاہلیت ہے۔ بلکہ موضوع یہ ہونا چاہئے کہ ہم سے تو میت کو نفع پہنچے اور میت سے ہمیں نفع پہنچے۔

شریعت نے ہم سے میت کو نفع پہنچنے کی صورت تو ایصال ثواب بتلائی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ ؎

"قبر کے اندھیرے گھرانے میں میت اپنے گھر والوں سے آس باندھتا ہے کہ شاید مجھے کوئی یاد کرے اور شاید مجھے کوئی ثواب پہنچادے"۔

حدیث شریف میں ہے کہ

"قبر میں میت کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی بچہ دریا میں منجدھار کے ہچکولے کھارہا ہو' اور اسے تنکا بھی ہاتھ لگ جائے تو وہ اسے بھی اپنا سہارا سمجھتا ہے' ٹھیک اسی طرح میت قبر میں راحت و نجات کی خاطر اپنے وارثوں اور دوستوں سے آس لگائے رہتا ہے کہ کاش مجھے کوئی یاد کرے اور ثواب پہنچائے جو میرے لئے تنکے کا سہارا ہو جائے"۔

سو خان بہادر کی خیر خواہی یا ان کے حقوق کی ادائیگی جو ہم سب کے ذمہ ہے یہ نہیں ہے کہ اس نیکی ہستی کے غم میں ہم چار آنسو بہالیں اور رومال سے آنکھوں کو پونچھ کر اپنے گھر روانہ ہو جائیں بلکہ یہ ہے کہ ان کی راحت رسانی کا سامان بہم پہنچائیں اور وہ ایصال ثواب ہے۔

ایصال ثواب کی آسانی

کوئی بڑی بات نہیں ہے اگر ہر شخص روزانہ یا دوسرے تیسرے روز قل ھو اللہ شریف تین بار پڑھ کر مرحوم کو ثواب اور دعا میں یاد کر لیا کرے۔ قل ھو اللہ کو تین دفعہ پڑھنے کا ثواب حدیث شریف میں ہے کہ

"ایک پورے قرآن کے ثواب کے برابر ہے"۔

اللہ نے کس قدر آسانی فرمادی کہ دو منٹ میں تین دفعہ قل ھو اللہ پڑھو اور ثواب حاصل کرو جو دس بارہ گھنٹے کی محنت سے پورا قرآن شریف پڑھ کر حاصل ہوتا ہے اس لئے چند آنسو بہالینا یا چند کلمات تعزیت زبان سے ادا کر دینا مرحوم کی خیر خواہی نہیں بلکہ ایصال ثواب کرنا حقیقی خیر خواہی ہے خواہ جان سے جیسے تلاوت نماز اور دوسری عبادات کا ثواب پہنچانا یا مال سے جیسے غرباء و مساکین کو بہ نیت ایصال ثواب کھانا یا کپڑا پہنچانا وغیرہ۔

محاسن مرحوم

پس ہماری مجلس یا انفرادی نشست کا ایک موضوع تو بحکم شریعت یہ ہونا چاہئے کہ ہم میت کو نفع پہنچائیں اور دوسرا موضوع یہ ہے کہ میت سے ہم خود نفع حاصل کریں اس کی صورت شریعت نے یہ بتلائی ہے کہ

اذکرو محاسن موتاکم

"اپنی میت کی خوبیاں بیان کیا کرو"۔

تاکہ ان خوبیوں کے تذکرہ سے ایک طرف تو میت کی طرف سے قلوب میں محبت پیدا ہو اور محبت کے داعیہ سے لوگ اسے ثواب و دعا سے یاد رکھیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی خوبیوں کے تذکرہ سے خود ہم میں ان خوبیوں کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور ہم بھی اس کے نقش قدم پر چل کر وہی مقام حاصل کریں جو مرنے والے نے حاصل کیا تھا۔

پس! ایصال ثواب سے میت کو ہم سے کچھ ملتا ہے اور میت کے عمدہ تذکرہ سے ہمیں میت سے کچھ ملتا ہے۔ اس لئے ہماری اس مجلس کا موضوع رونا اور اظہار غم کرنا نہیں ہونا چاہئے بلکہ خان

بہادر مرحوم کو نفع پہنچانا اور ان سے خود نفع حاصل کرنا ہونا چاہئے۔

مرحوم کی یادگار

خان بہادر مرحوم کی عمدہ ترین یادگار "یہ ہائی اسکول ہے جو انکی تنہا کوششوں سے قائم ہوا۔ اور اس وقت قائم ہوا جب کہ سب اس کے قیام سے مایوس تھے لیکن ان کی ہمت مردانہ تھی کہ مایوسیوں کے ہجوم میں پامردی کے ساتھ وہ کھڑے ہوئے اور اسکول قائم کر کے چھوڑا، جس کا نفع آج قصبہ کے ہندو، مسلمان دونوں کو پہنچ رہا ہے۔ درمیانی مدت میں ایسا وقت بھی آیا کہ اسکول باقی رہنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، مرحوم نے مجھ سے بھی اس کا تذکرہ فرمایا اور یہ کہ لوگوں کو اس کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے۔ میں نے بھی ان کے بزرگانہ ارشاد کی تعمیل میں اسکی جدوجہد کی اور اس میں کامیابی ہوئی جس پر ہمیشہ ممدوح مسرت کا اظہار فرماتے تھے لیکن حقیقتاً یہ کام صرف ان کی ہمت مردانہ کا نتیجہ تھا کہ اسکول کو مایوسیوں کے ہجوم میں بھی چلاتے رہے۔ حتی کہ انہیں کتنے ہی ماہ تنخواہ میں اپنی ذات سے ہزاروں روپیہ خرچ کرنا پڑا۔ مگر اس کار خیر سے نہ ہٹے۔ علم کی بقاء کا راستہ پیدا کرنا خواہ وہ کسی بھی چیز کا علم ہو امر خیر ہے۔ جبکہ حسن نیت سے ہو اور صدقہ جاریہ ہے کیوں کہ عمل تو عامل کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے لیکن علم عالم کے ساتھ یا علم کا انتظام کرنے والے کے ساتھ ختم نہیں ہوتا بلکہ باقی رہتا ہے۔ یہ مادی دولت نہیں ہے کہ اسے جتنا خرچ کرو گھٹتی ہے بلکہ روحانی دولت ہے کہ جتنا خرچ کرو بڑھتی ہے۔

اس لئے ہم سب کا فرض ہے کہ ان کے اور محاسن کے ساتھ ان کے اس صدقہ جاریہ کو باقی رکھنے کی امکانی سعی کرتے رہیں، جس سے مرحوم کی روح خوش رہے گی اور اجر دائمی سے منتفع ہوتی رہے گی۔

بہر حال رونے اور غم والم کی اظہار کے بجائے ہمارا کام ایصال ثواب اور ذکر محاسن ہونا چاہئے کہ یہی ان کے دلوں میں ہمہ وقت زندہ رہنے کی سبیل ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خان بہادر مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مقامات عطا فرمائے اور جس طرح انہیں دنیا میں اس نے قبول فرمایا تھا اس طرح آخرت میں انہیں قبول فرمائے اور ان کے پسماندگان اور تمام وارثوں اور عزیزوں کو ان کے نقش قدم پر چلائے اور صبر و تسلی عطاء فرمائے۔ ہم سب ان کے دکھ درد کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جامع مذہبؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاس بَشِیْرًاوَّ نَذِیْرًاوَّدَاعِیاً اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً............ اَمَّابَعْدُ............

فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. اَلْیَومَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ)

جامع مذہب

آیت کے ذیل میں دین اسلام کو جامع بتلایا۔ یہود و نصاریٰ کی مختلف جزئیات کو پیش کرتے ہوئے یہ واضح فرمایا کہ دین اسلام پچھلے تمام آسمانی دینوں اور ملتوں کا جامع بنایا گیا ہے‘ اس دین میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی سختی موجود ہے وہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی نرمی اور درگزر بھی موجود ہے‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اگر یہ حکم تھا کہ تمہیں اگر کوئی ایک تھپڑ مارے تو تم بھی ایک تھپڑ مارو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اگر یہ حکم تھا کہ تمہارے گال پر اگر کوئی ایک طمانچہ لگائے تو تم دوسرا گال بھی پیش کر دو۔

دین اسلام میں نہ وہ سختی ہے اور نہ یہ نرمی ہے‘ بین بین کا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

جَزٰٓءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا

”برائی کا بدلہ برائی لیکن اتنا ہی“۔

اس کی وضاحت دوسری آیت میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ اگر تمہاری کوئی ایک آنکھ پھوڑے تو تم بھی اس کی ایک آنکھ پھوڑ دو تمہاری ناک پر اگر کوئی گھونسہ مارے تو تم بھی اس کی ناک پر ایک گھونسہ ماردو، تمہارے کوئی اگر دانت توڑ دے تو تم بھی اس کا ایک دانت توڑ دو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاف کر دیا جائے تو اس کی بھی اجازت ہے گویا بدلہ لینے کی بھی اجازت ہے اور معاف کر دینے کی بھی اجازت ہے۔ اس طرح اس دین میں شریعتِ موسوی بھی آ گئی ہے اور شریعتِ عیسوی بھی آ گئی۔ متعدد واقعات اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے اس مجز کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح اسلام سے پہلے مختلف ادیان اور مختلف شریعتیں جاری تھیں اور آپس میں اختلاف اور عداوتوں کی خلیج روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اسلام نے آ کر اختلاف اور عداوتوں کی خلیج کو پاٹا اتفاق و اتحاد پیدا کیا اور تمام اقوام عالم کو ایک دین پر جمع کر دیا۔

طبقاتی اِجتماعیت

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ہندوستان کے تمام مذہبی طبقات بلکہ اُمراء کو صوفیاء کو سلاطین کو وزراء کو غرض ملک میں پھیلے ہوئے تمام منتشر طبقات کو جمع کرنے کی کوشش کی، خطوط روانہ فرمائے پیغامات روانہ کیے اور ملت کے تمام طبقات کو ایک نقطہ پر جمع فرمایا۔

دارالعلوم کی شانِ اجتماعیت

یہ دارالعلوم دیوبند بھی اپنے مورث اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے طرز پر قائم کیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند سے پہلے ہندوستان میں اہلِ علم کے مختلف طبقے تھے۔ کوئی متکلم اور کوئی منطقی تھا اور کوئی اہل حدیث تھا کوئی اہل قرآن تھا کوئی فلسفی تھا۔ مگر دارالعلوم کے اکابر، اس کے بانیوں نے ایک ایسا نصاب جاری فرمایا جس سے ملک کے تمام طبقوں میں وحدت اور یکسانیت پیدا ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند نے سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں محدثین پیدا کئے ہزاروں مفسرین، قرآن اور متکلم پیدا کیے جنہوں نے دین اسلام کی حقانیت، اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت دنیا کے گوشے گوشے میں کی۔ دارالعلوم کا فاضل بیک وقت محدث بھی ہے مفسر بھی ہے، متکلم بھی ہے، مبلغ اور صوفی بھی ہے، حق تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند کو ایسی

جامعیت اور مرکزیت عطا فرمائی ہے کہ اس کے فضلاء دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور دینی خدمت کر رہے ہیں یہ وہی جامعیت اور مرکزیت ہے جس پر شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ملک کے تمام طبقات کو جمع فرمایا۔

وفاق المدارس دارالعلوم دیوبند نے اجلاس صد سالہ کے موقع پر متعدد اہم و مفید اور کار آمد تجاویز منظور کرائیں۔ ان تجاویز میں سے ایک اہم تجاویز میں سے ایک اہم تجویز وفاق المدارس کی بھی ہے اس تجویز کا مقصد بھی ہندوستان کے تمام مدارس اور مکاتب کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے اگر ہندوستان کے تمام مدارس ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ دارالعلوم دیوبند پہلے سے بنا بنایا مرکز موجود ہے تو اس میں نفع دونوں کا ہے۔ مدارس اور مکاتب کا بھی اور دارالعلوم دیوبند کا بھی ملک میں پھیلے ہوئے مدارس کی خدمات سے دارالعلوم باخبر رہے گا۔ مدارس کے فضلاء اور تعلیم یافتہ حضرات کی شہرت اور ان کی خدمات سامنے آئیں گی۔ مدارس اپنے مرکز دارالعلوم دیوبند کی خدمات، حالات اور کار گزاریوں سے واقف ہوں گے۔ تو یہ وفاق مدارس کی تجویز ایسی تجویز ہے۔ جس کے روبہ عمل آجانے کے بعد فضلاء کی تنظیم بھی قائم ہو جائے گی۔ تنظیم فضلاء نہ تنہا کوئی مقصد ہے نہ اس پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اصل وفاق المدارس اور تنظیم مدارس ہے۔ اگر ہندوستان کے تمام مدارس اور مکاتب منظم ہو کر اپنے مرکز کے ساتھ وابستہ ہو جائیں گے تو فضلاء کی تنظیم خود بخود قائم ہو جائے گی کیوں کہ ان مدارس اور مکاتب کے چلانے والے اس کے اساتذہ اور ذمہ دار اکثر و بیشتر فضلاء دارالعلوم ہی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

افادات علم وحکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور
حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز
کے علمی جوابات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ہ

حامداً و مصلّیاً

حسن نیت سے حرام، حلال نہیں بنتا

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر قوم نے اپنے قومی مفاد کے خیال سے کچھ فنڈ جمع کیا مثلاً لاکھ دولاکھ روپیہ اور پھر یہ سمجھ میں آیا کہ اس رقم کو بطورِ قرض تاجروں کو دیں اور چونکہ تاجر بہر صورت بینک سے سودی قرض لیتا ہے تو کیوں نہ ہم اس رقم کا سود وصول کریں تاکہ فنڈ قائم رہے اور ترقی کرتا ہے اور قوم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے تو قوم کی یہ ہمدردی اسلامی شریعت کے نزدیک جائز ہے یا نہیں؟

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ سود کا مسئلہ تو واضح اور کھلا ہوا مسئلہ ہے۔ اجتہادی یا روعاتی مسئلہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیت ہے:

اَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (القرآن)

"اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا"۔

سود کسی بھی نوعیت سے ہو وہ حرام ہی رہے گا اور قومی ہمدردی اگر حرام طریق سے ہو تو وہ مستقل وبال جان بنے گی دنیا میں بھی آخرت بھی میں، کسی عمل کے لئے محض نیت کی خوبی کافی نہیں جب تک کہ وہ عمل شریعت کے مطابق نہ ہو۔ اچھی نیت سے اگر کوئی گناہ کرے تو وہ نیکی نہیں بن جائے گا اور نہ ہی اس نیت کا کوئی اعتبار ہوگا

جب دو چیزیں تھیں بیع اور سود۔ ایک حلال قرار دیا اور ایک کو حرام۔ تو بجائے اس کے کہ اس پر سود لیں اور صریح حرام کے مرتکب ہوں، خود بھی گناہ میں مبتلا ہوں اور قوم کو بھی گناہ میں مبتلا

کریں۔ اس کو کسی تجارت میں کیوں نہ لگادیں، خواہ ایک شخص وکیل بن جائے۔ سب کی طرف سے نفع ونقصان کا شریک رہے اور اس منافع سے وہ قوم کی خدمت کرے کہ وہ سرمایہ بھی باقی رہ سکتا ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ محض سرمایہ کو رکھنے کے لئے ایک حرام شکل اختیار کی جائے کہ وہ راس المال کو بھی حرام اور ناجائز کردے تو اس سے قوم کو فائدہ نہیں بلکہ ضرر پہنچے گا یہی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ کھلے طور پر کیسے خلاف ورزی کریں گے محض اس نیت سے کہ قومی ہمدردی ہو۔۔۔ آج یورپ والے جو سود لے رہے ہیں اور دے رہے ہیں ان میں بھی تو قومی ہمدردی کا جذبہ ہے کہ قوم کو فائدہ پہنچے لیکن وہ تو شریعت کے مکلف ہی نہیں مگر جو لوگ شریعت کے مکلف ہیں اور اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں او یہ بھی جانتے ہیں کہ سود لینے دینے میں ضرر بھی ہے۔

پھر جانتے بوجھتے کسی کام کو کرنا اور اس پر اعتماد بھی کرلینا صرف یہ سمجھ کر کہ ہماری تو نیت نیک ہے نہایت ہی غلط اور غیر مناسب بات ہے اور قوم کے ساتھ ہمدردی کی بجائے درپردہ دشمنی ہے، دنیاوی بھی اور اخروی بھی۔

عملِ مشروع میں ہی حسن نیت کا اعتبار ہے

لہٰذا کسی کام کے لئے محض نیت کی خوبی کافی نہیں۔ اب نیک نیتی سے کوئی یوں سمجھ لے کہ نماز تو اچھی چیز ہے اس کی چھ رکعت ہی پڑھ لوں نفع ہی نفع ہو گا تو چار بھی نہ ہوں گی وہ بھی منہ پر ماردی جائیں گی تو جہاں اسلام میں نیت کی خوبی ضروری ہے۔ حسن عمل یا عمل صالح اسی کا نام ہے کہ جس میں اخلاص اور حسن نیت بھی ہو اور ساتھ میں عمل کی صورت بھی وہی جو شریعت سے ثابت ہو۔

اسی لئے سورہ ملک میں فرمایا گیا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً (القرآن)

برکت والی ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ملک ہے دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی اور کائناتوں کا بھی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہی ذات ہے کہ جس نے موت اور حیات پیدا کی۔ کسی کو وجود دیا کسی سے وجود چھینا، کسی کو زندہ کیا کسی کو مردہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں ہے وجود اور عدم کی باگ دوڑ۔

عالم میں یہ تغیرات، موت، حیات، نعمت، سلب نعمت کیوں رکھے؟ وجہ بیان فرمائی:

لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً

تا کہ اللہ تمہیں جانچے کہ تم اچھا عمل کرتے ہو یا برا۔

جب تم اس کے ملک میں ہو' اس کے اقتدار کے نیچے ہو' اس کی قدرت کے تحت ہو تو تم اس کے حکم کی اتباع کرو گے یا نہیں اسی کو جانچنے کے لئے عالم میں یہ تغیرات رکھے ہیں تا کہ تمہارے ایمان کی جانچ ہو اور دیکھیں کہ تم میں احسن عملاً کون ہے۔

عمل صالح کی دو بنیادیں

احسن عملاً کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ نے کی ہے کہ اَیْ اَخْلَصُہٗ وَاَثْبَتُہٗ حسن عمل اور علم صالح وہ ہے کہ خالص ہو' رضاء خداوندی کے لئے اخلاص کے ساتھ ہو مخلوق کی رضاء یا اپنی رضاء نفس شامل نہ ہو۔

اگر رضاء خلق کا شائبہ تک بھی شامل ہے عمل کے اندر تو وہ داخل شرک قرار دیا گیا ہے اور ظاہر کے اعتبار سے ثابت یا لسند ہو اور بطریق صواب ہو یعنی اس نہج پر ہو کہ جس طرح شریعت نے بتلایا ہے' تو گویا عمل صالح کی دو بنیادیں ہو گئیں ایک اخلاص للہ کہ جو کلمہ بیان کر رہا ہے وہ ہے لاالٰہ الا اللہ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' وہی برحق ہے۔ اسی کا حکم ماننے قابل ہے۔ اور اسی کی رضا پر چلنے سے نجات حاصل ہو سکتی ہے اور اسی کلمہ کے دوسرے جز محمد رسول اللہ سے نکلتا ہے۔ اتباع سنت۔ اس لئے کہ بطریق صواب وہی ہے۔ جس کو سرکار دو عالمؐ نے کر کے دکھایا ہے یا جو آپؐ کے متبعین حضراتِ صحابہؓ کا تعامل ہے' اس کا حاصل یہ نکلا کہ جس عمل میں لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ شامل ہو گا وہی عملِ صالح ہو گا۔

عمل صالح اسے کہتے ہیں کہ میں اور آپ سمجھ رہے ہیں کہ فلاں نے بڑے اچھے کام کئے رفاہِ عام کا کام کیا بہت ہی عمدہ کام کیا ہمارے اور آپ کے سمجھنے سے اور محض تخیل سے وہ عملِ صالح نہیں بنے گا اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے بلکہ عملِ صالح بنتا ہے دو بنیاد سے اخلاص للہ اور دوسری بنیاد ہے اتباع سنت۔ جس کام میں اخلاص ہے اور اتباع سنت بھی ہے وہ عملِ صالح ہو گا۔

شرک وبدعت کی بُنیاد

اب اگر اخلاص میں کمی آئی یعنی کسی کام میں رضا خداوندی کے ساتھ کچھ مخلوق کی رضا بھی شامل ہو گئی۔ یا نفس کی رضا مخلوط ہو گئی تو وہ عمل خالص اللہ کے لئے نہ رہا اس لئے جس درجہ اخلاص میں غیر اللہ کی رضا شامل ہو گی شرک کی بنیاد پڑتی چلی جاوے گی اور شرک فی العمل ہو جائے گا۔

محمد رسول اللہ کے معنی ہیں اتباع ہو رسالت خداوندی کا۔ اب جس درجہ اتباع میں کمی آتی جائے گی اسی درجہ ابتداع اور بدعت کی بنیاد پڑتی جائے گی جو شرک تک پہنچائے گی تو دین کی اصلاح کی دو بنیادیں ہیں اخلاص اور اتباع سنت اور دین کے فساد کی دو بنیادیں ہیں شرک اور بدعت۔ لاالٰہ الا اللہ میں کمی آنے سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے اور محمد رسول اللہ میں کمی آنے سے بدعت کی ابتدا

ہوتی ہے۔

اب ہر آدمی کا کام ہے کہ اپنے ہر کام میں غور کرے کہ جو کام میں کر رہا ہوں اس میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ شامل ہے یا نہیں جس پر اس کا ایمان ہے اگر ہے تو عملِ صالح ہے۔ نہیں تو پھر وہ عملِ طالح۔ تو ایک تو ہے صریح چیز جس کو شریعت نے صراحۃً ممنوع قرار دیا ہے اس کو اگر جائز کرنے کی فکر میں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اخلاص تو پہلے ہی کھو دیا وہ کام رضا حق کے لئے نہ رہا اور ساتھ میں اتباع کو بھی خیر باد کہہ دیا کہ وہ ریاست کی پیروی نہ رہی تو اس عمل میں برکت کہاں سے ہو گی۔

اس سے جتنے بھی آثار پیدا ہوں گے وہ سب نجس اور ناپاک ہوں گے اس لئے کہ معدہ ہی در حقیقت حوض بدن ہے اس کا پانی گندہ ہوا تو ایک ایک عضو میں گندگی پہنچے گی۔ معدہ میں پاک چیز بھری ہوتی ہے تو ہر عضو میں پاک چیز پہنچے گی۔ ایمانی خوشبو پیدا ہو گی۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب مرنے کا وقت قریب ہوتا ہے ملائکہ نزع روح کرتے ہیں تو ملائکہ ہاتھوں کو، پیروں کو، منہ کو ٹانگوں کو سونگھتے ہیں کہ ان میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے۔ وہ جو قلب کا ایمان ہے جب وہ پھیلتا ہے تو ہاتھ پیر پر آتا ہے، عمل کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ تو ملائکہ اس سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پیر میں ایمان کی کس قدر خوشبو ہے۔

ابتدا سے لے کر انتہا تک اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف دو ہی چیزوں کی جانچ ہے وہ یہ کہ ہر عمل میں ایمان کا دخل ہو اور ہر عمل میں اتباع کا دخل ہو ایمان میں کمی آئی۔ شرک پیدا ہوا۔ اتباع میں کمی آئی تو بدعت پیدا ہوئی۔ اور یہ دونوں چیزیں دین کے فساد کی ہیں تو آدمی قومی ہمدردی کرے اور دین کو پہلے ہی خیر باد کہہ دے۔ یہ ہمدردی کیا ہوئی یہ تو نہ اپنی ہمدردی رہی نہ قوم کی ہمدردی رہی۔

قوم کے اخلاق کا تحفظ

محض قومی ہمدردی کے نام پر ہم قوم کو ناپاک غذائیں پہنچائیں اور ساری قوم کے اخلاق کو گندہ بنا کمینہ اخلاق قوم کے اندر پیدا کرنا یہ کون سی ہمدردی ہے، لہٰذا یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ لاکھ دو لاکھ روپیہ جمع محض اس لئے کہ ہماری قوم کی خدمت ہو مگر اس جمع کے اندر دین بھی تو شامل ہونا چاہئے کہ تاکہ قوم کے اندر ناپاک اخلاق پیدا نہ ہوں اور قوم سے ناپاک افعال نہ سرزد ہوں۔

اگر اس کی غذا لقمہ صحیحہ ہے تو اخلاق صحیح ہیں، لقمہ ناپاک ہے تو اخلاق بھی ناپاک ہیں اس لئے ہم نے اکابر کو یہ دیکھا ہے کہ بیعت کرتے وقت وہ پہلے پوچھتے تھے، کہ تمہارے پاس موروثی زمین تو نہیں ہے کچھ سود وغیرہ تو نہیں ہے جس کو تم کھاتے ہو، پہلے اس سے توبہ کرو، جب بیعت کریں گے اس لئے کہ جب غذا ہی تمہاری مشتبہ ہو گی تو ذکر اللہ تمہارے اندر کیا اثر کرے گا اگر اللہ کا نام لو گے تو اس کی تاثیر واقع نہیں ہو گی۔ اللہ کا نام جیسا پاک ہے وہ پاک ہی ظرف چاہتا ہے ناپاک ظرف کے اندر

پاک چیز نہیں بھر جاتی۔ وہ بھی ناپاک بنجائے گی تو غذا پر اور اکل حلال پر دار و مدار ہے اخلاق حسنہ کا۔

ظلمتِ اخلاق

اسلام نے سب سے زیادہ زور اکل حلال پر دیا ہے۔ اس لئے جتنی چیزیں ہیں کہ جس سے لقمہ میں کوئی حرمت پیدا ہو۔ کوئی ناجائز شکل پیدا ہو۔ ان سب چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دے دیا۔ سود کو حرام کر دیا۔ احتکار کو حرام قرار دے دیا۔ احتکار کے معنی ہیں گرانی کی امید پر مال کو روک رکھنا احتکار کی صورت میں مخلوق کو ستانا ہے اور مخلوق کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ ضرورت ہوتے ہوئے مال کو اپنے نفع کے لئے روک کر رکھنا ایسی تمام چیزیں حرام قطعی ہیں اور کچھ "مکروہی" ہیں۔ مگر ایسی تمام چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے کہ جن سے مال میں کسی قسم کا اشتباہ پیدا ہو۔ کوئی حرمت پیدا ہو یا کوئی کراہت پیدا ہو۔

مقصد اس کا یہ ہے کہ مسلم پیدا ہوا ہے دنیا میں اپنی آخرت بنانے کے لئے دنیا اس کے لئے وسیلہ ہے وسیلہ اس کا اگر گندہ بنا تو مقصد بھی گندگی آجائے گی وسیلہ اگر پاک ہے تو مقصد بھی پاک ہوگا۔ اسی لئے مقصودِ اصلی آخرت ہے۔ گو اس کے لئے دنیا وسیلہ ہے اس کے قواعد بنا دیئے ہیں کہ جائز طریق پر کمائیں۔ جائز طریق پر خرچ کریں۔ ناجائز اور حرام مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے بچیں، نہ بچنے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ برکت نہیں ہوگی بلکہ برکت نہ ہونے کے ساتھ ساتھ ظلمت بھی ہوگی، اور اس کے آثار ناپاک ظاہر ہوں گے۔ عمل میں بھی اور اخلاق میں بھی۔

قومی خدمت جائز ذرائع سے ہونی چاہئے

اگر ہم قومی خدمت کریں اور ہم اس کے اندر اشتباہ پیدا کریں یا کم از کم مکروہ چیزیں داخل کر دیں یا صریح حرام چیزیں داخل کر دیں تو اس سے برکت کیا ہوگی بلکہ خود بھی مبتلا ہوں گے غلاظت میں اور قوم کے قلب میں بھی غلاظت بھرنے والے ہوں گے ان کے دل میں بھی خیر و برکت پیدا نہیں ہوگی۔ اس لئے یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ سرمایہ جمع کیا تاکہ قوم کو فائدہ پہنچے۔

سرمایہ کے تحفظ کی صورت بجائے حرام کے، یہ شکل کیوں نہیں اختیار کر لیتے مضاربت کی صورت کرلیں۔ دو چار افراد اپنی تجارت میں لگا دیں اور حسب رقم اس کا منافع دیتے رہیں۔ رقم بھی محفوظ رہے گی اور منافع بھی چلتا رہے گا اور ترقی بھی ہوتی رہے گی۔۔۔ آخر اس کے کیا معنی ہیں کہ مسلمان نفع کمائے تو اس کی طبیعت حرام اور مکروہات کی طرف کیوں جاتی ہے جبکہ وہ اللہ اور رسولؐ کو مانتا ہے۔ اس کی طبیعت اور فطرت کا تو تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ مشتبہ چیزوں سے بچے اور جائز اور حلال چیزوں کی طرف چلے تاکہ اپنا بھی نفع ہو اور دوسروں کا بھی نفع ہو تو بھید یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات کیا ہے کہ صاحب! سود سے کریں گے قوم کی خدمت کوئی فرعی چیز ہو یا کوئی اجتہادی چیز ہو تو اس میں کچھ گنجائش نکالیں بھی۔ ایک صریح اور قطعی حرام چیز اور آدمی اس سے فائدہ سوچے یہ کسی طرح

مناسب نہیں۔

حرام میں شفا نہیں

بیماری اور دواؤں کے سلسلے میں حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے:

ان اللہ لم یجعل شفاء کم فیما حرّم علیکم

اللہ نے ان دواؤں میں تمہارے لئے شفا نہیں رکھی جو دوائیں حرام ہیں۔ شراب ہے، قمار کی چیزیں ہیں، جوا ہے، ان میں شفا نہیں ہے۔ اگر ظاہری طور پر شفا ہوئی بھی تو روح اتنی بیمار ہو گی کہ بدن پھر آخر غلیظ اور گندہ ہو گا۔ پھر بیمار پڑے گا جب مادی امراض کی شفا بھی حرام میں نہیں تو روحانی امراض کی شفا کیسے ہو جائے گی۔ حرام کے اندر، اور وہ بھی قطعی حرام، اس لئے یہ سوال ہی آنا نہیں چاہئے۔ نیت نیک ہے۔ جذبہ نیک ہے۔ پھر قومی خدمت کرے۔ تو کوئی بینک ایسا قائم کرے جو شرعی جواز کے تحت ہو۔ ذرا سا تغیر کر دو وہی نفع رہے گا۔ مگر جائز بن جائے گا۔

متبادل صورت

تو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ اس لاکھ ڈیڑھ لاکھ کو باقی رکھنے کی صورت کو ذرا سا تبدیل کر کے حد جواز میں لے لیا جائے تاکہ حرام سے بچا جائے۔

تو مسلمان کا تو کام ہی یہ ہے کہ معاملہ ہو۔ اطاعت ہو، عبادت ہو، اس میں حرام و مکروہ سے بچ کر حد جواز کی طرف آئے، یہی معنی اس کے اسلام کے ہیں ورنہ تو مسلم اور غیر مسلم میں فرق کیا رہ گیا۔ وہ بھی سود خور، تم بھی سود خور، وہ بھی حرام خور اور تم بھی حرام خور۔ تو ہم تمہیں حلال خور بھی نہیں بنانا چاہتے (بر سبیل لطیفہ فرمایا) اور حرام خور بھی نہیں بنانا چاہتے۔ آدمی اکل حلال پر رہے۔

تو میں عرض کرتا ہوں کہ نیت بھی نیک ہے، جذبہ بھی نیک اور قومی خدمت کا جذبہ مبارک، ذرا سا تغیر کر کے اس کو حد جواز میں لے لیں۔ کیوں حرام کی طرف جارہے ہیں کہ قوم کی روح کو بھی گندہ کریں اور خود بھی گندے بنیں اور آخرت کا مواخذہ الگ کوئی بینک قائم کر دیں یا کوئی ایسی صورت قائم کر دیں کہ اپنی تجارت میں لگالیں یا کوئی کمپنی تجارت کی بنا دیں اور اس میں شرکاء ہوں نفع نقصان کے شریک رہیں اور پھر وہ رفاہِ عام کے لئے خرچ کریں تو اس سے راس المال بھی محفوظ رہے گا۔ اور بڑھتا بھی رہے گا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ کیوں ایسا کر رہے ہیں اور کس قسم کا وہ اسلام ہے جو اس پر آمادہ کر رہا ہے۔

مطالعہ کا علم لائقِ اعتماد نہیں

سوال: حضرت کہا جاتا ہے کہ اضعافاً مضاعفۃً ربوا ہے صرف ربوا حرام نہیں ہے اس پر حضرت نے دریافت کیا کہ یہ علماء کہتے ہیں۔ یا تاجر کہتے ہیں۔

سائل نے کہا کہ حضرت! یہ بات ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے کہی تھی۔ رسالوں میں لوگوں نے دیکھ لی ہے اس کا بہانہ بنایا جارہا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ رسالوں میں تو بہت سے مضامین آتے رہتے ہیں۔ اہل حق کے بھی اور اہل باطل کے بھی مُاوّلین کے بھی ومکذِبین کے بھی کہیں ان میں سے چھان بین کر کے حق اور صواب کو نکالنا یہ تو متدین ء علماء کا کام ہے اور تاجر جو متہم ہوں پیسہ کمانے کی خاطر ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں وہ تو ایسی چیزوں میں حیلہ تلاش کریں گے کہ ان کا نفع ہاتھ سے نہ جائے وہ جائز ناجائز کی پرواہ نہیں کرتے یا تو فتویٰ لیا جائے ایسے علماء سے جو متدین ہوں۔ ملک و قوم کو جن کے دین و دیانت پر اعتماد ہو اور ان کا علم مستند ہو۔ قوت مطالعہ سے جو علم آتا ہے اس میں امام اپنا نفس ہوتا ہے جو چاہے کرے اور نفس ہے ناتہذیب یافتہ اس لئے یہ معتبر نہیں کہ فلاں وکیل صاحب نے یہ کہہ دیا اور فلاں ڈاکٹر منسٹر صاحب نے یہ کہہ دیا۔

تو جس کے آخر میں "ٹر" ہو ہم اس کی بات نہیں مانیں گے (بر سبیلِ لطیفہ فرمایا) کوئی عالم متدین کہے یا فتویٰ دے یا مستند اداروں سے فتویٰ حاصل کیا جائے وہ اجازت دے دیں تو آپ بے تکلف کریں۔

فلاں نے کہہ دیا اس نے کہہ دیا یہ قابل اعتبار بات نہیں۔

مسلم و حربی کے درمیان سودی معاملہ

سوال: ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا حدیث لاربوابین المسلم والحربی کے تحت مسلم اور حربی کے درمیان سود کا معاملہ ہوسکتا ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ یہ حدیث لاربوابین المسلم والحربی کہاں ہے؟ اور اس حدیث کے ساتھ جو دوسری حدیث ہے وہ آپ کے سامنے نہیں۔ یہ ائمہ میں خود مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ قطعی بات یہ ہے کہ سود کسی حالت میں جائز نہیں اب جو کہتے ہیں لاربو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ربو جائز ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ربوا ہوتا ہی نہیں۔

مسلم اور کافر کے درمیان دار الحرب میں معاملہ اور ہوتا ہے اور پھر دار الحرب میں یہ بھی قید ہے کہ جنگ جاری ہو' حالت امن نہ ہو۔ اس وقت کا یہ مسئلہ ہے' ایک دار الحرب کا یہ معنی ہیں کہ شعائر اسلام وہاں بلند نہ ہوں۔ اس کے مسائل دوسرے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر دار الحرب مان لیا جائے تو دار الحرب کے دوسرے احکام سامنے نہیں؟

دار الحرب کی آڑ میں پیسہ بٹورنا

دار الحرب جب ہو تو ہجرت کرنی واجب ہے۔ ملک چھوڑ کر دار السلام کی طرف جائے۔ اس کی تو جرات نہیں کرتے کہ

یہ دار الحرب ہے اسے چھوڑ کر دار الامن اور دار الاسلام میں جانا چاہئے اس کا دھیان کسی کو نہیں آتا جب دھیان جائے تو پیسہ کی طرف جائے۔ تو دار الحرب کا حیلہ مل گیا ہے پیسہ بٹورنے کو۔ یہ حیلہ جوئی اور پیسہ بٹورنا ہے۔

اگر دار الحرب مانتے ہیں تو دوسرے مسائل پر کیوں نہیں عمل کرتے۔ مثلاً تجارت ضروری ہے وہ قوت پیدا کرنی ضروری ہے جس سے دار الحرب دار الاسلام بنے' کفار سے جنگ کرو اس کی تیاری کرو اور پیسہ اس میں لگاؤ جہاد کے لئے ہتھیار فراہم کرو' اس کے لئے کوئی صاحب تیار نہیں کوئی صاحب آمادہ نہیں۔

دار الحرب صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ سودی لین دین جائز ہو جائے اور اب تک کا سود جائز ہو جائے۔ اس وقت دار الحرب کے متعلق یہی ایک مسئلہ نہیں بلکہ ہجرت بھی ہے۔ جہاد بھی ہے' قومی معاملات بھی ہیں کتنے ہی مسائل دار الحرب کے متعلق ہیں تو پھر آخر پیسہ ہی کیوں سامنے آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ پیسے کا ہے اور دار الحرب حیلہ ہے اور جذبات دوسرے ہیں دار الحرب کی آڑ لے کر پیسہ بٹورنا چاہتے ہیں سودی لین دین کر کے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ محدث دہلوی کا فتوی ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے بارے میں ہے' پھر ان کا کیا جواب ہو گا اس پر حضرت نے فرمایا کہ ہمارے اکابر کا بھی فتوی ہے' تو کیا ان کا یہ بھی فتوی ہے کو سودی لین دین کرو' حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے فتویٰ دیا تھا اس زمانے میں جبکہ انگریز کا کامل تسلط تھا۔ لیکن کیا انہوں نے یہ بھی فتویٰ دیا تھا کہ سودی لین دین بھی شروع کر دو۔

سود پر دلچسپ مباحثہ

حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ' حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوریؒ لاہور تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت مولانا طفیل احمد صاحبؒ زندہ تھے اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے اور صحیح دین دار لوگوں میں سے تھے۔ بی اے بھی تھے' ان کی رائے یہ تھی کہ سودی لین دین جائز ہونا چاہئے۔ بغیر اس کے قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ بھی نکالا تھا "سود مند" نام کا۔ سود کے جواز کے جتنے حیلے مل سکتے تھے اس میں وہ سب موجود تھے اور باقاعدہ اس کی اشاعت وطباعت کی گئی۔

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ حضرت تھانویؒ سے کسی نے ان کا ذکر کیا کہ حضرت! وہ سود کے جواز کی فکر میں ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ لونڈے کی بات کا کیا اعتبار' ذکر کرنے والے نے کہا کہ حضرت! لونڈا ہے؟ وہ تو مولانا طفیل صاحب بوڑھے آدمی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جس کا نام

طفیل ہے (طفیل کے معنی ہیں چھوٹا سا بچہ) تو وہ لونڈا نہیں تو اور کیا ہے۔ تو خیر اس زمانے میں یہ قصہ چل رہا تھا اور یہ سب حضرات لاہور پہنچے۔ مولانا ظفر علی خان صاحب مرحوم (ایڈیٹر زمیندار) اور ڈاکٹر اقبال صاحب مرحوم اور دوسرے بڑے بڑے لوگ ملنے کی خاطر حاضر ہوئے۔ اتفاق سے مولانا ظفر علی خان صاحبؒ بھی کچھ اسی خیال کے تھے جو خیال مولانا طفیل احمد صاحبؒ کا تھا۔ انہوں نے سود کے جواز پر آدھ گھنٹہ بڑی مدلل تقریر کی اور اقتصادی دلائل وغیرہ سے ثابت کیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ حضرات ذرا کچھ مائل ہوں گے 'ڈھیلے پڑیں گے سود کے سلسلے میں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے جو جواب دیا وہ تو صرف دو لفظوں کا تھا ان کی بات تو ایسی تھی۔ فرمایا کہ:

"بھائی ہم پل نہیں بننا چاہتے۔ جسے جہنم میں جانا ہو خود جائے۔ ہماری گردن پر پیر رکھ نہ جائے"

یہ جواب سن کر سب چپ بیٹھے رہے علامہ اقبال بھی مولانا ظفر علی خان صاحب بھی کسی کو بولنے کی ہمت تک نہ ہوئی۔ پھر علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے آدھ گھنٹہ بڑی مفصل تقریر کی جس میں انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ سود ہر حالت میں حرام ہے کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

حکم شرعی کے تحت قومی ہمدردی ہونی چاہئے

یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا ہے اور قومی ہمدردی کے نام پر چل رہا ہے اور ایسے ہمدرد پیدا بھی ہوئے اور گزر بھی گئے اور دوسرے بھی پیدا ہوئے اور بھی گزر گئے۔ اور بھی پیدا ہوں گے اور وہ بھی گزر جائیں گے۔ مگر مسئلہ اپنی جگہ اٹل رہا ہے اور رہے گا۔ اس سلسلہ میں اگر خلجان ہے تو سیدھی سی بات ہے کہ جو معتمد اور مستند ادارے ہیں ان سے استفتاء کر لیں۔ اس میں منشاء ظاہر کر دیں کہ ہم نے اتنی رقم جمع کی ہے اور ہمارا منشاء یہ ہے کہ قوم کی خدمت اور رقم محفوظ رہے۔ اس کے منافع سے قوم کو فائدہ پہنچے۔ اس کی جائز صورتیں کیا ہو سکتی ہیں؟ ۔۔۔ ایک صورت یہ ہے کہ سود لیا جائے ایک صورت یہ ہے کہ تجارت میں لگا دیا جائے تو اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے، جو وہاں مستند فتویٰ آجائے اس پر عمل کیا جائے۔ اجر بھی ملے گا اور قوم کا فائدہ بھی ہو گا۔

مدارِ دین حُجت ہے

ایک صاحب نے پوچھا اگر جماعت کی اکثریت نے فیصلہ کر دیا کہ سود کا روپیہ لے لیا جائے۔ اس میں کچھ حرج نہیں تو اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ دین کا مدار مجاریٹی پر یا سروں کی گنتی پر نہیں۔ یہ کوئی کونسل یا اسمبلی

کے فیصلے تھوڑا ہی ہیں۔ اسمبلی میں سر گنے جاتے ہیں۔ سروں کی تعداد پر فیصلہ ہوتا ہے۔ سروں کے اندر کی چیز نہیں دیکھی جاتی یعنی عقل بھی ہے یا نہیں؟ اس کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا بلکہ تعداد کی زیادتی پر فیصلے ہوتے ہیں اور دین کا مدار حجت پر ہے۔ اس کے بارے میں تو علامہ اقبال صاحبؒ نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بترس از طرز جمہوری اسیرِ پیر دانا شو

کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسان نمی آید

کہ اس جمہوری طرز کو چھوڑ دو اور کسی پیر دانا کے قیدی بن جاؤ اگر دو سو گدھے جمع ہو جائیں تو انسانی فکر تھوڑا ہی ان کے دماغ سے نکلے گی۔ دو سو گدھے جمع ہو جائیں تو گدھے کا خیال ہی نکلے گا انسانی فکر کہاں سے نکلے گا۔ انسانیت ہو تو جب ہی انسانیت کی بات ذہن سے نکل سکتی ہے اور انسانیت وہاں مفقود ہے۔ تو بے وقوفی کا خیال ذہن سے بر آمد ہوگا۔

اسی کو قرآن کریم نے کہا ہے:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

زمین میں بے وقوفوں کی جو اکثریت ہے اس کا اتباع مت کرو وہ تم کو گمراہ کر رہے ہیں حق کے راستے سے ہٹا کر چھوڑیں گے۔ اس لئے اگر اکثریت فیصلہ کرے تو وہ دینی حجت کے مقابلے میں کوئی کارگر نہ ہو سکے گا۔ خواہ پوری دنیا کے انسان فیصلے کو مل کر پاس کر دیں اور دینی حجت اس کے خلاف ہو۔ لہٰذا سود حرام ہی رہے گا جیسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ کسی کے حلال یا جائز کرنے سے جائز نہیں ہوگا۔ پاخانے کو کتنا ہی دھولو۔ صاف کر لو وہ پاخانہ ہی رہے گا۔ پاک تو ہونے سے رہا۔ ناپاک ہی رہے گا اور اس پانی کو بھی ناپاک کر دے گا۔ جس پانی سے اس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تو ایسے ہی ایک حرام قطعی چیز خود تو حلال نہیں ہو گی۔ اوپر سے ان اذھان کو بھی اپنی رو میں بہا کر گندہ کر دے گی جن اذھان میں اس قسم کے تصورات ذہن میں نہ جمانے چاہئیں اور نہ ہی ایسے ارادے کرنے چاہئیں جب کوئی شئے حلال طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ تو اس کے حصول میں حرام طریقہ کو کیوں استعمال کریں۔ اللہ ہمیں محفوظ فرمائیں۔ اس قسم کے خیالات سے۔

مراتبِ عصمت

سوال: ایک صاحب نے سوال کیا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام باجماع امت معصوم ہیں ان کی عصمت میں کسی کو کلام نہیں اور قبل البلوغ بچے ازرو شرع معصوم ہیں۔ کیونکہ شریعت نے قبل البلوغ ان کے کسی فعل شنیع پر دارو گیر نہیں کی۔ لہٰذا ان کی عصمت بھی متفقہ علیہ ہے اور اولیاء اللہ بھی گناہ سے بہت بچتے ہیں اس اعتبار سے وہ بھی معصوم ہوئے تو اب حضور والا وضاحت فرمادیں کہ ان کی عصمت میں کچھ تفاوت ہے یا سب کی

عصمت ایک ہی قسم کی ہے؟

جواب: اس پر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ہاں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ بچوں کے اندر جو قوت ہے گناہ کی وہ اس وقت بیدار نہیں وہ ابھار جس کا تعلق فعل سے ہے وہ ابھری ہوئی نہیں ہے صرف مادہ موجود ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں مادہ بھی موجود ہے اور نفس بھی موجود ہے اور پھر نفس کا مقابلہ کر کے گناہ سے بچتے ہیں۔۔۔اور یہ کمال ہے۔

منشاءِ گناہ

فرمایا کہ انسان میں گناہ کا منشاء صرف دو چیزیں ہیں۔ حب جاہ اور حب باہ۔ اسی لئے بعض گناہ تو سرزد ہوتے ہیں جاہ طلبی سے مثلاً آدمی اقتدار چاہتا ہے اس کے لئے دوسروں کی توہین کرتا ہے۔ تذلیل کرتا ہے، زبردستی دباتا ہے۔ جس کو اس زمانہ کی اصطلاح میں استحصال عوام کہتے ہیں۔ یعنی عوام کو حاصل کر کے ایک شخص لیڈر بنتا ہے۔ پھر چاہے دوسروں کا خون ہو مگر اسے کرسی ملی۔ اسے عزت ملی۔ ہزاروں مخلوق برباد ہوتی ہے، کٹ جاتی ہے مگر اس کی لیڈری چمک جاتی ہے۔ اس کا منشاء ہوتا ہے حب جاہ اور حب اقتدار۔

ایک شخص اپنے کو بڑا جانتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ کسی کو سلام کرنے میں اپنے کو عار محسوس کرے گا، وہ چاہے گا کہ دوسرے مجھے سلام کریں۔ میں بڑا آدمی ہوں۔ یہ چھوٹے ہیں ان کا فرض ہے کہ یہ میرے آگے جھکیں۔

تو کبر کے معنی فقط بڑا بننے کے نہیں ہیں بلکہ تحقیر ناس یعنی لوگوں کو حقیر سمجھنا اور ذلیل جاننا اور اپنے کو ان سے بالاتر اور بڑا جاننا۔ یہ حقیقت ہے کبر کی۔ اور یہ جذبہ انسان میں موجود ہے، اس سے سینکڑوں گناہ متعلق ہیں۔ لڑائی جھگڑا، گالم گلوچ، مار پیٹ، قتل و غارت گری اور دنیا بھر کے سینکڑوں گناہ محض جاہ کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں، آدمی اپنے کو چھوٹا سمجھے تو اس قسم کے گناہ کا انسداد ہو سکتا ہے۔

ایک جذبہ انسان میں باہ کا ہے یعنی شہوانی قوت ہے، ہزاروں گناہ اس سے متعلق ہیں۔ یہ شہوتیں دو ہیں۔ ایک شہوت بطن کو پورا کرنے کے لئے کھانے پینے کی چیزیں جمع کرتا ہے اور شہوتِ فرج سے اس کو نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو ہزاروں گناہوں کا سرچشمہ یہ بھی ہے اس قسم کی شہوت کو پورا کرنے کے لئے جائز و ناجائز کی پرواہ نہ کرے گا۔ چوری ہو، رشوت ہو، سود ہو، بہرحال کسی طرح سے پیسہ جمع ہوں اس سے نفس کے اندر وہ قوت بڑھے جس سے شہوانی جذبات پورے ہو سکیں تو شہوت بطن کا حاصل ہے۔ مرغوباتِ نفس کو بٹورنا اور جمع کرنا۔ مال ہو، لباس ہو، سامان ہو۔ آدمی اسے حاصل کرے جس طرح سے بھی ہو سکے۔ جب اس وقت میں آدمی غرق ہو جاتا ہے اس کے حرام و حلال کی کوئی پرواہ نہیں رہتی۔ جیب کترے جیب کترتے ہیں۔ چوری

کرنے والے چوری کرتے ہیں۔ ڈکیتی ڈالنے والے ڈکیتی ڈالتے ہیں۔

ایک خاص قسم کی ڈکیتی ہے قانونی جس میں قانون کی آڑ لے کر مال بٹورا جاتا ہے۔ خواہ ٹیکس لگا کر خواہ ٹیکس لگا کر خواہ کسی کو ڈرا دھمکا کر جیسے پولیس والے کیا کرتے ہیں۔ کہ جرم ہو نہ ہو اسے ڈرایا دھمکایا اس نے کچھ رشوت دی اسے چھوڑ دیا۔ تو مال کی تحصیل میں آدمی حرام حلال کی پرواہ نہیں کرتا اور ہزاروں گناہ اس سے سرزد ہوتے ہیں ایک شہوست فرج یعنی شرم گاہ کی شہوت ہے۔ اس سے آدمی بدکاری، زناکاری، فحش، عریانی وغیرہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ جیسے شہوت بطن سے ہزاروں گناہ متعلق ہیں اس طرح شہوت فرج سے بھی ہزاروں گناہ متعلق ہیں۔

شیطان کا گناہ اور حضرت آدمؑ کی لغزش

عالم ازل میں ایک گناہ شیطان نے کیا اور ایک لغزش حضرت آدم سے سرزد ہوئی۔ شیطان کے گناہ کا منشاء تھا جاہ طلبی جب اس کو حکم دیا گیا کہ آدمی کو سجدہ کرو۔ تو اس نے کہا کہ میں آدم کے سامنے سجدہ کیوں کروں۔ یہ حکم عدولی کی۔ اور یہ ہی نہیں کہ صرف اتنا ہی کہہ کر بس کر دی ہو۔ بلکہ حق تعالیٰ کے حکم میں "مین میخ" بھی نکالی اور کہا کہ (معاذ اللہ) آپ کا یہ حکم خلاف فطرت ہے۔

خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ

آپ نے مجھے آگ سے بنایا اور آدم کو مٹی سے۔

اور آگ کی فطرت ہے سر اونچا کرنا اور مٹی کی خاصیت ہے پست ہونا۔ تو آپ نے سربلند ہونے والے کو پست کے سامنے ذلیل ہونے کا کیوں حکم دیا میں اونچا ہونے والا اس پست کے آگے کیسے جھک جاؤں؟ یہ گناہ حکم عدولی کا سرزد ہوا ابلیس لعین سے جس کا منشاء تھا جاہ طلبی، عزت، حسد، کبر، رعونت فرعونیت۔

اور ایک لغزش سرزد ہوئی حضرت آدم علیہ السلام سے۔ وہ حقیقتاً گناہ تو نہیں تھی بلکہ غلط فہمی تھی اور وہ یہ کہ شجرہ ممنوعہ کے کھانے سے روکا گیا تھا اور باقی جنت کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا حکم تھا اور اس درخت کے پاس جانا تک ممنوع تھا۔ کھانا تو درکنار، وہ درخت حضرت آدم نے کھا لیا لیکن حکم عدولی کا کوئی واہمہ بھی نہ تھا۔

تلبیس ابلیس

حضرت آدمؑ کے ذہن میں شیطان نے اولاً وسوسہ ڈالا اور تدبیر سمجھائی اور تلبیس کر کے تاویل سمجھائی کہ اس کی ممانعت ابدی نہیں ہے۔ بلکہ خاص وقت تک تھی وہ وقت نکل گیا۔ اب تمہارا معدہ اس نعمت کو ہضم کرنے کا متحمل ہے۔

اور اسکی خاصیت یہ ہے کہ جو اس درخت کو کھالے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہے گا۔ اس

نعمت سے نہیں نکل سکے گا۔

جھوٹ بھی بولا اور دھوکہ بھی دیا اور قسم بھی کھائی۔

وَقَاسَمَهُمَا اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ

قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تم کھالو گے تو ابدی طور پر جنت میں رہو گے اور اگر اس کو نہ کھایا تو ممکن ہے کہ جنت سے نکال دیئے جاؤ اور ان کو سمجھایا کہ ابدی حکم نہیں، بلکہ ایک وقت تک کے لئے تھا۔ اب جنت کی آب و ہوا آپ میں اتر کر گئی۔ پوری طرح رچ گئی ہے۔ اب آپ کھالیں گے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ابتدائی حالت میں کھانے میں مضرت تھی۔ حالانکہ آدم علیہ السلام کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ میں کیسے کھاؤں اور حکم خداوندی کے خلاف کیسے کروں؟

مگر ادھر تو اس کمبخت نے قسم کھائی اور آدم علیہ السلام پاک قلب ہیں۔ سچے قلب والے ہیں۔۔ نہ دھوکے سے واقف نہ فریب۔ اور اللہ کا نام لے کر ایک شخص فریب کرے یہ تو گویا ان کے وہم میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کوئی آدمی خدا کا نام لے کر بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہی بات ہو اور یہ واقعہ ہے کہ جو شخص سچا ہوتا ہے اسے دھوکہ ہی یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے؟۔ وہ تو جھوٹ کو بہت بری چیز سمجھتا ہے۔ اس لئے سچا آدمی دوسروں کو بھی سچا سمجھتا ہے۔ اس کا وہم بھی نہیں جاتا کہ یہ جھوٹ بول کر دھوکہ دے رہا ہے۔

اسی واسطے محدثین لکھتے ہیں۔ ان اکذب الحدیث حدیث الصالحین کہ صوفیاء کی حدیثیں جھوٹی ہوتی ہیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ (معاذ اللہ) وہ تو اتنے سچے ہوتے ہیں کہ اللہ کے رسول کا نام لے کر کوئی روایت کرے کہ اللہ کے رسولؐ نے یہ فرمایا ہے۔ تو ان کو وہم بھی نہیں گزرتا کہ کوئی آدمی اللہ اور رسول کا نام لے کر جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ وہ تو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ تو سچے آدمی بعض دفعہ دوسروں کے قسم کھانے کی وجہ سے اور یقین دلانے کی وجہ سے مبتلا ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ان کا قلب دھوکہ سے، فریب سے پاک ہے تو ابلیس نے فقط تاویل ہی نہیں سمجھائی بلکہ قسم بھی کھائی۔ ادھر آدم پاک قلب ہیں۔ دھوکہ سے فریب سے واقف نہیں۔ اور پھر جنت میں رہ کر کوئی قسم کھائے کہ اللہ کی قسم میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ تو حضرت آدم کا وہم بھی نہیں جھوٹ بولنے پر۔

ادھر تو ابلیس نے دھوکہ دیا۔ ادھر حضرات حوا نے کہا کہ اجی کھالو! ایک دانہ میں کیا حرج ہے۔ بیوی کی آدمی سنتا ہے اور جلدی سے اس کے خلاف بھی نہیں کرتا اتنا کہنے سننے سے حضرت آدمؑ کے قلب میں یہ بات بھی بیٹھ چکی تھی کہ ممکن ہے یہ ہی بات ہو کہ اس کی ممانعت ابدی نہ ہو۔ ابتداء

میں ہو اب جب کہ یہاں کی آب و ہوا اثر کر گئی تو ایک آدھ دانہ کھا لینے میں کیا حرج ہے۔ اوپر سے شیطان لعین نے قسمیں کھائیں اور بیوی نے دیا سہارا تو کھالیا درخت۔

خطاء اجتہادی اور عصمت

اس لئے حقیقتاً یہ گناہ نہیں تھا۔ گناہ کہتے ہیں جان بوجھ کر کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا۔ حضرت آدمؑ جان بوجھ کر خلاف ورزی کرنے سے پاک تھے۔ یہ سمجھے کہ ہو سکتا ہو کہ حکم خداوندی کے معنی اور مطلب یہی ہوں جو یہ شخص قسم کھا کر بیان کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ میں غلط فہمی میں ہوں۔ اس قسم کے فریب میں میں آکر مبتلا ہو کر وہ کھالیا۔ یہ لغزش ہوئی صورۃً اور حقیقتاً گناہ نہیں بلکہ غلط فہمی ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ خطا فکری ہے' یا خطاء اجتہادی ہے۔ یہ سر زد ہو گئی ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے خطاء اجتہادی ہو سکتی ہے۔ فرق صرف اتناء ہے کہ ان کو غلطی پر باقی نہیں رکھ جاتا ہے فوراً حق تعالیٰ مطلع کر دیتے ہیں۔ دوسرا کوئی مجتہد خطاء اجتہادی کرے تو ہو سکتا ہے کہ عمر بھر اسے صواب سمجھتا رہے اور ہو وہ حقیقت میں خطاء تو غرض ان چیزوں میں مبتلا ہو کر حضرت آدمؑ نے وہ درخت کھالیا۔

لغزش اور گناہ کا فرق

مگر اس کا منشاء کبر اور جاہ نہیں تھا۔ خود ہی کہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کیسے کروں لیکن معنی حکم کے قسم کھا کر بیان کرنے والے نے غلط بیان کر دیئے اور چیز تھی کھانے پینے کی اور کھانے پینے کی چیزوں میں قوت باہ اور شہوانی قوت آگے بڑھتی ہے۔ کبر و نخوت اس میں نہیں ہوتا۔ شیطان کے گناہ کا منشاء کبر تھا اور تکبر تھا۔ اور آدم کی لغزش کا منشاء حرص تھا اور حرص آدمی کی چیز ہے اور کبر در حقیقت شیطان کی چیز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں کبر کا گناہ بہت سخت ہے وہ معاف نہیں ہو سکتا جب تک متکبر پوری توبہ نہ کرے۔ اس نے توبہ نہ کی ابد الاباد کے لئے ملعون قرار دے دیا گیا اور ابدی جہنمی بنا دیا گیا اور آدم سے جو لغزش سر زد ہوئی اس میں کبر اور نخوت کا (معاذ اللہ) کوئی شائبہ ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ حرص تھی اور اوپر سے غلط فہمی اس لئے جو گناہ شہوت سے یا باہ سے سر زد ہو وہ شدید نہیں ہوتا ہے تو آدم کی خصوصیت ہے اور کبر سے سر زد ہو تو وہ تکبر ہے اور وہ حق تعالیٰ کی شان ہے اس میں گویا اپنے کو اللہ کا شریک بنا رہا ہے اور یہ کھلا ہوا شرک ہے۔ لازمی بات ہے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ اس لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

لایدخل الجنة من کان فی قلبہٖ مثقال ذرة من الکبر

وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس میں ذرہ برابر بھی تکبر موجود ہو' (جب تک کہ اس سے توبہ نہ کرے)۔

ایک گناہ وہ ہے جس کا منشاء کبر و نخوت ہے اور ایک لغزش وہ ہے جس کی منشاء حرص ہے۔

حرص سے سرزد ہونا یہ تو آدمی کی جبلت ہے' اور کبر سے سرزد ہونا یہ شیطان کا کام ہے' کبر میں ٹھیک مقابلہ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کا کہ آپ بڑے ہیں' میں بھی بڑا ہوں۔ اور باہ سے جو گناہ ہوتا ہے اس میں آدمی خود اپنے کو ہیچ سمجھتا ہے کہ میں حرص میں مبتلا ہوں۔ اس سے اللہ کی بڑائی میں دل کے اندر کوئی کمی نہیں آتی۔

اب نتیجہ نکالئے کہ آدم علیہ السلام سے جو لغزش ہوئی وہ جاہ سے ہوئی یا باہ سے ہمیں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آدمؑ کے قلب میں عظمت خداوندی بدستور موجود تھی اور دوسرے کی عظمت جب ہی ہو سکتی ہے جب اپنے آپ کو کم سمجھے لہذا حضرت آدمؑ کی لغزش میں کبر کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ ادھر اس کم بخت کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت تھی ہی نہیں اس لئے وہ ابدالاباد کے لئے ملعون ہو گیا اور ادھر ان کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا جبکہ توبہ کی اور چالیس برس تک برابر روتے رہے اور بے حد توبہ و استغفار کیا۔ حالانکہ وہ گناہ نہ تھا بلکہ وہ ایک فکری لغزش تھی۔ بہر حال میں نے عرض کیا کہ دو ہی قوتیں ہیں ایک جاہ طلبی کی ایک باہ طلبی کی۔

عصمت اطفال

بچوں میں جاہ طلبی اور باہ طلبی کی دونوں قوتیں بیدار نہیں ہوتی' نہ ان میں تکبر ہوتا ہے کہ وہ لیڈر بنیں صرف کھیل کود کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سے شہوانی مادہ تو ہوتا ہے مگر ابھرا ہوا بیدار نہیں ہوتا۔ بلوغ سے قبل اس میں ابھار نہیں ہوتا۔ لہذا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے کہ ان میں وہ قوت ہی ابھی ابھری ہوئی نہیں ہے جو گناہ کا منشاء ہے۔

عصمت انبیاء علیہم السلام

انبیاء علیہم السلام کی تمام قوتیں کامل ہوتی ہیں۔ پھر وہ بچتے ہیں نفس کی مخالفت کر کے اپنے صبر سے جبر سے کمال نیت سے اور کمال استقلال سے اور کمال عظمت خداوندی سے۔ یہ بات نہیں کہ انبیاء علیہم السلام مجبور ہیں گناہ کرنے سے وہ گناہ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر مجبور ہوتے تو گناہ سے بچنا ان کے حق میں کوئی کمال نہ ہوتا کمال یہی ہے کہ ہر قسم کی قوت ہے اور پھر بچتے ہیں حکم خداوندی کی عظمت میں' اور نفس کا مقابلہ کرنے کی ان میں اتنی قوت ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا اور بالکل عصمت ہی رہتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے معنی مجبور کے نہیں بلکہ ان میں سارے مادے بدرجہ اتم موجود رہتے ہیں۔ مگر سارے مادوں کو وہ کلیتہً تابع کر لیتے ہیں حق تعالیٰ کے کہ جہاں آپ فرمائیں گے وہاں ہم ان مادوں کو استعمال کریں گے اور جہاں سے آپ روک دیں گے وہاں سے ہم رک جائیں گے۔ تو انبیاء میں قوتیں اور مادے سب موجود رہتے ہیں پھر ان کا گناہ سے بچنا ارادی اور اختیاری ہے اس لئے ان

کے حق میں کمال ہے اگر ان کا گناہ سے بچنا مجبوراً ہوتا تو یہ ان کے حق میں کوئی کمال نہ تھا۔

کیونکہ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک نامرد ہو اور وہ یوں کہے کہ میں بڑا متقی ہوں کہ میں عورت کے پاس نہیں جاتا۔ دوسرا کہے گا کہ کمبخت تیرے اندر جانے کی طاقت کیا ہے۔ تو مجبوری میں بچا ہوا ہے۔ تیرے اندر وہ مادہ ہے ہی نہیں۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ شہوانی مادہ پورا موجود ہو۔ اور پھر آدمی خوف خداوندی کی وجہ سے بچے ایک لنگڑا لولا آدمی جو چارپائی سے ہل بھی نہیں سکتا وہ یوں کہے کہ میں چوری نہیں کرتا۔ اس سے پاک ہوں۔ لوگ کہیں گے تو پاک کیا ہے تو تو مجبور ہے۔ تجھے آج قوت مل جائے تو ڈکیتیاں ڈالے گا۔ اب تیرے اندر طاقت ہی نہیں۔ تو تو کرے گا کیا۔ محض چارپائی پر بیٹھا رہے گا بچنا اسے کہتے ہیں کہ طاقت موجود ہو اور کرتب پورا جانتا ہو اور پھر بچتا ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے اور تو ارادے اور اختیار سے سوچ سمجھ کر علم و عقل کی روشنی میں بچے اسے تو بچنا کہتے ہیں اور جہاں روشنی ہی نہ موجود ہو اور بچے اسے بچنا نہیں کہتے۔

عصمت انبیاء اور عصمت اطفال کا فرق

بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے ہے کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت بیدار نہیں ہوتی صرف مادہ موجود ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام میں وہ ساری قوتیں موجود ہیں۔ پھر وہ معصوم ہیں ارادے سے' اختیار سے تو عصمت دونوں میں موجود ہے' مگر فرق اتنا ہے کہ انبیاء اختیاری معصوم ہیں اور بچوں میں غیر اختیاری عصمت ہے۔

یہ علم کے ساتھ معصوم اور بچے لاعلمی کے ساتھ معصوم' وہ ناطاقتی سے معصوم اور انبیاء کمال طاقت اور قوت کے ساتھ معصوم۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل ہے۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل نہیں اگر دو برس کا بچہ گناہ نہ کرے تو اسے کامل نہیں کہتے اس لئے کہ نہ اس میں ارادہ ہے اور نہ وہ قوت ہے۔ لہذا اس کے معصوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اسے مجبوراً گناہ کرنے سے روک دیا ہے۔ وہ طاقت اس میں خدا نے ابھاری نہیں۔ اس لئے وہ بیچارہ اپنے ارادے سے کچھ نہیں کر سکتا اور انبیاء میں ساری قوتیں موجود ہیں اور پھر بچتے ہیں۔ یہ ہے کمال

باعث تعجب ایمان

اور اصول بھی یہی ہے کہ رکاوٹیں اور موانع بہت ہوں اور پھر نیکی کرے تو وہ زیادہ قابل قدر ہے اور ایک ہے یہ ہے کہ کوئی رکاوٹ موجود نہیں اور نیکی کرنے کے لئے دواعی موجود ہیں۔ تو ہے تو وہ بھی نیکی ہی مگر زیادہ عجیب و غریب نہیں' زیادہ قابل قدر نہیں۔ اس قسم کی ایک حدیث میں ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے صحابہؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ بتلاؤ ایّھم اعجب ایمانا

سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟

صحابہؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! سب سے زیادہ عجیب ایمان ملائکہ کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ملائکہ کو کیا ہو گیا جو وہ ایمان نہ لائیں عرش ان کے سامنے کرسی ان کے سامنے' جنت ان کے سامنے وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون ایمان لانے والا ہوگا؟ یعنی ان کا مان لینا کوئی زیادہ کمال نہیں کیونکہ وہ اس چیز کو مان رہے ہیں جس کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے نہ ماننے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

پھر عرض کیا یا رسول اللہ انبیاءؑ کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ انبیاءؑ کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں گے وحی ان کے اوپر آرہی ہے۔ فرشتے انہیں نظر آرہے ہیں۔ مشاہدہ حق میں وہ مشغول ہیں۔ جلال و جمال کا دروازہ ان پر کھلا ہوا ہے۔ تجلی حق ان کے سامنے ہے وہ بھی انکار کریں گے تو کون اقرار کرے گا اس لئے ان کا ایمان کیا عجیب؟

پھر عرض کیا گیا کہ ہمارا ایمان عجیب ہے فرمایا کہ تمہیں کیا ہوا کہ تم ایمان نہ لاؤ۔ پیغمبرؐ تمہارے سامنے موجود۔ وحی تمہارے سامنے اتر رہی ہے۔ معجزات تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون ایمان لائے گا۔ اس لئے تمہارا ایمان بھی عجیب نہیں ہے۔

پھر عرض کیا کہ اللہ اور رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ عجیب ایمان ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد میں آئیں گے نہ رسول ان کے سامنے' نہ معجزے ان کے سامنے' نہ ان کے سامنے وحی اتر رہی ہوگی بلکہ رکاوٹ اور موانع اتنے ہوں گے کہ کوئی ایمان میں شک ڈال رہا ہے۔ کوئی دل میں تردد پیدا کر رہا ہے۔ کہیں کفار' کہیں منافقین' کہیں نفس کے جذبات ہزاروں رکاوٹیں موجود اور دواعی جو تھے ایمان کے کہ وحی اور رسول کا سامنے ہونا وہ ہے نہیں پھر بھی ایمان پر جمے ہوئے ہیں۔ تو ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔

جبری عصمت

اس سے معلوم ہوا کہ کثرت موانع اور رکاوٹوں کے اندر جو خیر کا کام کرے وہ زیادہ قابل قدر ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی رکاوٹ ہی نہیں بلکہ دواعی اور محرکات ہی موجود ہوں اور پھر خیر اور نیکی کرے تو رہے گی تو وہ خیر ہی اور نیکی ہی مگر زیادہ عجیب و غریب نہیں ہوں گی' تو بچے اگر گناہ سے بچتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ سمجھتے بوجھتے ہیں اور نفس کا مقابلہ کر کے بچتے ہیں۔ ایسا نہیں بلکہ نفس میں تو ان کے جذبہ ہی نہیں ہے گناہ کا۔ نہ شہوت کا جذبہ ہے۔ نہ کبر و نخوت کا جذبہ ہے۔ لہذا اب جو وہ گناہ سے بچ رہے ہیں اسے بچنا نہیں کہتے ہیں وہ تو گناہ سے الگ تھلگ ہیں۔ بچنا اس کہتے ہیں کہ قوت ہو۔ ارادہ بھی ہو۔ قوی کی اس پر قدرت بھی ہو کہ اس کام کو کر گزرے اور پھر بچے' تو بچوں میں عصمت ہے مگر مجبوری کی ہے اور وہاں انبیاء کے اندر

عصمت ہے ارادی اور اختیاری۔ تو معصوم دونوں ہیں مگر فرق رہے گا علم کا اور لاعلمی کا ارادے کا اور غیر ارادے کا خبر کا اور بے خبری کا۔

حفاظت اولیاء کرام

رہے اولیاء اللہ، صلحاء متقین جو گناہ سے بچتے ہیں۔ ابھی عرض کیا گیا ہے کہ گناہ سے انبیاء بھی بچتے ہیں اور بچے بھی اور اولیاء اللہ بھی فرق اتنا ہے کہ انبیاء میں تو عصمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس معنی میں وہ معصوم ہیں اور بچوں میں مادہ موجود ہے مگر بیدار نہیں اس معنی پر کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت نہیں۔ لہذا وہ بھی معصوم ہیں اب رہے اولیاء اللہ ان سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ حتی الامکان وہ بچتے ہیں اس لئے ان کو معصوم تو نہیں کہیں گے بلکہ محفوظ کہیں گے۔ منجانب اللہ ان کی حفاظت ہوتی ہے۔

اور بناء حفاظت کی کثرت ذکر ہے۔ رات دن ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں اور مشاہدہ رہتا ہے ان کو جلال و جمال کا قلب کا رابطہ اور نسبت اتنی قوی ہے کہ کسی وقت بھی حق تعالیٰ کا تصور اور دھیان ان سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اس واسطے وہ بچتے ہیں۔ لیکن اگر ذرا اوجھل ہو جائے تو امکان ہے کہ لغزش کریں اور ایسا ہوا بھی ہے کہ بعض اولیاء کبار میں بعض دفعہ غلبہ نفس ہوا اور معصیت سرزد ہو گئی۔ خواہ حکمت اس کی کچھ ہی ہو مگر اس کا امکان ہے۔

حضرت شبلیؒ کا عبرتناک واقعہ

حضرت شبلیؒ اکابر اولیاء میں سے ہیں اور یوں کہنا چاہئے کہ سرداران اولیاء میں سے ہیں اور ہزاروں خانقاہیں حضرت شبلی کی خانقاہ سے آباد تھیں اور تقویٰ وطہارت کا ایک کارخانہ پھیلا ہوا تھا۔ وقت کے تمام اولیاء ان سے استفادہ کرتے تھے۔

ایک روز وہ مریدین کے ساتھ سیر و تفریح کو نکلے جب ایک بستی پر گزر ہوا جو نصاریٰ و مجوسیوں کی بستی تھی۔ دیکھا کہ وہ لوگ خنزیر چرا رہے ہیں۔ دل میں خیال آیا کہ

> "یہ کیا انسان ہیں۔ نہ ان میں ایمان ہے نہ انہیں گندگی اور پاکی کی تمیز۔ سور چرا رہے ہیں۔ شراب پی رہے ہیں۔ اصل میں مومن ہم لوگ ہیں کہ ہر برائی سے اللہ نے ہمیں بچالیا ہے اور ہم گناہ سے بچے ہوئے ہیں اور دین کے اندر ہم غرق ہیں"۔

دل میں یہ خیال پیدا ہوا ایک وسوسہ کے درجہ میں تھے

ع نزدیکاں رابیش بود حیرانی

کے اصول سے جو جتنا مقرب ہوتا ہے اسکے دل میں اگر خطرہ بھی آتا ہے تو اس پر بھی

گرفت ہوتی ہے۔ یوں کہئے کہ عمل پر اتنی گرفت نہیں ہوتی جتنی کہ مقربین کے خطرات پر ہوتی ہے اور عتاب ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بستی میں جب یہ پہنچے تو دیکھا کہ کنویں پر چند لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں۔ ان میں عیسائی کی ایک لڑکی بہت ہی حسین و جمیل تھی۔ شیخ کی طبیعت اس پر مائل ہو گئی اور اتنی مائل ہو گئی کہ ضبط نہ کر سکے جا کر اسے نکاح کا پیغام بھی دے دیا۔

اس نے جواب دیا کہ میں نکاح جب کروں گی جب میرا باپ اجازت دے دے۔ شیخ نے پوچھا تیرا باپ کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ گھر میں ہے۔ تو اس کے گھر پہنچے اس سے جا کر درخواست کی۔ اس نے کہا کہ میں ایک شرط پر نکاح کر سکتا ہوں وہ یہ کہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنی ہو گی۔

شیخ نے کہا منظور ہے اور اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی اور مرتد ہو گئے۔ معتقدین اور مریدین نے آکر شیخ سے منت لجاجت کی لیکن شیخ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور شیخ مبہوت سے رہ گئے۔ خدام نے پوچھا کہ فلاں آیت آپ کے ذہن میں ہے۔ شیخ نے کہا کہ میرے ذہن میں کوئی آیت نہیں گویا پورا قرآن ذہن سے نکل گیا کوئی آیت ہی یاد نہیں آتی۔ پھر مریدین نے احادیث کے حوالے دے کر سمجھانا چاہا۔ شیخ نے اس پر بھی یہی کہا کہ مجھے کوئی حدیث بھی معلوم نہیں۔ گویا حدیث بھی ذہن سے نکل گئی اور اس کے عشق میں مستغرق ہیں۔ حتیٰ کہ کل جس لکڑی سے سہارا دے کر جمعہ کا خطبہ پڑھتے تھے۔ آج دیکھا گیا کہ اسی لکڑی سے خنزیر چرا رہے ہیں۔ شیخ کی ایسی حالت دیکھ کر لوگ رو دیئے۔ چیخیں نکل گئیں اور پورے ملک میں خانقاہیں غیر آباد ہو گئیں اور جہاں جس مرید کو پتہ چلتا رہا وہیں وہ سکتے کے عالم میں رہ گئے بہت سے لوگ برداشت نہ کر سکے۔ خبر سنتے ہی اچانک انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ کچھ معمولی صدمہ نہ تھا کہ ایک شیخ وقت مرتد ہو گئے۔ فکر تھی کہ دوسروں کے ایمان کے کیا ہو گا۔ اس لئے سب لوگ دعا کر رہے ہیں۔ کہیں انفراداً کہیں اجتماعاً اور ایک خاص تعداد تو ہر وقت شیخ کے پاس ہی خدائے مالک الملک کے دربار میں دعاؤں میں مشغول رہتی تھی۔

کچھ دن گزرنے کے بعد شیخ کو تنبہ ہونا شروع ہوا کہ میں کس حالت میں ہوں اور مریدین سے دریافت فرمایا کہ میں کس حالت میں ہوں۔ لوگوں نے جواب دیا کہ آپ عیسائیت میں ہیں۔ شیخ نے کہا معاذ اللہ 'استغفر اللہ' توبہ واستغفار کی اور اسی وقت کہا کہ مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان بناؤ۔ کلمہ تو تھا ہی ذہن میں بس ایک چیز غالب آگئی۔ اب جو دھیان دیا تو پورا قرآن شریف ذہن میں موجود ہے۔ پوری احادیث محفوظ کہا کہ میں یہاں آکر کیسے پھنس گیا ہوں؟ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ واقعہ ہے فوراً توجہ کر کے وہاں سے واپس ہوئے اور استغفار میں مصروف رہے۔ تمام خانقاہوں میں خوشیاں منائی جانے لگی اور پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اللہ نے شیخ کو پھر اسلام میں لوٹا دیا۔

ادھر تو یہ واقعہ ہوا اور ادھر یہ ہوا کہ اس عیسائی گھرانے پر یہ اثر ہوا کہ وہ خود اپنی لڑکی کو لے کر حاضر خدمت ہوا کہ حضرت اس کو مسلمان کر لیں اور اپنے نکاح میں قبول فرمالیں۔ حضرت نے

فرمایا کہ مجھے تو نکاح کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس تو بیوی موجود ہے نہ وہ عشق، نہ وہ محبت۔ بعد میں جب سوچا تو معلوم ہوا کہ قلب میں جو خطرہ آیا تھا ایک زعم کا کہ اصل میں ہم ہیں انسان۔ یہ عیسائی کیا کرتے ہیں اس کا جواب دیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ بڑے سے بڑے ولی سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔

حفاظت اولیاء کا طریق چونکہ اولیاء اللہ میں تقویٰ کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس غلبہ کی ہی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ' بہت جلد رجوع نصیب فرماتے ہیں اور قرآن کریم میں اسی لئے فرمایا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّہُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَاھُمْ مُّبْصِرُوْنَ

جن لوگوں کی عادت تقویٰ اور طہارت کی ہے اور وہ تقویٰ دل میں جما ہوا ہے اور پھر شیطان کی کوئی جماعت ان کو ورغلا لیتی ہے تو تھوڑی دیر تو وہ مبتلا ہوتے ہیں اس کے بعد اچانک وہ تقویٰ ابھرتا ہے اور فوراً وہ قوت ایمانی سامنے آتی ہے تو لاحول پڑھتے ہیں اور اس سے بچتے ہیں۔

یہاں سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ایک گناہ تو وہ ہے کہ قلب میں اس کا مادہ جمع ہے اور مسلسل گناہ کرتا جا رہا ہے۔ جیسے (معاذ اللہ) زناکاری کا مادہ ہے اور وہ شخص مبتلا بھی ہے اس میں۔۔۔۔ اور ایک وہ ہے کہ قلب بالکل پاک ہے مادہ ہی نہیں گناہ کرنے کا۔ البتہ ماحول سے متاثر ہو کر گھبرا کر اتفاق سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی تو ہو ہزار توبہ کرے گا اور وہ اتنی بڑی توبہ ہو گی کہ اگر وہ یہ گناہ نہ بھی کرتا اور ہزاروں نیکیاں کرتا تو شاید اتنے درجات بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ واستغفار سے بلند ہوئے۔ اولیاء کرام میں گناہ کا مادہ بھی موجود ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ گناہ میں مبتلا ہو جائیں اور کھلی معصیت سرزد ہو لیکن جب تک وہ توبہ نہ کرلیں چین نہیں آتا اور بہت بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے۔

وجوہ عصمت مگر انبیاء علیہم السلام میں یہ نہیں کہ کھلی معصیت سرزد ہو جائے۔ ہاں خطاء فکری ہو سکتی ہے لیکن اس کے تقاضوں پر کوئی عمل ہو۔ اس سے وہ بری ہیں اور اس کی وجوہات بھی ہیں۔۔۔۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا جو بدن تیار کیا گیا ہے اس میں غالب حصہ جنت کی مٹی کا ہے۔

تو مٹی جب پاک شامل ہے تو خمیر بھی پاک۔ پہلی چیز تو پاکی کی یہی ہے کہ بدنوں کے مادے جب ان کے پاک پیدا کئے گئے ہیں اس سے جو طبیعت بنے گی قدرتی طور پر اس طبیعت میں پاکی ہو گی اور ظاہر بات ہے کہ جب طبیعت ایسی ہے تو بالطبع خیر ہی کی طرف جائیں گے۔ شر کی طرف کبھی نہ جائیں گے' لامحالہ اس میں خیر ہی خیر ہو گا اور کوئی گناہ سرزد تو کیا ہو کسی گناہ کا خطرہ تک بھی ان کے قلب پر نہ گزرے گا۔ تو مادہ پاک ہے۔ بدن بھی پاک ہے۔ لازمی بات ہے کہ ان بدنوں سے جو اعمال

اور افعال صادر ہوں گے وہ بھی پاک ہی ہوں گے۔

جب ابدان ظاہرہ پاک مادے سے بنے ہیں تو ظاہر بات ہے ارواح بھی ان میں اتنی ہی مقدس ترین ہیں اور ان روحوں کے اندر مشاہدہ ہے کمالات حق کا ہر وقت حق تعالیٰ کے سامنے حضوری ہے کوئی آدمی گھر میں بیٹھ کر گناہ کا تصور کرے یہ تو ممکن ہے لیکن بادشاہ کے دربار میں ہو۔ اس کی عظمت' اس کا جلال دیکھ رہا ہو' وہاں ممکن نہیں کہ بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ انبیاء علیہم السلام تو ہر وقت مشاہدہ کی حالت میں ہیں۔ ملائکہ ان کے سامنے وحی ان پر آ رہی ہے۔

تو وہ بیچارہ نفس کرے گا کیا۔ گو مادے سارے موجود ہوں۔ نفس مغلوب ہی رہے گا تو مادہ بھی پاک' روح بھی پاک اور اوپر سے احوال بھی پاک کہ مشاہدہ ہے عالم غیب کا اور وحی کا نزول اور علم الٰہی براہ راست اتر رہا ہے اوپر سے پھر حفاظت خداوندی بھی شامل ہے۔

چونکہ ان سے دنیا کی ہدایت کا کام لینا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو معصوم رکھا گیا ہے کہ اگر ان سے ایک گناہ بھی سرزد ہوا تو مخلوق ان کی بات نہیں مان سکتی کہ جب آپ ہی ان چیزوں میں مبتلا ہیں پھر ہمیں کیوں نصیحت کرتے ہیں۔ اس لئے ان حضرات کو بری رکھا گیا ہے' ان کے مادے پاک' روحیں پاک' احوال پاک' ماحول پاک اور اوپر سے مشاہدات اور ہر وقت حضوری شاہی دربار میں اس لئے وہاں عادتاً ممکن نہیں کہ کوئی گناہ سرزد ہو۔ زیادہ سے زیادہ عقلی امکان رہ جاتا ہے۔

اولیاء اللہ سے صدور گناہ خلاف تقویٰ نہیں

سے عقلاً بھی گناہ کا امکان ہے اور عادتاً بھی اس لئے کہ جو رکاوٹیں انبیاء کو دی جاتی ہیں۔ من جانب اللہ وہ نہ ان کے مادے میں ہیں نہ ان کی ارواح میں وہ چیزیں ہیں۔ نہ ملائکہ ان کے سامنے حاضر ہیں اور نہ وحی ان پر اتر رہی ہے۔ اس لئے گناہ کرنے کا امکان ہے اور بہتوں سے گناہ ہوا بھی ہے۔ بعض ائمہ صحابہؓ سے گناہ سرزد ہوا۔ جیسے ماعز بن مالک ہیں ان سے گناہ سرزد ہوا اور ان کو رجم کیا گیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قلب تو پاک ہے اور گناہ جڑ پکڑے ہوئے بھی نہیں۔ ماحول سے متاثر ہو کر ایک حرکت سرزد ہو گئی۔

لیکن پھر اتنی توبہ کی اتنی توبہ کی کہ حدیث میں ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ماعز بن مالکؓ نے اتنی بڑی توبہ کی ہے کہ اگر وہ توبہ عالم کے اندر پھیلا دی جائے تو سب کے گناہ معاف ہو جائیں اس ایک توبہ کے اثر سے' تو اولیاء کے اندر فقط امکان عقلی ہی نہیں بلکہ ایک درجہ میں امکان عادی بھی ہے کہ گناہ سرزد ہو جائے مگر حفاظت خداوندی شامل ہوتی ہے تو گناہ ہوتا نہیں اور اگر ہو جائے تو اتنی بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے کہ سو برس کی عبادت سے شاید وہ درجات بلند نہ ہوں جو اس توبہ سے ان کے بلند ہوتے ہیں۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ رات کو لیٹے اور شیطان نے کچھ اثرات پھیلا کر قلب اور دماغ میں پہنچائے۔ تہجد کے لئے آنکھ نہ کھل سکی اور تہجد چھوٹ گیا۔ حالانکہ ترک تہجد کوئی معصیت نہیں۔ اس لئے کہ امتی کے اوپر نہ فرض ہے نہ واجب۔ مگر جو اہل اللہ تہجد کے عادی ہوتے ہیں ان کا گر ایک تہجد بھی قضا ہو جائے تو سمجھتے ہیں کہ ساری عمر اکارت ہو گئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ سر پر آپڑا۔ تو حضرت امیر معاویہؓ اس تہجد کے قضا ہونے پر تمام دن روئے۔ استغفار کیا دعائیں مانگی اور کہا کہ یہ پہلی بار قضا ہوا ہے۔

غرض اگلے دن جب سوئے ہیں تو عین تہجد کے وقت ایک شخص نے انگوٹھا ہلایا کہ ؎

"حضرت امیر! تہجد کا وقت ہو گیا ہے اٹھئے تہجد پڑھ لیجئے"۔

حضرت امیرؓ نے اجنبی آواز محسوس کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ میری مجلس رائے میں تو کون اجنبی ہے جو مجھے میرے زنان خانے میں تہجد کے لئے اٹھانے آیا ہے؟ اس نے کہا کہ "میں شیطان ہوں "تہجد کیلئے اٹھانے آیا ہوں" فرمایا کہ کم بخت تو اور تہجد کیلئے اٹھائے۔ اس نے کہا جی ہاں خیر خواہی کا جذبہ ابھرا اور مجھے گوارا نہ ہوا کہ آپ کا تہجد قضا ہو۔

فرمایا کہ تو اور خیر خواہی کرے۔ اللہ نے فرمایا ؎

اِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا

شیطان تمہارا دشمن ہے تم اسے دشمن ہی سمجھو۔

وہ کبھی دوست نہیں بن سکتا ہے اس لئے تو اور دوستی کرے۔ یہ ناممکن ہے۔ سچ سچ بتا تو کیوں آیا ہے۔ ورنہ میں بھی صحابی ہوں اور اتنی قوت رکھتا ہوں کہ تیری گردن مروڑ دوں گا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تب وہ اصلیت کھلی۔

اس نے کہ کہ اصل قصہ یہ ہے کہ میں نے ہی کل ایسی حرکت کی تھی کہ آپ کا تہجد قضا ہو گیا۔ میں نے کچھ ایسے وساوس اور آثار دماغ اور قلب پر ڈالے کہ آپ کو گہری نیند آگئی اور وقت پر آنکھ نہ کھلی۔ آپ نے سارے دن استغفار کیا تو تہجد سے اتنے درجے بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ سے بلند ہوئے۔ اسی لئے میں نے آپ کو اٹھایا کہ اگر آج قضا ہو گیا پھر توبہ کریں گے پھر درجے بلند ہوں گے۔ تو سو درجوں کے بجائے ایک ہی درجہ بلند ہو یہی اچھا ہے کچھ تو درجات میں کمی ہو گی۔

جب اتنی بات اس نے سچ کہہ دی تب حضرت امیرؓ نے اس کو چھوڑا۔ فرمایا کہ صحیح ہے یہ خباثت تیرے دل میں چھپی ہوئی تھی۔

بہر حال اولیاء کاملین سے گناہ کے سرزد ہونے کا امکان بھی ہے اور عادتاً بھی ممکن ہے اور وہ تقویٰ کے منافی بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ تقویٰ جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ گناہ جڑ پکڑے ہوئے نہیں وہ کچھ بیرونی اثرات سے گھر گھرا کر شاذ و نادر واقع ہو سکتا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام سے یہ چیز ممکن

نہیں ہے۔

مقام عصمت اور شیطان

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر قلب کے دائیں جانب فرشتے کا مقام ہے اور بائیں جانب شیطان کا مقام ہے۔ یہ خیر کے وعدے دیتا ہے اور شیطان شر سمجھاتا ہے۔ دونوں کی جنگ ہوتی ہے۔

صدیقہ عائشہؓ نے عرض کیا یارسولﷺ! کیا آپ کے قلب کے بائیں جانب بھی شیطان کا مقام ہے؟ فرمایا کہ ہاں

لیکن وہ شیطان خود مسلمان ہو گیا۔

اس کا اثر مجھ پر کیا پڑتا میرا اثر اس پر یہ پڑا کہ اس کی ماہیت بدل گئی اور بعض روایتوں کے الفاظ ہیں کہ ہے وہ شیطان ہی، مگر میں اس سے بچالیا جاتا ہوں۔ اس کا کید و مکر مجھ پر اثر نہیں کرتا۔ شیطان انبیاء علیہم السلام پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا اور ان کی صورت بھی اختیار نہیں کر سکتا۔ حدیث پاک میں ہے کہ اگر خواب میں کسی نے مجھے دیکھا تو اس نے مجھے ہی دیکھا۔ شیطان کو قدرت نہیں کہ میری صورت میں آئے اور میرا نام لے کر کہے کہ میں ہوں۔ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ صورت بھی نہیں بنا سکتا۔ چہ جائیکہ ان کے حقائق میں اثر انداز ہو سکے۔

حفاظت اولیاء اور شیطان

شیطان اولیاء اللہ کے قلوب میں اثر ڈال سکتا ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ کسی وقت بہک جائیں اور امکان ہے کہ کوئی معصیت بھی ان سے کسی وقت سرزد ہو جائے، لیکن چونکہ تقویٰ غالب ہے اس واسطے وہ غالب آکر یا تو اس گناہ سے بچا دیتا ہے اور اگر سرزد ہو جائے تو عظیم الشان توبہ نصیب ہوتی ہے کہ وہ سو عبادتوں سے بڑھ کر عبادت ہوتی ہے۔

حاصل کلام اور درجات عصمت

مطلب یہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔ عصمت اختیاری کے ساتھ اولیاء اللہ محفوظ ہیں۔ حفاظت خداوندی کے ساتھ اور حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ گناہ عادتاً ممکن ہے اور انبیاء علیہم السلام میں عادتاً ممکن نہیں صرف عقلی امکان ہے مگر ان سے گناہ ہو گا نہیں اگر ہو تو وہ گناہ نہیں بلکہ خطاء فکری ہے۔ جس پر ان کو بہت جلد متنبہ کر دیا جاتا ہے ان کو اس پر باقی نہیں رکھا جاتا ہے اور بچے معصوم ہیں۔ عصمت اضطراری کے ساتھ کیونکہ ان میں مادہ ہی ابھرا ہوا نہیں ہے جو سرچشمہ ہے گناہ کا، نہ شہوانی قوتیں ابھری ہوئی ہیں کہ شیطانی حرکت کریں۔ صرف ایک طبیعت کی شوخی ہوتی ہے۔ کھیل کود کرتے ہیں لیکن کوئی ارادی چیز نہیں ہوتی کہ ارادے سے کچھ مکر و فریب کر کے دنیا کو دھوکہ دیں۔ بچوں کی

طبعیتیں بالکل سادہ ہوتی ہیں تو عصمت دونوں میں ہے ایک میں خلقی عصمت ہے ایک میں ارادی عصمت ہے' ایک میں علم کے ساتھ عصمت ہے۔ ایک میں ناواقفی کے ساتھ عصمت ہے۔ ایک میں قوت وتمام وکمال کے ساتھ عصمت ہے اور ایک میں قوتوں کی ناتمامی اور خامی کے ساتھ عصمت ہے۔ تو عصمت دونوں میں ہے بچوں میں بھی اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام میں بھی مگر یہ فرق ہے اور اولیاء اللہ معصوم نہیں بلکہ محفوظ ہیں۔

بندہ حکم پر انکشاف اسرار ہوتا ہے

ایک صاحب نے اسی مجلس میں ایک پرچہ پر ایک سوال لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔

حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ نے اس پرچہ کو پڑھا۔ سوال یہ تھا کہ کفارہ مشرکین کی نابالغ اولاد جو انتقال کر جائے ان کا کیا حشر ہوگا۔ آخر وہ بھی تو معصوم ہیں۔ اس میں شریعت کا کوئی فیصلہ ہو تو مع اسرار و حکم بیان کیجئے۔

سوال کا آخری جز "مع اسرار و حکم بیان کیجئے"۔ حضرت کو ناگوار معلوم ہوا۔ اس لئے تلخ مزاجی کے ساتھ جواب ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا کہ یہ کیا لفظ ہے "مع اسرار و حکم بیان کیجئے"۔ اسرار و حکم ہم پر کب ضروری ہیں ہم تو ناقل ہیں احکام کے' حکم بیان کر دیں گے۔ یہ اسرار و حکم کا مطالبہ ہی غلط ہے۔ طالب اسرار کو اسرار کبھی نہیں مل سکتا۔ خادم اور مطیع پر اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

اگر بادشاہ کے سامنے کوئی جاکریوں کہے کہ حضور اپنی سلطنت کے سارے راز مجھے بتلا دیجئے اور بیگمات شاہی کا پردہ بھی اٹھا دیجئے اور یہ بھی بتلا دیجئے کہ آپ کے خزانے میں کتنے جواہرات ہیں؟ تو حکم یہ ہوگا کہ اس نامعقول کو کان پکڑ کر نکال دو۔ یہ کون ہے ہمارے اسرار پوچھنے والا؟

اور ایک شخص بادشاہ کا مطیع و فرماں بردار ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کہے کہ بہت اچھا حکم ہوا کہ فلاں وقت حاضر ہو جاؤ۔ وہ کہے بہت اچھا۔ ہر کام اور ہر بات کو ہر وقت ماننے کو تیار ہے۔ بس حکم کا بندہ ہے۔ سال بھر اطاعت کرتے کرتے جب بادشاہ کو اعتماد قائم ہوگا تو کہے گا کہ بڑا مخلص ہے۔ بڑا مطیع ہے۔ تو حکم دیا جائے گا کہ آج سے تم شاہی محل سرائے میں ہر وقت آسکتے ہو۔ تم معتمد علیہ ہو کوئی روک ٹوک نہیں۔ تو لیجئے بیگمات کا پردہ اٹھ گیا۔

اگر وہ گھروں میں آرہا ہے اور اس کی اطاعت اسی طرح کی جاری ہے اور بالکل حکم کا بندہ ہے۔ اسی طرح دو برس گزر گئے تو بادشاہ کو پورا اطمینان ہو گیا کہ بڑا مخلص اور مطیع ہے۔ اس پر بادشاہ خوش ہو کر کہے گا کہ آؤ آج ہم تمہیں اپنے خزانے دکھلائیں گے' خزانہ کھول کر اس کو اندر لے جائے گا اور دکھلائے گا کہ یہ جواہرات ہیں یہ سونا ہے' یہ چاندی ہے لیکن اس کی اطاعت پھر اسی طرح جاری وساری ہے' چار پانچ برس بعد بادشاہ کہے گا کہ آؤ ہم تمہیں اپنی حکومت کی پالیسیاں سمجھائے دیتے

ہیں۔ ایک پالیسی حکومت کی یہ ہے اور ایک یہ ہے اور یہ بھی ہے' اور یہ حکمت عملی ہے تو خادم اور مطیع پر ساری چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں اور جو طلب کرے کہ جناب پردہ اٹھا دیجئے بیگمات کا تو بادشاہ کہے گا کہ اس کو کان پکڑ کر باہر نکال دو' اس کو پھانسی دے دو یہ کون ہے اسرار طلب کرنے والا۔

تو اسرار کی طلب نہیں کی جاتی اسرار تو آثار ہیں جو اطاعت پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ حکم معلوم کرے یہ کیا سوال ہے کہ اس کی حکمت بھی بتاؤ! اس کا راز بھی بتاؤ؟ آپ کون ہیں راز پوچھنے والے؟ جب اللہ کا حکم آگیا تو اس سے بڑھ کر راز اور کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ حکم نہ مانیں گے جب تک راز معلوم نہ ہو۔ تو آپ اللہ کے مطیع نہیں بلکہ اپنی عقل کے مطیع ہو گئے کہ عقل سے راز مجھ میں آگیا تو مان لیا نہ سمجھ میں آیا تو رہ گئے۔ یہ نہایت لغو سوال ہے کہ اسرار بتائیے۔ سوال یہ ہونا چاہئے کہ حکم کیا ہے اور بس۔ اسرار معلوم کرتے ہیں تو پہلے اطاعت کیجئے۔ دین پر مضبوطی سے قائم رہئے۔ فرائض و واجبات ادا کر کے ثابت کر دیجئے کہ ہماری طبیعت بھی خادم' عقل بھی خادم' اور ارادہ بھی اللہ کا غلام' مشیت بھی غلام' پھر اسرار منکشف ہوں گے۔ اسرار تو آثار ہیں اور آثار کی طلب نہیں کی جاتی ہے۔ احکام کی طلب کی جاتی ہے۔ تو حکم پوچھئے کہ مشرکین کی نابالغ اولاد کا حکم کیا ہے۔

مشرکین کی نابالغ اولاد جنتی ہے یا جہنمی؟

اولاد مشرکین کا شرعاً جو حکم ہے اور جس میں محدثین ذراری مشرکین کے الفاظ سے باب باندھتے ہیں کہ مشرکین کی نابالغ اولاد آیا جنتی ہے یا جہنمی؟ اس میں علماء کے آٹھ مذہب ہیں۔ ایک مذہب یہ ہے کہ ان کی فطرت پر حکم لگا دیا جائے گا۔ چونکہ یہ بڑے نہیں ہوئے۔ فطرتوں میں سادگی تھی اور عمل واقع نہیں ہوا اور جنت دنار عمل کے اوپر ہے اور وہاں عمل ہے نہیں اس لئے فطرت پر حکم لگا کر داخل جنت کریں گے مگر وہ داخلہ سزا یا جزا کے طور پر نہ ہو گا بلکہ محض انعام و تکریم کے طور پر ہو گا اور انہیں خدمہ بنا دیا جائے گا اہل جنت کا وہ داخل تو رہیں گے جنت میں مگر اصل باشندوں کے خادم بن کر بطور خادم کے رہیں گے اور یہ ہی ان کے حق میں بڑے اعزاز کی بات ہو گی کہ انہیں جنت میں خدمہ بنا کر داخل کر لیا جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ اس میں توقف کیا جائے یعنی حکم مت لگاؤ اس لئے کہ روایات مختلف ہیں اور قطعی حکم لگا دینا کہ وہ جنتی ہیں یا جہنمی ہیں۔ ٹھیک نہیں' اس لئے سکوت اختیار کیا جائے معاملہ کو تفویض کیا جائے حق تعالیٰ کے اور کہا جائے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ انجام کیا ہو گا بلکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ ان کو تابع کیا جائے گا۔ ان کے آباؤ اجداد کے یعنی ملحق کر دیا جائے گا۔

اگر آباؤاجداد جنمی ہیں تو وہ بھی جنمی ہیں اور اگر آباؤاجداد جنتی ہیں تو وہ بھی جنتی ہیں تو وہ بھی جنت میں جائیں گے۔

اس دنیامیں جب مردم شماری ہوتی ہے تو نابالغ بچوں کو بھی گنتے ہیں۔ مسلمانوں کے بچوں کو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ انہیں اسلام کی خبر ہے نہ دوسری چیزوں کی خبر ہے مگر ماں باپ کے تابع بنا کر مسلمان سمجھے جاتے ہیں۔ تو گویا وہ اہل مذہب قیاس کرتے ہیں قرآن کی اس آیت پر

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ.

جو لوگ ایمان لائے مگر عمل ان کے زیادہ صحیح نہیں تھے تو ان کے آباؤاجداد کی کرامت کی وجہ سے درجہ ان کا بھی بلند کر دیا جائے۔ گو عمل ان کے ٹھیک نہیں۔ تو جب مومن کی کرامتوں کی وجہ سے ان کے بچوں کے درجات بلند ہو سکتے ہیں تو ان کے آباؤاجداد کی خباثتوں کی وجہ سے وہ بھی ان کے تابع ہو جاویں گے لہذا وہ بھی جنمی۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بچہ جب تک نابالغ رہے اور بالخصوص شیر خوار۔ وہ حقیقت میں نفس کا جز ہوتا ہے ماں باپ کے۔ ماں دودھ پلا رہی ہے اس لئے ماں کے نفس کے تابع ہے۔ اس کا نفس مستقل نہیں اور باپ کما کے کھلاتا ہے۔ اس لئے وہ باپ کے نفس کے تابع ہے۔ جب وہ عاقل بالغ ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو تب کہا جائے گا کہ اب اس میں استقلال پیدا ہوا ہے اور جب تک عقل میں بلوغ نہ ہو تو وہ ماں باپ کے تابع ہی سمجھا جائے گا وہ مسلم ہیں تو یہ بھی مسلم وہ کافر ہیں تو یہ بھی کافر۔ اس کا کفر واسلام جب ہی معتبر ہو گا جب وہ عقل وارادے اور اختیار سے قبول کرے گا۔ تو نابالغ اولاد ماں باپ کے توابع ہیں لہذا جو ان کا حکم ہے وہی ان کے نابالغ بچوں کا حکم ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ نہ وہ جنتی ہیں نہ وہ دوزخی بلکہ وہ بیچ میں اعراف کے اندر رکھ دیئے جائیں گے کہ وہ جنت ہے نہ دوزخ۔

ایک مذہب یہ ہے کہ قیامت کے دن ان کی آزمائش کی جائے گی اور ایک آگ روشن کی جائے گی اور حق تعالیٰ کی طرف سے ان بچوں کو کہا جائے گا کہ آگ میں کود پڑو تو جن کے مزاج میں سلامتی ہو گی فطرتوں کی وہ کود پڑیں گے۔ وہ آگ حکم خداوندی سے باغ و بہار بن جائے گی اور بعضے تامل کریں گے کہ ہم آگ میں کیسے چلے جاویں۔ ڈریں گے جھجکیں گے ادھر سے حکم ہے کہ آگ میں کودو، اور وہ کودتے نہیں۔

معلوم ہو گا کہ اگر یہ جوان ہوتے تو یہی سرکشی ان کے اندر ہوتی۔ ان کی فطرت ہی کے اندر سرکشی داخل ہے۔ ان کی فطرت میں سلامتی نہیں۔

ایک مذہب یہ ہے اور بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ وہاں امتحان لیا جائے گا عمل سرزد نہیں ہوا۔ صرف جانچ کر لی جائے گی کہ فطرتوں کا رخ کیا ہے اسی اعتبار سے وہ جنتی یا جنمی ہوں گے۔

اسلم ترین مذہب بہر حال اس میں آٹھ مذہب ہیں لیکن جو اسلم ترین مذہب ہے وہ صرف توقف کا ہے کہ ہم حکم نہیں لگاتے حق تعالیٰ جانتے ہیں چاہے وہ فطرت پر حکم لگادیں' چاہے وہ عمل پر حکم لگادیں ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ شریعت ظواہر پر حکم لگاتی ہے اور وہاں ظاہر کچھ ہے نہیں تو کاہے پر حکم لگادیں۔ رہی فطرت تو وہ باطنی چیز ہے اور باطن کی ہمیں خبر نہیں کہ ہے کیا۔ اور ہم کو نہیں حکم لگانے والے تو اسلم طریق یہ ہی ہے کہ توقف کیا جائے۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہو جو اکثر علماء کہتے ہیں کہ وہ اہل جنت کے خدمہ بن کر جنت میں داخل ہوں گے۔

نس بندی

سوال آج کل مسلمانوں میں ضبط ولادت اور نس بندی کا رجحان پایا جارہا ہے۔ شرع میں اس کی کیا گنجائش ہے؟

نس بندی شرعی اصول کے تحت ممنوع ہے اس لئے کہ شریعت کا منشاء تکثیر اولاد ہے۔ اسی بناء پر آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ **تزوّجوا الودود فانیّ مکاثر بکم الامم**

یعنی ایسی عورتوں سے نکاح کرو جن سے اولاد زیادہ پیدا ہوتا کہ قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں۔ اس لئے قانون عام تکثیر نسل ہے اور اسلام چونکہ جامع اور معتدل مذہب ہے اسی لئے اس نے دوسری جانب کی بھی رعایت رکھی وہ یہ کہ اگر خاوند اور بیوی اتنے کمزور ہو جائیں کہ اولاد ہوگی تو جان کا خطرہ ہے اور وہ آپس میں طے کر لیں اور اولاد نہ ہونے کی دوا کھالیں تو وہ کر سکتے ہیں۔

استثنائی حکم

استثنا کو کوئی قانون عام کی شکل میں پیش کر کے یہ کہے کہ اسلام نے نس بندی کو جائز قرار دیا ہے تو یہ خیانت ہوگی۔ اور یہ ایسے ہوگا' جیسے کہ شراب ہے اور نجس العین ہے اور نص قطعی سے اس کی حرمت ثابت ہے لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ اس کی جان بچ نہیں سکتی جب تک یہ شراب نہ پی لے۔ تو شراب پلانے کی اجازت ہے اس لئے کہ جان بچانا فرض ہے۔ یہ ایک استثنائی حکم ہے لیکن اگر کوئی اس کو قانون عام کی شکل میں پیش کر کے یہ کہے کہ اسلام نے شراب جائز قرار دی ہے اور یہ امانت داری نہیں بلکہ خیانت ہوگی۔

اسی وجہ سے قانون عام اپنی جگہ ہوتا ہے اور استثنائی حکم اور ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں موجود ہے کہ اپنی زبان سے کلمہ کفر مت نکالو اس قسم کا کلمہ اپنی زبان سے نکالنا شرعاً ممنوع ہے۔ لیکن آگے فرماتے ہیں۔

کہ اکراہ کے وقت کلمہ کفر کہنے کی اجازت ہے۔ مثلاً دل میں اطمینان کے ساتھ ایمان موجود ہو اور کسی نے گلے پر تلوار رکھ دی اور کہنے لگا تو کفر کا کلمہ زبان سے کہہ دو ورنہ ابھی ذبح کر دوں گا تو قرآن اجازت دیتا ہے کہ کفر کا کلمہ کہہ دو اور دل میں ایمان رکھو اور مطمئن رہو تمہاری کوئی گرفت نہ

ہو گی۔

اب کوئی کہے کہ اسلام میں کفر کا کلمہ کہنا جائز ہے اور قانون عام بنا کر پیش کرے تو سراسر خیانت ہے یہ صرف ایک استثنائی حکم ہے۔ خاص حالت میں اس کی اجازت ہوگی اسی بناء پر حکم عام اور قانون عام اور ہوتا ہے اور استثنائی احکام الگ ہو جاتے ہیں۔ استثناء کو استثناء رکھا جائے گا اور قانون کو قانون عام رکھا جائے گا۔

اسلام میں فرض ہے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھے اگر بیماری غالب ہے اور کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو اور اگر بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر پڑھو۔ اب اگر اس کو کوئی قانون کے طور پر یوں کہہ دے کہ اسلام کا قانون ہے کہ نماز بیٹھ کر پڑھ لیا کرو تو یہ خیانت ہو گی حکم عام وہی رہے گا کہ کھڑے ہو کر پڑھو اور اگر کوئی خاص حال پیش آجائے تو اس کی وجہ سے اجازت ہے مگر وہ شخصی بات ہو گی عام حکم نہ ہو گا یہی صورت یہاں بھی ہے کہ ایک تو تکثیر نسل ہے یہ تو قانون عام ہے اور ایک ہے استثناء وہ شخصی حالت کے تحت ہوتا ہے اس کے لئے بھی فتویٰ ہوتا ہے اور اگر مفتی اجازت دے دے تو وہ حکم عام سے نکل کر اجازت شخصیہ کے اندر آجاتا ہے۔ قانون عام اپنی جگہ پر برقرار رہے گا۔ یہ تھی واقعہ کی قانونی بحث!

منظّم فساد سے روٹی کی بچت

میرے پاس سہارنپور کے دو ڈپٹی کلکٹر آئے اور نس بندی کے سلسلے میں گفتگو کرنی شروع کی اس بارے میں انہوں نے سوال کیا جس کا ایک جواب میں نے ہنسی کا دیا اس سے وہ بے حد شرمندہ ہوئے۔

وہ یہ تھا کہ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو جو یہ فکر لاحق ہے کہ اولاد اور آبادی بڑھتی جارہی ہے اور روٹی گھٹتی جارہی ہے اس سے بحث نہیں کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط بہرحال آپ کو فکر آبادی کے بڑھنے اور روٹی گھٹنے کی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو یہ مصیبت جو پیش آرہی ہے۔ موجودہ نسل ہی سے پیش آرہی ہے۔

اس پر میں نے کہا کہ آنے والوں کا راستہ تو بعد میں روکنا۔ ان کی پہلے (موجودہ) میں کمی شروع کر دو۔۔۔۔۔اس کی عمدہ صورت یہ ہے کہ جو ملک میں فسادات پیش آرہے ہیں ان کو منظّم اور باقاعدہ کر دیجئے۔ ہر ایک شہر میں روزانہ ایک دو فساد ہوتے رہیں اور معتد بہ افراد قتل ہوتے رہے تو دس برس میں انشاء اللہ کافی کمی ہو جائے گی اور آپ کی روٹی بچ جائے گی اس جواب سے وہ جھینپ گئے۔

تقسیم دولت میں عدم توازن

اس کے بعد میں نے کہا کہ جو کام آپ کے کرنے کا ہے وہ تو اصل میں آپ لوگ کرتے نہیں اور نہ کرنے کے کاموں میں

آپ لوگ چل رہے ہیں۔ روٹی کی کمی اس لئے نہیں کہ آبادی بڑھ رہی ہے آج تو زمینوں میں اتنی کاشت ہو رہی ہے جتنے افراد بڑھ رہے ہیں رزق بھی بڑھ رہا ہے۔

پھر بھی جو کمی ہے اس کی بناء یہ ہے کہ آپ کے ملک میں دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے جو غریب ہے وہ بے حد غریب ہے اور جو امیر ہے وہ بے حد امیر ہے ملک کے وہ خاندان جو اربوں کھربوں کے مالک ہیں قانون پر ان کا قبضہ ہے۔ پارلیمنٹ کے ممبران ان کے ممنون ہیں وہ قانون ایسا بنواتے ہیں کہ ان کا سرمایہ بڑھتا رہے اور غریب فٹ پاتھ پر پڑنے کے قابل بھی نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔ اگر آپ دولت کی تقسیم صحیح کر دیں کہ امیر اور سرمایہ دار کو ذرا نیچے اتار دیں اور غریب کو ذرا اونچا اٹھائیں اس سے توازن پیدا ہو جائے گا اور یہ شکایت رفع ہو جائے گی۔ یہاں ہزاروں بورے غلے سمندر میں ڈالے جاتے ہیں۔ جب وہ غلہ پرانا ہو جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ غلہ اور رزق کی کمی نہیں بلکہ نیتوں کی خرابی ہے۔ یا طرز عمل کی خرابی ہے۔ آپ ان دولت مندوں پر اور سرمایہ داروں پر پابندی عائد کر دیں اور ان کی دولت میں ایسے راستے نکالیں کہ غرباء پلیں اور ملک میں ایک بھی فٹ پاتھ پر پڑنے والا نہ رہے۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملک میں غرباء کتنے ہیں ان کی کیا حالت۔ نہ ان کے پاس روٹی نہ کپڑا نہ گھر نہ در۔

اور دوسری طرف دیکھو' برلا' ٹاٹا' باٹا وغیرہ کو کہ یہ بھی یاد نہیں کہ دولت کتنی ہے۔ وہ بڑھ رہے ہیں دولت میں اور یہ بڑھ رہے ہیں غربت میں یہ نظم کی خرابی ہے آپ اس خرابی کو ڈالنا چاہتے ہیں ماؤں کے پیٹوں پر کہ آنے والوں کو روک دو' اس کا ان سے کیا تعلق اپنا نظم صحیح کیجئے۔

اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں وہ چاہتے تھے کہ مجھ سے کچھ بیان حاصل کریں۔ میں ان کو بیان تو کیا دیتا' مگر وہ وہاں سے چپ ہی ہو کر اٹھے' میں نے ان سے کہا کہ بس دو ہی صورتیں ہیں یا فسادات کو منظم کرو۔ اچھے خاصے افراد ہر روز قتل ہوتے رہیں دس بارہ سال میں کمی آجائے گی اور یہ نہیں کرتے تو نظام صحیح کرو' دولت کی تقسیم صحیح کرو۔

سرمایہ دار کا طریق واردات

اور میں نے یہ بھی کہا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ ان سرمایہ داروں نے اپنی بدکاریوں پر پردہ ڈالنے کیلئے یہ شوشے چھوڑ رکھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نس بند کرو یہ کرو اور وہ کرو تا کہ ان کی دولت پر زور نہ آئے' اور ان کے پیسے میں کمی نہ آئے۔ یہ اس کو چھپانے کے لئے چالاکی کرتے رہتے ہیں تا کہ پبلک دھوکہ میں مبتلا رہے۔ ہم دھوکہ میں آنے والے نہیں۔ اپنا نظم درست کیجئے آپ کا نظام صحیح نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ایسا ہی کیا تو بیس برس کے بعد سر پکڑ کر روئیں گے جب اولاد کی کمی ہو گی' نہ فوج میں آدمی ڈھنگ کا

ملے گا اور نہ پولیس میں پھر بعد از خرابی بسیار اضافہ نس پر سوچیں گے۔

کثرت اولاد پر انعام

میں نے کہ آپ یہاں رزق کی کمی کی وجہ سے آنے والوں پر پابندی عائد کرنا چاہتے ہیں اور بعض ملکوں میں یہ قانون ہے کہ جتنی اولاد زیادہ ہو گی اتنا ہی والدین مستحق انعام سمجھے جاتے ہیں یعنی اگر کسی کے یہاں دس بچے ہیں تو اتنے فی صد انعام دیا جائے گا۔ اور بارہ ہیں تو اتنا۔ یہ رزق کی کمی وہاں کیوں نہیں؟ وہاں لوگ کیوں فاقے نہیں بھرتے۔ اس لئے کہ دولت کی تقسیم میں نابرابری نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اس مصیبت سے دوچار نہیں ہوتے ہیں۔

استثنائی اجازت

سوال : استثنائی شکل میں نس بندی کرا سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب : استثنائی شکل دوسری بات ہے اس میں نس بندی ہی کیا بعض دوائیں ایسی ہیں جن کے کھانے سے اولاد نہیں ہوتی جب آدمی اس حال پر پہنچ جائے کہ بیوی اس قابل نہ ہو اور اس کی جان کا خطرہ ہو اور وہ کہے کہ مجھے تحمل نہیں اور آئندہ بچہ پیدا ہونے کی تکلیف سے جان جانے کا اندیشہ ہے تو اسے شریعت کی جانب سے اجازت ہے کہ کوئی ایسی دوائی کھا لے جس سے بچہ پیدا نہ ہو مگر استثنائی حکم استثنائی رہے گا اور اس کو قانون عام کی شکل نہیں دی جا سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

انٹرویو

ضبط وتحریر

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ'

علامہ قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ

سے

ایک ملاقات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا مقام دعوت وتجدید

علمی' سیاسی' معاشرتی اور تجدیدی کارنامے۔

پچھلے دنوں جب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے سفر پاکستان کے دوران اپنی خاص محبت اور تعلق کی بناء پر دارالعلوم حقانیہ کو بھی اپنی تشریف آوری سے نوازا اور دارالعلوم کو فضائیں حضرت کی آمد کی وجہ سے پرنور مجالس اور محافل سے سراپا نور بن گئیں۔ تو اچانک دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ماہنامہ "الحق" کے لئے مرکز اسلام کے مدیر شہیر اور حضرت حکیم الاسلام مولانا نانوتوی کے علوم واسرار کے امین سے ایک انٹرویو ریکارڈ کرایا جائے۔ ادھر یہ خواہش ادھر حضرت کی مصروفیات اردگرد پروانوں کا ہجوم اور پھر حضرت کی علالت اور تکان سفر کے ساتھ ساتھ تازہ زکام اور نزلہ اس پر مستزاد مگر خدا کی خاص دستگیری تھی کہ رات کے گیارہ بجے کے بعد اس مقصد کے لئے کچھ یکسوئی کا وقت نکل ہی آیا۔

دارالعلوم کا مستقبل

حضرت والا سے پہلا سوال دارالعلوم دیوبند کے مستقبل کے بارے میں تھا۔ بھارت سے مسلمانوں کی ثقافت' پرسنل لاء اور ثقافتی مراکز کے متعلق جو خبریں آتی ہیں وہ اگرچہ مبالغہ آمیز ہی سہی لیکن پریشان کن ضرور ہوتی ہیں اور پھر مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔۔۔۔ کہ

ع　　　عشق ست وہزار بدگمانی

جس شجرہ طوبی کے لئے حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ' شاہ عبدالعزیزؒ اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی جس کی داغ بیل حجۃ اسلام حضرت مولانا محمد قاسم

نانوتویؒ اور فقیہ اسلام مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے سراپا اخلاص و عمل بزرگوں نے رکھی، پھر جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے اساطین امت نے اپنی زندگی تج دی۔ آج انوار و معارف کے امین اور بانی دارالعلوم کے حفید رشید مولانا محمد طیب قاسمی سے پہلا سوال اسی دارالعلوم دیوبند کے بارے میں تھا۔ جسکی تعمیر و تشکیل سے خود حضرت قاری صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی پوری زندگی کی داستان وابستہ ہے۔ حضرت نے پورے اعتماد، مضبوط ایمان اور توکل سے بھرپور انداز میں جواب دیا۔

"جی ہاں، اللہ بہتر کرے، بنیاد تو اس کی ایسی ہی ہے کہ مستقبل روشن ہے انشاء اللہ اور یہ اس لئے کہ بڑی بڑی گھاٹیاں آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا بڑے بڑے مخالف پیدا ہوئے مگر اللہ کا فضل ہے وہ بڑھتا ہی رہا"۔

اطمینان اور تسلی کے لئے یہی کچھ کافی تھا، مگر یکایک دھیان مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر اول دارالعلوم دیوبند کے ایک مکاشفہ یا پیشین گوئی کی طرف گیا جسے کہیں پڑھا یا سنا تھا، اور پھر جب یہ بھی خیال آیا کہ دارالعلوم اپنی زندگی کے سو سال پورے کر چکا ہے تو گویا دل و دماغ پر ایک بجلی سی کوندی اور سائل نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ سے اس بارہ میں پوچھا کہ

"حضرت! کسی بزرگ غالبا مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ایک مقولہ سننے میں آیا ہے کہ سو سال تک تو اس دارالعلوم کا خدا محافظ ہے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ شانہ، کی شان بے نیازی کا جو فیصلہ ہو"۔

حضرت نے اس کا جواب دیا اور یکایک فکر واضطراب کی گھٹائیں اطمینان اور امید کی قندیلوں سے روشن ہو گئیں۔ حضرت نے فرمایا۔

"نہیں اتنا میں نے سنا ہے کہ یہ مدرسہ چلتا رہے گا، چلتا رہے گا یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب ہو اور یہ مدرسہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے۔ اس پیشین گوئی سے ہم تو بڑی امید باندھے ہوئے ہیں"۔

پھر حضرت نے فرمایا

"یہ ایک عجیب بات ہے اور اب تک پوری ہوتی چلی آ رہی ہے"۔

حضرت قاری صاحبؒ وضاحت فرما رہے تھے اور چشم تصور نے دہلی کے لال قلعہ پر ہلالی پرچم لہراتا دیکھا۔ کانوں نے اس کی سرسراہٹ محسوس کی اور مسلمانوں کی عظمتوں کی امین سرزمین پر شوکت اسلام کے تصور ہی سے جھوم اٹھا، مگر کیا خبر کہ یہ سنہرا خواب بھی زندگی کی اور حسرتوں کی طرح شرمندہ تعبیر ہوتا ہے یا نہیں۔۔۔ اس امید و بیم میں راقم الحروف نے اپنی بات دوسری پیرایہ میں دہرائی۔

تجدید دین کا مظہر اتم

حضرت! تجدید دین کا زمانہ تو اشخاص وافراد کے لحاظ سے سو سال کا ہوتا ہے۔ تو یہ تو دین اور علوم دین کا ایک مجدد ادارہ ہے تو اس کی عمر تو ہزاروں سال ہونی چاہئے۔

ابھی میں نے اپنی بات پوری نہیں کہ کہ حضرت نے ایسا امید افزاء اور ایمان پرور جواب دیا کہ دل و دماغ میں فکر واضطراب کے بجائے خدا کی رحمت اور وعدہ حفاظت دین کے یقین کی شمع فروزاں ہوئی۔ حضرت نے فرمایا۔

"میں نے اپنے بزرگوں مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اور دیگر حضرات سے کئی بار سنا ہے کہ مجدد کے لئے شخص واحد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ جماعت بھی ہو سکتی ہے اور ان حضرات نے فرمایا کہ یہ جو حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ اور ان اکابر کی جماعت ہے یہ سب مجدد ہیں جنہوں نے سنت بدعت میں معروف اور منکر میں تمیز پیدا کی، اور اس کے بعد فرمایا کہ ۔

ان حضرات کی تجدید کا مظہر اتم یہ دارالعلوم ہے۔ اسی کو مجدد کہا جائے اور مولانا حبیب الرحمٰنؒ نے دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ جو عمل ہے تجدید دین کا اس کی نسبت اور قیام کا مرکز ہے دارالعلوم، اور ہندوستان میں یہ دارالعلوم قلب الرحیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے چکی کے پاٹوں کے بیچ میں کلی ہوتی ہے۔ تو اس کے اردگرد چکی کے پاٹ گھومتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے نہ صرف دینی معاملات بلکہ ملکی معاملات بھی اس کے اردگرد گھوم رہے ہیں، اس کے اندر کچھ قوت اور مقناطیسی طاقت خدا نے رکھی ہے اور تیسری بات جس سے ڈھارس بندھتی ہے، وہی مولانا یعقوب صاحبؒ کا مقولہ کہ یہ دارالعلوم چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب آجائے اور یہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے"۔

ظرافت آمیز شکوہ

حضرت ابھی اپنی بات سمیٹ رہے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ مجلس میں تشریف لائے اور حضرت کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ حضرت نے ان کی طرف متوجہ ہو کر انٹرویوں نگاروں کی ستم کاری کا شکوہ اس ظرافت آمیز انداز میں فرمایا کہ ۔

"ان لوگوں کا منشاء یہ ہے کہ تم رات کو بھی جاگو گے دن کو بھی نہیں سونا چاہئے آج بھی جاگنا چاہئے اور کل کو آٹھ گھنٹے کا سفر ہے جاگ کر چلے جانا تا کہ مجاہدہ مکمل ہو جائے"۔

بزرگوں کی شفقت سے طبیعت میں جو گستاخی اور شوخی آگئی ہے، اس کی بناء پر عرض کیا گیا کہ حضرت پورے سفر میں ہماری "قدر شناس میزبان حکومت" نے آپکے تقریر وبیان پر پابندی لگاکر آپ کو بڑی راحت پہنچائی ہے۔ اب ہم کل سے اس کی کسر یہاں دار العلوم حقانیہ میں نکالنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے جن کی طبیعت کو خدا نے شکوہ وشکایت کی بجائے صبر و تمکنت اور تحمل کی نعمت سے بڑی فراوانی سے نوازا ہے۔ ہماری اسلامی حکومت کے اس سراسر نامناسب اقدام پر احتجاج یا افسوس کے بجائے احسان مندی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ:

"جی ہاں یہ تو واقعی یہاں کی حکومت کا میرے ساتھ نادانستہ احسان ہے یا پھر میرے ضعف، بڑھاپے، اور علالت پر خداوند کریم کا غیبی کرم، ورنہ تقریر پر پابندی نہ ہوتی اور ہر جگہ دوستوں کے تقاضا پر مجھے بولنا پڑتا تو شاید میری طبیعت اس کی متحمل نہ ہوسکتی۔۔۔۔ گو میں تو وہاں سے یہ ارادہ کر کے آرہا تھا کہ تقریر و بیان سے حتی الوسع علالت کی وجہ سے پہلو تہی کروں گا"۔

عالم اسلام کے ایک جلیل القدر عالم دین سے اور مسلمانوں کے قابل فخر بزرگ کی اپنے ملک میں اس "پذیرائی" کا ذکر چھیڑ کر مجھے خود ندامت اور خفت محسوس ہونے لگی مگر حضرت کی زبان سے ایسا تبصرہ سن کر اپنے اکابر کی شرافت نفس اور علوم اخلاق کا ایک پہلو تو سامنے آ ہی گیا۔

اس کے بعد گویا اصل انٹرویو شروع ہوا ایک ایک پرزہ جس پر عجلت میں چند سوالات لکھے گئے تھے حضرت کی طرف بڑھایا۔ حضرت نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہماری طفلانہ خواہش اور تنگئ دامن کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

"ارے بھائی! یہ تو بڑے لمبے سوال ہیں اس میں سے کسی ایک سوال کے ایک گوشہ پر گفتگو کے لئے بھی یہ پوری رات ناکافی ہے"۔

مگر ایک سدا بہار گلشن سے گزرنے والے کسی سراپا شوق کی نظر تو اپنی تنگ دامنی سے زیادہ انواع واقسام کی زیبائش اور رعنائی پر ہوتی ہے۔ اس کے دامان نگاہ میں تو پورا چمن سمیٹ لینے کی چیز ہے کہ پھول ہے تو یہی اور سرسبز و شاداب گوشہ ہے تو بس یہی۔

امام دعوت وعزیمت

سب سے پہلا سوال حجۃ اسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بارہ میں تھا جن کے سر پر خدا تعالیٰ نے ظلمت کدہ ہند میں حفاظت دین کا سہرا باندھا اور جن کی مومنانہ بصیرت، مجاہدانہ جدوجہد، حکیمانہ علوم اور جدید علم کلام کی وجہ سے خداوند کریم نے دور غلامی میں اسلام اور اسلامیان ہند کے علوم و تہذیب کو محفوظ رکھا۔ بلاشبہ اس امام کبیر کی نظیر قرون اولیٰ ہی میں مل سکتی ہے۔ علم میں، عمل میں، جہاد اور ریاضت میں، تدبر اور سیاست میں،

تصوف اور سلوک میں حضرت حجۃ الاسلام یکتائے روزگار تھے۔

ایک نقاد عالم نے بالکل صحیح کہا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ' کی ذات ستودہ صفات انیسویں صدیں کے نصف آخر میں بے شبہ آیت من آیات اللہ تھی۔ آپ کے علمی' اخلاقی' اور روحانی کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے رازی کا فلسفہ' شعرانی کا علم الکلام غزالی کا سوز وگداز' ابن تیمیہ کا صولت بیان' ولی اللہ کی حکمت و دانش' احمد سرہندی کی غیرت و حمیت اسلامی اور ٹیپو کی شجاعت یہ سب چیزیں کس فیاضی سے ایک شخص میں جمع کر دی تھیں۔ اور بقول حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ۔

"ہمارے اکابر تو وہ ہیں کہ اگر ان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرادیا جائے اور بتلایا نہ جائے تو دیکھنے والے رازی اور غزالی ہی سمجھیں گے"۔

اور آج حضرت قاری صاحب سے اسی امام دعوت و عزیمت' سر خیل ارباب صدق و صفا' علمبر دار جہاد حریت اور نابغۂ روزگار شخصیت کے مقام دعوت و عزیمت پر کچھ روشنی ڈالنے کے لئے کہا گیا تھا۔۔۔ اور حجۃ الاسلام کے پوتے فرمار ہے تھے کہ۔

تین بڑے کام

حضرت نانوتویؒ نے زندگی میں جو کام انجام دیئے وہ بہت زیادہ ہیں لیکن بنیادی طور پر تین بڑے کام انجام دیئے سب سے پہلا کام دار العلوم دیوبند کا قیام ہے۔ یہ اتنا عظیم کام ہے کہ پوری دنیا پر اس نے اثر ڈالا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ خلافت اسلامیہ کی تائید میں ہمہ وقت منہمک رہے۔ سلطان عبدالحمید خان خلیفہ تھے۔ گو وہ خلافت نام کی رہ گئی تھی مگر حضرت چاہتے تھے کہ وہ نام ہی قائم رہے۔ اس سے تمام ممالک اسلامیہ میں ایک مرکزیت قائم رہے گی اس لئے حضرت نے خود بھی سلطان کی حمایت میں قصیدے لکھے مولانا محمد یعقوبؒ اور مولانا ذوالفقار علیؒ سارے بزرگ رطب اللسان رہے۔ اور جب بھی ترکوں سے کسی کی جنگ ہوئی یہ حضرات ترکوں کی حمایت میں کھڑے ہوئے' کہیں چندہ جمع کر رہے ہیں' کہیں رائے عامہ پیدا کر رہے ہیں۔ غرض ہمہ وقت مصروف رہتے۔

تو مقصد یہی تھا کہ خلافت کا نام قائم رہے۔۔۔ اور تیسری چیز یہ انجام دی کہ دیوبند اور نواح دیوبند میں نکاح بیوگان کو انتہا درجہ کا عیب سمجھا جاتا تھا اور یہ چیز ہندوؤں سے آئی تھی' اگر کسی نے نام بھی لیا تو تلواریں نکل آتی تھیں۔ حضرت نے لطیف پیرایہ میں اس کی تحریک شروع کی جب اندرونی طور پر خواص کو اپنا ہم خیال بنایا تو اس کے بعد جلسہ عام کیا۔

ہمارے یہاں دیوان کا دروازہ جو ہے وہ نواب لطف اللہ خان مرحوم کا محل ہے جو اورنگ زیب کے وزیر خارجہ تھے اور دیوبند میں عثمانیوں کے مورث اعلیٰ تھے۔ اس میں حضرت نے وعظ فرمایا۔

بہت بڑا مجمع تھا۔ درمیان میں ایک شخص اٹھا اور کہا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ فراست سے سمجھ گئے تھے کہ کیا کہتا ہے؟۔۔۔۔ جواب میں فرمایا کہا بھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ ایک ضرورت پیش آئی۔ لوگوں نے سمجھا کہا استنجاء وغیرہ کی ضرورت پیش آئی ہو گی۔

حضرت گھر میں گئے۔ حضرت کی بڑی بہن بیوہ تھی، ۹۵ برس کی عمر میں نہ نکاح کے قابل نہ کچھ، مگر اعتراض کرنے والے کو اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ آپ دنیا کو نصیحت کرتے ہیں مگر آپ کی بہن تو بیٹھی ہے۔ گھر میں گئے تو بڑی بہن کے پیروں پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے گھبرا کر کہا کہ بھئی تم عالم ہو یہ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا میں بہر حال آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ آج ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمت کریں تو آپ پر موقوف ہے۔ فرمایا کہ میں ناکارہ اور سنت رسول کی احیاء میری وجہ ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ آپ نکاح کر لیجئے۔ فرمایا کہ بھئی تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ منہ میں دانت نہیں کمر جھک گئی۔ ۹۵ برس میری عمر ہے۔ کہا یہ سب میں جانتا ہوں۔ مگر اعتراض کرنے والے اس چیز کو نہیں دیکھتے تو فرمایا کہ اگر سنت رسول ﷺ میری وجہ سے زندہ ہو سکے تو میں جان قربان کو بھی تیار ہوں۔

تو۔۔۔ ان کے دیور کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اور انکے خاوند کا وہاں پر جو چودہ پندرہ آدمی تھے خاندان کے انہی کے سامنے نکاح پڑھایا گیا۔ گواہ بنا دیئے گئے اس میں کچھ دیر لگ گئی، پھر حضرت نانوتویؒ باہر آئے اور مجمع میں دوبارہ تقریر شروع کی، وہی سائل پھر کھڑا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمایا کہئے اس نے کہا آپ دنیا کو نصیحت کر رہے ہیں اور آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہے تو ہم پر کیا اثر ہو گا؟

فرمایا، کون کہتا ہے؟ ان کے نکاح کے تو شاید گواہ بھی یہاں موجود ہوں گے۔ دو تین آدمی درمیان میں کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے۔ اصلاح معاشرت اور رسومات مٹانے کے لئے حضرت نے خود اپنے گھر سے قربانی پیش کی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی مجلس میں ستر اسی نکاح پڑھے گئے اور پھر یہ سنت ایسی کھلی کہ ہزاروں بیواؤں کا نکاح ہو گیا۔

روح دار العلوم تو پہلی چیز تو دار العلوم کے قیام پر زور دیا۔ اس کی روح فی الحقیقت یہ تھی کہ علوم نبوت اگر عام ہوئے اور ایمان سنبھل گئے تو پھر مسلمان سب کچھ کر سکتے ہیں اور اگر ایمان ہی نہ رہا تو پھر کچھ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ جب شوکت اور حکومت جا چکی تو کم از کم دین تو محفوظ رہ جائے وہ رہ گیا تو آگے سب کچھ ہو جائے گا۔

اس لئے سفر میں جہاں بھی گئے تو مدارس قائم کرتے چلے گئے، مراد آباد میں مدرسہ شاہی امروہہ میں مدرسہ عربیہ بریلی میں مدرسہ اشاعت العلوم انبیٹھ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسے اور اگلاوٹی میں مدرسہ قاسمیہ قائم کیا اور جتنے متوسل تھے خطوط لکھتے رہے کہ جہاں ہو مدرسہ قائم کرو۔ اور یہ حضرت کی ایک بڑی سیاست تھی اور اس کا حاصل یہ تھا کہ قوم کو علم کے راستے سے تیار رکھنا کہ وہ

مضبوطی سے قائم رہے اور جب دین ہوگا تو آئندہ ممکن ہے کہ ان میں شوکت اور قوت بھی آجائے۔

اصلاح معاشرہ اور خلافت اسلامیہ

ادھر معاشرت کو درست کیا۔ معاشرت کی سب سے بڑی خرابی نکاح بیوگان کی طرف توجہ دی۔۔۔ تیسری چیز یہ تھی کہ خلافت اسلامیہ کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ ہر وقت اس کا دھیان جس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرت چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام کی کوئی نہ کوئی بود نبود قائم رہے۔ اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے تو کم سے کم کسی اسلامی حکومت سے تو مربوط رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی امیدوں کا مرکز بہت دنوں تک افغانستان رہا۔

افغانستان سے رابطہ

اور برطانیہ کو یہ شکایت رہتی کہ یہ جماعت شورش کر رہی ہے اور افغانستان سے مل کر برطانوی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے مگر ان حضرات کو اس کی کیا پرواہ تھی؟ افغانستان سے برابر اپنا ایک رابطہ قائم رکھا اور یہی وجہ ہوئی کہ:-

"جب امیر نادر خان کا انتقال ہوا اور ظاہر شاہ تخت سلطنت پر بیٹھ گئے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے مجھے نمائندہ بنا کر بھیجا کہ امیر مرحوم کی تعزیت اور امیر موجود کی تہنیت کروں میں افغانستان حاضر ہوا اور میں نے یہ تحریر لکھ کر پیش کی کہ ہمارا مقصد کوئی مالیہ اور چندہ لینا نہیں بلکہ ان روابط کو زندہ کرنا ہے جو ہمارے اکابرؒ کے تھے جس پر صدر اعظم نے مجھے بلایا۔ امیر بڑی عنایت و شفقت سے پیش آئے جب میں قصر صدارت میں پہنچا تو ہم لوگ بیٹھ گئے اور یہ خیال تھا کہ شائد ملاقات کے کمرہ میں بلایا جائے گا۔ لیکن یکایک دیکھا کہ خود صدر اعظم وہیں آرہے ہیں۔ ہم سب لوگ کھڑے ہوئے آگے بڑھے تو وہی افغانی طریقہ پر معانقہ دلیاں بایاں مونڈھا چومنا' پوری محبت کا اظہار انہوں نے کیا۔ اس کے بعد فرمایا "بفرمائید" آپ آگے چلیں میں نے کہا "نے نے خلاف ادب است" فرمایا نہیں نہیں آپ کو آگے چلنا ہوگا اور میں اس کی وجہ بتاؤں گا۔ اب ہم اس شان سے چلے کہ میں آگے آگے میرے پیچھے صدر اعظم صاحب ان کے پیچھے سردار نعیم خان اور ان کے پیچھے مولانا محمد میاں صاحب (منصور انصاریؒ) اور ان کے پیچھے غازی صاحب۔ اس ترتیب سے ہم آگے بڑھے تو وہ جو رسمی کرسی تھی' اس پر مجھے بٹھلایا اور خود دوسری کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اب میں وجہ بیان کرتا ہوں' اور وجہ مختصر یہ ہے کہ۔۔۔ کابل کی یہ حکومت ہمیں آپ بزرگوں

کی دعاؤں سے ملی ہے اور یہ اشارہ تھا اس طرف کہ امیر نادر خان صاحب کے چچا تایا سردار محمد یوسف خان اور سردار محمد آصف خان۔ یہ دونوں بیعت تھے حضرت گنگوہیؒ سے، اور برطانیہ نے انہیں ڈیرہ دون میں نظر بند کر رکھا تھا۔ تو یہ حضرات شکار کے حیلے سے گنگوہ آکر حضرت کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور حضرت کوئی نصیحت فرمادیتے۔۔۔۔ آخر دفعہ جب ملاقات ہوئی تو حضرت نے فرمایا "جاؤ کابل کی حکومت تمہارے خاندان میں آئے گی اور عدل سے کام کرنا"۔

انہیں حیرت ہوئی کہ کابل کی حکومت سے ہمارا کیا تعلق؟

امان اللہ کی حکومت تھی یہ لوگ بنی اعمام میں سے تھے، تو انہیں عہدے وزارتیں وغیرہ تو ملتی تھی۔ مگر حکومت کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ سمجھے کہ حضرت نے حوصلہ افزائی کے طور پر ایک کلمہ کہہ دیا ہے۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بچہ سقہ کی حکومت آئی۔ امان اللہ خان معزول ہوئے۔ کیونکہ اسی نے مظالم ڈھائے تو قوم متوجہ ہوئی کہ امیر نادر خان کو فرانس سے بلایا جائے۔ وہ آئے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور پھر شہید ہو گئے۔ تو صدر اعظم کا اشارہ اسی طرف تھا۔

پھر صدر اعظم نے فرمایا کہ:

"ہمارے پاس کچھ تبرکات آپ کے بزرگوں کے محفوظ تھے۔ مولانا نانوتویؒ کی ایک ٹوپی تھی جو میری والدہ کے پاس تھی اور ہمیں جب کوئی بیماری ہوتی تو والدہ ہمیں وہ ٹوپی اوڑھاتی تھی اور ہمیں شفاء ہو جاتی۔ آج ڈاکٹر رفقی بے (جو ترک ہے) کو ہم چھ ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں مگر اس کے نسخوں سے وہ شفا نہیں ہوتی جو ان تبرکات کی وجہ سے ہوتی اور فرمانے لگے۔ کہ بچہ سقہ کے زمانے میں ہمارا گھر لوٹا گیا، لاکھوں روپیہ کا سامان چوری ہو گی، لیکن ہمیں صدمہ ہوا تو تبرکات کا جس کا آج تک ہمارے اوپر اثر ہے۔ پھر صدر اعظم افغانستان نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو آگے بڑھا رہا ہوں"۔

ترکوں سے روابط

یہ تو افغانستان سے روابط تھے اور سلطان عبدالحمید خان ترکوں سے تعلق کا حال معلوم ہوا جس سے ان حضرات کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے کہ یوں چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہو جائے، مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو، شیخ الہندؒ کی بھی یہی تحریک تھی وہ چاہتے تھے کہ عالم اسلام متحد ہو کر ترک اور افغانستان سب مل کر ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ حضرتؒ کی یہ تحریک تھی اور وہ ہوئے بھی حملہ آور۔ مگر کچھ تو یہ ملک تیار نہ تھا، کچھ مجاہدین ناتربیت یافتہ تھے، نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا اور یہ خواہش انہیں ورثہ میں اپنے استاذ

حضرت نانوتویؒ سے ملی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں تو گویا حضرت جوش جہاد میں غرق تھے اور بس یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جان دے دوں شاملی میں تلواروں سے مقابلہ بھی کیا۔ الغرض حضرت کی زندگی کے کارناموں میں ایک عملی کارنامہ تو دارالعلوم ہے، جس کا فیض اطراف عالم میں پہنچا، دوسرا معاشرتی کارنامہ ہے، اور تیسرا سیاسی اور اجتماعی کارنامہ کہ تہذیب و تعلیم ہی کے سلسلہ میں سہی مگر ممالک اسلامیہ میں کوئی نہ کوئی ربط قائم رہے۔

انگریزی دور میں محکمہ قضاء کا قیام

اس سلسلہ میں حضرتؒ نے دارالعلوم دیوبند میں محکمہ قضاء قائم کیا اور مولانا یعقوبؒ کو قاضی بنایا تو ہزاروں مقدمات جو برس ہا برس سے الجھے ہوئے تھے، منٹوں میں طے ہوئے لوگوں کا وقت اور مالیہ بچا، یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر انگریز نے آخر میں توڑ دیا دیوبند میں ایک تھانیدار کو بھیجا جو بڑا سخت قسم کا آدمی تھا چنانچہ وہ آیا۔ رمضان شریف کا آخر عشرہ تھا۔ اس نے آکر حضرت نانوتویؒ سے مصافحہ کیا اور بہت جرات کے ساتھ کہا کہ کیا آپ ہندوستان میں شرع محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا آپ نے محکمہ قضاء قائم کیا؟

حضرت نے بڑی نرمی سے کہا کہ

"یہ تو ہم لوگ گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں جو لاکھوں روپے خرچ کر کے مقدمات فیصل کرتی ہے۔ ہم نے منٹوں میں فیصل کر دیئے"۔

مگر اس نے کہا نہیں آپ پورا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں رپورٹ کروں گا اس پر حضرت کو غصہ آیا اور کہا کہ

"کان پکڑ کر اسے نکال دو"۔

طالب علموں نے دھکے دے کر اسے نکالا اور حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ

"جا ہم تیری رپورٹ کریں گے، نکال دو اس شیطان کو یہاں سے"۔

بہر حال عید کا دن آیا تھانیدار کے ہاں دودھ کے بالٹے بھرے تھے، کپڑے تیار خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ اچانک گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اس کی رشوتوں کی انتہا ہو گئی ہے۔ اس کو فوری برخاست کیا جائے۔ اور بازار میں دکان دکان پر جہاں سے اس نے رشوت لی۔ پیروں میں رسی ڈال کر اسے پھرایا جائے۔ تو اس حالت میں اسے گھمایا گیا کہ یہ روتے ہوئے کہتا جا رہا تھا کہ

"افسوس میں نے تو رپورٹ نہیں کی مگر مولوی جی نے میری رپورٹ کر دی"۔

تو اس کا خمیازہ جلد اس نے بھگت لیا۔ اس کی جگہ دوسرا آیا۔۔۔ اس کے بعد ان بزرگوں کی وفات ہو گئی اور وہ محکمہ نہیں چلا۔

تو حضرت چوتھا منصوبہ یہ تھا کہ اسلامی پرسنل لاء اور مخصوص قانون شریعت کے مطابق طے ہو۔

اسی کے تحت دارالعلوم کے اکابرؒ نے جب لنڈن سے مسٹر مانڈے وزیر ہند آیا اور جارج کا زمانہ تھا، تو میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمدؒ) علماء کا ایک وفد لیکر ان سے ملنے کے لئے گئے اور درخواست یہ کی کہ۔

"ہندوستان میں محکمہ قضاء قائم کر دیا جائے جس میں شریعت اسلام سے مخصوص چیزیں نکاح، طلاق، عدت، میراث، اوقاف وغیرہ طے ہوں"۔

خیر اس نے ظاہر میں تو کہا اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اور پارلیمنٹ میں بھی۔ لیکن یہ وقتی بات تھی نہ اس نے پیش کیا نہ ایسا ہوا۔

تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ

مگر ان بزرگوں کا جذبہ برابر یہی تھا کہ اسلامی اقتدار مسائل کے درجہ میں سہی، قائم ہو جائے تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ کے سلسلہ میں حضرت نانوتویؒ نے ایک یہ کیا کہ لوگوں کو بہت زیادہ حج کے لئے مائل کرتے تھے اور فرمایا کہ اول تو عبادت ہے اور عبادت بھی اجتماعی وہاں جاکر مکہ والوں سے بھی سابقہ پڑے گا۔ وہاں اسلامی حکومت دیکھیں گے تو ان کے قلوب پر اثر پڑے گا تو شوکت اسلامی کے جذبات لے کر آئیں گے تو علم و معاشرت، سیاست اور خلافت یہ چند چیزیں ایسی ہیں جو حضرت کی تمام خدمات کی محور ہیں۔

رات آدھی گزر چکی تھی شرکاء مجلس ذکر قاسمیؒ میں ایسے محو کہ گویا ایک حسین خواب دیکھ رہے ہوں اور زمانہ پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہو کہ یکایک حضرت قاری صاحبؒ نے بساط لپیٹنی چاہی، سننے والے چونک پڑے اور حضرت کے ضعف نقاہت کے باوجود ان کی توجہ حضرت نانوتویؒ کے ایک مخصوص شان "علمی کمالات" کی طرف مبذول کرنا چاہی کہ ابھی ذکر محبوب کچھ دیر اور چلتا رہے کہ اصحاب غرض کو تو اپنی مطلب برآری سے ہی کام ہوتا ہے ورنہ عقل اور ادب دونوں حضرت کو مزید تکلیف دینے سے روک رہے تھے مگر دل بضد تھا کہ۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

حضرت نانوتویؒ کی علمی شان تجدید

حضرت نانوتویؒ کی علمی شان تجدید کا ذکر آیا تو حضرت قاری صاحبؒ گویا یکدم تازہ دم ہوئے اور فرط نشاط میں محو ہو کر فرمانے لگے کہ علوم و معارف میں بھی حضرتؒ کا بالکل مجددانہ انداز ہے۔

حضرتؒ کی جو تصانیف ہیں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی نگاہ بہت تھی تصانیف پر اور یہ جملہ فرمایا کرتے تھے کہ

"سو برس تک فلسفہ کتنے روپ بدل کر آئے لیکن حضرتؒ کی حکمت قلعی کھولنے کے لئے کافی ہو گی۔ سو برس تک کوئی اسلام کا مقابلہ اور اسلام پر حملہ حجت سے نہیں کر سکتا۔ اتنی حجتیں جمع فرمادیں' تو گویا ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال دی جس سے اسلامی حقائق اور دقائق پورے واضح ہوتے ہیں"۔

اور مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ

"میں اپنی نظر کے لحاظ سے کہتا ہو کہ سلف میں بھی بہت کم لوگ ملیں گے جنہوں نے اس قسم کی حکمت جمع کی ہو۔ یہ حضرتؒ ہی کا حصہ ہے"۔

"حضرت کی ہر چیز بیچ کی نہ تھی بلکہ آخری کنارے پر لگی ہوئی تھی"۔

علم کے بارہ میں ایک بات مجھے اور یاد آئی کہ مولانا یعقوب صاحبؒ صاحب کشف وکرامت بزرگوں میں سے تھے اور انکے ہاں اخفاء تھا نہیں' جو واردات ہوتی صبح طالب علموں کے سامنے پیش کر دیتے کہ یہ رات کو کشف ہوا' یہ الہام ہوا' یہ عادت تھی۔ تو ایک دن فرمایا کہ

"بھئی آج صبح کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو بال بال بچ گیا۔ میرے مرنے میں کسر نہیں تھی"۔

طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت! کیا بات پیش آئی؟

فرمایا کہ

قرآن کریم کے علم کا ایک اتنا بڑا دریا میرے قلب کے اوپر سے گزرا اور غنیمت یہ ہے کہ وہ گزرتے ہی نکل گیا' ورنہ میں تحمل نہیں کر سکتا تھا"۔

اس کے بعد خود فرمایا کہ

"میں مراقب ہوا کہ یہ کیا چیز تھی۔ تو منکشف یہ ہوا کہ میرے بھائی حضرت نانوتویؒ میرٹھ میں میری طرف متوجہ ہوئے' ان کی توجہ کا یہ اثر کہ علم کا ایک عظیم دریا میرے قلب پر گزرا"۔

اور اس کے بعد خود فرمایا کہ

"جس شخص کی توجہ کا اثر ہے کہ اتنا بڑا علم گزر جائے کہ برداشت نہ ہو سکے تو وہ شخص خود اتنا بڑا علم کس طرح اٹھائے پھر رہا ہے"۔

اس میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مولانا یعقوبؒ اور تمام اساتذہ دار العلوم نے جن میں اساتذہ بھی ائمہ فنون تھے۔۔۔ مولانا سعید احمد صاحبؒ امام معقولات سمجھے جاتے تھے۔۔۔ ان سب

نے مل کر حضرت نانوتویؒ سے درخواست کی کہ تفسیر کی کوئی کتاب پڑھادیں تاکہ قرآنی علوم ہم بھی سیکھیں۔ حالانکہ یہ سب ائمہ علوم تھے۔ مولانا یعقوب تو صدر مدرس تھے۔

علوم کا عروج

تو حضرت نے منظور فرمایا۔ چھتہ کی مسجد میں حضرت نے درس شروع کردیا۔ الم سے شروع فرمایا تو حروف مقطعات پر کوئی دو اڑھائی گھنٹہ تقریر فرمائی اور عجیب و غریب علوم و معارف ارشاد فرمائے۔

اور یہ عجیب بے نفسی کا دور تھا کہ سارے اساتذہ سبق پڑھ کر باہم کہنے لگے کہ بغیر تکرار کے یہ علوم محفوظ نہ ہوں گے۔ لہذا تکرار کیا جائے۔ نودرہ میں بیٹھ کر تکرار شروع ہوگیا' مولانا یعقوبؒ نے تقریر شروع کی۔ بیچ میں ایک جگہ رکے' بات یاد نہیں رہی کسی اور کو بھی یاد نہ آئی۔ تو کہا میں مولانا سے پوچھ کر یہ تقریر کروں گا۔۔۔ تو صبح کی نماز پڑھ کر حضرت جب اپنے حجرے میں آرہے تھے تو مولانا یعقوبؒ نے عرض کیا کہ حضرت تقریر کا فلاں حصہ یاد نہیں رہا۔ تو کھڑے کھڑے حضرت نے تقریر شروع کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ نہ لفظ اس عالم کے تھے نہ معنی اس عالم کے ایک حرف بھی سمجھ میں نہ آیا کہ مولانا کیا فرمارہے ہیں۔ تو عرض کیا حضرت ذرا نازل ہو کر فرمائیے کہ کچھ سمجھ جاؤں۔ اب دوبارہ تقریر شروع کی تو الفاظ سب سمجھ میں آئے مگر معانی نہیں۔ تو پھر عرض کیا کہ حضرت کچھ اور نازل فرمائیے ہم وہاں تو نہیں پہنچے تو فرمایا کہ مولانا دوسرے وقت آئیے گا۔ تو اس وقت کہوں گا۔ تو علوم میں اس وقت کتنا عروج ہوگا کہ ادھر کہہ رہے ہیں اور ادھر سمجھ میں نہیں آرہا تو علم کا یہ حال تھا اور عمل تو ظاہر ہے۔

راقم نے عرض کیا کہ حضرت! ایسے علوم و معارف کی تسہیل اگر ہو جائے تو اس میں بہت سے فتنوں کا علاج ہے۔۔۔ فرمایا۔ ہاں! ہم نے مجلس معارف القرآن سے اسے شروع کیا اور ایک آدھ رسالہ بھی چھاپا تسہیل بھی کی لیکن یہ سلسلہ چلا نہیں۔ اس لئے کہ علماء کی توجہ نہیں وہ کہتے کہ یہ مغلق مضامین ہیں۔ میں نے کہا بھئی حمد اللہ اور ملا حسن' اور قاضی تو سمجھ لو تو ان علوم میں کیا دقت ہے' تو ارادہ نہیں سمجھنے کا۔ عرض کیا گیا کہ کاش مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں علوم قاسمی کا جو منصوبہ پیش کیا' اس کے مطابق کام کرنے کی صورت نکل آئے' حضرت قاری صاحب فرمانے لگے کہ وہ منصوبہ میں نے ہی مولانا گیلانی مرحوم کے سامنے رکھا تھا کہ آپ نے تین جلدوں میں سوانح لکھی مگر اصل سوانح تو حضرت کے علوم ہیں۔ آپ اس پر تبصرہ کریں مگر افسوس کہ اس کام سے پہلے مولانا گیلانی کی وفات ہوگئی' پانچ ہی صفحات مقدمہ کی شکل میں لکھ پائے تھے۔

الغرض بڑے عجیب وغریب علوم و حقائق ہیں۔

کچھ اپنی زندگی کے بارے میں

حضرت قاسم العلومؒ کے سراپا نور زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد اب اگلا سوال خود حضرت حکیم الاسلام کی زندگی کے بارے میں تھا' اور ڈرتے ڈرتے حضرت سے کچھ اپنی زندگی کے بارے میں ارشاد فرمانے کی جرات کی گئی۔

پیدائش کا پس منظر

حضرت مسکرا کر فرمانے لگے۔ میری زندگی کیا جو میں بیان کروں۔ ہاں ایک تو پیدائش کا قصہ ہے جو مجھے یاد آیا اور جسے اپنے بڑوں سے میں نے سنا۔ وہ یہ کہ میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد مرحوم) کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی' جو شادی خود حضرت نانوتویؒ نے کرائی تھی۔ تو سارے بزرگوں بالخصوص حضرت شیخ الہندؒ کی یہ تمنا تھی کہ حضرت نانوتویؒ کی نسل چلے' تو دوسری شادی دیوبند میں کرائی۔ اس سے میرے تین بھائی مجھ سے پہلے پیدا ہوئے لیکن وہ کمسنی میں پیدا ہوتے ہی مر گئے۔ تو حضرت شیخ الہندؒ کو بڑی تڑپ تھی کہ کوئی زندگی کی اولاد ہو۔

تو فتح پورہ سو میں ایک بزرگ تھے جو اولاد کے بارے میں مستجاب الدعوات مشہور تھے۔ تو حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ کو حضرت شیخ الہندؒ نے بھیجا کہ وہاں جا کر دعا کراؤ کہ مولانا حافظ احمد صاحبؒ صاحب اولاد ہوں۔ وہ سفر کر کے گئے۔۔۔ جا کر عرض کیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا بھیجا ہوا ہوں اور یہ درخواست ہے۔

انہوں نے فرمایا کہ ؎

"رات بیچ میں ہے کل صبح اس کا جواب دوں گا"۔

مولانا ان کے مکان میں ٹھہر گئے' صبح آئے اور خوش ہوئے۔ فرمایا کہ میں نے دعا کی اور جب تک منظور نہ کرائی سجدہ سے سر نہیں اٹھایا۔ اور مجھے وعدہ دیا گیا کہ حافظ صاحب کا لڑکا ہوگا۔ جو حافظ اور قاری بھی ہوگا' مولوی بھی ہوگا اور حاجی بھی ہوگا۔۔۔ مجھے یہ واقعہ اس وقت معلوم ہوا جب پہلا حج ہوا اور میں جا رہا تھا تو طلبہ اساتذہ سب اسٹیشن گئے۔ اس تانگے میں مولانا عبدالسمیع صاحبؒ تھے اور میں تھا۔ مولانا نے کہا کہ بھئی! میں تجھے ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ اور یہ واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ ؎

"جب تو حافظ قرآن ہو گیا تو میں نے کہا ایک جز تو الحمدللہ قبول ہو گیا پھر تو نے قرات کی تکمیل کی تو میں نے کہا دوسرا جز پورا ہوا۔ پھر تو نے فراغت تحصیل کی تکمیل کی تو میں نے کہا' الحمدللہ اس بزرگ کے کشف کا تیسرا جز بھی مکمل ہوا' آج تو حج کو جا رہا ہے۔ تو فرمایا کہ خدا کا شکر ہے چوتھا جز بھی پورا ہو رہا ہے"۔

آگے چل کر حضرت قاری صاحب نے فرمایا۔

میری پیدائش کے بعد کان میں اذان دینے کے لئے حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کو بلایا گیا

جو اکابر دیوبند اور مشائخ میں سے تھے اس وقت حیات تھے اور میری عمر کے آٹھ نو برس تک حیات تھے' ان کی صورت مجھے یاد ہے اور میں خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا' انہوں نے کان میں اذان دی۔۔۔
حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے صاحبزادے حافظ محمد یوسف صاحب بھی اکابر بزرگوں میں سے تھے۔ وہ دیوبند تشریف لائے اس وقت میری عمر مہینہ ڈیڑھ مہینہ تھی تو میری دادای صاحبہ مرحومہ نے مجھے ان کے پاس بھیجا کہ اس کے لئے دعا کریں۔ انہوں نے ہاتھ میں لے کر کہا کہ اسے میں لے چکا ہوں' دعا کیا کروں' قبول کر چکا ہوں۔ اب اللہ جانے کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ ظاہر صورت تو یہ پیش آئی کہ میری شادی رامپور میں ان کے خاندان میں ہوئی۔ ان کی عزیزہ میرے گھر میں آئی۔ ممکن ہے یہ مطلب ہو یا اور کوئی۔

حضرت حکیم الاسلام کی بسم اللہ

اس کے بعد جب مجھے الف با تا پڑھنے کے لئے بٹھلایا گیا تو بہت بڑا جلسہ دار العلوم میں منعقد کیا گیا۔ دور دور سے مہمان آئے۔ تو مولانا ذوالفقار علی صاحب حضرت شیخ الہند کے والد نے بسم اللہ کرائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے والد مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایک قصیدہ پڑھا جو بہت بڑے شاعر تھے۔ اس قصیدہ کا مجھے ایک مطلع یاد رہا اور ایک مقطع۔ مطلع تو یہ تھا۔

حبذا مکتب طیب کے مبارک تقریب
کچھ عجب طرح کا جلسہ کچھ عجب طرح کی سیر

اور مقطع یہ تھا جو تاریخ کو بھی سمیٹے ہوئے تھا۔

ربِّ یسِّر جو کہا اس نے تو بے روئے ریا
فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تمم بالخیر

ناز برداری

بہر حال ان اکابر کی توجہات تھیں' میں نے اپنی زندگی ایسی گزاری جیسے شہزادے گزارتے ہیں۔ ہر طرف حضرت نانوتویؒ کے نام لیوا بڑے بڑے اکابر' حضرت شیخ الہند وغیرہ حضرات بس اس طرح ناز برداری کرتے تھے جیسے کوئی بادشاہ زادہ ہو' اب بھی جو یہ حضرات کچھ لحاظ پاس کرتے ہیں' غلط فہمی میں نہیں کہ میرے اندر کوئی قابلیت ہے۔ اصل میں نسبت ہے ان بزرگوں کی جس کی وجہ سے یہ سارا اکرام ہے۔

مسلمانوں کے تنزل کے اسباب

یہاں تک حضرت کہہ گئے تھے کہ رفیق مجلس قاری سعید الرحمٰن صاحب (راولپنڈی) نے ایک تلخ موضوع چھیڑ دیا۔ ''مسلمانوں کے تنزل کے اسباب'' ایک ایسا موضوع جس پر بحث و فکر تو مدتوں

سے ہو رہی ہے مگر مرض کا علاج صرف نایاب اور بیش قیمت نسخوں کے معلوم کرنے سے کب ہو سکا ہے جب تک مرض کے ازالہ کے لئے علمی قدم نہ اٹھایا جائے۔ آج مسلمانوں کے تنزل کے اسباب و محرکات پر بلا مبالغہ ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی اہم دینی یا سماجی تقریب ان اسباب پر زور بیان صرف کرنے سے خالی نہیں جاتی' منبر و محراب کو لیجئے یا میدان صحافت و انشاء وہ کون سا انداز ہے جو مسلمانوں کے جگانے اور مرض کی تلافی کرنے کے لئے اختیار نہیں ہو رہا۔ مگر جمود اور تعطل کی تہیں جمتی ہی جا رہی ہیں اور جب سقوط بیت المقدس کے واقعہ ہائلہ اور قیامت صغری نے بھی ہماری خواب غفلت کو نہ جھنجھوڑا تو شاید صور اسرافیل ہی ہم غفلت شعاروں کو بیدار کر سکے۔ مگر۔۔۔ہائے وہ بیداری جو سوائے افسوس اور کف ندامت ملنے کے کسی کام کی ثابت نہ ہو سکے۔

یہی تصور حضرت قاری صاحب مرحوم کے سامنے آچکا ہو گا کہ جب انہوں نے سوال سنا تو ایک دلگداز سانس بھر کر خود ہی سوال دہرا لیا۔

"مسلمانوں کے تنزل کے اسباب ؟"

اور پھر اہل سیاست پر ایک بھرپور نشتر چبھوتے ہوئے فرمایا۔

اس میں تو سیاسی لوگوں کی رائے معتبر ہے' ایک ملا کی رائے کیا معتبر ہو گی۔ وہ سیاست جو مسلماوں کے عروج و زوال کے خدائی قوانین سے بے خبر ہو کر بھی صرف مادیت کے گھمنڈ میں تاریخ کے ہر واقعہ پر رائے زنی اپنا حق سمجھتی ہے۔ حضرت قاری صاحب کے اس مختصر سے جملہ میں واقعی اس سیاست پر یہ ایک بھرپور وار تھا۔۔۔۔ تنزل کے اسباب کا ذکر شروع کرتے ہوئے قاری صاحب نے اصول اور کلیات پر گفتگو کے بجائے اپنے معاشرہ کی چند جزئیات سے اس پر روشنی ڈالنا چاہی۔ ایک صاحب بصیرت شخصیت اور صاحب نظر کا ہی کام ہے کہ علمی اور نظری چیزوں کی بجائے وہ جزئیات اور عملی مثالیں سامنے رکھ دے جن سے نظریات اور کلیات تشکیل پذیر ہوتے ہیں۔ مگر انسانی فہم ہمیشہ عملی مثال اور نمونوں ہی سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔

تنزل کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے حضرت نے نہ تو فلسفیانہ موشگافیوں کی آڑ میں پناہ لینی چاہی' اور نہ پیچیدہ عقلی اور نظری طول طویل محرکات کی فہرست مرتب فرمائی بلکہ موجودہ معاشرہ کی ایک ایسی دھندلی سی تصویر نگاہوں میں رکھ دی' جس کے ساتھ ہم سب اپنا موازنہ کر سکیں اور پھر خود ہی سوچیں کہ اس سارے تنزل اور بربادی کے ذمہ دار اگر ہم خود نہیں تو اور کون ہے ؟

افسوس ان لوگوں کی بے بصیرتی پر جن کی نظر اسباب تنزل سے بحث کرتے ہوئے موجودہ مسلم معاشرہ کی بے اعتدالیوں پر تو نہیں جاتی مگر رہ رہ کر ان کی ساری غور و فکر یورپی تہذیب اور مغرب کے سسکتے ہوئے فلسفہ حیات کے گرد گھومنے لگتی ہے۔۔۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے تنزل کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا۔۔۔ کہ ابھی دو تین برس کا وقعہ ہے' میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے

ساہیوال۔ دارالعلوم آئے اور بہت متاثر ہوئے۔ یہ جنگ ستمبر شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے' انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا! ملک کے حالات بہت نازک اور خراب ہیں میں نے کہا جی ہاں! اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہا کوئی سبب بھی ہے اس پستی اور پریشانی کا۔ میں نے کہا۔ ہاں سبب ہے۔ کہا کیا سبب ہے؟ میں نے کہا بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا اس واسطے کہ میں ہوں ایک مذہبی آدمی' تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطہ نگاہ سے سوچتا ہوں۔ آپ ہیں سیاسی اور بر سر اقتدار انسان آپ ہر چیز کو سیاسی نقطہ نظر سے سوچتے ہیں۔ میرا نقطہ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اس لئے بتانا غیر ضروری ہے۔

اس نے اصرار کیا کہ کچھ تو کہئے گا اور میرا منشاء بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں۔

مذہبی نقطہ نظر سے اسباب تنزل

تو میں نے کہ سن لیجئے۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے اور نہ کوئی قوم عددی اکثریت سے ترقی کر سکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کر سکتی ہے دنیا کی اقوام کردار اور اخلاق سے ترقی کرتی ہیں تو اس وقت ہمارے ملک کی اخلاقی گراوٹ انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اس لئے حالات نازک نہ ہوں گے تو کیا ہوگا؟ کہنے لگے بالکل صحیح بات ہے لیکن یہ تو ایک اصول بیان کیا آپ نے' اس کی مثال بھی ہے؟ میں نے کہا مثال کے طور پر پہلی بات یہ ہے کہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے جب ایک ہندو عورت باہر پھرتی تھی تو گز بھر کا گھونگھٹ اس کے منہ پر ہوتا اور حیاء کی وجہ سے بچتی ہوئی چلتی وہ وقت عورت نہ صرف گھونگھٹ سے باہر ہے بلکہ لباس سے بھی۔ اور اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر آپے سے باہر ہو گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ ایسی عورتوں کی کوکھ سے جو اولاد پیدا ہوگی کیا اس میں شرم وحیاء اور غیرت ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ریلوں میں ہمیں سفر کرنے کی نوبت آتی ہے تو اسکولوں اور کالجوں کے نوجوان لڑکے کسی ڈبہ میں اگر آجاتے ہیں تو ہمیں یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی ہیں جا نور اس قدر بے ہودہ اور رکیک حرکتیں کرتے ہیں کہ کوئی بھلا آدمی نہ کر سکے۔ اگر ان لوگوں کے کندھے پر ملک کا بار آگیا تو سوائے بداخلاقی کے یہ اور کیا پھیلائیں گے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ریلوں میں سفر کرتے دیکھا کہ جہاں کہیں شوگر ملز آیا گاڑیاں گنوں سے بھری کھڑی ہیں۔ سو پچاس اترے کسی نے سو گنے' کسی نے دو سو گنے کسی نے پچاس' کسی نے گٹھڑی باندھ لی اور قطعاً انہیں یہ احساس نہیں کہ یہ ہماری چیز ہے یا غیر کی۔ تو اگر ملک کا بار ان کندھوں پر آیا تو سوائے لوٹ کھسوٹ کے یہ کیا کریں گے؟

چوتھی بات یہ ہے کہ تاجروں کا طبقہ ہے اور تجارت پر ملک کا دارومدار ہے۔ اس طبقہ میں بلیک الگ ہے، نفع خوری الگ ہے۔ ذخیرہ اندوزی الگ ہے۔ توجب تاجروں میں خیانت آجائے توملک کی برقراری کیسے ہو سکتی ہے؟

پانچویں بات یہ ہے کہ جب حکام کو دیکھا جائے تورشوت ستانی، جانب داری، اقرباء پروری، یہ ایک عام چیز بن گئی ہے اور رشوت تو ایسا ہے جیسا حق ہو گیا۔ توجب حکام میں خیانت آجائے تو بھلا وہ ملک کیسے برقرار رہے گا۔ میں نے کہا یہ حالات ہیں۔ کہنے لگا بالکل بجا ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے ملک کی اخلاقی حالت درست کرے۔ آپ دولت اور بیرونی کرنسی جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں لیکن اس کی فکر کسی کو نہیں۔

کہنے لگا کہ یہ ناممکن ہے کہ اخلاقی حالت درست ہو سکے۔ میں نے کہا کیوں؟ کہا حکومت یہ نہیں چاہے گی کیونکہ اخلاق درست ہوتے ہیں مذہبی تعلیم سے اور حکومت سیکولر یعنی لا مذہب ہے۔ وہ آنہیں سکتی بیچ میں۔

نقطہ نظر کا اختلاف

تو میں نے کہا کہ میرے اور آپ کے نقطہ نظر میں یہاں سے فرق ہو گیا۔ آپ کے نزدیک سیکولر کا معنی لامذہبیت ہے اور میرے نزدیک سیکولر کا معنی ہمہ مذہبی حکومت ہے کہ ہر مذہب حکمران ہو۔ اور گورنمنٹ کا فرض ہے کہ ہر طبقے کو مجبور کرے کہ وہ اپنی مذہب تعلیم پائے۔ تاکہ اس کا اخلاق صحیح ہو۔ کہنے لگے یہ ہو نہیں سکتا۔ میں نے کہا کہ آپ خود چاہتے ہیں کہ اس ملک میں چور اور ڈاکو پیدا ہوں۔ کہنے لگا آپ جو چاہیں مطلب نکال دیں، باقی یہ ہوگا نہیں، میں نے کہا ایک تدبیر میں بتلادوں، کہا کیا؟ میں نے کہا ملک ہمارے سپرد کر دیجئے، سب حالت درست کر دیں گے۔ اس پر وہ بہت ہنسا۔ تو بہر حال ملک اور قوم کی ترقی ہوتی ہے۔ اخلاق و کردار سے، جب یہ ختم ہو جائے تو سب سے بڑا تنزل کا سبب یہی ہے۔

راقم السطور نے کہا حضرت! ہمارے تنزل میں مغربیت کا بھی حصہ ہے؟ فرمایا اس سے بھی وہی بات نکلتی ہے کہ مغربی اخلاق اختیار کئے جائیں۔ اسلامی اخلاق چھوڑ دیں، تعلیم مغربی غالب ہو اور دینی تعلیم مغلوب، دینی افراد مغلوب ہوں اور بے دین افراد غالب ہوں۔ بنیاد سب کی ایک ہی ہے کہ مذہب سے رشتہ توڑ دو۔

برسر اقتدار طبقہ کی اصلاح کا طریق

اب اس کے بعد اصلاح کی کیا صورت ہو؟ تو حضرت نے اپنے تجربہ اور بصیرت کی بناء پر فرمایا کہ آپ حضرت بحمد للہ مذہب کی خدمت کر رہے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمی جو

اس لپیٹ میں آ گئے ان کا دین درست ہو رہا ہے لیکن برسر اقتدار طبقہ بالکل دوسرے رنگ میں ہے مگر اس میں بھی میری ایک رائے ہے کہ کسی سے تقابل کی ٹھان کر کسی کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ آپ چاہیں تو ایجی ٹیشن کریں یا مقابل بن کر اصلاح کرنا چاہیں' یہ ہو نہیں سکتا۔ اس کی صورت تو یہ ہے کہ مستغنیانہ طریق سے ان لوگوں کے دلوں میں کچھ چیزیں ڈالی جائیں اور اپنا غرض مطلب کچھ نہ رکھا جائے' نہ عہدہ نہ دولت' بلکہ انہیں آپ یقین دلا دیں کہ اقتدار تمہارا رہے گا اور ہم بھی اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ ہم اقتدار نہیں چاہتے۔ مگر اتنی بات کرو اور ایسا کرنا ملک اور قوم دونوں کے لئے نافع' ورنہ اس سے ملک قوم اور تمہارے اقتدار سب کو خطرہ ہے۔ اس انداز سے کام کرنا چاہئے۔ سیاسی رنگ کے لوگ سیاسی انداز سے اور دینی رنگ کے لوگ دینی انداز سے جب تک خواص کو متوجہ نہیں کریں گے۔ کام نہیں چلے گا۔ اب عوام کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور ایجی ٹیشن کی صورت اختیار ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ اشتعال میں آ جائے حکومت' تو وہ پھر چڑ جاتی ہے' تو نہ صرف یہ کہ وہ آپ کی نہیں مانے گی بلکہ گرانے کی کوشش کرے گی۔۔۔۔ تو اصلاحی رنگ میں چند افراد اپنی زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر دیں اور جو اوپر کا طبقہ ہے ان میں رسوخ حاصل کر کے اس کے کانوں میں باتیں ڈال دی جائیں اور اس انداز سے کہ فلاں بات تیرے مفاد کے خلاف ہے۔

حکومت سے کام لینے کا طریق!

حضرت! پاکستان کے علماء کے لئے کوئی مخصوص پیغام؟

"پیغام کا مجھے حق بھی نہیں۔ غیر ملک کا آدمی پیغام کیا دے۔ مگر یہ میں نے صبح کی مجلس میں بھی تفصیل سے کہا تھا کہ جو مفکر قسم کے لوگ چند علماء ہیں اور بااثر بھی ہیں وہ ایک یادداشت کے طور پر کچھ بنیادی چیزیں حکومت کو پیش کریں اور اس پر یہ ظاہر کر دیں کہ ہم آپ کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں۔ ہمارا پورا تعاون رہے گا۔ تقویت اور نصرت کریں گے۔ مگر اتنی چیز ہے کہ دین کے لئے اور ملک کی بقاء کے لئے فلاں فلاں کام کرو۔ اگر یہ نہیں ہو گا تو ملک و قوم میں خرابی ہو گی اور آپ کی بنیاد بھی اس سے قائم ہے"۔

اس یادداشت اور ملاقاتوں میں جزئیات کو پہلے نہ چھیڑا جائے۔ بلکہ اصولی اور کلی رنگ میں یہ لوگ کچھ مانوس ہو جائیں گے۔ پھر آہستہ آہستہ جزئیات سود وغیرہ جیسے مسائل کان میں ڈال دیئے جائیں مگر پہلے ارباب اقتدار کے ذہن کو اصول میں لے آیا جائے۔۔۔۔ میں تو واقعی اگر یہاں کا باشندہ ہوتا اور بازیابی کا موقع ملا جاتا تو صدر ایوب سے کہتا مجھے آپ اپنا خادم اور خیر خواہ سمجھیں مگر دو باتیں ہیں' ایک تو یہ کہ تعلیم قرآن اور دینی علوم کو عام قرار دیں اور یہ کام مستند علماء سے کرائیے۔ ہر اس عالم کو عالم نہ سمجھیں جو علم کا لبادہ پہن کر آئے اور علم اس کا محض مطالعہ یا اخبار بینی کا ہو' نہ اس کے پاس سند ہو نہ استاد ہو' نہ بزرگوں کے پاس رہ کر اس نے علم حاصل کیا ہو' ایسے علماء کو اختیار کر کے ان سے

ہر کام میں مشورہ نہ کریں۔ ہر مدعی علم کو عالم نہ سمجھیں بلکہ اس کی تلاش کر کے کام کریں۔

کوئی طبیب بھی اگر ہوتا ہے تو یہی نہیں کہ مریض ہر کس وناکس کے ہاتھ میں جا کر ہاتھ دے دے گا۔ اور نبض دکھلا دے گا بلکہ وہ پہلے ڈھونڈتا ہے کہ طبیب طبیہ کالج کا فارغ ہے یا کہاں کا؟ اس کا بورڈ یا سند دیکھتے ہیں۔ اس کے پاس آنے والے مریضوں کی اکثریت کو دیکھتے ہیں کہ شفایاب ہو کر جاتے ہیں یا نہیں۔

تو جان بچانے کے لئے آپ انتخاب کریں تو ایمان بچانے کے لئے کیا ضروری نہیں کہ صالحین روحانی اطباء صحیح علماء کا انتخاب کیا جائے۔

اور دوسری بات ان سے یہ عرض کرتا کہ آپ معروفات کو یکدم جاری نہیں کرتے تو نہ سہی مگر کم از کم منکرات کا راستہ تو بند کر دیں۔ اس سے اخلاق میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو مقدم چیز ہے دفع مضرت اور جلب منفعت موخر ہے۔۔۔ اور دفع مضرت میں یہ ہے کہ کم از کم پہلے وہ منکرات تو ختم کر دیں جو عقلی منکرات ہیں اور دنیا کی ہر قوم اسے برا سمجھتی ہے۔ اس کے بعد منکرات شرعیہ کو لیں۔ جب اس سے فارغ ہوں تو معروفات شرعیہ کو لیں مگر کم از کم منکرات تو ختم کر دیں اور یہ بھی تدریجاً سہی رفتہ رفتہ اس لئے کہ آپ کی مجبوریاں ہیں۔۔۔ آپ کے روابط اور مراسم سیاسی ان اقوام سے ہیں کہ ان کے ہاں یہ منکرات جزو تمدن ہیں تو اگر یکدم آپ کامیاب نہ ہوں تو راستہ تو منکرات مٹانے کا ڈال دیں۔۔۔ دوسری چیز یہ عرض کرتا کہ خلفاء راشدین یا سلاطین عادل جو گنے چنے ہیں ان کے علاوہ عامتہ وہی سلاطین ہیں جنہیں اپنی اقتدار کی فکر ہے لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے جس بادشاہ کے ساتھ کوئی عالم ربانی لگ گیا۔ اس کی حکومت نہایت اعلیٰ گزری حالانکہ وہ عالم عہدہ دار نہیں تھا۔۔۔ ہارون الرشید کے ساتھ امام ابو یوسفؒ لگے ہوئے تھے۔۔۔ اورنگ زیب عالمگیر علماء سے مشورہ لیتا رہا۔۔۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بارے میں مرحوم نوابزادہ لیاقت علی خان نے مجھ سے کہا کہ جب ہم کسی مسئلہ میں الجھ جاتے ہیں تو مولانا عثمانیؒ سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

تو جب آپ اسلام کے نام پر۔۔۔ حکومت کر رہے ہیں اور ملک اسلام کا ہے تو اسلام کے حاملین سے کب صرف نظر کیا جا سکتا ہے تو جو قدم اٹھائیں تو کم از کم دو چار علماء کی بات تو سن لیا کریں' آپ انہیں نہ جاگیر دیں' نہ عہدہ نہ وہ طلب کریں گے۔

حکام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور کرنے کے لئے تجویز

حضرت حکیم الاسلام اصلاح احوال کی تجویز پر اپنی بصیرت اور فراست ایمانی کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے' اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر عصر حاضر کی اسلامی قیادت مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر اسلام کو فرسودہ اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کا عقیدہ دل ودماغ میں راسخ کر چکی ہو۔ دین کی ترجمانی کے لئے کسی صلاحیت اور استحقاق کو اجارہ داری سمجھا جا رہا ہو اور جب رعایا کی اکثریت بھی

اعجاب رائی (اپنی رائے پر گھمنڈ اور غرور) میں مبتلا ہو چکی ہو۔ پھر جب خوشامدی' خود غرض اور لالچی قسم کے علماء نے حکام کے ساتھ روابط کو رعیت کی نگاہ میں دین فروشی کے ہم معنی سمجھ لیا ہو۔ اور خالص مصلحانہ کوششوں پر بھی سیاست کا رنگ چڑھ گیا ہو تو حکام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور ہونے کے لئے اور دینی اقتدار کی خاطر اس خلا کو پاٹنے میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خیر خواہانہ تجویز کس حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہے؟ اس راہ کی مشکلات کو ایک خاص رخ سے پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کیا۔

"حضرت! جب حکام سمجھ بیٹھے ہوں کہ اسلام عصر حاضر کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تو انہیں حاملین اسلام کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو جانا کب ممکن ہے۔۔۔؟ حضرت نے فرمایا! ان کی یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہئے کہ اسلام موجود دور کی ترقیات میں حارج ہے۔ بلکہ ان کے دل میں ڈال دینا چاہئے کہ زمانہ کی کوئی چیز بھی جو کسی درجہ میں واقعی صحیح اور کار آمد ہو۔ اسلام اس کا مخالف نہیں مگر وہ منکرات جو دنیا کے ہر قوم میں منکرات عقلی ہیں۔ زناکاری' جواء' سود' شراب نوشی قسم کی چیزیں جس کی قباحت مسلمات عقلیہ میں سے ہے۔ ان چیزوں کو ترقی کا معیار بنا کر اسے اسلام کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا۔ البتہ جو چیزیں منکر نہیں ہیں اور اخلاق و معاشرت پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اسلام کبھی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ سیاسی اور ملکی تدابیر میں ہمیشہ توسیع سے کام لیا گیا ہے۔ اور جو اجتہادی امور ہیں اس کی اسلام میں گنجائش ہے اور ان کی اچھائی برائی کی جانچنے کے لئے ایسے لوگوں کو مشیر بنائیں جنہیں فقہ اور شریعت پر عبور ہو"۔

پھر قاری صاحب نے فرمایا۔ مقصد اصلاح حال ہے۔ اور یہ کہ حالات سدھر جائیں اخلاص اور جذبہ خیر خواہی کے ساتھ ایسا راستہ اختیار کیا جائے' ایک دوسرے کو دور کرنے کی بجائے نزدیک کر دے۔

تعمیری اندازی اصلاح

رات ڈھل رہی تھی۔ وقت تیزی کے ساتھ دل و دماغ پر اپنے حسین نقوش ثبت کرتے ہوئے گزر رہا تھا۔ ایسے نقوش جو مجلس میں چلے والے ٹیپ ریکارڈر کے فیتہ پر ثبت ہونے والی ارتعاشی اور صوتی حرکات سے کہیں زیادہ پائیدار اور دیرپا تھے۔ وقت بجائے خود ایک ایسی مشین ہے جو ایک ایسے نامہ اعمال کے اوراق میں سب کچھ محفوظ کر رہی ہے۔ جس کی پہنائیوں اور گہرائیوں پر "الساعۃ" اور زلزلۃ الساعۃ کی ہلاکت انگیزیاں بھی اثر انداز نہ ہو سکیں گی اور جب کرتا دھرتا سب کچھ مجسم بن کر سامنے آجائے گا تو پکارنے والا پکار اٹھے گا۔

مَالِهٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصَاهَا

ایسی صحبتیں کب بار بار نصیب ہوتی ہیں۔ حضرت کو مزید تکلیف دینا دل و دماغ پر کتنا ہی گراں گزر رہا تھا' مگر بے اختیار جی چاہا کہ اس مجلس سعید میں کچھ ذکر الحق اور دار العلوم حقانیہ کا بھی آجائے اور پوچھ بیٹھا کہ "الحق" کے لئے کون سا طریقہ کار پسندیدہ ہے؟ فرمایا۔

وہی پالیسی میں نے جو عرض کر دی۔ توافق سے کام چلے گا' تقابل سے نہیں۔ تعمیری انداز میں اصلاح کی سعی تقابل کے انداز سے آپ کی باتیں کسی مخالف پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گی۔

حضرت! جب الحاد اور بے دینی غالب ہو چکی ہے' پھر کیسی موافقت۔۔۔؟ برجستہ فرمایا۔ اسی کی اصلاح کے لئے تو توافق کی ضرورت ہے۔ اور یہ توافق الحاد اور بے دینی سے نہیں ہوگا۔ ان افراد سے توافق ہوگا تاکہ ان لوگوں کو الحاد سے ہٹا دیا جائے۔

حضرت! کچھ لوگوں پر تو مایوسی کی فضا چھا گئی ہے۔ اصلاح کی مساعی بار آور معلوم نہیں ہو رہیں۔۔۔؟ حضرت قاری صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

کام کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ مایوس نہ ہوا جائے آپ تو ورثہ انبیاء ہیں۔۔۔ انبیاء کبھی مایوس نہ ہوئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے اس قوم کو عذاب دینا ہے۔ تب حضرت نوح نے بددعا دی کہ کسی کافر کو بھی زندہ نہ چھوڑ ورنہ۔۔۔ ساڑھے نو سو برس تک نصیحت فرماتے رہے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

دیگر بلاد اسلامیہ تو دہریت' مغربیت اور بے دینی کی لپیٹ میں آ ہی گئے اور ہو گئے تو ایسے حالات میں اہل دین کب تک شکستہ خاطر نہ ہوں گے؟

حضرت نے جواب دیا کہ ایسی چیزوں کو تو ملک کے سامنے بطور نظیر پیش کیا جانا چاہئے کہ آج بلاد اسلامیہ باوجود قوت کے تباہ ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلامی اخوت اور مسلمانوں کے عام اتحاد کو خیر باد کہہ دیا۔ وطنیت کو آگے رکھا۔ اسلامیت کو پیچھے رکھا تو اتنی نظیروں کے ہوتے ہوئے بھی تمہاری آنکھ نہ کھلے تو تباہی سے کیسے بچ سکو گے؟

ورثہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت! قوم اور ملک کی اصلاح تو ارباب عزیمت اور اولوالعزم لوگوں کا کام ہے۔ ہم جیسے عامیوں کے لئے بھی کچھ ارشاد ہو۔۔۔ فرمایا۔ حضور ﷺ نے ورثہ چھوڑا ہے کتاب اللہ اور سنت رسول کا۔ فرمایا تم جب تک انہیں پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے۔

ترکت فیکم الثقلین لن تضلو بعدی ابدا ان تمسکتم بهما

دار العلوم کی ترقی

حضرت! اس مدرسہ دار العلوم حقانیہ کے بارے میں کوئی نصیحت؟

فرمایا! آپ لوگ جو اختیار کئے ہوئے ہیں' بحمد للہ مدرسہ چل رہا ہے۔ غالب ہو رہا ہے۔ مولانا موجود ہیں۔ ہر وقت قال اللہ اور قال الرسول ہے۔ اس سے زیادہ کیا روحانیت اور معنویت ہو گی۔ خدا نے مدرسہ کو ایسے بزرگ اور اساتذہ دیئے ہیں جو الحمد للہ دین مجسم ہیں۔

حضرت! مادر علمی دار العلوم دیوبند کی رفتار ترقی کیا ہے اور بجٹ؟

فرمایا! انقلاب کے وقت سوا لاکھ تھا اور اب ساڑھے دس لاکھ ہے' انقلاب کے بعد کچھ فکر بھی تھا کہ کیسے چلے گا' مگر اللہ نے بڑھایا اور تمام شعبے بڑھتے ہی گئے' پہلے آٹھ شعبے تھے اب چوبیس شعبے ہیں۔ اسی طرح پہلے اساتذہ اڑتیس تھے' اب ستر کے قریب ہیں۔ اسی طرح عمارات دگنی تگنی ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے طلبہ ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔ آخری سوال تھا کہ حضرت! نئی پود سے مستقبل میں دار العلوم دیوبند کے لئے کیسی توقعات ہیں۔۔۔۔؟ فرمایا۔

اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ اس دور کی سب سے بڑی مشکل قحط الرجال کی ہے۔ مگر ہمیں توقع ہے کہ اسلاف کے نقش قدم پر چلنے والے نئی پود میں بھی ہیں' چاہے گنے چنے ہی ہوں مگر اب بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔

دوران گفتگو ایک دفعہ حضرت نے موجودہ زمانہ کی سیاست پر بھی اپنی رائے ظاہر کی اور کہا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس زمانے کی سیاست اور دین میں بیر ہے۔ اس سیاست اور ڈپلومیسی کا بنیادی پتھر ہے۔ نفاق گندم نما جو فروشی۔ اس میں دین باقی نہیں رہ سکتا وہ تو صرف اسلامی سیاست ہے جو دین کے ساتھ چلتی ہے اور وہ تو جوہر ہے اسلام کا۔ اور ایک ہے عصری سیاست' یہ بالکل تقابل پر ہیں دین کے جو چیز دین میں حرام ہیں۔ اس کے ہاں واجب ہیں۔ جو یہاں محمود ہیں وہ وہاں مذموم۔ اور صرف یہ میرا مقولہ نہیں بلکہ مولانا اصغر حسین مرحوم نے بھی یہی الفاظ ارشاد فرمائے کہ۔۔۔۔۔

"مولوی صاحب! آج کی سیاست اور دیانت میں بیر ہے"۔

اب رات کا ایک بج چکا تھا اور بادل ناخواستہ اس پر لطف محفل کی بساط لپیٹنی ہی پڑی۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆
☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبات حکیم الاسلام

جلد دہم

افادات

از

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہ

سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

ناشر

نعمان پبلشنگ کمپنی

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فون : 7241703 فیکس :

نام کتاب: خطبات حکیم الاسلام جلد دہم

ازافادات: قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

کمپوزنگ: دارالنشر یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون :7356963

کمپوزر: دلدار حسین ۔ طاہر انور

ڈیزائینگ: حافظ محمد احمد چوہدری

ترتیب جدید: نعمان پبلشنگ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون نمبر 7241703 فیکس نمبر

قیمت: ....

ملنے کے پتے

☆ مکتبہ حنفیہ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون:7241703

☆ مکتبہ حنفیہ عقب فائر بگیڈ اردو بازار گوجرانوالہ فون پی پی :215507

☆ مکتبہ صدیقیہ نور محل روڈ بہاولپور فون :0621-875998

☆ مکتبہ مدنیہ ۱۷ اردو بازار لاہور فون :

☆ مکتبہ العارفی متصل جامعہ اسلامیہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد فون پی پی :717811

☆ مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

☆ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

☆ مکتبہ مکیہ 22 علامہ اقبال روڈ لاہور فون :6374594

☆ مکی دارالکتب یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

☆ مکتبہ رحیمیہ چونگی نمبر 2 اڈہ بازار اکوڑہ خٹک صوبہ سرحد

☆ عزیز کتاب گھر بیراج روڈ سکھر

☆ کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

☆ دارالاشاعت اردو بازار کراچی نمبر ۱

سٹاکسٹ ایجنسی شمالی علاقہ جات

☆ مکتبہ المیزان القرآن رزمک اڈہ میرانشاہ صوبہ سرحد

فہرست مضامین خطبات، حکیم الاسلام جلد دہم

نبی امی علیہ السلام

گھر میں حضور علیہ السلام کو کوئی پڑھانے والا نہیں تھا' قوم میں کوئی پڑھانے والا نہیں تھا' ملک میں علم کا چرچا نہیں تھا' غرض کوئی علمی وسیلہ اور ذریعہ نہیں تھا۔۔۔ تو امیوں کا ملک تھا' بے پڑھوں کا ملک تھا۔۔۔ اس میں ایک شخص آکر اٹھے اور اتنے بڑے بڑے علوم پیش کرے کہ اس کے علم کو دیکھ کر دنیا دنگ رہ جائے۔۔۔ اور نہ صرف علم پیش کرے بلکہ اتنا عظیم قانون دنیا کے آگے پیش کرے جو زندگی کے تمام شعبوں اور گوشوں پر حاوی ہو اور اس حالت میں پیش کرے کہ نہ خود پڑھا لکھا نہ کسی نے اس کو پڑھایا نہ ملک مین پڑھنے لکھنے کا کوئی چرچا نہ گھرانے اور خاندان میں کوئی پڑھا لکھا علم موجود' اس کے باوجود ایسا علم پیش کرے کہ علماء اس کے علم کو دیکھ کر تھک جائیں دانش مند عاجز ہو جائیں' مان لیں' تو یہ اتنا بڑا علم۔۔۔۔ بجز اس کے کہ خدا نے سکھایا ہو اور کیا سبیل ہو سکتی ہے؟ در حقیقت یہ حضور علیہ السلام کے نبی ہونے کی دلیل ہے۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ' وَنَسْتَغْفِرُہٗ' وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ' وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ' وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ' وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ' وَرَسُوْلُہٗ' اَرْسَلَہٗ' اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْراً وَّ نَذِیْراً وَّ دَاعِیاً اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً.................اَمَّابَعْدُ.........

فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْھُم یَتْلُوْا عَلَیْھِم اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ ہ

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ .

تمہید

بزرگان محترم!

آپ اس مقدس مجلس میں سیرت سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور سیرت کس کی ہے؟ میری یا آپ کی نہیں یا مطلقاً انسان کی نہیں.... بلکہ عالم بشریت کے سردار اور آقائے دو جہاں جناب رسول اللہ ﷺ کی "سیرت پاک" سننے کے لئے تشریف لائے ہیں۔

حضور علیہ السلام کی سیرت، ظاہر ہے آپ نبوت کی حیثیت سے سننا چاہتے ہیں یعنی حضور علیہ السلام میں ایک حیثیت بشر اور انسان ہونے کی ہے اور ایک حیثیت پیغمبر اور رسول ہونے کی ہے، آپ محض انسانی سیرت سننے کے لئے نہیں آئے بلکہ "پیغمبرانہ سیرت" سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ گویا نبوت کی سیرت آپ کا مقصد ہے۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ نبوت کی سیرت اس کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی کہ کچھ تھوڑا بہت نبوت کا مفہوم آپ کے سامنے آجائے۔ جب آپ نبوت کو کسی حد تک سمجھ لیں گے تو پھر نبوت کی سیرت خود بخود سامنے آجائے گی۔۔۔ اسی بنا پر میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے۔

موضوع تقریر

اس میں حق تعالیٰ شانہ، نے پہلے حضور علیہ السلام کی نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کے بعد "نبوت کی دلیل" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد "اجزائے نبوت" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد "مقاصد نبوت" بیان کئے ہیں۔ اس لئے اس تقریر کے کچھ اجزا ہوں گے۔ ایک دعویٰ نبوت ایک نبوت کی دلیل ایک نبوت کا تجزیہ کہ اس کے اجزا کیا ہیں اور کن کن چیزوں پر نبوت مشتمل ہے۔ نبوت کی حقیقت کیا ہے؟۔۔۔ اور پھر نبوت کے دنیا میں آنے کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟۔۔۔ یہی چند اجزا ہیں جو اس وقت تقریر کا موضوع ہیں۔ اور یہی موضوع اس آیت کا بھی ہے۔ تو تقریر در حقیقت اس آیت کی توضیح اور اس کی تشریح ہوگی آیت بہت سے علوم پر مشتمل ہے اور ہم جیسوں کا کام نہیں کہ ان علوم اور ان معارف کو بیان کر دیں یا بیان کا حق ادا کر دیں۔۔۔ لیکن بالاجمال تھوڑا ان تمام موضوعات کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔

دعویٰ نبوت اور دلیل نبوت

پہلی بات دعویٰ نبوت ہے۔۔۔ حق تعالیٰ شانہ نے خود دعویٰ کیا ہے:

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّنَ رَسُوْلاً

اللہ وہ ذات ہے جس نے اُمیّوں میں رسول بھیجا۔ ان پڑھوں میں رسول بھیجا۔ تو بعثت کا دعویٰ یہی در حقیقت، دعویٰ نبوت ہے۔ اللہ جس کو بھیجتا ہے، رسول ہوتا ہے۔۔۔ یہ تو گویا ایک دعویٰ ہوا کہ ہم نے ایک رسول بھیجا لیکن رسالت کی دلیل کیا ہے۔؟ جو ذاتِ مقدس آئی اور جس کے لئے اللہ نے بھی دعویٰ کیا کہ میں اپنا رسول بھیج رہا ہوں اور رسول نے بھی دعویٰ کیا کہ میں رسول ہوں:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا

اے انسانو! خواہ وہ کسی ملک کے باشندے ہوں، کسی قوم کے فرد ہوں آج کے ہو یا آئندہ قیامت تک کے ہوں۔ میں ان سب کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔۔۔ تو اللہ نے بھی دعویٰ کیا کہ میں رسول بھیج رہا ہوں اور رسول نے بھی دعویٰ کیا کہ میں اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہو۔

اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے کہ آپ ﷺ کی نبوت اور رسالت تسلیم کی جائے؟

وہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

اُمیّوں میں اُمّی رسول آیا

یعنی ان پڑھوں میں ایسا رسول بھیجا جو پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ یہ ان پڑھ ہونا در حقیقت نبوت کی دلیل ہے۔

آپ سوال کریں گے کہ ان پڑھ ہونا تو بظاہر عیب کی بات ہے۔ اگر ہم کسی پڑھے لکھے کو یوں کہدیں کہ تم ان پڑھ ہو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تو وہ اپنی توہین محسوس کرے گا ان پڑھ ہونا یا بے پڑھا لکھا ہونا بظاہر تو کوئی کمال کی چیز نہیں ہے، عرف عام میں اسے حقیر سمجھا جاتا ہے، عیب سمجھا جاتا ہے اور یہاں اتنے بڑے منصب کے لئے یہ دلیل بیان کی جارہی ہے کہ جس منصب سے بڑھ کر دنیا میں کوئی منصب نہیں ہے۔ آخر اس دعویٰ میں اور دلیل میں ربط کیا ہے کہ آپ ﷺ کا بے پڑھا لکھا ہونا ہی دلیل ہے کہ آپ ﷺ سب سے زیادہ عالم اور سب سے زیادہ عالم بشریت میں اونچے اور سارے انسانوں میں مقدس ترین انسان ہیں۔۔۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم سیکھنے کے لئے نہیں آتے سکھلانے کے لئے آتے ہیں۔ دنیا میں ان کا کوئی استاذ نہیں ہوتا۔ وہ براہ راست اللہ سے علم حاصل کرتے ہیں اور مخلوق کو دیتے ہیں۔

تو پیغمبر کسی کے شاگرد نہیں ہوتے۔ صرف حق تعالیٰ ان کے استاذ ہوتے ہیں۔ پھر وہ دنیا کو اپنا شاگرد بناتے ہیں اور تلمیذ بناتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم دینے کے لئے آتے ہیں، علم لینے کے لئے نہیں آتے۔

نبوت انسانیت کے لئے ذریعۂ علم

اسی واسطے کوئی بھی علم ایسا نہیں ہے جس کی بنیادیں پیغمبروں نے قائم نہ کی ہوں۔ یعنی آخرت کا علم ہو سب کی بنیادیں انبیاء علیہم السلام نے قائم کی ہیں۔۔۔ پہلے تو میں اپنے بن میں ایک دلیل سمجھا کرتا تھا کہ شاید میرا مفہوم ہو اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں سب انسان کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ شَيْئاً

"اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ اس حال میں کہ تم ذرہ برابر علم نہیں رکھتے"۔

تو انسان دنیا میں بے علم آتا ہے۔ ماں کے پیٹ سے کوئی علم لے کر نہیں آتا۔ جاہل پیدا ہوتا ہے۔

لَاتَعْلَمُوْنَ شَيْأً

عربیت کے قاعدے کے مطابق یہی نکرہ نفی کے نیچے آرہا ہے، جس کے معنی عُموم کے ہوتے ہیں کہ ذرہ برابر بھی انسان علم نہیں رکھتا، جب آتا ہے تو ایک مضغہ گوشت ہوتا ہے نہ اس میں شعور ہے نہ عقل نہ علم ہے صرف حس ہے۔۔۔ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو فرماتے ہیں:

ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئاً

"پھر ہم تمہیں ایک ایسی عمر کی طرف لوٹاتے ہیں جو ارذل ترین عمر ہے کہ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود پھر تم بے پڑھے ہو جاتے ہو، علم کے باوجود پھر بے علم بن جاتے ہو"۔

جب انسان انتہائی بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے تو آج قوت حافظہ رخصت ہو گئی تو پہلا علم ختم ہو گیا۔۔۔ حواس میں خلل آگیا تو جدید علم آنے کی صورت نہ رہی کہ نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے تو پچھلا سرمایہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور آئندہ کے آنے کی کوئی صورت نہیں رہی۔۔۔ تو جیسا آیا تھا ویسا ہی چلا جاتا ہے۔۔۔ تو حق تعالیٰ گویا اعلان کرتے ہیں کہ جب تم آئے تھے تو اس وقت بھی عالم نہیں تھے اور جب جا رہے ہو تو جب بھی نہیں۔ تو علم تمہارا ذاتی نہیں۔ اگر تمہارا ہوتا تو ماں کے پیٹ سے آتا اور قبر کے پیٹ تک ساتھ جاتا۔ علم ہمارا ہے جتنے زمانے تک ہم چاہتے ہیں تمہارے اندر ڈال دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں نکال لیتے ہیں۔ تو کسی انسان کی ذات میں علم نہیں ہے۔ تو جب سارے انسان ایسے ہی فرض کر لئے جائیں تو عالم انسانیت میں علم نہ رہا تو سرچشمہ علم کا اللہ کی ذات نکلتا ہے۔

علوم دنیوی کا ذریعہ بھی نبوت ہے اس واسطے کہ انسان جانوروں سے تو علم حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ تو اس سے بھی زیادہ کم رتبہ ہیں۔ نباتات، جمادات سے حاصل نہیں کرتا وہ جانوروں سے بھی کم حیثیت ہیں۔ تو ماتحت اور ارذل سے علم حاصل نہیں کیا جاتا۔ افضل سے حاصل کیا جاتا ہے تو

انسان کے اوپر جو افضل ذات ہے وہ تو اللہ ہی کی ہے تو سوائے اس کے کہ خدا سے انسان میں علم آئے اور کوئی شکل نہیں اور خدا سے علم آنے کی صورت یہی ہے کہ کچھ مخصوص بندے ایسے ہوں جن کو براہ راست اللہ میاں اپنا علم سکھائیں۔۔۔ وہی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔۔۔ تو ہر علم لوگوں کو پیغمبروں ہی کے ذریعہ سے آسکتا ہے۔۔۔ تو پہلے تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارا ہی مفہوم ہوگا۔۔۔

مگر بعد میں دیکھا کہ ابن حزم ظاہریؒ جو بہت بڑے جلیل القدر عالم ہیں نے ملل و نحل میں دعویٰ کیا ہے کہ :

"تمام علوم معاش کے ہوں یا معاد کے۔ سب انبیاء لے کر آئے ہیں"۔

چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام پر لغت کا علم اترا۔ فرمایا گیا :

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

حضرت ادریس علیہ السلام پر ھندسہ اور ریاضی کا علم اترا۔۔۔ حضرت داوٗد علیہ السلام نے صناع کا علم سکھلایا۔۔۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ :

كان بعض الانبياء يخطّ خطاً

بعض انبیاء خط کشی سے خطوط سکھلاتے تھے۔ یا تو لکھنا مراد ہے کہ لکھنا ان سے چلا یا خط کشی کا علم مراد ہے کہ خطوط کھینچ کر آئندہ کے بارے میں باتیں بتلانا اور قواعد سے ان کا استخراج کرنا جس کو رمل اور جفر کا علم کہتے ہیں۔ بہر حال مختلف قسم کے علوم احادیث میں آتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب ہیں اور سب کے استاذ حق شانہ ہیں۔

مُعلّمِ الانبیاء

اس لئے قرآن میں جہاں بھی پیغمبروں کے علم کا دعویٰ کیا گیا ہے وہاں انہوں نے معلوم اپنے آپ کو ظاہر کیا :

حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا :

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا

"اللہ نے آدم علیہ السلام کو ناموں کا علم سکھلادیا"۔

حضور علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے :

وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمْ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْماً

"اے پیغمبر! اللہ ہی نے تمہیں علم دیا تم پہلے سے نہیں جانتے تھے؟

فرمایا گیا :

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ

جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا.

”اے پیغمبر! تمہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں۔ ایمان کیا چیز ہوتی ہے لیکن ہم نے تمہارے قلب میں نور ڈالا جس سے تم پر یہ تمام چیزں روشن ہو گئیں۔ تو ہم ہیں ہدایت کرنیوالے“۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیر خواب کا علم دیا گیا۔ تو کہتے ہیں:

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ

”اے میرے پروردگار! آپ ہی نے مجھے مصر کی سلطنت عطا کی اور آپ نے ہی مجھے خواب کی تعبیر کا علم بخشا“۔

حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْماً

”ہم نے خضر ”علیہ السلام“ کو علم فراست سکھلا دیا تھا“۔

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کہتے ہیں:

عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ

ہمیں پرندوں کی بولیوں کا علم سکھلا دیا۔۔۔ اور یہ اللہ نے ہم کو سکھلایا۔

تو یہ تمام علوم جو انبیاء علیہم السلام میں آئے۔۔۔ ظاہر ہے کہ نہ انہوں نے کسی کالج میں تعلیم پائی نہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری ان کے ہاتھ میں تھی۔ براہ راست اللہ کی تعلیم تھی اور پیغمبر شاگرد تھے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم دینے اور سکھلانے کے لئے آتے ہیں۔ سیکھنے کے لئے نہیں آتے۔

نبوت اور طبیعت

انبیاء علیہم السلام کی فطرت پیدائشی طور پر منور ہوتی ہے۔ ان کی طبیعت ادھر ہی چلتی ہے جدھر علم اور کمال ہو۔ نقص اور عیب کی طرف پیغمبر کی طبیعت فطرۃً نہیں چلتی۔

سیر کی روایات میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جب پانچ سال کی عمر کے ہوئے تو ان کی والدہ ماجدہ نے انہیں پڑھانے کے لئے مکتب میں بھیج دیا۔ مکتب میں جا کے شاگردوں کی لائن میں بیٹھ گئے۔ تو استاذ نے کہا کہ کہو ”الف“۔

فرمایا: الف کے معنی کیا ہیں۔؟

استاذ نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں۔؟

فرماتا: کیا تو مہملات کی تعلیم دینے بیٹھا ہے۔

استاذ نے کہا کہ کیا الف کے کچھ معنی ہوتے ہیں۔ ؟

فرمایا: جو چیزیں علم کا سرچشمہ ہیں اگر وہی علم سے تعلق نہ رکھیں تو پھر علم کہاں سے آئے گا؟ انہیں حروف سے تو علم پیدا ہے۔

استاذ بے چارہ حیران ہوا کہ یہ بچہ کہاں سے آگیا ہے اس نے مجھے ہی پڑھانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا کہ کیا تو جانتا ہے کہ الف اور ب کے کیا معنی ہیں؟

فرمایا۔ ہاں جانتا ہوں۔ پوچھا کیا معنی ہیں۔

فرمایا ایسے تھوڑا ہی بتلاؤں گا۔ استاذی کی جگہ چھوڑ اور شاگردی کی لائن میں آ اور میں تیری جگہ بیٹھوں۔ اس کو اٹھایا اور اٹھا کر شاگردوں کی جگہ بٹھایا اور خود جا کر مسند پر بیٹھ گئے۔

پھر الف سے جو توحید کے مضامین اور حقائق بیان کرنے شروع کئے ہیں۔ تو استاذ بھی حیران تھا اور مکتب والے بھی حیران تھے کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔

غرض انبیاء علیہم السلام طبعی طور پر اور فطری طور پر علم کی طرف چلتے ہیں۔ یہ ان کی طبیعت ہے۔ باوجود یہ کہ فلاسفہ یہ لکھتے ہیں کہ طبیعت بے شعور ہوتی ہے۔ طبیعت میں جذبات ہوتے ہیں، شعور نہیں ہوتا مثلاً آپ کو بھوک لگتی ہے، یہ ایک طبعی جذبہ ہے لیکن آپ دلیل سے بھوک نہیں لگاتے۔ طبیعت خود بخود ابھر آتی ہے پیاس لگتی ہے تو دلائل سے نہیں لگتی۔ آپ یوں نہیں کہتے کہ چونکہ یہ وجہ ہے۔ لہذا مجھے پیاس لگنی چاہئے بلکہ بلا دلیل پیاس لگتی ہے، اس لئے کہ طبعی جذبہ ہے۔

بلکہ اگر پیاس اور بھوک لگی ہوئی ہو اور دلائل سے ثابت کیا جائے کہ ہرگز پیاس نہیں لگ سکتی۔ تب وہ بھی نہیں رکے گی۔ آپ جتنی چاہیں دلیلیں بیان کریں۔ وہ تو طبیعت سے ابھر رہی ہے۔ تو طبیعت جذبات کا سرچشمہ ہے۔ طبعیت سے شعور اور علم نہیں پیدا ہوتا۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی طبیعت بھی شعور کی طرف چلتی ہے۔ عقل تو بڑی چیز ہے، ان کی طبائع میں شعور ہوتا ہے۔ طبعی جذبات خود عاقلانہ ہوتے ہیں۔

نبوت اور بچپن کا دور

آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کے واقعات قرآن کریم میں سیارات کے بارے میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ تو ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام گہوارے کے اندر لیٹے ہوئے تھے۔ اچانک ستارے طلوع ہونے شروع ہوئے۔ اب گہوارے میں لیٹا ہوا بچہ، عقل تو بڑی چیز ہے، اس کی تو طبیعت بھی پختہ نہیں ہوتی۔ مگر گہوارے میں لیٹے جب دیکھتے ہیں کہ کچھ روشن چیزیں سامنے آئیں۔ تو طبعاً روشنی کی طرف بڑھتا

ہے ظلمت کی طرف نہیں جاتا اسے چاندنا اور روشنی محبوب ہوتی ہے تاریکی محبوب نہیں ہوتی۔۔۔ طور پر یہ بھی تمام انسان جانتے ہیں کہ روشنی ظلمت سے برتر ہے۔ اس لئے اس کی طرف کشش ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے دیکھ کر فرمایا:

هٰذَا رَبِّیْ

یہ پروردگار معلوم ہوتا ہے جو اتنی چمک دمک کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں رفعت و بلندی اور اونچائی بھی ہے اور روشنی بھی ہے۔ تو جس میں رفعت و عظمت اور نورانیت ہو۔ بس وہ رب ہوگا۔ تو فرمایا: هٰذَا رَبِّیْ

لیکن جب تارے طلوع ہو کر بالآخر غروب ہونا شروع ہوئے تو فرمایا:

لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ

ڈوبنے والی چیز رب اور خدا نہیں ہو سکتی۔ جو چیز وجود پائے اور پھر وہ زائل ہو جائے یہ شان رب کی نہیں ہے۔ اس کے بعد چاند نکلا فرمایا:

هٰذَا رَبِّیْ

یہ رب ہوگا اس لئے کہ یہ تمام ستاروں سے بڑھ گیا ہے۔ اس ایک نے وہ روشنی کی کہ سارے ستارے اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ تو فرمایا:

هٰذَا رَبِّیْ

"یہ میرا رب ہوگا"۔

فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ

جب وہ اپنی چمک دمک دکھا کر گم ہو گیا اور نیچا پڑ گیا اور آنکھوں سے چھپ گیا۔ تو فرمایا کہ یہ بھی میرا رب نہیں ہو سکتا۔۔۔ بس اب تو اگر میرا رب ہی مجھے ہدایت نہ دے تو معلوم نہیں میں کس کس چیز کو رب سمجھتا رہوں گا۔

اس کے بعد آفتاب نکلا جس نے پوری دنیا کو جگمگا دیا جس رات کو لاکھوں کروڑوں ستارے مل کر زائل نہیں کر کے کتنا ہی چاندنا کیا مگر رات ہی رہی۔ سورج کی ایک کرن نکلی اور رات غائب ہو گئی۔۔۔ اور کرن بھی ابھی نہیں نکلی وہ تو صبح صادق ہوئی جبھی رات بھاگنی شروع ہو جاتی ہے بہر حال جب سورج نکلا تو اس کی چمک دمک دیکھ کر فرمایا:

هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ

"یہ بڑا رب معلوم ہوتا ہے"۔

فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ.

جب وہ بھی اپنی چمک دکھلا کر اور پورا عروج پا کے گرنے لگا اور زوال کے طرف چلا عصر کے وقت اس کا چہرہ فق ہونے لگا۔ روشنی ماند پڑ گئی اور بالآخر منہ چھپا کے رخصت ہوا تو فرمایا:

"ان تمام چیزوں کو رب ماننا در حقیقت شرک میں مبتلا ہونا ہے۔ میں ان چیزوں سے بری ہوں جن میں تم شرک کرتے ہو اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہوئے میں اس شرک کا ساتھی نہیں"۔

تو ابراہیم علیہ السلام گھوارے میں لیٹے ہوئے بچپن کی حالت ہے اور آسمان کے حقائق میں غور فرما رہے ہیں اور خدا کے وجود پر استدلال کر رہے ہیں اگر مفسرین کا یہ قول مان لیا جائے کہ آپ گھوارے میں ہیں اور مہد کی حالت میں ہیں تو اس سے یہ مدعا ثابت ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی طبیعت بالطبع علم کی طرف چلتی ہے وہ پالنے میں ہوتے ہیں جب بھی علم ہی باتیں کرتے ہیں۔ مکتب میں پہنچا دیئے جائیں جب بھی علم ہی کی باتیں کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ جب پیدا ہوئے ہیں تو بعض روایات میں پیدائش کی کیفیت آتی ہے کہ آپ ﷺ کس شان سے پیدا ہوئے؟ نگاہیں آسمان کی طرف تھیں اور شہادت کی انگلی اٹھی ہوئی تھی۔ گویا توحید کا اعلان کرتے ہوئے آپ ﷺ دنیا میں تشریف لائے۔

گویا طبعی چیز ہے۔۔۔ لیکن طبعیت ادھر ہی چلتی ہے جو حقیقت ہے گویا انبیا علیہم السلام کی طبیعت حقائق کی طرف جاتی ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا

"حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بچپن تھا کہ ہم نے حکم دیدیا"۔

یعنی علم اور معروف لدُنی اور کمالات زبانی عطا کر دیئے گئے حالانکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بھی بچپن تھا اس لئے بعض علماء نے تو دعویٰ کیا ہے کہ سنت اللہ سے مستثنیٰ کر کے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن میں نبوت بھی دے دی گئی۔ بہر حال انبیاء علیہم السلام کی طبعیت پیدائشی طور پر پاک ہوتی ہے۔ وہ نیکی ہی کی طرف چلتی ہے۔ کبھی بدی کی طرف نہیں جاتی۔ ہمیشہ خیر کی طرف اور علم و شعور کی طرف بالطبع چلتی ہے۔ بہر حال پیغمبر دنیا میں آکر کسی سے سیکھتے نہیں کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کرتے نہ کسی مدرسہ میں جا کر پڑھتے ہیں ان کے معلم براہ راست حق تعالیٰ شانہ ہیں تو نبی کریم ﷺ کی شان فرمائی گئی کہ آپ ﷺ اُمّی اور ان پڑھ تھے یعنی کسی مدرسہ میں آپ ﷺ نے تعلیم نہیں پائی۔ کسی استاذ سے آپ ﷺ نے کچھ سیکھا ہی نہیں۔

خاندانی ذرائع علم کے انقطاع سے امیت کا تحفظ

پھر ساتھ میں یہ کہ آپ ﷺ تو امّی اور بے پڑھے لکھے تھے۔۔۔ لیکن پڑھنے کا ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ اولاد کو تعلیم دیا کرتے ہیں۔ اس واسطے کہ خود بچہ اپنے طور پر تعلیم کی طرف نہیں جاتا۔

طفل بمکتب نمی رود ولے ورندش

بچہ مکتب کی طرف خود نہیں جاتا اسے زبردستی بھیجا جاتا ہے بعض اوقات ماں باپ مار پیٹ کے بھیجتے ہیں۔ بہر حال باپ کا فرض ہوتا ہے کہ بچے کو تعلیم دلائے۔

جناب رسول اللہ ﷺ کی پیدائش سے پہلے باپ کو اٹھالیا گیا کہ ہمارے پیغمبر پر یہ تہمت ہی نہ آنے پائے کہ باپ نے تعلیم دلادی ہوگی۔ اس سے امیت اور زیادہ مضبوط ہوگئی کہ خود بھی پڑھنا لکھنا نہیں جانتے اور جو پڑھنے لکھنے کا ذریعہ تھا باپ۔ وہ پہلے ہی اٹھالئے گئے۔

اب یہ ہوسکتا تھا کہ ماں تعلیم دلائے۔۔۔ جو دانش مند مائیں ہوتی ہیں۔ اگر باپ دنیا سے رخصت ہو جائے اور وہ باپ کے قائم مقام ہو کے تعلیم دلاتی ہیں اور بعض دفعہ بچے کی تعلیم و تربیت میں باپ سے بھی آگے بڑھ جاتی ہیں۔

علماء اسلام میں ایک بڑے جلیل القدر عالم اور امام ہیں۔ جن کا نام نامی امام ربیعہؒ ہے سلف صالحین میں مشہور ہیں۔۔۔ ربیعۃ الرتے ان کا لقب ہے۔۔ یہ ماں کے پیٹ میں تھے کہ باپ کو اتفاق سے سفر پیش آگیا' اس زمانے کا تجارتی سفر تھا۔ آج کے وسائلِ سفر تو مہیا نہ تھے کہ موٹروں میں بیٹھے اور پہنچ گئے۔ ریلوں میں بیٹھ گئے اور ہزاروں میلوں کے سفر کی مسافت طے کرلی۔ ہوائی جہاز میں بیٹھے اور ہزاروں میل گھوم لئے یہ تو تھا ہی نہیں ' وہی اونٹوں کا سفر تھا۔ بہت زیادہ ہوئے گدھے پر سوار ہوگئے اور تیز چلے گھوڑا مل گیا۔

اس طرح سے سفر کرتے تھے۔۔۔ غرض امام ربیعہؒ کے والد ماجدؒ کو سفر پیش آیا تجارتی سفر تھا اور سفر بھی لمبا چوڑا۔ دس برس لگ جائیں بیس برس لگ جائیں تو خود ربیعہؒ کے والد نے ربیعہؒ کی والدہ سے کہا کہ مجھے سفر درپیش ہے۔ تجارت کا سفر ہے اور کئی ملکوں میں جانا ہے۔ بہت ممکن ہے مجھے دس بارہ برس لگ جائیں تو بیس ہزار روپیہ اپنی بیوی کو دیا۔ دس پندرہ برس مجھے آنے میں لگ جائیں تو اس سے اپنا خرچ چلاتی رہنا اور اس کا حساب رکھنا۔۔۔ چنانچہ یہ دے کر رخصت ہوگئے۔

ان کے جانے کے چار پانچ ماہ بعد امام ربیعہؒ پیدا ہوئے۔۔۔ جب ان کی چار پانچ برس کی عمر ہوئی تو ماں نے انہیں مکتب میں بٹھلادیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے مستقل استاذ مقرر کئے اور ان کی تنخواہ مقرر کی اور رقم خرچ کرنا شروع کر دی۔۔۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں ربیعہؒ نہایت جید عالم

بنے۔ حافظ بنے، محدث بنے مفسر بنے اور فقیہ و مفتی بنے حتی کہ بارہ برس کی عمر میں فتوی انہیں سپرد کر دیا گیا۔ مدینہ منورہ (زادھا اللہ شرفاً و کرامتاً) کی مسجد نبوی (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) میں ان کا درس شروع ہوا۔ بڑے بڑے جلیل القدر علماء ان کے درس میں آ کر بیٹھتے تھے۔ خود یہ لڑکے۔ ابھی ڈاڑھی بھی نہیں نکلی۔۔۔ بڑے بڑے علماء ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے لگے۔ تمام ممالک اسلامیہ میں ان کا شہرہ اور چرچا ہوا۔۔۔ تقریباً پندرہ برس کے بعد ان کے باپ لوٹے۔

جب گھر پہنچے تو امام ربیعہؒ گھر میں تھے۔ اپنی عمر کے لحاظ سے جوان ہو گئے تھے قد و قامت تھا۔ باپ نے دیکھا کہ ایک اجنبی مرد میرے گھر میں گھسا ہوا ہے۔ باپ کو آیا غصہ۔ اس نے کہا کہ :

تو کون ہے جو میرے گھر میں گھسا ہوا ہے ؟

بیٹا، باپ کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے کہا :

کم بخت! تو کون ہے جو میرے گھر میں گھسا ہوا چلا آ رہا ہے ؟

باپ بیٹے میں سر پھٹول شروع ہوئی۔ وہ اسے کہتا کہ تو اجنبی مرد میرے گھر میں کیوں آیا ہے ؟ اور بیٹا باپ سے کہہ رہا ہے۔

آوازیں جو بلند ہوئیں تو ماں نے اندر سے سنا۔ جھانک کر دیکھا تو پہچان گئی کہ میرا خاوند آ گیا ہے۔ جلدی سے آ کر بیچ بچاؤ کیا اور ربیعہؒ کو اشارہ کیا کہ تم باہر چلے جاؤ اور ربیعہؒ کے باپ کے غصہ کا یہ عالم کہ بیوی پر بے اطمینانی کا اظہار کیا کہ یہ کون مرد تھا جو گھر میں گھسا ہوا تھا۔۔۔ اس نے کہا کہ تم اطمینان سے بیٹھو۔ میں سب کچھ سمجھاؤں گی۔ خیر بمشکل تمام ٹھنڈ گیا۔۔۔ مگر وہ بار بار پوچھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کون تھا ؟ اور آتے ہی یہ سوال کیا کہ جو روپیہ میں دے گیا تھا۔ اس کا حساب دے۔۔۔ اس نے کہا کہ میں روپیہ لے کر بھاگ نہیں جاؤں گی۔ حساب بھی آپ سن لیں اور اس شخص کے بارے میں بھی آپ سن لیں۔ مگر آپ جلدی نہ کریں۔ کچھ دم لیں بمشکل تمام خاوند کو ٹھنڈا کر کے کھانا وانا کھلایا۔۔۔ اور کہا کہ آپ لباس تبدیل کریں، غسل کیا لباس تبدیل کیا، یہاں تک کہ ظہر کا وقت آ گیا۔ کہا مسجد نبوی (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) میں آپ نماز پڑھ آئیں۔ اس کے بعد آپ کو سارا حساب سمجھا دوں گی۔

یہ مسجد نبوی ﷺ میں گئے۔۔۔ تو نماز کے بعد وہاں ربیعۃ الرائےؒ کا درس شروع ہوا تو بڑے بڑے اجلہ علما ان کے سامنے بیٹھے اور اتنا بڑا درس مسجد نبوی ﷺ میں کسی عالم کا نہیں ہوتا تھا جتنا ربیعۃ الرائے کا ہوتا تھا۔۔۔ تو باپ بیٹھ گیا۔ انہیں کیا خبر کہ یہ میرا بیٹا ہے سنتے رہے، سنتے رہے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب درس سے اٹھے تو گھر آئے اور آ کر یہ کہا کہ :

"آج میں نے ایک ایسے جلیل القدر عالم کا درس سنا ہے کہ میں نے اپنی عمر میں ایسا بڑا عالم نہیں دیکھا اور میری روح تازہ ہو گئی۔ میری تمام کدورتیں دھل گئیں میں نے تو ایسا کوئی امام نہیں دیکھا۔ بہت تعریفیں کیں"۔

بیوی نے کہا کہ آپ کے نزدیک ایک اتنا بڑا عالم کتنے روپے میں تیار ہو سکتا ہے؟ کہا کتنے روپے میں؟ اگر خزانے بھی ختم جائیں تو وہ خزانہ ہلکا پڑ جائے گا اور وہ عالم بھاری ہو گا۔۔۔ پوری دنیا خرچ کر کے بھی اگر ایسا عالم بنا دیا جائے تو سستا سودا ہے۔۔۔ کہا کہ:

"یہی ہے وہ آپ کا بیٹا اور بیس ہزار روپے میں نے اس کے عالم بنانے پر خرچ کئے ہیں"۔

تو بیوی کے ہاتھ چوم لئے۔۔۔ اور جب بیٹا آیا تو اس سے معافی مانگی اور بیٹا باپ سے معافی مانگ رہا ہے کہ میری گستاخی معاف کیجئے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ آپ باپ ہیں۔۔۔ باپ کہہ رہے ہیں تو عالم کا استاذ ہے تو میرا بھی استاذ ہے، اتنا بڑا عالم ہے۔

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہے۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہے۔۔۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر باپ نہ ہو مگر ماں سلیقہ مند ہو تو وہ بیٹے کو پڑھاتی ہے۔ ربیعۃ الرائے جیسا بیٹا پیدا ہو جاتا ہے۔۔۔ اگر جناب رسول اللہ ﷺ کے والد ماجد دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، ماں پڑھاتی۔۔۔ لیکن ابھی چند ہی سال کے ہونے پائے تھے۔ کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ وہ سہارا بھی ختم ہو گیا جو علم کا ذریعہ بنتا۔ باپ بھی نہیں رہے، ماں بھی نہیں رہی۔

اب دادا نے اپنی کفالت میں لیا۔ مگر ظاہر ہے کہ دادا پھر ایک واسطہ ہوتا ہے جو تو اپنے باپ کو یا ماں کو لگتی ہے واسطہ کے ساتھ اتنی لو نہیں ہوتی۔۔۔ لیکن جتنی بھی لگتی ہے مگر آٹھ ہی برس کی عمر تھی کہ دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔۔۔ اس کے بعد ابو طالب کے سپرد کر دیا گیا کہ آپ نگرانی اور تربیت کریں۔ ابو طالب نے عمر بھر نگرانی اور دیکھ بھال کی۔۔۔ بہر حال گھرانے میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو تعلیم دے سکتا۔

قومی ذرائع کے علم کے انقطاع سے امیت کا تحفظ

اب اگر گھر میں ماں باپ اور دادا بھی نہ ہو کوئی تعلیم دلانے والا نہ رہے لیکن ملک، و قوم میں علم کا چرچا ہو، تب بھی آدمی کچھ نہ کچھ پڑھ لکھ سکتا ہے۔ وہاں ملک بھی جاہلوں کا ملک تھا دنیا کی قوموں میں ان کا لقب ہی جہلائے عرب تھا۔ یہ بھی کوئی نہیں کہتا تھا کہ عرب کے دانش مند ہیں۔۔۔ عالم نہ کہیے، دانش مند تو کہتے جہلائے عرب ان کا خطاب تھا اور اس زمانے کا نام زمانہ جاہلیت تھا۔ گویا اوپر سے لے کر نیچے تک قوم پر جاہلیت چھائی ہوئی تھی اگر حضور علیہ السلام کے لئے

گھرانے میں کوئی مربی نہیں تھا تو ممکن تھا کہ قوم کے اندر کوئی مربی بن جاتا۔ کوئی معلم بن جاتا، تو تہمت آجاتی کہ یہ جتنا عالم ہے یہ تو قوم کا سکھلایا ہوا ہے۔

طبیعت ذہین تھی، چند باتیں قوم والوں سے سنی، ذکی طبیعت تھی تو پاؤ بھر کا علم من بھر کا کر کے دکھلایا تو نبوت کے اوپر تہمت آجاتی۔ اس لئے گھرانہ جیسا تھا اس سے زیادہ قوم تھی کہ وہاں علم کا نشان نہیں تھا۔ کوئی علم کا چرچا نہیں تھا۔

محل بعثت کے لحاظ سے امیت کا تحفظ

پھر یہ ممکن تھا کہ قوم میں کوئی نہ ہو تو باہر سے اہل علم کی آمدورفت رہتی ہے۔ اگر باہر سے اہل علم اور علماء کی آمدورفت رہتی تو کچھ نہ کچھ علم کے کلمات کان میں پڑتے۔۔۔ لیکن باہر سے کوئی کیسے آتا۔؟

اس لئے کہ باہر سے جب آئیں ملک میں تجارت ہو، زراعت ہو، دولت ہو اور دولت بڑھانے کے لئے وسائل موجود ہوں، باہر کے لوگ آئیں، اہل کمال آئیں تو وہاں کی کیفیت یہ ہے:

وَادٍ غَيْرِ ذِىْ زَرْعٍ نَدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ.

نہ پانی نہ گھاس نہ دانا۔۔۔ بے آب و گیاہ ملک، سوکھی ہوئی پہاڑیاں، بگولے موجود غبار موجود ریگستان یا کوہستان، نہ نہریں نہ دلنہ نہ پانی نہ سبزہ باغ نہ کھیتی کوئی چیز بھی تو نہیں تھی۔ باہر سے کوئی آئے تو کس لئے آئے؟

اگر علم کا چرچا ہو تو اہل علم آئیں، صنعت و حرفت کا چرچا ہو تو صناع پہنچیں، تجارت اور زراعت ہو تو تاجر اور زراع پہنچیں جب کوئی سلسلہ نہیں تو باہر سے کوئی کیسے آئے؟

خلاصہ یہ نکلا کہ گھر میں حضور علیہ السلام کو کوئی پڑھانے والا نہیں تھا۔۔۔ امیوں کا ملک تھا بے پڑھوں کا ملک تھا۔۔۔ اس میں ایک شخص آکر اٹھے اور اتنے بڑے بڑے علوم پیش کرے کہ اس کے علم کو دیکھ کر دنیا دنگ رہ جائے اور نہ صرف علم پیش کرے بلکہ اتنا عظیم قانون دنیا کے آگے پیش کرے جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو اور اس حالت میں پیش کرے کہ نہ خود پڑھا لکھا نہ کسی نے اس کو پڑھایا نہ ملک میں پڑھنے لکھنے کا چرچا۔ نہ گھرانے اور خاندان میں کوئی پڑھا لکھا عالم موجود۔۔۔ اس کے باوجود ایسا علم پیش کرے کہ علماء اس کے علم کو دیکھ کر تھک جائیں، دانشمند عاجز ہو جائیں، ہار مان لیں، تو یہ اتنا بڑا علم۔۔۔ بجز اس کے کہ خدا نے سکھلایا ہو اور کیا سبیل ہو سکتی ہے؟

تو امی ہونا در حقیقت یہ حضور علیہ السلام کے نبی ہونے کی دلیل ہے۔

اُمیت نبوت کی سب سے بڑی دلیل

نبوت کی عظیم الشان دلیل یہ ہے کہ آپ امی تھے اور امیوں کے اندر مبعوث ہوئے۔ پڑھے لکھے لوگوں میں آتے تو متہم ہو سکتے تھے کہ ان لوگوں نے آپ ﷺ کو پڑھا دیا ہوگا آپ ﷺ کو کچھ سکھا دیا ہوگا۔ لیکن سکھلانے کے جتنے راستے ہیں سب بند ہیں اور اس کے جتنے اسباب ممکن ہیں سب منقطع ہیں۔ خود پڑھے لکھے نہیں اور علم وہ پیش کیا کہ پڑھے لکھے سب عاجز ہو گئے دنگ رہ گئے انگشت بدنداں رہ گئے۔ تو بجز اس کے کہ یہ علم حق تعالیٰ تعلیم فرمائیں اور کوئی صورت نہیں اور اللہ ہی کی تعلیم فی الحقیقت نبوت ہے۔ حق تعالیٰ مخفی طور پر قلب کے اوپر علوم کا القاء فرمائیں کمالات وحی الہام فرمائیں۔ غرض امیت اور ان پڑھ ہونا آپ علیہ السلام کی نبوت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔۔۔ ان پڑھ ہیں قرآن کریم لا کر پیش کیا۔ قرآن کریم وہ ہے کہ پوری دنیا اس کا مثل لانے سے عاجز آ گئی۔ چیلنج کئے گئے تحدیاں کی گئیں۔ مگر عاجز آئے اور اس کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ ہر قوم اس کی طرف جھک رہی ہے۔ اس کے اصول سے استفادہ کرنا چاہتی ہے اور اس کے فروع سے مستفید ہونا چاہتی ہے، زمانہ بڑھتا جاتا ہے، ترقی کرتا جاتا ہے، ہر پرانی کتاب پرانی بن گئی۔ مگر یہ کتاب (قرآن مجید) ہر زمانے میں نو بہ نو اور تازہ بہ تازہ ہے، تو اتنا جامع قانون پیش کرنا اور پیش کرنے والے ایک امی ہوں۔ یہ اس کے سوا اور کاہے کی دلیل ہو سکتی ہے کہ یہ اتنا عظیم قانون خدا ہی کا القاء کیا ہوا ہے۔ گویا نبوت کی سب سے بڑی دلیل امیت ہوئی۔

وحی اور عقل کا فرق

ظاہر میں تو ان پڑھ ہونا بشری کمزوری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کے حق میں یہی سب سے بڑے کمال کی دلیل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ پیغمبر کا یہ کمال نہیں ہے کہ وہ سوچ سوچ کر کچھ اچھی باتیں کہہ دے۔ سوچ کر کہیں گے وہ استدلال ہوگا وہ عقل کا شگوفہ ہوگا۔ لیکن وحی عقل سے بالاتر چیز ہے۔ عقل جب خود غلطیاں کھانے لگتی ہے۔ تو اس کی صحت و سقم معیار خود وحی بنتی ہے، جو اس کو سیدھا کرے، عقل میں استقامت نہیں پیدا ہوتی پورا اجلا نہیں پیدا ہوتا جب تک علم اور وحی اس کی مدد نہ کرے۔

دیہات میں بھی تو عقلاء ہوتے ہیں لیکن ان کی عقلیں ماند ہوتی ہیں اس لئے کہ علم سے جلا نہیں ہوتی شہروں میں تعلیم کا چرچا ہوتا ہے تو عقلیں کھل جاتی ہیں اور جلا پا جاتی ہیں یہ نہیں کہ دیہات میں عقلمند ہوتے ہی نہیں اور تقسیم یہ ہو گئی کہ خدانخواستہ دیہات میں سب بے وقوف اور شہروں میں سارے عقلمند۔ یہ نہیں۔ دیہات میں بھی دانشمند ہوتے ہیں، اعلیٰ سے اعلیٰ اہل استعداد ہوتے ہیں۔ چونکہ تعلیم نہیں ہوتی اس لئے ان کی عقلیں ماند پڑی رہتی ہیں اور علماء اسلام میں تو بڑے بڑے

ائمہ بکثرت دیہات سے اٹھے ہیں۔ امام غزالیؒ غزالہ دیہات کے رہنے والے ہیں امام رازیؒ خود دیہاتی ہیں۔ امام حسن بصریؒ خود دیہاتی ہیں غرض بڑے بڑے اجلہ علماء اور صوفیاء دیہات کے رہنے والے تھے۔ علم حاصل کیا۔ اس نے عقلوں کو جلا دی، فہموں کو اونچا کیا تو جلیل القدر علماء بن گئے غرض عقل محض جب تک اسکے علم کی مدد نہ کرے ٹھوکریں کھاتی ہے۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کا یہ کمال نہیں ہے کہ وہ عقل سے سوچ کر کچھ کہیں یہ تو ہر شخص کر سکتا ہے۔

نبی کی عقل کی بلندی

باوجودیکہ انبیاء علیہم السلام کی عقل عام انسانوں کی عقل سے بہت بلند و برتر اور اونچی ہوتی ہے۔ اس واسطے کہ اس عقل کے اوپر ہی تو علم اترتا ہے۔ جتنی بڑی عقل ہوگی اتنا بڑا علم اس کے اوپر اترے گا۔ اتنا ہی بڑا ہو کر نمایاں ہوگا۔

اگر آپ کے درس میں کوئی کم عقل بیٹھا ہوا ہو اور آپ اس کے سامنے تقریر کریں اور ایک دانش مند بیٹھا ہوا ہے۔ تو تقریر دونوں کے دماغ میں ایک پہنچی مگر ایک اٹھے گا تو آدھی بھی باقی نہیں رہے گی۔ غرض کامل العقل کے سامنے جب علم رکھا جاتا ہے تو وہ کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے اور ناقص العقل کے سامنے جب علم ہوتا ہے تو وہ آدھا بھی نہیں رہتا۔ انبیاء علیہم السلام کی عقلیں بھی سب سے زیادہ تیز ہوتی ہیں۔۔۔ اور سردار انبیاء اور خاتم الانبیا ﷺ جن کی شان یہ فرمائی گئی کہ:

اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْأَوَّلِیْنَ وَالْآخِرِیْنَ.

"اگلوں اور پچھلوں کے علوم بھی مجھے عطا کر دیئے گئے"۔

اتنے بڑے علم کے لئے اتنی بڑی عقل کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے سید الانبیا کے عقلی کارنامے ظاہر کرنے کے لئے مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یعنی ایک تو وحی الٰہی کے ذریعے پیغمبرانہ کارنامے ہیں لیکن جو خالص عقل سے فیصلے فرمائے ہیں۔ ان کے بارے میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور اس سلسلے میں واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کے عقلی کارنامے

چنانچہ اس ذیل میں ایک واقعہ مجھے یاد آگیا۔ جب غزوۂ بدر ہوا۔ ادھر سے مسلمان تو تین سو تیرہ صحابہ تھے اور ادھر ایک ہزار کا لشکر تھا تو تین سو تیرہ کا ایک ہزار سے مقابلہ تھا۔ دونوں کے کیمپ الگ الگ تھے۔ پہاڑ کے اس دامن میں مشرکین مکہ کا کیمپ تھا اور ادھر صحابہ کرامؓ تھے۔

اتفاق سے دشمن کے کیمپ کا ایک آدمی صحابہؓ کے کیمپ میں نکل آیا مشرکین کا کوئی نوجوان ادھر آگیا راستہ بھولا یا قصداً آیا۔ بہرحال ادھر آیا تو صحابہؓ نے اس کو تھام لیا۔ یہ تو بڑی اہم بات ہوتی

ہے، کہ دشمن کے کیمپ کا کوئی فوجی آدمی آجائے تو فوراً اس کو پکڑ لیا پکڑ کر اس سے پوچھنا شروع کیا کہ تمہارے کیمپ میں کتنے آدمی ہیں؟ مقصد یہ تھا کہ دشمن کی قوت کا اندازہ کیا جائے۔ تو یہ ایک طبعی بات ہے کے جب بھی دو جماعتیں لڑتی ہیں تو ہر ایک چاہتا ہے کہ میں اندازہ کروں کہ دشمن کی طاقت کتنی ہے تو صحابہؓ نے یہ چاہا کہ طاقت کا اندازہ ہو جائے۔ تو پوچھا کہ تمہارے لشکر میں کتنے آدمی ہیں؟ اس نے مرعوب کرنے کے لئے کہا کہ:

واللہ لکیثر

بہت بڑا جمع ہے، بڑی جمعیت ہے، پھر پوچھا۔ دباؤ ڈال کر پوچھا۔ سختی سے پوچھا۔ مگر اس نے بتلا کے نہیں دیا۔ بس یہ کہتا رہا۔

واللہ لکیثر

خدا کی قسم بہت بڑا مجمع ہے۔

غرض پوچھنے میں ناکام ہو گئے۔ اس میں جو کچھ آوازیں بلند ہوئیں تو حضور علیہ السلام اپنے خیمہ مبارک سے باہر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا:

یہ شور کیسا ہے؟

لوگوں نے عرض کیا:

یارسول اللہ! مشرکین میں سے ایک شخص ادھر آگیا ہے۔ ہم اس سے پوچھ رہے ہیں کہ تمہاری طاقت کتنی ہے یہ بتا کے نہیں دیتا۔

فرمایا:

اسے چھوڑ دو! کیوں خواہ مخواہ اسے پریشان کرتے ہو؟ اس کو چھڑوا دیا۔ اس نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ تو دو منٹ کے بعد پوچھا کہ:

تمہارے لشکر میں اونٹ کتنے ذبح ہوتے ہیں؟

اس نے کہا دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے ہیں۔

فرمایا:

ایک ہزار آدمی معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ایک اونٹ کو سو آدمی کھا سکتے ہیں اور دس اونٹ روز ذبح کرنا بتلا رہا ہے کہ یہ اس کی دلیل ہے کہ ایک ہزار آدمی ہے۔

غرض وہ بات جو سب مل کر حل نہ کر سکتے تھے وہ آپ ﷺ نے منٹ بھر میں حل کر دی۔ یہ وحی سے نہیں بتلایا، عقل سے بتلایا۔ محض تدبّر اور دانش سے بتلایا۔ یہ ایک تجربہ اور اندازہ سے بتلایا۔ بہرحال نبی کریم ﷺ کی عقل مصفیٰ بھی بہت اونچی تھی اور علم تو آپ کا اونچا تھا ہی۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ :

میرا پڑوسی مجھے بہت زیادہ ستاتا ہے۔ میں عاجز آگیا ہوں میں نے منتیں کیں خوشامدیں کیں ہاتھ جوڑے۔۔۔ مگر وہ باز نہیں آتا اور ہر طور پر مجھے ستاتا ہے۔ اب میں کیا کروں۔ عاجز ہو گیا ہوں۔،

حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ "تدبیر بتلاتا ہوں اور وہ یہ کہ اپنے گھر کا سارا سامان نکال کر سڑک کے بیچ میں رکھ دے اور اس کے اوپر بیٹھ جا اور جو آنے والا پوچھے کہ بھئی تم نے گھر کے ہوتے ہوئے سامان کیوں باہر ڈالا؟ اسے کہنا کہ پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ گھر چھوڑ دے۔ سڑک کے بیچ میں بیٹھ جا۔

چنانچہ اس نے جاکر سامان نکالا اور سڑک کے بیچ میں رکھ کر خود سامان کے اوپر بیٹھ گیا۔ اب جو آرہا ہے پوچھتا ہے کہ بھئی! گھر تمہارا موجود ہے کیوں سڑک کے بیچ میں بیٹھے ہو۔ اس نے کہا صاحب!

پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسول نے فرمایا گھر چھوڑ دو سڑک پر بیٹھ جاؤ' لوگوں نے کہا لعنت ہے اس شخص پر جو اپنے پڑوسی کو ستائے۔

اب جو آرہا ہے وہ اس پر لعنت کر رہا ہے' صبح و شام ہزاروں لعنتیں اس پر برسیں شام کو اس نے ہاتھ جوڑے 'اللہ کے واسطے تو اپنے گھر چل اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر تجھے کبھی نہیں ستاؤں گا۔ خود جا کے اس کا سامان رکھا اور وعدہ کیا کہ عمر بھر خدمت کروں گا اور اللہ کے واسطے دے کر اس کا سامان رکھا۔ یہ بات وحی سے نہیں ارشاد سے فرمائی تھی بلکہ یہ دانش کا اثر تھا۔

غرض انبیاء علیہم السلام جیسے اللہ کی طرف سے علم لے کر آتے ہیں۔ ویسے ہی کمال دانش لے کر آتے ہیں۔ تو جتنا بڑا علم اتنی ہی بڑی دانش۔ چونکہ سید الانبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم سب سے بڑا تھا تو دانش بھی سب سے بڑی تھی۔ اس لئے حضور علیہ السلام کی دانش مندیوں پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔

وصف امیت کو مفاخر کے مواقع پر ذکر کیا گیا

بہر حال جناب رسول اللہ ﷺ امی تھے اور امیت آپ کا سب سے بڑا وصف ہے۔ حق تعالیٰ نے اسکو مفاخر کے مواقع اور مدح کے موقع پر ذکر فرمایا ہے :

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَھُمُ

الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ

توراۃ وانجیل میں آپ ﷺ کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک رسول آئیں گے وہ نبی ہوں گے اور امی ہوں گے۔ تو صحابہؓ کو کہا جارہا ہے اور پوری انسانیت کو خطاب ہے کہ جن کا تم توراۃ اور انجیل میں ذکر پاتے ہو۔ وہ نبی امی بے پڑھے لکھے ہیں۔ تو یہ ان پڑھ ہونا اور بے پڑھا ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ آپ ﷺ نے اتنا علم پیش فرمایا وہ آپ ﷺ کا سوچا سمجھا نہیں تھا بلکہ من اللہ تھا۔ حق تعالیٰ کی جانب سے آیا ہوا تھا۔

جیسی بعثت ویسا علم

اور پھر وہ علم کیسا تھا؟

اوتیتُ علم الاوّلین والاٰ خرین

اگلے اور پچھلوں کے تمام علوم آپ ﷺ کے اندر جمع کر دیئے تھے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے:

کان النبی یُبعث الیٰ قومہٖ خاصۃ وبعثت الیٰ الناس کافۃ

”پہلے تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اقوام کی طرف بھیجے جاتے تھے اور میں سارے انسانوں کی طرف بلا تفریقِ قوم ووطن سارے وطنوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ فرمایا:

بُعِثْتُ اِلَى الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ

”کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں“۔

میری امت میں جیسے ترکی ہیں ویسے حبشی بھی آئیں گے جیسے عرب ہیں ویسے ہی ہندی اور چینی بھی آئیں گے۔ ہر خطے اور ہر ملک کے لوگوں کی طرف میں مبعوث کیا گیا ہوں تو پہلے انبیاء علیہم السلام مخصوص اقوام کی طرف آتے تھے۔ اس لئے انہیں وہ علوم دیئے جاتے تھے جو انہی قوموں کی ذہنیت کے مطابق ہوں ان قوموں کے مزاج کے مناسب ہوں اور معجزات بھی ویسے ہی دیئے جاتے ہیں گویا مخصوص علوم ہوتے تھے۔

بعثتِ عیسوی کا پسِ منظر

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف تشریف لائے اور خود فرماتے تھے۔ میں اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہوں۔ یعنی ان کی اصلاح کے لئے آیا ہوں۔ تو قدرتی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ

اسلام کو وہی علوم عطا کئے گئے جو اسرائیلی ذہنیت کے مطابق تھے دنیا کی دوسری اقوام کی کچھ بھی ذہنیت ہو۔ ان علوم میں اس کی رعایت کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ اس لئے کہ ان کے ذمہ صرف نبی اسرائیل کی اصلاح تھی۔

دوسری اقوام کی طرف جو انبیاء آئے ان قوموں کے مناسب علوم اور کمالات لے کر آئے تو جیسی ذہنیت کی قوم ہوتی ہے اسی نوع کے علوم اور مسائل دیئے جائے ہیں اور دلائل و معجزات دیئے جائے ہیں۔

بعثتِ مُوسوی کا پسِ منظر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں سحر وساحری کا زور تھا لوگ رسیوں کے سانپ بنالیتے تھے۔ لاٹھیوں کے سانپ بنا کر پیش کرتے تھے۔ ویسا ہی معجزہ دیا گیا کہ عصا ہاتھ میں دی گئی۔ زمین پر ڈالا تو اژدہا بن گیا ہاتھ میں اٹھایا تو لکڑی بن گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فن طب کا زور و شور تھا ایک ایک طبیب اٹھتا تھا اور گارنٹی دیتا تھا کہ میں مریض کو ضرور اچھا کر کے رہوں گا ابرص کو اچھا کردوں گا مادر زاد اندھوں کو اچھا کردوں گا تو اسی نوع کا معجزہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا کہ وہ دواوں سے اچھا کریں اور یہ آنکھ پر ہاتھ پھیر دیں تو آنکھ صحیح و سالم ہو جائے۔ مبروص کے بدن پر ہاتھ پھیر دیں تو برص غائب اور انتہا یہ کہ کسی پرندے کی صورت بنا کر قُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ کہہ دیں تو وہ اُڑتا ہوا دکھائی دینے لگتا تھا۔ تو اِحیاءِ موتی ' ابرص کا اچھا کرنا اور مادر زاد اندھوں کی آنکھوں کا درست کرینا۔ غرض ایسے معجزات دیئے گئے۔ جس قسم کی چیزیں اسباب کے درجے میں پھیلی ہوئی تھیں تو ہر نبی کے زمانے میں ہر نبی کو اسی قسم کے علوم دیے گئے جو اس قوم کے مناسب حال تھے۔

بعثتِ نبی اُمیّ کا پسِ منظر

جناب رسول اللہ ﷺ چونکہ تمام عالم کی طرف مبعوث ہوئے تو آپ ﷺ کو جامع العلوم بنا گیا۔ ہر ذہنیت آپ کی شریعت میں موجود ہے کہ اسی ذہن کے مطابق تربیت دی جائے۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو علمِ اسماء دیا گیا۔ فرمایا گیا:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا

تو حدیث میں ہے کہ:

عُلِّمْتُ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا كَمَا عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا

”آدم علیہ السلام کو سب نام سکھلا دیئے گئے تو وہ علم مجھے بھی عطا کیا گیا“۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر کا علم دیا گیا۔ آپ ﷺ کو مستقل تعبیر خواب کا علم دیا گیا تھا کہ تعبیرِ خواب کے اصول بیان کرنا کہ جس سے فن بن جائے۔ اور ہزاروں معبر پیدا ہو جائیں۔ تو انبیاء علیہم السلام میں حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیر خواب کا علم دیا گیا تھا لیکن حضور علیہ السلام کو تعبیر خواب کے اصول بتلائے گئے جو قرآن وحدیث میں بکھرے ہوئے ہیں جس کے ذریعے سے یہ ایک فن بنا اور اس فن کے بڑے بڑے امام اس اُمّت کے اندر پیدا ہوئے۔ جنہوں نے انہی اصول و قواعد کے مطابق تعبیرات دیں۔ تو جُزئی علم نہیں دیا گیا بلکہ کُلّی طور پر علم دیا گیا۔ غرض حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیر خواب کا علم دیا گیا یعنی جزئی خواب جو آتے تو وہ ان کی تعبیر بتلا دیتے تھے۔ مگر وہ اصول و قواعد جن سے تعبیر دینے کا طریقہ معلوم ہو جائے یہ فنی صورت نہیں تھی۔۔۔ لیکن جناب رسول اللہ ﷺ پر قواعد منکشف ہو گئے جن کو کتابوں میں نقل کیا گیا ہے اور وہ فن مستقل بن گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے خواب کا ذکر کیا جاتا تو جو تعبیر ان کے قلب میں اِلقاء کی جاتی وہ ارشاد فرماتے اور واقعہ سامنے آجاتا۔ مگر جناب رسول اللہ ﷺ جو تعبیرات فرماتے۔ ان کے دلائل بھی ذکر کئے گئے ہیں۔ علماء نے ان کو منضبط اور جمع کر کے ایک فن کی صورت دیدی۔

تعبیر خواب کا علم علومِ مقصودہ میں سے نہیں ہے۔ علوم مقصودہ میں تو احکام ہیں جن پر چل کر آدمی سعادت ابدی حاصل کرے اور اُخروی نجات حاصل کرے۔ اگر عمر بھر کسی کو خواب کی تعبیر نہ معلوم ہو یا کوئی فن نہ جانے تو قیامت کے دن یہ سوال تھوڑا ہی ہوگا کہ تم نے تعبیر خواب کا علم کیوں نہ حاصل کیا؟ تو علوم مقصودہ میں سے نہیں مگر اسکے باوجود قرآن کریم اور احادیث سے ایسے علوم کی بنیاد بھی نکلتی ہے جو مقاصد نہیں ہیں مگر قرآن وحدیث نے انکو ایک فن کی صورت دیدی ہے اور علماء نے اپنے فہم کے مطابق اس فن کو ترتیب دے دیا ہے۔

غرض دیگر انبیاء علیہم السلام کو مخصوص علوم عطا کئے گئے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی تو بنیاد ہی خواب سے چلی ہے۔ اس لئے خواب کا علم ہی ان پر وار دکیا گیا:

اِنِّی رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُھُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ

یوسف علیہ السلام نے ہی تو خواب دیکھا تھا کہ میں دیکھتا ہوں کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمر مجھے سجدہ کر رہے ہیں یہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی ابتداء ہوتی ہے وہ شمس و قمر تو ان کے والدین تھے وہ گیارہ ستارے ان کے بھائی پھر لمبا قصہ چلا اور نکلنا پڑا۔ پھر کنعان کے کنویں میں گرائے گئے پھر وہاں سے نکالے گئے۔ کنعان کے بازار میں بیچے گئے اور پھر جا کر ملکِ مصر کی سلطنت پر فائز

ہوئے۔ پھر وہ گیارہ بھائی محتاج ہو کر پہنچے انہوں نے ہی سرپرستی کی اور بالآخر حضرت یعقوب علیہ السلام بھی پہنچے۔ آپ نے جا کر تعظیم و تکریم کی۔ تو ابتداء خواب سے ہوئی تھی تو خواب کا علم ایک مستقل علم کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کو دیا گیا جو وحی کے ذریعہ ان پر اترتا تھا۔ غرض انبیاء علیہم السلام کو جتنے علوم عطا کئے گئے وہ سارے کے سارے حضور علیہ السلام کو عطا کئے گئے تو تمام علوم کا جامع نبی کریم ﷺ کو بنا دیا گیا اس لئے کہ آپ ﷺ خاتم تھے اور آپ ﷺ سب سے آخر میں تشریف لائے اور ظاہر بات ہے کہ جب تمام ماتحت عدالتوں سے فیصلہ چلتا ہے اور اپیل چلتی ہے تو آخری عدالت میں آ کر آخری حکم ہوتا ہے پھر اس کے بعد کسی اور جگہ مقدمہ نہیں جاتا۔ وہاں بالکل انتہاہی ہو جاتی ہے۔

خاتم النبین کے لئے کمالِ جامعیت ضروری ہے

کسی اسکول کا کالج میں جب اساتذہ جمع ہوں تو کچھ اساتذہ درجہ ابتدائی کے ہوتے ہیں وہ ابتدائی علوم کچھ سکھلاتے ہیں، کچھ لغات بتلا دیتے ہیں۔ اس کے بعد درجہ وسطانی کے استاذ ہوتے ہیں جو اوپر کی باتیں بتلاتے ہیں۔ جو آخری مدرس ہوتا ہے۔ جس کو پرنسپل کہنا چاہئے وہ سب سے اخیر کا مدرس ہے جو سب سے اونچی چیزیں بتلاتا ہے۔ تو قاعدہ کی بات ہے کہ پرنسل کو ان تمام چیزوں کا علم ہونا چاہئے جو ماتحت مدرس بتلا رہے ہیں۔ لیکن ماتحت مدرس کیلئے ضروری نہیں ہے کہ اتنا بڑا علم رکھتا ہو جتنا صدر مدرس رکھتا ہے۔ اسکی جماعتیں چھوٹی ہیں وہ ابتدائی چیزیں سکھلائے۔

تو حضرت آدم علیہ السلام آئے بچے کو جب آپ کچھ سکھلاتے ہیں تو پہلی چیز سکھلانے کی یہ ہے کہ آپ نام سکھلا دیتے ہیں کہ یہ روٹی ہے، یہ لوٹا ہے' یہ زمین ہے۔ یہ آسمان ہے' تو سب س پہلا علم ناموں کا ہے۔ اس کے بغیر اشیاء میں تمیز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے سب سے پہلے نبی علیہ السلام نے آ کر اسماء سکھلائے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

"آدم علیہ السلام کو ناموں کی تعلیم دی گئی"۔

اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام آئے۔ وہ اسماء جان چکے تھے۔ اب انہیں آگے کا علم دینا چاہئے انہوں نے اسماء کی مسمیات اور اشیاءِ مدلولہ کو سامنے کرا کر معرفتِ خداوندی کرائی جن کے نام پہلے سے سیکھے ہوئے تھے۔

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا

"اے لوگو! کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے کیسے آسمان کو تہہ بہ

تہہ پیدا کیا اور چاند اور سورج کے انڈے اس میں جلائے"۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا

زمین سے تمہیں اس طرح سے اگا دیا جیسے کہ درخت اگائے جاتے ہیں زمینی اجزاء جمع کر کے تمہیں انسان مجسم بنا دیا۔ تو اللہ نے تمہیں زمین سے پرورش کیا اور پروان چڑھایا۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام نے آسمان اور زمین کے نام نہیں سکھلائے بلکہ نام والی چیزیں سامنے کر رہے ہیں کہ انہیں دیکھ کر اس بنانیوالی ذات کا پتہ چلاؤ۔ تو آدم علیہ السلام نے فقط نام سکھلائے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اسماء والی چیز دکھلانا شروع کر دیں۔

پھر ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا تو انہوں نے فقط زمین و آسمان کی صورتیں نہیں دکھلائیں فرمایا گیا:

وَكَذٰلِكَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ

آسمان و زمین کا نہیں بلکہ ان کے "ملکوت" کا علم دیا۔ "ملکوت" حقائق کو کہتے ہیں یعنی زمینوں کی حقیقتیں نمایاں کیں، آسمانوں کے نفوس نمایاں کئے اور حقائق منکشف کئے۔ تو پہلے پیغمبر نے اسماء سکھلائے۔ دوسروں نے صورت دکھلائی۔ تیسرے نے حقیقت کا پتہ دیا کہ صورت کے اندر کیا حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ سیارات کے نفوس کا پتہ دیا۔ زمین کے نفوس اور حقائق کا پتہ دیا۔

اب جبکہ شئے کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ صورت بھی معلوم ہو گئی۔ اس کی حقیقت اور ماہیت بھی معلوم ہو گئی۔ اب یہ معلوم ہونے کی ضرورت تھی کہ ان کے احکام کیا ہیں؟ ان کی خاصیتیں کیا ہیں؟

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے احکام کی تفصیل بیان کی جس کو فرمایا گیا کہ ہم نے ان کو توارۃ دی۔

تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ

جس میں ہر چیز کی تفاصیل بتلا دی گئیں۔ ہر چیز کا حکم ان کے سامنے کر دیا گیا۔ تو جب ایک شئے کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ صورت کا بھی پتہ چل گیا، حقیقت کا بھی پتہ چل گیا، خاصیت اور حُکم بھی معلوم ہو گیا۔ اب حکم کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ اس کے عِلَل واَسرار اس کے دلائل اور حقائق شرعیہ کا پتہ چلے۔

نبی اُمّی کے دین کا امتیاز

تو جناب رسول اللہ ﷺ کو حقائق شرعیہ کا علم دیا گیا، یعنی اسماء بھی معلوم، صورتیں بھی معلوم، حقیقتیں بھی معلوم، احکام بھی معلوم، مگر

احکام کے حقائق کا پتہ نہیں تھا۔ تو وہ آپ ﷺ نے دیا۔ قرآن کریم کا نام ہے۔

تِبۡیَانًا لِکُلِّ شَیۡءٍ

تبیان دعویٰ مع الدلیل کو کہتے ہیں۔ جو دعویٰ کیا اس میں علت چھپی ہوئی ہے۔ جو حکم پیش کیا کیا اس میں حکمت پوشیدہ ہے، اس سے مجتہدین نے کام لیا اور اس سے علل واسرار نکال کر اس سے فقہ نکالنا شروع کیا اور احکام کا استنباط کیا۔ تو انبیاء علیہم السلام پر شرائعِ اصلیہ اُتاری گئیں اور اس اُمت کے ربانی علماء اور ائمہ پر شرائع وضعیہ اتاری گئیں کہ اصلی شریعتوں سے استنباط کر کے وضعی شریعتیں پیدا کریں۔ استنباط واجتہادِ احکام کریں۔

تو اجتہاد فقط حکم میں نہیں ہوتا۔ حکم کی علت میں ہوتا ہے کہ جب یہ علت یہاں ہے اور اس پر حکم دائر ہے، تو یہ علت اگر کسی اور جگہ پہنچ گئی تو یہ حکم وہاں بھی پہنچ جائے گا اسی کو قیاس کہتے ہیں کہ کسی علت جامعہ کی وجہ سے حکم مشترک کیا جائے کہ جو حکم یہاں ہے وہی وہاں ہے، اسی وجہ سے ائمہ اجتہاد پیدا ہوئے۔۔۔ غرض پچھلی شرائع میں صرف احکام تھے، وہ احکام جزوی طور پر اقوام کو معلوم تھے۔ وہ رسوم کے طور پر ان پر عمل کر لیتی تھیں۔۔۔ لیکن اس شریعت میں احکام کیساتھ علل واسرار بھی دیئے گئے تا کہ ایک حکم پر قیاس کر کے ہزاروں احکام پیدا کئے جاسکیں۔

نبی اُمیؐ کے علم کی شانِ جامعیت

اب ظاہر بات ہے کہ جو احکام کی علتیں بیان کرے گا۔ احکام اسے پہلے سے معلوم ہوں گے۔ اگر نہ ہوں تو علت کہاں سے بیان کرے گا۔ احکام معلوم ہوں گے اسے اشیاء کا بھی علم ہونا چاہئے ورنہ کیسے بیان کیا؟ اور جب اشیاء کا علم ہوگا تو صورتیں اور شکلیں بھی پہچانی ہوئی ہوں گی اور جب صورتیں معلوم ہیں تو ان کے اسماء بھی معلوم ہوں گے۔

اس سے اندازلگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ کا علم کتنا وسیع اور کتنا جامع ہوگا۔

اور ایسی جامع العلوم شخصیت پر جو علم اتارا جائے گا اس کی وسعت کا اندازہ بھی اسی سے کیا جاسکتا ہے چونکہ آپ ﷺ خاتم الانبیا بن کر آنے والے تھے۔ اس لئے آپ ﷺ کی ذات بابرکات میں پہلے تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم جمع کر دیئے گئے۔

ظاہر بات ہے کہ آپ ﷺ اُمی ہو کر اتنے وسیع علوم پیش کریں اور ظاہری صورت ان کے علوم کی کوئی نہیں۔ تو یہ متعین ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کو علم دینے والی فقط ایک اللہ کی ذات ہے کہ اُمی ہیں مگر سرچشمہ علوم سے براہ راست تعلق ہے، اس کی صفت علم سے آپ ﷺ کی ذات میں علم اِلقاء کیا جاتا ہے۔

تو اُمیت آپ ﷺ کی نبوت کی سب سے بڑی اور امتیازی دلیل ہے' بظاہر اُمی ہونا ایک عیب ہے مگر یہ اُمتی کے لئے ہے نبی کے لئے اس کی عظمت کی یہی دلیل ہے۔

یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔۔۔وقت کافی ہو گیا۔اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اتباع کی توفیق مرحت فرمائے اور اپنی مرضیات پر چلنا آسان فرمائے اور ہم سب کو اپنی رضا نصیب فرمائے۔ آمین

واخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین.

☆☆☆☆☆☆☆☆

راہنمائے انقلاب

صحابہ کرامؓ نے حضور اقدس ﷺ سے بلاواسطہ قرآن اخذ کیا' دل بدل گئے' روح بدل گئی' جذبات بدل گئے۔ پھر جہاں بھی یہ حضرات پہنچے وہاں بھی انقلاب بپا کر دیا۔ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے۔ خیر تخت الٹ دینا تو یہ ہے کہ ملک فتح کر لیا۔ قیصر کا ملک فتح ہو گیا' رومی ماتحت بن گئے' کسریٰ کا ملک فتح ہو گیا' ایران پر حکومت قائم ہو گئی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے مگر بڑی بات یہ ہے کہ جہاں بھی گئے۔ ملک بدل دیا' تہذیب بدل دی' مذہب بدل دیا' زبان بدل دی۔ ساری چیزوں میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ آج آپ "ممالک عربیہ" کہتے ہیں مصر کو' شام و عراق کو حالانکہ یہ عرب ممالک نہیں تھے۔ عراق جو ہے وہ خراسان کا ملک تھا۔ اس میں اور بولی بولی جاتی تھی عربی نہیں بولی جاتی تھی۔ مصر قبطیوں کا ملک تھا اس میں قبطی زبان بولی جاتی تھی۔ یہ صحابہؓ کی شان ہے کہ عراق میں پہنچے' مذہب بھی بدل دیا' زبان بھی بدل دی' مصر میں پہنچے' مذہب بھی بدل دیا اور زبان بھی عربی ہو گئی' تمدن تک بدل دیا' تہذیب تک بدل دی تو یہ تبدیلی اور انقلاب کی شان صحابہؓ میں کہاں سے آئی؟ اس قرآن کے ذریعے سے آئی۔ صحابہؓ اسی کو لے کھڑے ہوئے' اسی کو دستور العمل بنایا تو عالم کی کایا پلٹ دی۔

(از حضرت حکیم الاسلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.........اَمَّا بَعْدُ.........

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ لِمَنْ

شَاءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ. وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ.

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

احوال واقعی

بزرگان محترم!

آپ حضرات نے قرآن کریم کا ترجمہ شروع کر کے ایک بہت ہی بڑی سعادت حاصل کی ہے اور بہت بڑا اقدام کیا ہے۔ اس کی برکات دنیا میں اور آخرت میں کھلے طور پر انشاء اللہ نمایاں ہوں گی' اگر آپ نے اس کو پابندی سے اختیار کیا اور اس کو استقامت کے ساتھ آگے بڑھایا۔

کلام' آثارِ متکلم کو نمایاں کرنے کا ذریعہ ہے قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور ظاہر بات ہے کہ ہر کلام میں اثر ہوتا ہے۔ جیسا متکلم ہوتا ہے ویسے ہی اثرات اس کے کلام میں نمایاں ہوتے ہیں اور قران حکیم در حقیقت نمایاں کرتا ہے حق تعالیٰ شانہ' کی ذات کو' اس کی صفات کو' اس کے کمالات کو' اس کے افعال کو۔۔۔۔ جو شخص خیال کرتا ہو کہ میں اللہ کو آنکھوں سے دیکھ لوں تو وہ دل کی آنکھوں سے قرآن کریم کی تلاوت کرے تو حق تعالیٰ نظر آ جائیں گے۔

مقصود عبادات

کون سا ایسا بندہ ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی تمنا نہیں ہے۔ ساری عبادتیں ہی اس لئے کرتے ہیں کہ اس کو دیکھ لیں۔ اور یہ کوئی محض طبعی تمنا نہیں ہے بلکہ شرعی تمنا بھی ہے یعنی شریعت نے بھی یہی ہدایت کی ہے' فرمایا ہے۔

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّه' يَرَاكَ.

"اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ رہے ہو اگر یہ صورت نہیں تو کم از کم یہ یقین رکھو کہ اللہ ہم کو دیکھ رہا ہے"۔

یہ جو دیکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ عبادت کی ہی جاتی ہے دیکھنے کے لئے کہ اپنے معبود کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یہ تمنا ہر شخص کے دل میں ہے۔ نماز کے ذریعے دیکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب آدمی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو ظاہر میں اس کی نظر ہوتی ہے چٹائی کے اوپر اور حقیقت میں نظر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے چہرے کے اوپر لیکن آج نمازی کو

محسوس نہیں ہو رہا ہے کہ میں اللہ کا چہرہ دیکھ رہا ہوں، مگر جب قلب میں جمتے جمتے اخیر وقت آئے گا اور عمر اس تصور میں گزر جائے گی تو اچانک وہ جلوہ نگاہ کے سامنے آجائے گا جس کی تمنا میں آدمی عبادت کیا کرتا تھا تو عبادت کی ہی جاتی ہے دیکھنے کے لئے۔ مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ عابد و معبود کا آمنا سامنا ہو جائے۔ تو اس حدیث میں اس کی تدبیر بتلائی گئی کہ دل میں تصور یہ باندھے کہ میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں۔ اس کے چہرے پر میری نگاہ ہے میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر اس کے ساتھ کلام اللہ کی تلاوت ہوتی ہے نماز میں 'اس سے حق تعالیٰ شانہ' کے اوصاف و کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ٥ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں جو پالنے والا ہے جہانوں کا' جو رحمان ورحیم ہے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ قیامت کے دن کا مالک ہے۔ جس میں سارے اولین و آخرین جمع ہوں گے۔۔۔۔ آج بھی اس کی حکومت ہے مگر اس روز اس کی حکومت نمایاں ہو جائے گی سارے بنی آدم کے اوپر۔

تو حق تعالیٰ شانہ' کو دیکھنے کی مشق کرتے رہنے سے جب عمر بھر یہ تصور بنے گا تو ایک نہ ایک دن وہ چیز سامنے آجائے گی جسے دل میں جما رکھتا تھا۔ یہ ایک انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز کا وہ تصور دل میں جمالیتا ہے وہ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

تلاوت اعلیٰ ترین جمال کے حصول کا ذریعہ ہے

اسی طرح سے جب قرآن مجید پڑھتے ہوئے حق تعن کا دھیان دل میں جمائیں گے' وہ جم جائے گا۔ ایک وقت آئے گا کہ جس چیز کو دل میں جمایا تھا وہ آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔ یہ فطرت کے مطابق ہے۔ دنیا کی چیزیں چالیس دن بعد آجائیں گی' سو دن بعد آجائیں گے۔ لیکن چونکہ یہ اعلیٰ ترین جمال ہے۔ اس لئے اس میں پوری عمر چاہئے اگر پوری عمر تصور جمائے تو پھر وہ شے سامنے آجائے گی اور جمال خداوندی نمایاں ہو جائے گی۔ اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ جس کو یہ شوق ہو کہ میں حق تعالیٰ کی زیارت کروں اس کا طریق یہی ہے کہ قران کریم پڑھتے ہوئے ہر ہر حرف پر اس کا دھیان جمائے اور جما کر اس کو دل میں راسخ کرلے تو دنیا میں بھی جلوے نمایاں ہوں گے اور آخرت میں بھی دیدار ہو جائے گا۔ تو آپ نے بہت بڑا اقدام کیا ہے اور بڑی سعادت کا اقدام ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ شروع کیا ہے۔

دستور حیات

اگر ترجمہ سرسری طور پر سنا جائے تو ثواب تو ملے گا ہی لیکن اس دھیان سے ترجمہ ہو کہ میرے اللہ نے کیا کہا ہے' یہ کیا دستور العمل ہے۔ جس پر میں چلوں تو ایک

تو ہے محض معنی سمجھ لینا ایک ہے اس معنی کو دستور العمل بنانا کہ اس پر مجھے چلنا ہے چونکہ قرآن کریم قانون کی کتاب ہے اور قانون محض اس لئے نہیں پڑھایا جاتا کہ آدمی اس کو رٹ لے' اس لئے پڑھایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کے احکام اور اس کی پالیسیاں معلوم ہوں تا کہ جرائم سے بچے اور صحیح طور پر چلے قانون کے اوپر۔ تو اللہ نے اپنا کلام نازل فرمایا مگر محض تلاوت کے لئے نہیں کہ اس کو رٹ لیا جائے۔ یہ تو ابتدائی درجہ ہے اصل یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ اس میں کیا کہا جا رہا ہے۔؟ یہ کلام کیوں ہے؟ اس میں خطاب کیا ہے؟ مجھے کس طرح سے زندگی گزارنی ہے یہ میرا دستور العمل ہے اس نیت اور قصد سے اور اس عزم سے جب آپ پڑھیں گے تو کیفیات کچھ اور ہوں گی تو اس لئے۔

میں نے عرض کیا کہ ایک بہت بڑی سعادت کی بات آپ نے کی ہے کہ ترجمہ شروع کیا ہے۔

الفاظ قرآن کمالات خداوندی کے مظہر ہیں

قرآن کریم کے بارے میں حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

تبرّكْ بالقران فانّه' كلام الله و خرج منه'.

"برکت حاصل کرو اس کلام خداوندی سے اس لئے کہ یہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔

کلام جو ہوتا ہے وہ متکلم کے اندر سے نکل کر سامنے آتا ہے وہ اس کے جذبات ہوتے ہیں ان کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے۔ میں کوئی ہنسی کی بات کہوں تو آپ ہنس پڑیں گے۔ یہ لفظوں کا اثر نہیں ہے بلکہ یہ اس جذبہ کا اثر ہے جو میرے قلب میں موجود ہے کہ میں آپ کو ہنساؤں۔ لفظوں کو تو آڑ بنایا ہے۔ اگر جی چاہا کہ آپ کو رلایا جائے تو ایسا کلام کیا جائے کہ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑیں تو وہ لفظوں کا محض اثر نہیں وہ ان جذبات کا اثر ہوتا ہے جن کا بولنے والے نے قصد کیا ہے آپ نے لفظوں کو آڑ بنایا۔

اور جذبات اپنے پیوست کر دیئے قلب کے اندر کہ رو پڑا آدمی۔ پھر آپ کے دل میں جذبہ آیا کہ فلاں کو خوش کر دوں اور ہنسا دوں تو کچھ ایسے بول بولے کہ خواہ مخواہ ہنس پڑا اور خوش ہو گیا۔ وہ محض لفظ نہیں ہیں بلکہ وہ اندر کے جذبات ہیں' جنہوں نے الفاظ کا جامہ پہن کر اس کے دل میں اثر ڈالا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ' نے قرآن کریم کے الفاظ نازل فرمائے ان الفاظ میں وہ کمالات چھپے ہوئے ہیں جو بولنے والے کے اندر تھے' وہ کمالات ظاہر ہوتے ہیں ان الفاظ کے ذریعہ دنیا میں کوئی بھی جذبہ بغیر لفظوں کے سمجھ میں نہیں آتا اس لئے لفظوں کو بیچ میں لانا لازمی ہے اور ان ہی الفاظ کے اندر اللہ تعالیٰ نے کھپایا ہے اپنے کمالات کو اور ان ہی الفاظ کے ذریعہ ان کمالات کو بندوں تک پہنچایا ہے اور ان

کے دل میں اتارا ہے ان کمالات کو اپنے دل میں حاصل کرنے کی نیت سے اگر آپ تلاوت کریں گے اور دھیان اس پر دیں گے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور میرے دل میں کمالات کس طرح اتر رہے ہیں تو پھر اور ہی شان ہو گی۔ اسی کو حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے۔

تبرکْ بالقران فانّہ' کلام اللّٰہ و خرج منہ'.

"برکت حاصل کرو اس کلام خداوندی سے اس لئے کہ یہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔

بولنے والا جو بولتا ہے وہ اندر سے بولتا ہے لفظ آڑ ہوتے ہیں۔

یہ جو فرمایا ہے خرج منہ' اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ جس نے کلام اللہ سے اپنا پورا علاقہ قائم کر لیا ہے اس نے اللہ کے باطن سے علاقہ قائم کر لیا ہے اور جب وہ باطن سامنے آئے گا تو اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ بندہ جڑ چکا ہے حق تعالیٰ کے باطن سے اس کے کمالات سے۔

تو قرآن کریم ایک تبرک ہے اور جتنی بھی علم میں چیزیں ہیں وہ سب تبرکات ہیں اللہ کے۔ یہ زمین بھی اللہ کا تبرک اور عطیہ ہے جس سے ہم کام چلاتے ہیں۔ یہ آسمان اور چاند سورج بھی اللہ کے تبرکات ہیں جن سے ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن آسمان و زمین چاند سورج یہ اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں ہی ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ پردہ عدم سے وجود میں آئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکل کر نہیں آئیں۔ مگر قرآن اندر سے نکل کر آیا ہے۔ یہ تو کلام ہے اس لئے قرآن سے تعلق اللہ تعالیٰ کے باطن سے تعلق ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رسی اور اس کے تھامنے کا طریق کار

آپ کو اوپر کھینچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک رسی لٹکا دی ہے جس کے ذریعے آپ کو کھینچ لیا جائے گا۔ شیخ محی الدین ابن عربی بہت بڑے صوفیاء اور بہت بلند درجہ اکابر اولیاء میں سے ہیں وہ کہتے ہیں، صرف ان کا اپنا دعویٰ نہیں، قرآن وحدیث سے بھی یہی نکلتا ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک جتنا علاقہ ہے یہ جہنم کا علاقہ ہے اسی میں قیامت کے دن آگے اور تکلیف دہ چیزیں نمایاں ہونگی تو اب یوں سمجھنا چاہئے کہ اس وقت ہم سب جہنم میں موجود ہیں۔ حق تعالیٰ نے اوپر سے ایک رسی لٹکائی کہ جسے نکلنا ہو وہ اس رسی کو پکڑ لے جب ہم اس رسی کو کھینچیں گے وہ بھی کھنچ کر ہمارے پاس آجائے گا اور اس علاقہ سے نکل جائے گا۔

یہ رسی درحقیقت قرآن کریم ہے۔ اسی کو قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا .... بِحَبْلِ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدِ.

"اللہ کی رسی کو سب مضبوط تھام لو۔۔۔ یہ لٹکائی ہوئی رسی ہے جو عرش سے لٹکائی

گئی ہے اور زمین پر آئی ہوئی ہے"۔

جب وہ رسی کھنچ کر اوپر جائے گی تو جنہوں نے اسی رسی کو تھام رکھا ہے وہ بھی اس علاقہ جہنم سے کھنچ کر اوپر کو چلے جائیں گے۔ تو کفار کو جہنم میں داخل کرنے کی صورت نہیں ہو گی وہ تو ہیں ہی جہنم میں۔ مومن کو بھاگ نکلنے کی ضرورت ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ رسی کو مضبوط تھام لے جب رسی کھینچی جائے گی یہ بھی کھنچ کر اس علاقہ جہنم سے نکل جائے گا۔

اب ظاہر بات ہے کہ رسی کوئی سن کی بٹی ہوئی تو ہے نہیں اور ریشم کی نہیں کہ اس کو ہاتھ سے تھاما جاسکے۔ یہ تو علوم و کمالات کی رسی ہے جس کے تھامنے کے معنی یہ ہیں کہ دل سے یمان لا کر اسے دل میں جمائے۔ یہ ہاتھ سے پکڑنے کی چیز نہیں' دل سے پکڑنے کی چیز ہے۔۔۔ جس نے اس رسی کو دل کے ہاتھوں سے تھام لیا وہ بٹ گیا اللہ تعالیٰ کی رسی میں۔ اس لئے فرمایا گیا کہ وہ بھی کھنچ کر اللہ تعالیٰ کے باطن تک پہنچ جائے گا۔ یعنی اس کے ساتھ مربوط ہو جائے گا۔

عظمت و محبت کا تقاضا

آدمی کسی کو دور سے بھی دیکھ سکتا ہے مگر اتنا قریب ہو کہ وہ اپنے پہلو میں ہی بٹھلا دے۔ تو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ملنا بھی ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی اپنے کسی بڑے سے ملتا ہے تو دیکھنے پر قناعت نہیں کرتا جی چاہتا ہے کہ مل بھی لوں' مصافحہ بھی کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ملامس ہو گیا بدن سے اور پھر اور بہت چاہتا ہے کہ معانقہ بھی کر لوں تاکہ پوری طرح سے اسکے ساتھ پیوست ہو جاؤں تو محض دیکھ لینے پر ہی قناعت نہیں بلکہ ملنے کو بھی آگے بڑھتا ہے اور ملنے میں بھی یہ نہیں کہ چھوڑ دے بلکہ معانقہ کر کے چمٹ بھی جاتا ہے تاکہ پوری طرح سے اس کے اثرات اس کے اندر آجائیں۔

یہ آدمی کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ انسان کی جس طرح کی عظمت دل میں ہوتی ہے اس انداز سے ملنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ محبت کا یہی تقاضا ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہ' نے یہ قرآن اس لئے اتارا کہ اس کے کلام کو پڑھ کر دیکھ لو اس واسطے کہ اس کے کمالات نظر آجائیں گے' اس کے بعد دل میں جم جائیں گے۔ جب دل نے ان کے کمالات کو قبول کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس رسی کو دل کے ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا۔ پھر جب حق تعالیٰ اس رسی کو کھینچیں گے' تو یہ بھی کھنچ کر چلا جائے گا' ملاقات بھی ہو جائے گی' معانقہ بھی ہو جائے گا اور حق تعالیٰ کے پہلو میں جا بیٹھے گا۔

قیامت میں اوصاف کے لحاظ سے جماعت بندی

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن کچھ پارٹیاں بنادی جائیں گی' مختلف

اوصاف کے لحاظ سے ان میں کچھ وہ ہوں گے جن کے پاس اعمال سیۂ ہیں ان میں جو عملی غالب ہو گا' اسی اعتبار سے گروہ بنائے جائیں گے۔ مثلاً معاذ اللہ زانیوں کا ایک گروہ ہو گا' چوروں کا ایک گروہ ہو گا' اسی لحاظ سے اور دوسری پارٹیاں ہوں گی۔۔۔۔ اور کچھ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کے پسندیدہ اور محبوب بندے ہیں۔ ان میں جو عمل سب اعمال میں غالب ہو گا اسی کے اعتبار سے جماعت بندی کر دی جائیگی۔ مثلاً جس شخص کو اپنے اعمال میں نماز سے زیادہ شغف رہا ہے اس کو نمازیوں کی جماعت میں شامل کر دیا جائے گا اور جس کو روزہ سے زیادہ شغف رہا ہے اس کو روزے داروں کی جماعت میں شامل کر دیا جائے گا۔ جس میں صدقات کا غلبہ تھا اس کی ویسی ہی جماعت بنا دی جائے گی اور ہر جماعت لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ہو گی' جس میں بھی جو وصف اور عمل غالب رہا ہے اسی انداز سے ان کی جماعتیں بنا دی جائیں گی۔

اسی طرح سے دنیا میں جو اہل مصیبت گزرے ہیں ان کی جماعتیں الگ ہوں گی مثلاً نابینا جتنے ہیں ان کی ایک جماعت کی جائے گی۔ آدم علیہ السلام کی اولاد میں جتنے نابینا گزرے ہیں وہ سب ایک جماعت میں ہوں گے اور ان کا امام بنایا جائے گا حضرت شعیبؑ کو کہ آخری عمر میں ان کی بینائی زائل ہو گئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں سفید جھنڈا ہو گا۔ وہ بجلی کی طرح چمکتا ہو گا۔ حق تعالیٰ ان اندھوں سے خطاب کر کے فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں تمہاری آنکھیں چھین لی تھیں۔ ایک بڑی نعمت سے تمہیں محروم کر دیا تھا۔ مگر تم نے صبر کیا اور کوئی جزع فزع نہیں کیا آج تم کھلی آنکھوں ہو اور یہ حضرت شعیبؑ نورانی جھنڈا لئے جا رہے ہیں۔ اب تم میرے چہرے اور جمال کو دیکھتے رہو اور ابدالآباد تک تمہاری بینائی آج کھول دی گئی اور فرمایا جائے گا کہ۔

"یمین عرش (عرش کی دائیں جانب) میں آ کر قیام کرو۔ تم ہمارے مہمان ہو"۔

ان کے سامنے نعمتیں رکھی جائیں گی خدا کا کتنا بڑا احسان ہو گا کہ میدان محشر بپا ہے۔ مخلوق کا حساب کتاب ہو رہا ہے اور یہ نابینا لوگ کھلی ہوئی آنکھیں ہیں اور اللہ کے یہاں مہمان ہوں گے اور نعمتیں استعمال کر رہے ہوں گے۔

تو جب ان نابینا حضرات کی جماعت شان سے آئے گی اور حق تعالیٰ ان سے کلام فرما کر مہمان بنائیں گے ٹھیک اسی وقت میں علماء کی جماعت آگے بڑھے گی اور علماء کہیں گے کہ ہماری ہی تلقین سے اور ہمارے ہی بتلانے سے انہوں نے صبر کیا' ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں اور ان اندھوں کو یمین عرش میں جگہ دیدی گئی' حق تعالیٰ ان نابینا حضرات سے فرمائیں گے کہ انہیں کہنے دو تم آؤ یمین عرش میں وہ عرش کی دائیں جانب نعمتوں میں ہوں گے علماء وہیں کھڑے رہیں گے۔

اس کے بعد بلایا جائے گا ان کو جو جذام کے مرض میں مبتلا تھے کہ دنیا والوں نے ان کو

اچھوت بنادیا تھا۔ محشر کے دن ان کے بدن چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے اور ان کا امام بنایا جائے گا حضرت ایوب علیہ السلام کو اور ان کو سبز جھنڈا دیا جائیگا۔ کیونکہ انہوں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں اور بہت بیماریاں سہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم بھی یمیں عرش میں آجاؤ۔

پھر علماء ابھریں گے کہ ہمارے ہی کہنے سے توانہوں نے صبر کیا اور دل میں تسکین پیدا ہوئی اور ہمیں ہی کوئی پوچھتا نہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے' کہنے دو تم ان علماء کو' تم آگے چلو۔ اسی طرح سے معاملہ ہوگا۔

اہل علم کا اخروی مقام

اور اہل مصیبت جب سب نمٹ جائیں گے۔ پھر حق تعالیٰ علماء کو خطاب فرمائیں گے کہ تم صرف نعمتیں ہی حاصل کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم صرف اس لئے پیدا کئے گئے تھے کہ صرف اپنی ذات کا ہی نفع ڈھونڈو؟ بلکہ تم بھیجے گئے تھے دنیا کی ہدایت کے لئے یہاں لوگوں کی شفاعت کرو کھڑے ہو کر جب سب کو بخشوالو گے تب تم آگے بڑھنا۔ تم اپنے کام کے لئے نہیں پیدا کئے گئے بلکہ دنیا کے کاموں کے لئے پیدا کئے گئے تھے کہ دنیا کے انسانوں کو نفع پہنچاؤ۔ اس وقت ان کا رتبہ ظاہر ہوگا۔ وہ شفاعتیں کریں گے اور لاکھوں آدمی ان کی شفاعت کی بدولت بخشے جائیں گے۔ رب العالمین فرمائیں گے کہ اب تم نے اپنا کام پورا کیا ہے۔ دنیا میں ہدایت کی' یہاں شفاعت کی۔ تم یہ چاہتے تھے کہ تمہیں کوئی عہدہ مل جائے' کوئی نعمت مل جائے۔ یہ تمہارا کام نہیں تھا۔ تمہارا کام یہ تھا کہ دنیا کو سب کچھ ملے اور تم الگ کھڑے رہو اس کے بعد تمہیں اجر ملے تو بہر حال یہ جو یمین عرش میں جائیں گے یہی ہیں وہ جسے میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پہلو میں جگہ مل جائے گی کہ دنیا میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کو عقیدہ کی آنکھ سے دیکھا تھا' قبر میں اس کے جلوے دیکھے' میدان محشر میں اس کی تجلی دیکھی اور آخر میں جا کر مل جائیں گے یمین عرش میں حق تعالیٰ کے پہلو میں بیٹھ جائیں گے۔

تجلیات قرآن کریم کے ظہور کی ترتیب

یہ قرآن کا اثر ہوگا کہ آپ پڑھیں گے' پڑھ کر اس کی چیزیں جمائیں گے' دل میں اللہ تعالیٰ کے کمالات آئیں گے' عظمت بیٹھے گی' ایمان مضبوط ہوگا۔ اس کے انوار و برکات قلب کے اندر آئیں گے اور پھر وہ انوار محسوس طریق پر نمایاں ہوں گے اور پھر اس سے زیادہ محسوس طریق پر قبر میں نمایاں ہوں گے اور پھر اس سے زیادہ محسوس طریق پر تجلیات کی صورت میں میدان محشر میں نمایاں ہوں گے اور اس کے بعد حق تعالیٰ کا پہلو ہے کہ بس ہمارے پاس آجاؤ۔ تو وہ ساری چیزیں پوری ہو جائیں گی جو عبادت سے مطلوب تھیں کہ دیکھ بھی لیں' اپنے معبود کے قریب بھی

ہو جائیں۔ اس سے مل کر بھی لیں۔ اس کے پہلو میں بھی جا بیٹھیں۔ یہ صرف قرآن کریم ہی کے ذریعہ تمنا پوری ہو سکتی ہے۔۔۔ تو آپ نے ترجمہ شروع کرا کر قرآن کریم کا در حقیقت راستہ کھولا ہے مسلمانوں کے لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں اور مل بھی لیں اور اس کے پہلو میں بھی جا بیٹھیں اور اس سے ملاصق ہو جائیں۔ آپ نے یہ بہت بڑی سعادت کا کام کیا ہے۔

قرآن کریم کتاب انقلاب

یہی قرآن کریم ایک انقلابی کتاب ہے۔ دلوں کو بدل دیتی ہے۔ روحوں کو بدل دیتی ہے۔ ں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا وہ تو نہیں جانتے کہ یہ کیا چیز ہے۔ کیونکہ انہوں نے استعمال نہیں کیا اس کو اور جب تک کسی چیز کو استعمال نہ کیا جائے اس کے فوائد معلوم نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس کا کوئی اثر ظاہر ہو سکتا ہے' جیسے قیمتی سے قیمتی دوا ہو لیکن اس کو استعمال نہ کیا جائے تو وہ کیا اثر کرے گی۔ مثلاً شہد کو کہا گیا ہے کہ اس میں شفا ہے لیکن کوئی شخص شہد سے گھبرائے اور خیال کرے کہ شہد میرے گھر میں بھی داخل نہ ہو تو کیا فائدہ ظاہر ہو گا۔ ایسے ہی اگر قرآن کریم سے بچتے رہیں کہ قرآن کریم کو سنے بھی نہ اور اس کے پاس پھٹکے بھی نہ تو کیا اس کا نور ظاہر ہو گا' اسی کے لئے نور ظاہر ہو گا جو اس کو آکر سنے' اس کو پڑھے' اس کو دل میں جمائے۔ اسی سے اس کے انوار و برکات ظاہر ہوں گے تو اس لئے دیکھا جائے۔۔۔ تو قرآن کریم ایک انقلاب کی کتاب ہے' دلوں کو بدل دے' روحوں کو بدل دے' کایا پلٹ دے' زمانہ جاہلیت جو اسلام سے قبل کا زمانہ ہے اس کے اندر دلوں میں روحوں میں ہر برائی جمی ہوئی تھی' شرک میں وہ مبتلا تھے۔۔۔ بدعات میں وہ مبتلا تھے' منکرات میں وہ مبتلا تھے۔۔۔ چوری' ڈکیتی' زناکاری' ساری حرکتیں ان کے اندر موجود تھیں۔ نہ عقیدہ صحیح نہ عمل صحیح نہ مال درست بس جیسے جانور گزارتے ہیں۔ اس طرح سے زمانہ جاہلیت کا دستور تھا۔ رات دن ڈکیتی' رات دن مار دھاڑ' قبیلوں میں جنگ اور کشت و خون' ہر وقت کا یہی مشغلہ تھا' قرآن کریم آیا' جن دلوں نے اس کو قبول کیا اور اس سعادت کو حاصل کیا تو ایک دم کایا پلٹنا شروع ہو گئی۔ پہلے ان کا نام تھا جہلائے مکہ۔ جب اس کو قبول کر لیا اب ان کا نام ہو گیا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

تو جہلائے مکہ سے بن گئے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم یا وہ زمانہ جاہلیت تھا اب اس کا نام ہو گیا خیر القرون کہ دنیا کے سارے زمانوں میں بہترین زمانہ ہے یہ' وہ لوگ جو جہالت میں مبتلا تھے۔ وہی حضرات علماء کے استاذ بنے' عرفاء کے شیخ بنے۔ پوری دنیا کو نور سے منور کر دیا۔ ایک دم کایا پلٹ ہو گئی۔ جو ایک پیسے کے لئے ڈکیتیاں ڈالتے تھے' گردنیں کاٹتے تھے اور مرتے تھے پیسے کے اوپر۔ آج یہ کیفیت ہے کہ گھر بھرے ہوئے ہیں خزانوں سے اور وہ رخ کر کے بھی نہیں دیکھتے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ خزانے میں تشریف لے گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے' بیت المال میں لاکھوں روپیہ جمع تھا۔ سونے چاندی کو خطاب کر کے فرمایا۔

یَادُنْیَا غُرِّیْ غَیْرِیْ.

''اے دنیا! دھوکہ کسی اور کو دینا''۔

ہم تیرے دھوکہ میں آنے والے نہیں اور خزانچی کو اسی وقت حکم دیا کہ غرباء میں دولت تقسیم کی جائے۔ رات بھر دولت تقسیم ہوئی۔ یہ لوگ تھے جو پہلے ایک ایک پائی کے لئے جان دیتے تھے۔ آج خزانے پڑے ہوئے ہیں اور اس کو خطاب کر رہے ہیں کہ ہم تجھ پر رجھنے والے نہیں۔ ہم تجھ پر مرنے والے نہیں ہیں۔ یہ کایا پلٹ کہاں سے ہوئی؟ اس قرآن نے ہی تو دلوں کو بدل دیا تھا' روحوں کو پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ پہلے مال کی محبت تھی۔ اب کمال کی محبت ہوئی' پہلے مخلوق کی محبت تھی اب خالق کی محبت شروع ہوئی اور محبت میں مستغرق ہو گئے' غرق ہو گئے۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' لکھ پتی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ہیں۔ ایک دن گھر میں تشریف لائے تو اہلیہ محترمہ نے دیکھا کہ کچھ غمگین اور اداس ہیں۔ پوچھا کہ آج آپ اداس کیوں ہیں فرمایا کہ خزانے میں روپیہ زیادہ جمع ہو گیا ہے دل کے اوپر بوجھ پڑ رہا ہے کہ اتنی خرافات کہاں میرے سر پر لد گئی۔ اس کی وجہ سے غمگینی ہے۔ بیوی بھی صحابیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ انہوں نے کہا کہ پھر غم کی کیا بات ہے اللہ تعالیٰ کے نام پر غرباء کو تقسیم کر دو۔۔۔۔ بس تشریف لے گئے اور خزانچی کو بلا کر حکم دیا کہ غرباء میں روپیہ تقسیم کیا جائے' یتیموں اور بیواؤں کی مدد کی جائے۔ تمام رات مدینہ کی گلیوں میں روپیہ تقسیم ہوتا رہا۔ صبح کو جو حساب لگایا تو رات بھر میں چھ لاکھ روپیہ تقسیم ہوا۔ صبح کو گھر پہنچے تو بہت ہشاش بشاش۔ بیوی کے ہاتھ چومے اور کہا کہ بہت عمدہ تدبیر بتلائی تھی میرا دل ہلکا ہو گیا۔

تو پہلے یہ کیفیت تھی کہ ان کا دل ہلکا ہوتا تھا جب دولت زیادہ ہوتی تھی یا آج ہلکا ہونے لگا جب دولت ختم ہو جائے۔۔۔ یہ کایا پلٹ نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ انقلاب نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ دل بدل گئے۔

عورتوں میں انقلاب

دولت کی محبت سب سے زیادہ عورتوں کو ہوتی ہے اور ان ہی سے یہ روگ مردوں کو بھی لگتا ہے اگر عورتیں نہ ہوں تو یہ بھی اس روگ میں مبتلا نہ ہوں اور یہ محبت عورتوں میں اس لئے ہوتی ہے یہ پیدا ہوتے ہی زیوروں کی جھنکار میں پرورش پاتی ہیں۔ آج اس کے کان میں سوراخ کر دیئے تو بالیاں پڑ گئیں۔ ناک پھوڑ دی تو اس میں لونگ گھس گئی۔ ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کی بیڑیاں ڈال دیں۔ وہ بندھ گئیں۔ تو پیدائش سے لے کر وہ مبتلا ہوتی

ہیں سونے چاندی میں اس لئے ان کے دل میں محبت بیٹھ جاتی ہے سونے چاندی کی۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ.

"کیا یہ عورت جو رات دن زیوروں کی جھنکار میں پرورش پارہی ہے یہ عقل کامل رکھتی ہے؟"

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر خاوند سے تو تو' میں میں ہو جائے تو خاوند تو اپنے دلائل پیش کرے گا اور یہ وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے جائے گی۔ نہ دلیل نہ حجت' یہ اسی پر جمی رہے گی۔ تو جو کلام کی ایک قوت ہوتی ہے وہ نہیں رہتی۔ کیوں کہ علم نہیں اور علم اس لئے نہیں کہ مال یعنی سونا چاندی اندر گھسا ہوا ہے۔ علم نورانی ہے اور دولت سیاہ چیز ہے اور سیاہی کے ساتھ نور جمع نہیں ہوتا ہے اور سیاہی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ آپ خود دیکھتے ہیں۔ اب تو خیر وہ روپیہ نہیں رہا سونے چاندی کا اب تو کاغذ رہ گئے ہیں مگر جب سونے چاندی کے سکے تھے تو اگر پچاس روپیہ گن لیں تو انگلیاں سیاہ ہو جاتی تھیں۔ تو سونے چاندی میں کالک بھری ہوئی ہے۔ گنتے گنتے ہاتھ پیر سیاہ ہو جاتے تھے۔

جو عورتیں رات دن پیروں میں زیور پہنتی ہیں تو ان کے ٹخنوں پر سیاہ داغ پڑ جاتے ہیں۔۔۔

حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ میں نے سنا اسی کے بارے میں فرمایا کہ ؎

"دست زر آلود ایں قدر بدبو میکند۔ قلب زر آلود چہ قدر بدبو خواہد کرد"۔

یعنی جو ہاتھ سونے چاندی کو لگتے ہیں اس میں اس قدر بدبو آجاتی ہے اگر کوئی اٹک جائے سونے چاندی میں تو دل میں کتنی بدبو پیدا ہوگی اور کتنا تعفن پیدا ہوگا۔

تو عورتوں کے بارے میں فرمایا ؎

اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ.

"جب وہ عورتیں زیورات میں ہی نشو و نما پاتی ہیں تو ان کے اندر علم و کلام کی قوت کہاں سے ہو سکتی ہے"۔

وہ مرغ کی ایک ٹانگ ہانکے جائیں گی نہ حجت نہ دلیل۔ دوسرا لاکھ دلیل بیان کرے وہ اپنی ہی ہٹ پر رہیں گی۔ چونکہ دولت سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے عورتوں کے دل اتنے بدل دیئے تھے کہ بجائے محبت کے بیزاری پیدا ہو گئی تھی سونے چاندی سے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کے حاکم ہو گئے تھے تو انہوں نے دو بورے بھر کر گنیوں اور زیوروں کے اپنے خالہ کے ہاں ہدیہ کے طور پر بھیجے۔ تو اندازہ کیجئے کتنے ہزاروں اور کتنے لاکھوں روپے ہوں گے جبکہ دو

بوریاں بھری ہوئی ہوں۔ ایک طرف سونا اور ایک طرف چاندی یہ تمام سامان لے کر خالہ کے گھر پہنچے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ میں کیا کروں گی اتنی دولت کو غریبوں میں تقسیم کردو۔ وہ دولت غریبوں کو تقسیم ہونی شروع ہو گئی صبح سے تقسیم ہونی شروع ہوئی اور شام تک دو بوریاں خالی ہو گئیں۔ باندی نے عرض کیا کہ ام المومنین! آپ پر فاقہ ہے کچھ آپ نے بھی رکھ لیا ہوتا۔ فرمایا کہ بیوقوف پہلے سے کیوں نہیں کہا۔ دو چار روپے میں بھی رکھ لیتی۔ تو حالت یہ کہ ذہن میں یہ بھی نہیں کہ اتنے وقت سے فاقہ میں ہوں اور مجھے کچھ رکھ لینا چاہئے۔۔ اس قدر گویا کہ غنی ہو گئی تھیں زر سے اور دولت سے کہ یہ بھی یاد نہیں تھا کہ مجھے فاقہ ہے کہ کچھ مجھے بھی رکھنا چاہئے باندی کے یاد دلانے پر یاد آیا۔

تو عورت کے دل میں زیادہ محبت ہوتی ہے، یہ انقلاب تھا قرآن کا پیدا کیا ہوا کہ عورتوں کے قلوب کو اتنا پاک بنا دیا کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں آتا تھا کہ پیسہ پاس نہیں ہم فاقہ سے ہیں۔ یہ قرآن کا ہی تو انقلاب تھا۔۔۔ تو قرآن کریم دنیا میں بھی انقلاب پیدا کرتا ہے آخرت میں بھی۔ دنیا میں تو یہ کہ دل کے اندر بجائے کفر و معصیت کے ایمان کی حلاوت پیدا کرتا ہے اور آخرت میں جہنم سے بچا کے جنت میں پہنچاتا ہے۔ فتنوں سے نکال کر امان میں پہنچاتا ہے، قرآن یہاں بھی انقلاب لاتا ہے اور آخرت میں بھی انقلاب لائے گا اور برزخ میں قبر کے اندر بھی انقلاب لائے گا۔

قرآن کریم کا برزخ میں انقلاب

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سورۂ تَبَارَکَ الَّذِیْ کے بارے میں حکم یہ ہے کہ عشاء کے بعد اس کی تلاوت کر کے سویا کرو۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا۔

هِیَ الرَّافِعَةُ هِیَ الْمُنْجِیَةُ هِیَ الْمَانِعَةُ.

یہ رافعہ بھی ہے کہ عذاب کو رفع کرتی ہے۔ یہ مانِعَۃ بھی ہے کہ روک لگاتی ہے مصیبتوں پر، یہ مُنجیہ بھی ہے جو نجات دلاتی ہے عذاب سے۔ تو قبر کے اندر نجات دلا دینا، عذاب کو دفع کر دینا اور روک دینا یہ خاصیت ہے تَبَارَکَ الَّذِیْ کی۔۔۔۔ اسی واسطے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سوتے وقت سورۂ تَبَارَکَ الَّذِیْ پڑھ کر سویا کرو۔ اس لئے کہ سونا اور مرنا برابر ہے۔ سونے والا گویا کہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ موت سہل ہونے کے لئے ہی فرمایا کہ سورۂ تَبَارَکَ الَّذِیْ پڑھو۔ یہ "برزخ" میں بھی نجات دلائے گی۔ میدان محشر میں بھی بچائے گی۔ یہ امر ہے شریعت کا۔ اگر کوئی حافظ ہے تو حفظ پڑھ لیا کرے اور حافظ نہیں ہے تو دیکھ کر پڑھ لیا کرے۔۔۔ پانچ منٹ کی کیا بات ہے۔ عشاء کے وضو ہوتے ہی پڑھ کر سو جائے اس سے برکات حاصل ہوں گی۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹا دیا جائے گا اور عذاب کے فرشتے ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ اس وقت سورۂ تَبَارَكَ الَّذِیْ کو ایک شکل دے دی جائے گی وہ اس مشکل میں آکر کہے گی کہ خبر دار جو تم آگے بڑھے اس عذاب کو فوراً روک لو تو ملائکہ عذاب کہیں گے کہ ہم کو تو اللہ کا حکم ہے آپ کے کہنے سے کیسے رک جائیں وہ کہے گی کہ میں اللہ کا کلام ہوں۔ فرشتے کہیں گے کہ یہ سب کچھ صحیح ہے کہ آپ اللہ کا کلام ہیں مگر وہاں سے ہمیں کلام والے کا آرڈر ہے تو عذاب سے ہم کیسے رک جائیں تو یہ سورت غضبناک ہو جائے گی۔ اس پر ملائکہ عذاب کہیں گے کہ آپ اللہ سے کہیں۔ ہمیں نہ روکیں۔ ہم آپ کے کہنے سے رک نہیں سکتے۔ ہم تو آرڈر کے پابند ہیں وہ سورۃ کہے گی کہ ایک منٹ رک جاؤ۔ اس وقت عروج ہو گا اور پہنچے گی حق تعالیٰ شانہ ' کی بارگاہ میں اور جا کے کہے گی بہت غصے سے کہ یا تو اے اللہ مجھے اپنے کلام سے نکال دے کہ میں آپ کے قرآن کی سورت نہ رہوں اور اگر میں سورت ہوں تو اس کے کیا معنی ہیں کہ ملائکہ میری تعمیل نہیں کرتے میں تو آپ کا کلام ہوں میں آرڈر دیتی ہوں کہ وہ روکیں عذاب کو مگر وہ رکتے نہیں یا تو مجھے قرآن سے نکال دیجئے اور رکھنا ہے تو اس کے کوئی معنی نہیں کہ میرا حکم نہ چلے۔ حق تعالیٰ شانہ ' فرمائیں گے۔

میں دیکھتا ہوں تو تو بہت غصہ میں بھری ہوئی ہے۔۔۔ تو کہے گی۔

وَحَقٌّ لِیْ اَنْ اَغْضَبَ۔

"مجھے حق ہے کہ میں غصہ کروں"۔

میں کوئی معمولی چیز نہیں ہوں میں آپ کا کلام ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ میری تعمیل نہ کی جائے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے اس میت کو تیرے سپرد کر دیا جو مناسب سمجھے تو کر۔۔۔ اب آئے گی آرڈر لے کر کے اور ملائکہ عذاب سے کہے گی خبر دار! جو تم آگے بڑھے۔ یہ آرڈر ہے۔

تو حدیث میں آتا ہے کہ وہ ملائکہ منہ بسورتے ہوئے رخصت ہونگے جیسے کوئی شرمندہ شکست کھا کر جاتا ہے کہ ہماری کچھ بات بھی نہ چلی۔ وہ منہ بسورتے ہوئے واپس ہوں گے اور قبر خالی ہو جائے گی ملائکہ عذاب سے۔

حدیث میں ہے کہ یہ سورۃ میت کے منہ پر اپنا منہ رکھے گی جیسے کوئی بوسہ لیتا ہے اور کہے گی کیسا مبارک منہ ہے کہ جس سے میری تلاوت کی گئی تھی۔ پھر سینے پر منہ رکھے گی کہ کیسا مبارک سینہ ہے کہ جس میں میں محفوظ تھی۔ پھر قدموں پر منہ رکھے گی کہ کیسے مبارک قدم ہیں کہ جن سے کھڑے ہو کر میری تلاوت کی گئی تھی اور اس وقت میت سے کہے گی کہ تو آرام سے اور اطمینان سے رہ کوئی تیرے اوپر بار نہیں میں موجود ہوں فکر کرنے کی بات نہیں۔ تو قرآن کریم دنیا میں کایا پلٹ کر کے قلوب کو نورانی بنا دیتا ہے۔ برزخ میں کایا پلٹ کر کے عذاب کو دفع کرتا ہے اور میدان محشر میں

اللہ کے یمین میں پہنچا دیتا ہے۔۔۔ تو قرآن کریم میں ایک تبدیلی اور انقلاب کا مادہ ہے کہ دلوں کو بدل دے، روحوں کو بدل دے، ناپاک کو پاک بنادے۔ یہ انقلاب کا مادہ قرآن میں موجود ہے۔

انقلاب عظیم دنیا میں کتنا بڑا انقلاب برپا ہوا کہ حضور اقدس ﷺ نے جب قرآن کریم کی تلاوت کی ہے تو لوگ بدل گئے جو جاہلین مکہ تھے وہ صحابہ کرام بن گئے۔ زمانہ بدل گیا جاہلیت کے بجائے خیر القرون اس کا نام ہو گیا اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس مقام پر پہنچے کہ امت کا عقیدہ ہے کہ ؎

اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ".

"سارے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم متقی، پارسا، پاک دامن اور قلوب کے اندر کامل تقویٰ لئے ہوئے ہیں"۔

حضرت حسن بصریؒ سے کسی نے پوچھا تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، افضل ہیں یا عمر بن العزیز افضل ہیں؟ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، صحابی ہیں اور عمر بن عبد العزیز تابعی ہیں۔ انہوں نے حضور ﷺ کو نہیں دیکھا۔ ہاں حضرات صحابہ کرام کو دیکھا ہے۔ مگر عادل اتنے بڑے تھے کہ لوگ ان کو عمر ثانی کہتے ہیں۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور لوٹ آیا تھا۔ ان کے زمانہ خلافت میں عدل وانصاف انتہائی درجہ پر تھا۔ اس عدل وانصاف کے باوجود تین سو نفلیں بھی ثابت ہیں جو روزانہ پڑھتے تھے۔ اور علمی مشغلہ الگ رہا تو حضرت عمر بن عبد العزیز کا بہت ہی اونچا مقام ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سے ان کے دور خلافت میں کچھ خطا اجتہادی اور خطائے فکری بھی ہوئی ہیں اس بناء پر لوگوں نے حضرت حسن بصریؒ سے دریافت کیا کہ ؎

"حضرت عمر بن عبد العزیز افضل ہیں یا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ،؟

حضرت حسن بصریؒ نے جواب دیا کہ ؎

اگر امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑے کی ناک میں کچھ پانی آجائے اور اس پانی پر کچھ گرد بیٹھ جائے، وہ گرد ہزار درجہ افضل ہے عمر بن عبد العزیز سے۔ اس لئے کہ عمر بن عبد العزیز تابعی ہیں اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، صحابی اور اور کوئی شخص کتنے ہی اونچے مقام پر پہنچ جائے مگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا"۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے انقلاب کا نقشہ

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور اقدس ﷺ سے بلاواسطہ قرآن اخذ کیا دل بدل گئے روح بدل گئی' جذبات بدل گئے پھر جہاں یہ حضرات پہنچے وہاں بھی انقلاب بپا کر دیا قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دئیے خیر تخت الٹ دینا تو یہ ہے کہ ملک فتح کرلیا قیصر کا ملک فتح ہوگیا رومی ماتحت بن گئے کسریٰ کا ملک فتح ہو گیا۔ ایران پر حکومت قائم ہوگئی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مگر بڑی بات یہ ہے کہ جہاں بھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پہنچے ملک بدل دیا تہذیب بدل دی مذہب بدل دیا زبان بدل دی ساری چیزوں میں تبدیلی پیدا ہو گی۔

آج آپ ممالک عربیہ کہتے ہیں مصر کو شام و عراق کو حالانکہ یہ عرب ممالک نہیں تھے۔ عراق جو ہے وہ خراسان کا ملک تھا۔ اس میں اور زبان بولی جاتی تھی' مصر قبطیوں کا ملک تھا اس میں قبطی زبان بولی جاتی تھی۔ شام عیسائیوں کا ملک تھا اس کے اندر رومی زبان بولی جاتی تھی' فلسطینی بولی جاتی تھی۔ یہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان ہے کہ عراق میں پہنچے مذہب بھی بدل یا زبان بھی بدل دی۔ مصر میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا اور زبان بھی عربی بھی ہو گئی۔ تمدن تک بدل دیا تہذیب بدل دی۔۔۔ تو یہ تبدیلی اور انقلاب کی شان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں کہاں سے آئی۔۔۔؟ اس قرآن کے ذریعہ سے آئی۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی کو لے کر کھڑے ہوئے۔ اسی کو دستور العمل بنایا۔۔۔ تو عالم کی کایا پلٹ دی۔

انقلاب شر

آج جتنا قرآن سے دور ہوتے جا رہے ہیں اتنا ہی فساد برپا ہو رہا ہے اور شر کا انقلاب آتا جا رہا ہے لوگ خیر سے شر کی طرف آ رہے ہیں۔ علم سے جہالت کی طرف آ رہے ہیں۔۔۔ تہذیب سے بد تہذیبی کی طرف۔ تو انقلاب خیر اور انقلاب حسن کو قرآن پیدا کرتا ہے اور انقلاب شر ترک قرآن پیدا کرتا ہے۔ قرآن کو ترک کر دو گے تو دوسرا انقلاب آتا جائے گا تہذیب سے بد تہذیبی ہوتی چلی جائے گی۔ شائستگی بدل جائے گی ناشائستگی سے۔ علم ختم ہو جائے گا جہالت سے۔ اخلاق اور کمالات یہ قرآن ہی سکھاتا ہے۔ جب آدمی اس جڑ سے وابستہ نہ رہے تو کمالات کی شاخیں سامنے کہاں سے آجائیں گی۔

بہرحال قرآن برکت بھی ہے' ہدایت بھی ہے' نور بھی ہے اور وہ انقلاب بھی ہے کہ جب آتا ہے تو کایا پلٹ دیتا ہے۔

جنات میں انقلاب

حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے جنات اور شیاطین آسمانوں کے دروازوں تک پہنچ جاتے اور ملائکہ کی گفتگو سن لیتے۔ اس میں کچھ

جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں میں اس کی تبلیغ کرتے۔ یہ ان کا مشغلہ تھا۔ آپ کی بعثت کے وقت یہ سلسلہ ان کا منقطع کر دیا گیا اب کوئی آسمان پر اگر جاتا ہے تو اسے آگ کے بم مارے جاتے ہیں جس سے بھسم ہو جاتا ہے، فرشتے ان کو آسمان کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔ یہ جنات اس جستجو اور ٹوہ میں تھے کہ کون سی ایسی وجہ ہے کہ جس کی وجہ سے ہم کو روک دیا گیا ہے۔ یہ تو سمجھتے تھے کہ کوئی حادثہ ضرور پیش آیا مگر کون سا حادثہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا تھا۔ اس کی جستجو تلاش میں نکلے اور ان جنات کا وفد مکہ مکرمہ پہنچا اور حضور ﷺ تلاوت فرما رہے تھے قرآن کریم کی۔ انہوں نے قرآن کریم کو سنا اور سمجھ گئے کہ یہی وہ کلام ہے جس کے نازل ہونے کی وجہ سے ہمارے راستے بند ہوئے ہیں تاکہ ہم اس میں خلط ملط نہ کر سکیں۔

تو انہوں نے جا کر اپنی قوم سے کہا:

اِنَّا سَمِعنَا قُرْاٰناً عَجَباً یَّھْدِیْ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا اَحَداً.

"ہم آج ایسا کلام سن کر آئے ہیں کہ جو برزگی کی طرف لے جاتا ہے، راہنمائی کرتا ہے کمالات کی طرف۔ ہم تو اس کلام پر ایمان لے آئے اور ہم شرک نہیں کریں گے"۔

ہمیں تو توحید کامل نصیب ہو گئی اس کلام کو سن کر۔ یہی ہے وہ کلام جس کی وجہ سے ہمارے راستے روکے گئے ہیں۔۔۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات میں مشرکین بھی تھے۔ مشرکین آئے انہوں نے قرآن سن کر توبہ کی کہ:

وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا اَحَداً

"اب ہم شرک نہیں کریں گے"۔

وَاَنَّہٗ تَعَالٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَداً

"اور ہم توبہ کرتے ہیں اس سے جو ہم نے عقیدہ جما رکھا تھا کہ اللہ کے یہاں کوئی بیوی ہے اللہ کے کوئی اولاد ہے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر عیسائی بھی تھے جو عقیدہ ابنیت کے قائل تھے، اس سے توبہ کی جنات نے۔

تو قرآن کے وہ الفاظ کان پڑے تھے کہ ایک انقلاب پیدا کر دیا کفر سے ایمان کی طرف آ گئے شرک سے توحید کی طرف آ گئے ناشائستگی کی طرف آ گئے۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں قرآن کریم کے انقلاب کی ایک جھلک

یہی قرآن کریم ہے جو لوگوں کے دلوں کو بدلتا ہے، اگر اس کو پکڑے ہوئے ہیں تو خیر کی طرف پھرتے

رہیں گے اگر اسے ترک کر دیا تو شر کی طرف بڑھیں گے فتنوں کی طرف بڑھیں گے ایک سے دوسرے کو چین نہیں ملے گا تو قرآن نے پیدا کیا' ایثار ہمدردی' محبت' خدمت گزاری' جذبہ اطاعت' اپنے نفع پر اپنے بھائی کے نفع کو ترجیح دینا۔ یہ جذبات پیدا کر دیئے تھے ۔ خود غرضی مٹا کر لاغرضی پیدا کر دی اور اس درجہ کہ موت گوارہ مگر اپنے بھائی کا نقصان گوارہ نہیں۔

غزوہ بدر کے اندر بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم زخمی ہو کر گرے، لشکر میں کچھ آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو مجاہدین کی ضروریات پوری کرتے ہیں مثلاً مرہم پٹی وغیرہ۔ انہوں نے آکر مرہم پٹی کی ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے ان کو پیاس کا غلبہ ہوا۔ تو فرمایا پانی۔ اس وقت ایک آدمی کٹورہ بھر کر پانی کا لایا منہ کے قریب لے گئے کہ قریب سے ایک آواز آئی کہ پانی انہوں نے کہا کہ پہلے اسے پلاؤ میں بعد میں پیوں گا وہاں ان کے منہ سے لگا ایک تیسری آواز آئی' انہوں نے کہا کہ پہلے اسے پلاؤ میں بعد میں پیوں گا وہاں پہنچے تو چوتھی آواز آئی۔ وہ نہیں پینے پائے کہ پانچویں آواز آئی۔ وہاں پہنچنے تو چھٹی آواز آئی' --- غرض سات آوازیں آئیں ساتویں تک پہنچے تو وہ شہید ہو چکے تھے۔ چھٹے کے پاس لوٹ کر آئے تو وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔ پانچویں کو پلادوں وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔ اسی طرح لوٹ کر واپس آتے رہے اور دیکھتے رہے کہ شہید ہو چکے ہیں یہاں تک کہ ساتوں کے ساتوں پیاسے شہید ہوئے مگر یہ گوارہ نہ کیا کہ میں پانی پیوں اور میرا بھائی برابر میں پیاسا لیٹا رہے۔ موت گوارہ کی مگر دوسرے کا پیاسا رہنا گوارہ نہ کیا۔

وہی لوگ جو ایک ایک پائی کے لئے دوسروں کے گلے کاٹتے تھے آج ان میں اس درجہ ایثار پیدا ہو گیا کہ موت گوارہ کی مگر دوسرے کی پیاس گوارہ نہیں۔

قرآن انقلاب عظیم کا سرچشمہ

یہی وہ عظیم انقلاب ہے جو قرآن کریم نے پیدا کیا ہے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اندر۔ ان ہی مشت خاک کو کیمیا بنا دیا سونا چاندی اور ایسا بنا دیا کہ دنیا کی کایا پلٹ دی انہوں نے --- قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ تَبَرَّكْ بِالْقُرْاٰنِ برکت حاصل کرو قرآن سے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکلی ہوئی چیز ہے، یہ پیدا کی ہوئی چیز نہیں کلام خداوندی اس کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اس سے صادر ہو رہا ہے، اس نے سورج پیدا کیا' اس نے چاند پیدا کیا زمین پیدا کی اور کلام خود بخود اندر سے نکل کر آیا ہے۔ اس لئے کلام مخلوق نہیں ہے۔ مخلوق میں تو روح بن کر کلام بھرا ہوا ہے جسکی وجہ سے اشیا اپنی اصلیت پر قائم اور صحیح معلوم ہوتی ہیں اس لئے فرمایا کہ کلام اللہ سے برکت حاصل کرو۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ پیدا کئے ہوئے ہم اور

آپ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مخلوقات کو اپنے اندر کی چیز نکال کر دی ہے تاکہ ان کے اندر اس کلام کی برکت سے تہذیب پیدا ہو شائستگی پیدا ہو۔ تو اس اعتبار سے دو عالم ہوئے ایک عالم خلق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور ایک عالم ارواح ہے کہ اپنے حکم سے اپنے کلام سے اس کے اندر روح ڈالی ہے، تو قرآن کریم در حقیقت روح الٰہی ہے، روح خداوندی ہے جس سے اقوام زندہ ہوئیں۔ جس نے اسے لیا وہی زندہ ہوا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس روح کو لیا اس لئے وہ ایسے زندہ ہوئے کہ لاکھوں کروڑوں مردوں کو زندہ کر دیا انہوں نے ـــ ہم نے آج اس روح کو نکال دیا ہے پس ایسے پڑے ہوئے ہیں، جس کا جی چاہے مارے، جس کا جی چاہے کاٹ دے، جس کا جی چاہے کچھ کرلے، چونکہ ہمارے اندر جان ہی باقی نہیں ہے اور نہ ہی روح باقی ہے۔

اَلْقُرْاٰنُ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی جیسا کہ :اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوَ وَلَا یعلی اسلام بلند ہے اسے کوئی پست نہیں کر سکتا اس کی روح جس میں آجائے گی وہ بھی بلند ہو جائے گا۔ جس میں سے نکل جائے گی وہ پست ہو جائے گا۔

صحیح اِنقلاب کی تمنا میں اُلٹی زقند

تو آج ضرورت اس کی ہے کہ قرآنِ کریم کو سنبھالا جائے۔ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کچھ دولت ہو ہمارے پاس، کچھ بلڈنگیں ہوں، کچھ جائیدادیں ہوں۔ جب ہی ہم پنپ سکتے ہیں حالانکہ پنپنے کی یہ صورت نہیں ہے کیونکہ یہ چیزیں چھن بھی سکتی ہیں، انقلابات میں گھر تک چھن جاتے ہیں جائیدادیں تک چھن جاتی ہیں، دکانیں تک بک جاتی ہیں، بازار تک جلا دیئے جاتے ہیں، اگر ان سے شوکت وابستہ ہو تو وہ سب ختم ہو جائیں گی۔ اگر اندر روح بھری ہوتی ہے تو لاکھ بازار جلیں تو وہ جلتے رہیں، پھر سینکڑوں قائم ہو جائیں گے۔ مگر مومن کو ذرہ برابر فکر نہ ہو گی۔ نہ جلنے کی نہ آنے کی، اس واسطے جہاں اور تدابیر کرتے ہیں وہ ثانوی درجہ کی ہیں۔ پہلی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان، مسلمان تو بنے اور بننے کے معنی یہ ہیں کہ اس قرآن کی روح کو اپنے اندر جذب کرلے۔

کتابِ انقلاب کا طرزِ تعلیم

بہر حال یہ سلسلہ جو آپ حضرات نے قائم فرمایا ہے مبارک سلسلہ ہے مگر اس کو رسمی نہ بنایا جائے بلکہ پڑھایا جائے اور پڑھانے کے ساتھ سنا بھی جائے یعنی پڑھانے والا اور ترجمہ کرنے والا کبھی کبھی امتحان بھی لیتا رہے کہ کل ہم نے کیا بتایا تھا۔ فلاں آیت کا کیا مطلب ہے۔ اس پر آپ نے کچھ عمل بھی کیا ہے یا نہیں۔ اس لئے محض پڑھا دینا ہی کافی نہیں بلکہ تربیت بھی ضروری ہے علم کے ساتھ ساتھ۔ پھر اس کو دستور زندگی بنانا بھی ضروری ہے، علم اس وقت تک نفع نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ اس کو دستور زندگی نہ بنایا

جائے اور اس پر عمل نہ کیا جائے۔

آپ نے قرآن کا ترجمہ پڑھایا' احکام سمجھائے' اخلاق بتلائے۔ پھر چند دن کے بعد جانچ بھی کرتے رہیں' پوچھ گچھ بھی کرتے رہیں کہ بھئی کتنا عمل ہوا' کتنا نہیں' نہیں ہوا تو اس کی ترکیب بتلائیں جیسے کہ احادیث میں دعائیں وارد ہوئی ہیں اور قرآن کریم میں بھی بہت سی دعائیں ہیں۔ یہ تمام کی تمام لکھادی جائیں اور پھر سنی بھی جائیں ان سے معاشرت کی اصلاح ہوتی ہے' اخلاق درست ہوتے ہیں' ماحول بنتا ہے اس لئے محض ترجمہ پڑھا دینا ہی ذمہ داری نہیں ہے۔

کتاب انقلاب کا طرزِ تربیت

میں تو یہ کہتا ہوں کہ ترجمہ پڑھانے والا عمل بھی دیکھتا رہے اور تربیت بھی کرتا رہے' یہ نہ دیکھے کہ بس ان کو علم ہو گیا ہے۔ یہ تو اور مصیبت بن جائے گی حکمت کے ساتھ ان کی تربیت کرتا رہے۔ نبی کریم ﷺ نے محض تعلیم ہی نہیں دی ہے صحابہ کرامؓ کو کہ صرف قرآن کے معنی بتلا دیئے ہوں یا سمجھا دیئے۔ آپ ﷺ نے عمل کی بھی مشق کرائی ہے اور عمل کی نگرانی بھی فرمائی ہے۔

حضور ﷺ کا طرز تعلیم اور حکمت عملی

حدیث میں ہے کہ ہر قبیلہ حاضر ہوا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم ایمان لانا چاہتے ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا' بسم اللہ اہل قبیلہ نے کہا کہ ایک شرط ہے۔ وہ یہ ہے کہ نماز نہیں پڑھیں گے' فجر اور عشاء کی نماز نہیں پڑھیں گے' باقی تین وقتوں کی پڑھیں گے۔ آپ ﷺ نے قبول فرمالیا اور وہ اسلام قبول کر کے چلے گئے۔ انہوں نے نہ صبح کی نماز پڑھی اور نہ عشاء کی۔ ظہر' عصر' مغرب کی پڑ رہے۔

لوگوں کو تعجب ہوا کہ جیسے تین وقت کی نماز فرض ہے ویسے ہی دو وقت کی بھی فرض ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے یہ شرط کیسے مان لی۔ اس پر سب کو حیرت تھی۔ مگر ایک مہینے کے بعد ان لوگوں کے دلوں میں خود یہ خیال پیدا ہوا کہ بھائی فرض تو ساری نمازیں ہیں' ہم تین نمازیں ادا کر رہے ہیں' دو ادا نہیں کر رہے ہیں اس پر گناہ گار ہو رہے ہیں' تو فائدہ کیا ہوا اسلام لانے سے ؟

یہ سوچ کر پڑھنی شروع کی مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد پانچوں نمازوں کے پابند ہو گئے۔ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آئے۔ آپ نے انوارِ باطن سے پہچان لیا تھا کہ یہ اس شرط پر رہیں گے نہیں اور پڑھنی شروع کر دیں گے۔ اس لئے آپ نے شرط مان لی تھی۔۔۔ تو یہ حکمت تربیت کی تھی' تعلیم میں تو سب برابر ہیں۔ تعلیم میں تو یہی کہا جاتا ہے کہ بھائی جیسے ظہر' عصر' مغرب فرض ہیں' ویسے ہی عشاء اور فجر بھی فرض ہیں مگر اس سے آگے عمل کی بات ہے اور عمل میں تربیت کی

ضرورت پڑتی ہے اور تربیت میں حکمت کی ضرورت ہوتی ہے، تعلیم تو ایسی ہے جیسے کسی طبیب نے طب کی کتاب پڑھادی ہو اور علاج کرنے بیٹھے گا تو ہر ایک کا نسخہ الگ الگ لکھے گا۔ چونکہ ہر ایک کا مزاج الگ ہے، بیماری الگ ہے، تو تعلیم کے درجہ میں تو سب برابر ہوتے ہیں لیکن عمل کرانے کے درجے میں ہر ایک کا مزاج الگ ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج کی رعایت کرنی پڑے گی اور اسی مناسبت سے نسخہ تجویز کرنا پڑے گا۔ چونکہ حضور اقدس ﷺ مربی بھی ہیں۔ اس لئے ان کا مزاج پہچان کر مزاج کی رعایت کرتے ہوئے ان کی شرط کو قبول کرلیا اور انوار باطن سے پہچان بھی لیا تھا کہ بعد میں اس کو یہ قبول کرلیں گے۔

اس لئے آپ نے کوئی ردوکد نہ فرمائی اور ہوا یہی اور بالآخر وہ ساری نمازیں پڑھنے لگے۔ یہ کچھ حکمت تھی تربیت کی۔

میں عرض کررہا تھا کہ ترجمہ کرانے والے تعلیم کے درجہ میں تو سب کو ایک ہی طرح سمجھائیں گے مگر اس میں تربیت کی شان بھی ہونی چاہئے اور وہ ہونی چاہئے جداگانہ۔

ہر ایک کے مزاج کی مناسبت سے ہفتہ میں دو ہفتہ میں جانچ پڑتال کرتے رہنا چاہئے کہ عمل کررہے ہیں یا نہیں؟ نہیں کررہے تو کیا رکاوٹ ہے اس کو دور کیا جائے۔ اس طرح سے تربیت ہو کر اچھے خاصے مسلم بن جائیں گے۔

اس وجہ سے محض علم کافی نہیں جب تک کہ استعمال کا طریقہ نہ بتلایا جائے اور عمل کرا کے اس کی مشق نہ کرائی جائے، اس وقت ثابت ہوگا کہ قرآن کریم نے نفع پہنچایا اور کس طرح سے اس نے کایا پلٹ کی ہے۔

"تبریک" بہرحال یہ چند باتیں میں نے اس لئے عرض کردی ہیں کہ آپ حضرات قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے ترجمہ کلام اللہ کا آغاز کیا ہے یہ نہایت مبارک اقدام ہے حدیث میں فرمایا گیا ہے:

خیر کم من تعلم القران و علمه.

"پڑھنے والا بھی خیر ہے پڑھانے والا بھی خیر ہے"۔

لایاتیه الباطل من بین یدیه ولامن خلفه

قرآن کریم کے نہ دائیں طرف سے باطل آسکتا ہے نہ بائیں سے نہ سامنے سے نہ پیچھے سے، یہ چیز باطل سے بری ہے، حق محض ہے، اس لئے جس میں سرایت کرجائے گا اس کے پاس باطل نہ آسکے گا وہ بھی حق کے اوپر جمے گا تو آپ نے خیر کا کارخانہ کھولا ہے، پڑھانے والا بھی خیر ہوگا۔

سننے والا بھی خیر ہوں گے پھر اگر اس کے ساتھ عمل بھی مستقیم ہو جائے تو اس کے اثرات اندر اتر جائیں گے اور پھر اس کے فوائد ظاہر ہوں گے۔

یہ چند باتیں ذہن میں آئیں جو میں نے عرض کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر استقامت عطا فرمائے اس کے فوائد و برکات دنیا و آخرت میں ظاہر ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیں مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

"آمین"

" دُعا "

اللّٰھم انّا نسئلك علمًا نافعًا صالحاً ورزقاً واسعاً وشفاءً من کلّ داءٍ
وارزقنا یاربّ حُسنَ الخاتمة

اللّٰھمّ ربّنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا و ثبّت اقدامنا وانصرنا علی
القوم الکافرین ربّنا واتنا ما وعدتّنا علیٰ رسلك ولاتخزنا یوم القیٰمة
انّك لا تخلف المیعاد.

اللّٰھمّ وتوفّنا مسلمین والحقنا بالصّالحین غیر خزایا ولا مفتونینَ
وصلّی اللّٰه تعالیٰ علیٰ خیر خلقهٖ سیدّنا و مولانا محمّد وّعلیٰ اٰله
وصحبهٖ اجمعین برحمتك یاارحم الرّاحمین.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پس منظر

خُطبہ صدارت

اجلاس جمعیت العلماء صُوبہ بمبئی

منعقدہ ۴، ۶، ۷ صفر المظفر ۱۳۶۴ ہجری

اَز فخرُ الاماثل حضرت الحاج مولانا قاری حافظ محمد طیبؒ صاحب رحمتہ اللہ علیہ

(مہتمم دار العلوم دیوبند)

جمعیت العلماء صوبہ بمبئی نے گزشتہ سال ۴۴ء میں اپنے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب رحمتہ اللہ علیہ مہتمم دار العلوم دیوبند کو منتخب کیا تھا۔ ممدوح نے اس اجلاس میں ارتجالاً زبانی جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا اس نے اہل بمبئی کے مذہبی اور سیاسی احساس وشعور کو بیدار کرنے میں حیرت انگیز کام کیا۔ قبول وتاثر کی ایک رو تھی جو چالیس پچاس ہزار سامعین کے قلوب میں گھر کرتی چلی گئی تھی۔

مشرقی ومغربی تعلیم ونظریات دونوں کے حامل و دِلدادہ اس خطبہ سے یکساں متاثر تھے۔ سیاسی وغیری بیاسی سرکاری وغیر سرکاری مذہبی اور غیر مذہبی مسلم اور غیر مسلم کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس پر حقائق ومعارف کے اس آب حیات کا کوئی چھینٹا پڑ گیا ہو اور وہ خواب گراں سے ہوشیار نہ ہو گیا ہو۔ بمبئی کے کانوں نے پہلی مرتبہ ایک ایسا سیاسی پروگرام سنا جو قرآن وسنت اور صرف قرآن وسنت سے مرتب کیا گیا تھا۔ اور جس میں انسانی کے لئے دنیا کے موجودہ حالات میں فوزوفلاح اور کامیابی وکامرانی حاصل کرنے کے سہل الحصول اور یقینی طریقے بھی موجود تھے اور آخرت کی نجات کا سامان بھی۔

بمبئی ــــ! جہاں کے باحوصلہ اور نیک دل مسلمانوں کو ایک خود غرض جماعت نے اپنی نفس پرستی اور جلبِ منفعت کے لئے مبتلائے فریق کر رکھا تھا اور مخلصانہ مذہبی جذبات کو غلط راستوں پر ڈال کر سچا دین پیش کرنے والوں اور کلمۂ حق کہنے والوں سے اس درجہ متنفر اور متوحش کر دیا تھا کہ وہ ان کے قریب جانے یا ان کی کوئی بات سننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے انہوں نے جب جمعیت علماء کے پلیٹ فارم سے اس بیدار کن صدائے حق کو سنا تو وہ چونک اٹھے انہوں نے محسوس کیا کہ اربابِ غرض نے سالہا سے ان کے مذہبی جذبات کو جن راہوں پر ڈال کر علماء دیوبند کے

خلاف جو اشتعال اور نفرت پیدا کر دی ہے وہ سراسر باطل ہے۔ حق یہی ہے کہ دین و دنیا کی خیر و فلاح اور تعلیمات نبوی کا صحیح اسوہ اگر کسی کے پاس ہے تو وہ انہیں علماء حق کے پاس ہے۔

اس احساس کا پیدا ہونا تھا کہ بمبئی جیسے عظیم الشان شہر کے گوشہ گوشہ سے طالبان حق در گروہ حضرت ممدوح کی خدمت میں یہ التجا لے کر حاضر ہونے لگے کہ ہمارے علاقے کے مسلمانوں کے کان بھی اس صدائے حق سے آشنا کئے جائیں جس سے وہ اب تک مختلف حیلوں گمراہ کن تدبیروں سے محروم رکھے گئے ہیں۔ اہل بمبئی کی اس طلب صادق اور التجائے شدید نے حضرت مہتمم صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اپنے پروگرام میں مخلصین و طالبین بمبئی کے لئے جتنا وقت نکال سکیں نکالیں۔ چنانچہ حضرت ممدوح نے جتنا ممکن ہو سکا بمبئی میں قیام فرمایا اور وہاں کے تقریباً ہر حصہ سے تشنگانِ حقیقت و معرفت کو اپنے ارشادات عالیہ اور مواعظ حسنہ کے شیریں اور صاف وشفاف آبِ رواں سے سیراب کرنے کی کوشش کی۔ پیاسوں کی پیاس کا یہ عالم تھا کہ جام پر جام پیتے جاتے تھے اور ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ پکار رہے تھے۔ چونکہ مولانائے ممدوح کی ذات گرامی پر دار العلوم دیو بند جیسے عظیم الشان مرکزی ادارہ کی اہم ذمہ داریوں کا بارِ گراں بھی ہے اس لئے تقریباً تین ہفتہ سے زیادہ بمبئی میں قیام نہ فرما سکے اور بمشکل دیو بند واپس تشریف لائے۔

اس سال جمعیت کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ذمہ داران جمعیت نے پھر حضرت ممدوح سے صدارت اجلاس قبول کرنے کی باصرار درخواست کی اور اہل بمبئی کے والہانہ شوق کا شدومد کے ساتھ اظہار کیا چنانچہ مخلصین بمبئی کی دعوت کو قبول کرنا پڑا اور ممدوح نے بمبئی شریف لے جا کر فرائض صدارت انجام دیئے اس سال مسلمانان بمبئی کا ذوق و شوق المضاعف تھا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ حاضرین جلسہ کی تعداد ایک لاکھ سے بھی متجاوز ہوتی تھی۔ اجلاس جمعیت کے ختم ہونے پر اہل شہر کی جانب سے علاقہ وار جلسوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ان میں حضرت ممدوح نے انسان کی نجات اور اس کی زندگی کے مختلف گوشوں میں فلاح وخیر کا وہ پروگرام پیش فرمایا جو قرآن وسنت کا مرتب کردہ ہے۔ ان خطبات و مواعظ نے مسلمانان بمبئی کے ایمانوں میں جلا پیدا کر دی۔ ارباب باطل نے تدلیس و تلبیس اور افتراء و بہتان پر جماعت دیو بند کے خلاف سالہا سال میں عناد وعدوات کی جو عمارت کھڑی کی تھی وہ تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ کر رہ گئی اور بمبئی کے سنجیدہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد میں دیو بند کی محبت و عقیدت کا گہرا نقش قائم ہو گیا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

۵ صفر ۶۴ھ کو جمعیت العلماء صوبہ بمبئی کے سالانہ اجلاس میں حضرت ممدوح نے جو خطبہ ارشاد فرمایا دیو بند سے بمبئی تشریف لے جاتے ہوئے راستہ میں قلم برداشتہ تحریر فرمالیا تھا اتنا بھی موقع نہ مل سکا کہ مسودہ پر نظر ثانی کی جاسکتی۔ دراصل یہ خطبہ صدارت کے مضامین کا ایک اجمالی

خاکہ تھا جو رواروی میں بطور یادداشت مرتب کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ سامعین کو طبعاً تحریر کے سننے میں الجھن اور ضیق ہوتی ہے۔ نیز تحریر کے ذریعہ مسائل کی تفہیم میں مختلف الخیال اور تفاوت الخیال حاضرین کی کماحقہ رعایت نہیں رکھی جاسکتی۔ اس لئے ممدوح نے اس مرتب کردہ تحریری خاکہ پر زبانی خطبہ ارشاد فرمانا زیادہ مناسب خیال فرمایا۔ اس زبانی خطبہ میں بہت سے مضامین تحریر کردہ خطبہ سے زائد بیان ہوئے اور مجمع پر ان کا نہایت گہرا اثر پڑا۔ ممدوح کا خیال تھا کہ خطبہ پر نظر ثانی کے وقت تقریر کے زائد نکات و مضامین کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ لیکن حضرت ممدوح نے جیسے ہی تقریر ختم فرمائی۔ مدیران جرائد نے اصرار کیا کہ مسودہ جس حالت میں بھی ہے انہیں دے دیا جائے کہ انہوں نے تقریر کے جو نوٹ لئے ہیں۔ یہ مسودہ یقیناً ان سے زیادہ مفصل ہوگا اس لئے مسودہ دے دیا گیا اور اسے بمبئی کے اردو انگریزی گجراتی اور مرہٹی وغیرہ اخبارات نے نمایاں طور پر اور بعض نے پورا اور بعض نے اس کے خاص خاص حصے شائع کئے بلکہ بعض اخبارات نے پبلک کے شدید مطالبہ کی بناء پر اس مکمل مسودہ کو ایک سے زائد مرتبہ شائع کیا۔

بمبئی سے واپسی پر اثناء سفر میں ممدوح نے اس مسودہ پر نظر ثانی کر کے اس میں ان مضامین کا اضافہ بھی فرمادیا جو تقریر میں خاص طور پر آگئے تھے۔ اب حذف واز دیا اور ترمیم و تنسیخ کے بعد یہ مسودہ اپنی مکمل صورت میں مرتب ہو گیا ہے۔ چونکہ اس خطبہ کی حیثیت عام رسمی خطبات صدارت سے مختلف ہے اور اس میں زمانہ حال کی ضروریات میں مسلمانوں کی بہترین مذہبی وسیاسی راہنمائی کی گئی ہے۔ اس لئے مدیر رسالہ دارالعلوم کی درخواست پر حضرت ممدوح نے ترمیم شدہ مسودہ دفتر رسالہ کو مرحمت فرمادیا جس کو بالاقساط رسالہ میں شائع کیا گیا۔

دارالعلوم کے جن نمبروں میں یہ خطبہ صدارت شائع کیا گیا ہے اور اطراف و اکناف ہند سے ان کی فرمائش اس کثرت سے آئیں کہ وہ نمبر بہت جلد ختم ہو گئے اور فرمائشات کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اس لئے شائقین کے اصرار پر بہ منظوری حضرت مہتمم صاحبؒ یہ خطبہ صدارت کتب خانہ قاسم العلوم دیوبند کی جانب سے کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔

ناظم کتب خانہ قاسم العلوم دیوبند

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آل انڈیا احناف کانفرنس سے خطاب

جس امام کی جو ذہنی خصوصیات ہوں گی وہی اس کے اصول استنباط سے چھنیں گی اور پھر وہی خصوصیات ان اصول کے ماتحت مستنبط شدہ جزئیات سے بھی مترشح ہوں گی اور ان ہی خصوصیات کا رنگ بالآخر ان افراد کی تربیت کرے گا جو اس فقہ پر عامل ہوں گے۔ حاصل یہ ہے کہ ایک فقہ کا مقلد بظاہر تو جزئیات فقہ کی تقلید کرتا ہے لیکن بنظر حقیقت وہ ان اصول کی تقلید کرتا ہے جن سے وہ فقیہہ بنتا ہے اور اسے راہ عمل پر حقیقۃً وہ کلیات چلاتی ہیں جو ان جزئیات فقیہہ کو بروئے کار لاتی ہیں۔ پس اردو فقہوں پر چلنے والا مثلاً ایسی جزئیات کا انتخاب کرے جو بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نہ ہوں اور دونوں فقہوں کی تقلید ان غیر متعارض جزئیات میں شروع کر دے تو گو وہ جزئیاتی تناقض میں گرفتار نہ ہو مگر در حقیقت اس کلیاتی تناقض کا شکار بنے گا جو ان جزئیات کی تشکیل کی ضامن ہیں ان میں رچی ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب وہ اصولاً متناقض اور ذوقاً متخالف ہیں تو اس مقلد میں بھی یقیناً دو ذوقی رنگ اپنے تناقض سمیت بھرے جائیں گے۔ اندریں صورت ناگزیز ہے کہ باطنی طور پر اس کے روحانی مزاج میں فساد پیدا ہو اور وہ متضاد اثرات کی کشاکش کا شکار ہو کر پراگندہ حال بن جائے۔

(از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِمَعْرِفَۃِ سُبُلِ الْاِجْتِھَادِ وَتَقْلِیْدِہٖ وَاَرْشَدَنَا اِلٰی طَرِیْقِ اِتِّبَاعِ الْاَئِمَّۃِ وَتَائِیْدِہٖ فَنَوَّرَ قُلُوْبَنَا بِشُمُوْعِ اَعْلَامِ السُّنَنِ وَجَنَّبَنَا بِھَا عَنْ فِتَنِ الضَّلَالَۃِ وَالْغَوَایَۃِ مَاظَھَرَمِنْھَا وَمَا بَطَنَ. وَاخْتَارَلَنَابِحُسْنِ تَوْفِیْقِہٖ سُنَّۃَ الْاِتِّبَاعِ وَیَسَّرَلَنَاالتَّجَنُّبَ عَنْ وَرْطَۃِ الْبِدَعِ وَالْاِخْتِرَاعِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ حَبَّبَ اِلَیْنَا اِقْتِدَاءَ الْمُنِیْبِیْنَ بَعْدَاتِّبَاعِہٖ وَرَضِیَ لَنَا الْاِھْتِدَاءَ بِھَدْیِ الرَّاسِخِیْنَ بَعْدَ الْوُقُوْفِ عَلَیْہِ وَاِطِّلَاعِہٖ. فَنَشْھَدُاَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ شَھَادَۃً تُنْجِیْنَاعَنِ الْفُسُوْقِ بَعْدَالْاِیْمَانِ. وَتَکُوْنُ عِدَّۃً لِلتَّقْلِیْدِ بِطُرُقِ اَھْلِ الْفِقْہِ وَالْعِرْفَانِ ....اَمَّابَعْدُ!

شکریہ و تمہید

محترم حضرات!

میں اس تصور سے بھی خجل اور شرمسار ہوں کہ صدارت کے نام سے مجھ جیسے نااہل کو ایک ایسی جگہ پر لا بٹھایا گیا ہے جو کسی اہل ترین فرد کے لئے سزاوار ہو سکتی تھی اور اسی لئے مجھے اس منصب کے قبول کرنے میں حد درجہ تامل اور تردد تھا جس کا میں نے اعتذار کے لہجہ میں اظہار بھی کر دیا تھا لیکن وہ خود پذیرائی نہیں ہوا۔ آخر کار اس جماعتی ارشاد سے روگردانی کو بے ادبی خیال کرتے ہوئے میں اس منصب کو قبول کرنے پر مجبور ہو گیا اور آج اپنی بے بضاعتی کے ساتھ آپ کے سامنے ہوں۔ مجھے ان بے نفس بزرگوں کے اخلاص اور ایثار کی برکت سے جو اپنی صدارت کی دولت کو بے دریغ لٹا کر ہم جیسے نااہلوں کو مسند صدارت پر بٹھا سکتے ہیں۔ امید ہے وہ قادر و توانا جو رسوم حسنہ میں حقیقت حسنہ ڈالتا ہے اور جو اچھی صورتوں کے سانچہ میں اچھی سیرتیں القاء فرما دیتا ہے۔ اس رسمی اعزاز کو حقیقت کا پیش خیمہ بنا دے اور اس مبارک ہیئت کو جو بزرگان کانفرنس کی عزت افزائی سے بصورت موجودہ نظر آ رہی ہے عین حقیقت کر دے۔

وَمَاذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

بنا بریں میرا عقلی اور شرعی فریضہ ہے کہ میں ان تمام بزرگوں کا مخلصانہ شکریہ ادا کروں، جنہوں نے مجھے بایں بے بضاعتی قبول فرمایا ہے۔

فجزاهم الله عنّی خير الجزاء و احسن اليهم احسن الصلة . آمین

حضرت! اس مختصر تحریر سے میری غرض حنفیہ --- یا فقہ حنفی کی دعوت و تبلیغ یا دعایت و اشاعت نہیں یا اس کے منکرین یا غیر حنفی مسالک پر کوئی رد و انکار نہیں ہے کیونکہ یہ فقہی مسالک کچھ شرائع مستقلہ نہیں ہیں کہ ان کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ چھیڑ کر ایک سے دوسرے مسلک پر رد و طعن یا ایک سے دوسرے کا ابطال کیا جائے، یہ اجتہادی مسالک محض عملی راستے ہیں جو چلنے کے لئے صاف کئے گئے ہیں نہ کہ جنگ کے میدان ہیں جو لڑنے کے لئے بنائے گئے ہیں اور نہ موجودہ نازک زمانہ جب کہ مسلمانوں میں ہزاروں ما بہ النزاع موجود ہیں اس کے لئے موزوں ہی ہو سکتا ہے کہ ایک اور نزاع کو ہوا دی جائے-----

تحریر خطبہ کی غرض و غایت

اس مختصر نوشتہ سے غرض اصولی طور پر اجتہاد تقلید کے بارہ میں نقل صحیح اور عقل سلیم کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی معتبر اور مستند یعنی شرعی اجتہاد کی تقلید کوئی بدعت سیئہ نہیں ہے کہ

اسے قابل ملامت اور اس کے مرتکب کو مستوجب نکیر تصور کیا جائے بلکہ وہ ایک ایسا مسلوک راستہ ہے جو سلف سے لے کر آج کے خلف تک اجماعی طور پر دینی راہ گزر بنا رہا ہے اور امت نے اس کے سوا اپنے دین کے تحفظ کی کوئی اور صورت نہیں سمجھی۔

یہ غرض نہیں کہ تقلیدی مسلک سے انکار رکھنے والے کیسے ہیں اور کس حکم کے مستحق ہیں؟ میں اس سلسلہ میں ابتداء چند تمہیدی جملے اور جملے میں اصل مقصد کی چند باتیں عرض کروں گا جس کے خطاء وصواب کا فیصلہ حضرات علماء کے ہاتھ میں ہے۔

فانْ يّكُ صواباً فمن الله وان يّكُ خطاءً فمن نفسى والمرجو المسامحة والاصلاح وبالله التوفيق.

اللہ کا کام اور اس کا کلام

حضرات! اس عالم کی زندگی اور آبادی ورونق صرف دو چیزوں سے ہے بلکہ عالم میں آبادی کی صرف دو چیزیں ہیں ایک اللہ کا کام اور ایک اس کا کلام خدا کے کاموں سے کائنات عالم میں حسی نظام بنا ہے جسے عالم خلق کہتے ہیں اور اس کے کلاموں سے اقوام عالم کا یہ شرعی نظام استوار ہوا ہے جسے عالم امر کہتے ہیں۔

اَلَالَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ

پس عالم خلق ہو یا عالم امر دونوں میں اسی کی ذات وصفات اور کمالات علم وعمل کی جلوہ گری ہے اور تکوین وتشریع کے ان گوناگوں مظاہر میں اسی باطن مطلق کے محاسن اقوال وافعال ظہور کر رہے ہیں ۔

ہرچہ دیدم در جہاں غیر تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

تکوین وتشریع کا مبداء ومعاد واحد ہے

یہی وجہ ہے کہ تکوینی نظام بھی اسی سے چل کر اسی پر ختم ہوتا ہے اور تشریعی انتظام بھی اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی تکوین وتشریع اور امر کا مبداء اور معاد وہی اور صرف وہی ہے۔ عالم خلق کے بارہ میں مبداء ہونے کو اپنے کلام پاک میں اس طرح ارشاد فرمایا ۔

وَهُوَ الَّذِىْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ

"وہی ہے جو آغاز فرماتا ہے خلقت کا"۔

پھر اسی آیت سے ملحق اپنے معاد خلق ہونے کی یوں تصریح فرمائی کہ ۔

ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ

"پھر وہی ہے جو خلقت کو (اپنی طرف) لوٹا لیتا ہے اور وہ اس پر بالکل سہل ہے"۔

جس سے واضح ہے کہ کائنات کی ابتداء وانتہا صرف اسی سے ہے کوئی غیر اس میں دخیل نہیں اس طرح عالم امر کے بارہ میں اپنا مبداء ہونا یوں ظاہر فرمایا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ

"اللہ ہی ہے جس نے سات آسمانوں اور انہیں کی مانند زمینوں کو بنایا' اتر تا رہتا ہے امر ان کے درمیان"

اور دوسری آیت میں اپنے مرجع الامور اور معاد امر ہونے کی یوں تعبیر فرمائی کہ۔

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ

"اور اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹ جاویں گے"۔

جس سے نمایاں ہے کہ اوامر اور شرائع کا نازل کرنا اور آخر کار اپنی طرف اٹھا لینا صرف اسی کا کام ہے اس میں کوئی مخلوق یا کوئی بشر شریک نہیں۔ پس نہ تخلیق و تکوین میں اس کا کوئی ساجھی اور شریک ہے اور نہ تشریع و تعمیر میں کوئی اس کا سہیم و ندیم اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ

تکوین و تشریع کے اصول بھی ایک ہیں

یہاں سے خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے کہ تکوین اور تشریع کو بروئے کار لانے والے ایک ہی اصول فطرت ہو سکتے ہیں جو فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی فطرت سے ناشی ہیں کہ وہی ان دونوں کا مبداء اور انتہا ہے انہی اصول کو جب تخلیق میں استعمال کیا گیا عالم مخلوقات مکمل ہو کر سامنے آگیا اور انہی کو جب تشریع میں بکار لایا گیا تو عالم مشروعات تیار ہو کر پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

چنانچہ حق تعالیٰ کی صفت تانی و تدریج یا صفت ربوبیت کا اصول جس کے معنی آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ کسی شئے کو اس کی حد کمال تک پہنچانے کے ہیں جب تکوین کے ساتھ ہم کنار ہو تو بتدریج مخلوقات کا نظام مکمل ہو کر اس ہیئت کذائی پر آگیا جو آج زمین و آسمان، شجر و حجر، حیوان وانسان اور پوری منظّم کائنات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور وہی تدریج کا اصول جب تشریع سے ہم آغوش ہوا تو بتدریج ہی شرائع کا نظام بھی کامل و تام بن کر اس ہیئت کذائی پر سامنے آگیا۔ جو اسلام کی صورت میں ہمارے آگے ہے۔

مخلوقاتی نظام کی اس تدریجی ساخت اور تمہیلی مدت کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں راہنمائی فرمائی کہ۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى

عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ.

"بلاشبہ تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں' پھر چھا گیا عرش پر کہ امر کی تدبیر فرمائے"۔

اس کی تفصیلات دوسری آیات اور احادیث میں موجود ہیں کہ کتنے دن اور کون سے دن میں کیا چیز بنی اور اس نے اپنی تکمیل میں کتنی مدت لی۔ آیت سے بالاجمال یہ واضح ہے کہ یہ مجموعہ کائنات چھ ۶ دن میں تیار ہوا اس کے ساتھ جب یہ آیت بھی ملالی جائے کہ۔

وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ.

"اور ایک دن آپ کے پروردگار کا مثل ہزار برس کی مدت کے ہے جو تم شمار کرتے ہو"۔

تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات خلق کی تکمیل رفتہ رفتہ چھ ہزار برس میں ہوئی۔ ادھر شرعیاتی نظام کی تدریجی ترقی و تکمیل کی طرف بھی قرآن نے اشارہ فرماتے ہوئے تعلیمات الٰہیہ کا اولین مورد اور خلافت ربانی کا پہلا مرکز حضرت آدم علیہ السلام کو بتلایا ان کی علمی خلافت کے بارہ میں جو عالم امر کی ابتداء ہے۔

قرآن عزیز کا ارشاد ہے

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ.

اور خلافت نبوۃ کے بارہ میں جو عالم امر کی آخری کڑی ہے۔ حدیث ابوذر غفاریؓ میں جسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے آدم علیہ السلام کو اول الانبیاء اور نبی مکلم فرمایا گیا جن پر آسمانی صحف نازل ہوئے (مشکوٰۃ باب بدء الخلق) غرض قصر نبوت کی تعمیر آدمؑ سے شروع ہوئی جو نبوت اور علم نبوت کے پہلے مرکز تھے جن سے عالم امر کا آغاز ہوا۔ پھر اس قصر نبوت کی آخری خشت جس سے یہ قصر مکمل ہوا۔ حدیث ابی ہریرہؓ میں جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بتلایا گیا کہ:

خُتِمَ بِیَ الْبُنْیَانُ وَخُتِمَ بِیَ الرُّسُلُ (وفی روایة) فَاَنَا اللَّبْنَةُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ.

"مجھ سے قصر نبوت مکمل کر دیا گیا اور رسول ختم کر دیئے گئے (اور ایک روایت میں ہے) پس میں وہ خشت ہوں جس سے یہ قصر مکمل ہوا اور میں خاتم النبیین ہوں"۔

پس حضور اس علم نبوت اور ختم نبوت کے آخری مرکز تھے جن پر عالم امر کا اختتام کر کے اس کی تکمیل کر دی گئی۔ چنانچہ قرآن کریم نے حضورؐ کے آخری اور وداعی حج کے دن دین کی اس

تدریجی تکمیل کے آخری نتیجہ کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا کہ:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا.

"آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں تم سے دین کے بارے میں اسلام سے راضی ہو گیا"۔

اگر مورخین کا یہ قول اختیار کیا جائے کہ آدم علیہ السلام سے چھ ہزار سال بعد دور محمدیؐ شروع ہوتا ہے اور آپ ساتویں الف کے آغاز میں مولود اور مبعوث ہوئے ہیں (جس پر بعض آثار صحابہؓ اور احادیث بھی شاہد ہیں جن کو ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے) تو واضح ہوگا کہ تکوینیات کی طرح تشریعیات کی تکمیل بھی چھ ہزار سال میں ہوئی ہے اور جس طرح تکوین و تشریع میں تدریج و تانی کا اصول مشترک تھا اسی طرح اس کی مدت بھی مشترک اور یکساں ثابت رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے چھ دن یا دنیا کے چھ ہزار سال کی مدت مخلوقات اور مشروعات کا نظام مکمل ہو کر اس درجہ پر پہنچا دیا گیا کہ اب اس میں نہ کمی کی گنجائش رہی نہ زیادتی کی نہ ترمیم کی نہ تنسیخ کی کہ لَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ یعنی جس طرح کائنات عالم کے کلی مواد آب و خاک و باد و آتش پھر مواد کے کلی موالید جمادات' نباتات' حیوانات' پھر ان کے علویات اور سفلیات------

پھر مواد علوی و سفلی کی جامع انواع و اجناس' انسان' شیر' بکری' شجر' حجر اور بحر و بر' جن' ملک' سیارات و ثوابت' ارض و سماء وغیرہ کی یہ مجموعی ہیئت جسے عالم کہتے ہیں اب کوئی کمی بیشی قبول نہیں کر سکتے۔

اسی طرح دین کے اصول و کلیات اساسی قواعد و ضوابط اور تمام منصوص عقائد و احکام کی اس مجموعی ہیئت کذائی میں جسے اسلام کہتے ہیں کوئی کمی بیشی اور ترمیم و تنسیخ ممکن نہیں کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً

ایجاد اور اجتہاد

مگر ہاں جس طرح تکوین کے ان مرتب مواد اور علوی و سفلی ذخار سے بواسطہ فکر و تدبیر نئے نئے عجائبات کا اکتشاف کیا جا سکتا ہے اور ان کی چھپی ہوئی طاقتوں کا سراغ لگا کر تمدن کے نئے نئے کارنامے دنیا کو دکھائے جا سکتے ہیں جن کی کوئی حد نہیں کہ ----لَاتَنْقَضِیْ غَرَائِبُہٗ

اسی طرح تشریع کے منظم احکام و مسائل اور قواعد و کلیات کے مخفی علوم و اسرار کا پتہ لگا کر ان سے تدین کے نئے نئے فروعی مسائل لطائف و ظرائف اور حقائق و معارف پیدا کئے جا سکتے ہیں کہ

قرآن کی شان بھی لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ وارد ہوئی ہے۔ اس تکوینی اکتشاف کا نام ایجاد ہے اور تشریعی استخراج کا نام اجتہاد ہے۔ نہ ایجاد کی کوئی حد ہے اور نہ اجتہاد کی۔ یہ الگ بات ہے کہ جیسے ایجادات ہر زمانہ کی ذہنیت اور ضرورت کے مطابق ہوتی ہیں اور فطرۃ موجدین کی طبائع ان ہی ایجادات کی طرف چلتی ہیں جن کی زمانہ کو ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو طبائع کی یہ دوڑ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ آگے صرف ان ایجادات سے فائدہ اٹھانا رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی اجتہاد کا رنگ بھی ہر دور کی علمی ذہنیت اور وقت کے مقتضیات کے مطابق ہوتا ہے۔ مجتہدین کے قلوب فطرۃً چلتے ہیں اس استخراج کی طرف جس کی اس قرن کو ضرورت ہوتی ہے۔ پس تکمیل ضرورت کے بعد اجتہاد کا وہ دور نہیں لوٹتا جو گذر چکا ہے کہ زمانہ اس کی ضرورت سے فارغ ہو چکا ہے اب صرف اس سے نفع اٹھانے کا موقع باقی رہ جاتا ہے۔

اجتہاد کی انواع

مثلاً اگر عین دین میں اجتہاد کر کے استخراج علل وکلیات اور تدوین اصول کی ضرورت ہو گی تو مجتہد دماغ قدرۃ ادھر ہی چلیں گے اور اگر ان کلیات میں سے اجتہاد کے ذریعہ استخراج مسائل اور تدوین قانون کی ضرورت ہو گی تو مجتہد دماغ ادھر ہی متوجہ ہوں گے۔

اور پھر اگر ان متخرج مسائل کو واقعات پر منطبق کر کے ترجیح وانتخاب فتاویٰ کی ضرورت پڑے گی تو اجتہادات ادھر ہی بڑھیں گے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ جو درجہ بھی اجتہاد کے ذریعہ پردہ ظہور پر آجائے گا اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ پھر طبعی طور پر اس کے اعادہ کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اس لئے قدرۃً بعد کے مجتہد دماغ اس کی طرف چل ہی نہ سکیں گے کہ ان کے لئے ان حاصل شدہ اجتہادات میں اجتہاد کرنے کی طرف کوئی کشش ہی نہ ہو گی کہ تحصیل حاصل سے فطرت ہمیشہ گریز کرتی رہی ہے کیونکہ حاصل شدہ شئے سے صرف انتفاع کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے نہ کہ اسے حاصل کرنے کی۔

مجتہد کا کام حقیقت رسی ہے

اس سے آپ اس نتیجہ پر ضرور پہنچ گئے ہوں گے کہ موجد اور مجتہد کا کام محض سطحی امور کا دیکھ لینا نہیں بلکہ ان کی گہرائیوں میں گھس کر ان کی بنیادوں کا پتہ لگانا ہے۔ موجد کائنات کی اشیاء کی صورت سے گزر کر ان کی مخفی خاصیات کا پتہ چلائے گا تاکہ اس کی باطنی کلیت اور اندرونی وسعت سے اپنا علم وسیع کر کے کوئی ایجادی قدم اٹھا سکے اور مجتہد مسائل شرعیہ اور نصوص کے ظواہر سے گزر کر ان کے باطن میں گھسے گا

تا کہ علل کلیہ اور اسرار جامعہ کا سراغ لگا کر ان جزوی مسائل کو ہمہ گیر بنا سکے۔ خلاصہ یہ کہ جزئیات سے کلیات تک پہنچنا اور کلیات سے پھر نئے جزئیات کا یاد کر لینا کہ یہ در حقیقت حفظ ہوگا علم نہ ہوگا یا علم ادنیٰ ہوگا علم اعلیٰ نہ ہوگا۔

مثلاً تکوین کے سلسلہ میں دنیا کی بے شمار جزئیات وافراد زید، عمر، بکر، شجر، حجر اور بحر و بر کا دیکھ لینا یا سن کر معلوم کر لینا کوئی قابل ذکر علم نہیں کہ یہ ہر عامی سے عامی انسان کو میسر آسکتا ہے بلکہ یہ علم ہی نہیں حس ہے۔ خواہ آنکھ سے محسوس کرے یا کان سے ہاں یہ جان لینا کہ زید کن کلیات کے ماتحت زید ہے۔ اس کی حقیقت کی تشکیل کن کن کلیات سے ہو رہی ہے اور اس کی ماہیت میں کون کون سے کلیات حصہ دار ہیں۔ پھر زید جزئی کا اس کی ماہیاتی کلیات سے کیا رابطہ ہے حقیقۃً علم ہے جو حس کے مقام سے بالاتر ہے۔

آپ خود ہی غور کریں کہ زید اور زید کی طرح عالم جزئیات منتشر اور بے جوڑ نہیں بلکہ ہر جزئیت میں بیسیوں کلیات سرایت کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ سب جزئیات اور افراد سمٹ کر کسی نہ کسی نوع کے تحت میں آئے ہوئے ہیں۔ پھر ساری انواع سمٹ کر کسی نہ کسی جنس کے نیچے ہیں۔۔۔۔ پھر اجناس جمع ہر کر کسی جنس عالی اور جنس الاجناس کے تحت میں آجاتی ہیں اور کائنات کی اس فطری ترتیب و تنظیم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عالم کی تمام جزئی کثرتیں سمٹ کر کلیات کی طرف اور کلی وحدتیں پھیل کر جزئیات کی طرف دوڑ رہی ہیں۔ پس یہ زید جزئی بظاہر تو ایک جزوی شخص ہے لیکن بہ نگاہ غائرہ وہ ایک مستقل جہاں ہے جس میں ترتیب وار یہ سینکڑوں کلیات اور عمومات سمائی ہوئی ہیں اور اس زیدیت کی تشکیل و تکمیل کر رہی ہیں۔

اس جزئی زید کے اوپر انسان کلی ہے۔ جس میں زید کی طرح لاکھوں افراد انسانی لپٹے ہوئے پڑے ہیں۔ پھر انسان کلی کی حقیقت میں یا اس کے اوپر حیوان ہے جس میں حیوان کی طرح لاکھوں نمودار نباتی انواع کھپی ہوئی ہیں۔ پھر نامی کی اصل جسم ہے جس میں نامی کے ساتھ لاکھوں غیر نامی اور بے نمو جمادات شریک ہو گئے ہیں۔ پھر اس جسم مطلق سے اوپر جوہر ہے جس میں اجسام کے ساتھ ان گنت غیر جسمانی مجردات بھی آجاتے ہیں۔ پھر جوہر سے اوپر وجود ہے جو کلی الکلیات اور جنس الاجناس ہے جس کے نیچے جوہر کے ساتھ لاکھوں اعراض بھی آجاتے ہیں، پس ساری کائنات کے یہ مختلف الماہیات اور شاخ در شاخ اجزاء ان درمیانی کلیات سے گزرتے ہوئے وجود میں جمع ہو جاتے ہیں جو ان سب کی اصل اصول ہے اور اس طرح ایک زید کے بنانے میں کس قدر کلیات نے اپنا کام کیا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وجود نے جوہر کا لباس پہنا، جوہر نے جسم کی قبا اوڑھی، جسم نے نمو کی رداء پہنی۔ نامی نے حیوانیت میں قدم رکھا۔ حیوان نے انسانیت میں ظہور کیا اور انسان نے ان سارے

تشخصات کے ساتھ زید کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ پس زید مجموعہ اصول وکلیات نکلا جس کی جزئیت میں کتنی ہی کلیات سمائی ہوئی ہیں بلکہ اس کے ذریعہ سے خود متمثل ہو کر نمایاں ہو رہی ہیں۔

پس ایک عامی تو صرف زید کو دیکھ لے گا' لیکن ایک مفکر زید کے دیکھ لینے ہی پر قناعت نہیں کرے گا۔ اس کی گہری نظر ان مخفی کلیات واسرار تک پہنچ کر رہے گی جن سے زید کا قوام بنا اور وہ بایں ہیئت کذائی نگاہوں کے سامنے آنے کے قابل ہوا۔ اس لئے عامی کو جس میں صرف پیشانی کی آنکھ تھی مُبَصَّرْ کہیں گے لیکن اس باطن بین دانا کو جس کی مخفی آنکھ نے زید کے ان تمام مخفیات کو بھی دیکھ لیا مُبَصَّرْ ہی نہیں مُبَصِّرْ بھی کہیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ زید کے جثہ کا دیکھ لینا علم نہیں بلکہ زید کی کلی حقیقت کو پالینا اور پھر اس جزئی زید کا اس کلیات سے ارتباط معلوم کر لینا علم ہے جو ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔

شریعت حد درجہ مرتب اور منظم ہے

بالکل یہی صورت شرعیات کی بھی ہے کہ تشریع کے یہ لاکھوں مسائل اور شریعت کی یہ ہیئت کذائی محض سطحی اور نمائشی نہیں بلکہ پوری شریعت اپنے ظاہری مسائل اور باطنی دلائل نیز اپنے تمام فروع اور اصول کے لحاظ سے اس درجہ مرتب اور منظم ہے کہ وہ مثل ایک سیدھی زنجیر کے ہے جس میں یہ سارے اصول وفروع اور جزئیات وکلیات درجہ بدرجہ ترتیب وار پروئے ہوئے ہیں۔

شریعت کا کوئی جزئیہ نہیں جو کسی نہ کسی کلیہ کے ماتحت نہ ہو۔ ہر ہر فرع کسی نہ کسی اصل کے ماتحت ہے۔۔۔ پھر ہر ہر اصول کسی نہ کسی اصل اصول سے مربوط ہے اور سارے اصول وکلیات سمٹ کر کسی ایک اصل اصیل سے جڑے ہوئے ہیں۔ جس سے پوری شریعت ایک محیر العقول نظام کے ماتحت اور ایک ایسے شجر واحد کی صورت دکھائی دیتی ہے جس کی تمام شاخیں اور شاخ در شاخ ٹہنیاں مع اپنے ثمرات کے ایک اصل واحد سے ناشی ہو رہی ہیں اور ہر آن اپنے مستفیدین کو اپنے پھلوں سے بہرہ مند کر رہی ہیں۔

مَثَلاً کَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ" وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا.

"مثال کلمہ طیبہ کی اس پاک درخت کی مانند ہے جس کی جڑ تو تہہ میں گھسی ہوئی ہو اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں۔ پھل دے رہا ہو ہر آن اپنے پروردگار کی جانب سے"۔

پس آیات واحادیث میں جس قدر بھی جزئی احکام مذکور ہوتے ہیں جو زید عمر' بکر کی طرح پھیلے ہوئے ہیں ان کی تشکیل وہ اصول وہ کلیات و علل واسرار کرتے ہیں جو ان جزئیات میں مستور

ہوتے ہیں کہ ہر جزئی میں ایک علم کلی ہوتا ہے اور ہر علم کلی میں کوئی حکمت مصلحت کلیہ پوشیدہ ہوتی ہے۔ پھر ہر مصلحت کا تعلق کسی نہ کسی شان کمال سے ہوتا ہے۔ پھر ہر شان کمال کسی نہ کسی صفت الٰہی سے مربوط ہوتی ہے جس سے نفس انسانی کی صفات نقص اس جزئیہ شریعت کی تکمیل کے ذریعہ کمال کا اثر قبول کرتی ہیں اور پھر یہ صفات کمال ذات بابرکات سے مربوط ہیں کہ کمالات کا منبع ہی وجود ہے جیسے شرور کا منبع عدم ہے ؎

حرف حرفش راست اندر معنے
معنے در معنئے در معنے

اسی طرح ساری شریعت بالاخر ان درمیانی اصول وکلیات اور شئون وصفات سے گزرتی ہوئی اپنے وجود سے جا کر جڑ جاتی ہے۔ یعنی شریعت کے تمام اوامر ونواہی جو بمنزلہ افراد کے ہیں اپنی اپنی علل کے نیچے ہیں جو بمنزلہ انواع کے ہیں۔ پھر یہ تمام انواع سمٹ کر دو جنسوں کے نیچے آجاتی ہیں۔ معروف اور منکر پس سارے ماموارت کا سرچشمہ معروف ہے اور سارے منہیات کا سرمنشاء منکر ہے۔ اسی کو قرآن عزیز نے یوں واضح کیا ہے کہ ؎

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ۔

"وہ جو پیروی کرتے ہیں رسول ﷺ کی جو نبی امی ہے' پاتے ہیں وہ لکھا ہوا اپنے پاس تورات وانجیل میں' جو انہیں معروف کا امر کرتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔

پس اصل میں مامور بہ معروف اور منہی عنہ' منکر ہے اب جس چیز میں معروفیت ہوگی وہ مامور بہ بن جائے گا اور جس میں منکریت ہوگی وہ منہی عنہ' ہوجائے گا۔ اس لئے بالذات مامور ذہنی معروف ومنکر ہے کہ وہی حسن بالذات اور قبیح بالذات ہوتے ہیں اور بالعرض وہ چیزیں مامور ذہنی بنتی ہیں جن میں وصف معروفیت اور وصف منکریت موجود ہو کہ ان کا حسن وقبح ذاتی نہیں ہوتا لغیرہ ہوتا ہے۔ پس یہ معروف ومنکر کی دونوں اجناس اللہ کی صفت عدل کے نیچے آئی ہوئی ہیں۔ عدل الٰہی کا تقاضا ہے کہ معروفات برسرکار آئیں اور منکرات زیر ترک رہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔

"اللہ تعالیٰ امر فرماتا ہے عدل اور احسان کا اور روکتا ہے فحشاء ومنکر سے"۔

پس دین کے حق میں یہ صفت بمنزلہ جنس عالی کے ہے اور ظاہر ہے کہ عدل حصہ ہے اس کے وجود کا یعنی وجودی کمال ہے اس لئے گویا سارے اوامر اور نواہی وجود الٰہی سے مربوط ہوگئے اور اس طرح پوری شریعت ذات بابرکات سے وابستہ ہوجاتی ہے۔ اس کو واضح طور پر سامنے لانے کے لئے

ذیل کی امثلہ پر غور کیجئے۔

تنظیم شریعت کی چند امثلہ

(۱) وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی (زنا کے پاس بھی مت پھٹکو) اور ساتھ ہی اس کی علت نقل فرمائی کہ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً (کیونکہ زنا فحش ہے) پس بظاہر تو لَاتَقْرَبُوْا کا حکم زنا پر لگ رہا ہے مگر حقیقۃً فحش پر لگا ہوا ہے کہ فحش ہی کی وجہ سے زنا حرام ہوا ہے۔ اگر اس میں فحش کی شان نہ ہوتی تو وہ ہرگز حرام نہ ہوتا۔ چنانچہ دوسری جگہ کتاب مبین میں اس کی تصریح بھی ہے کہ۔

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ.

”اور اللہ روکتا ہے فحش سے اور منکر سے“

پس حکم کی شکل یوں ہو گئی کہ۔

الزّنٰی فحش والفحش حرام فالزّنٰی حرام

”زنا فحش ہے اور فحش حرام ہے للذا زنا حرام ہے“

پس اصل میں فحش کی جنس حرام نکلی اس کی وجہ سے زنٰی کا جزئیہ حرام بن گیا۔ اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ فحش کی علت کلیہ جن جن افعال میں پائی جاتی رہے گی اور وہ حرام ہوتے جائیں گے لیکن اس کا پتہ چلانا کہ فلاں جزئیہ میں فحش کی شان پائی جاتی ہے یا نہیں؟ ہر ایک کا کام نہیں یہاں سے مجتھد کے کام کا دائرہ شروع ہوتا ہے کہ فحش کی شان کسی فعل میں ثابت کر کے اس پر حرمت کا حکم لگا دے یہ ایسے ہی مجتھد دماغوں کا کام ہے جنہیں تشریع سے فطرۃً اور ذوقاً مناسبت ہو اور اللہ نے وہ ملکہ ان میں قدرۃً ودیعت فرمایا ہو۔

پھر فحش کے حرام ہونے کی بھی ایک علت ہے جس کی وجہ سے فحش میں حرمت آئی اور وہ اللہ کی صفت حیاء ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ حَیٌّ سَتِيْرٌ.

صفت حیاء کا فطری تقاضہ ہے کہ اس کے بندوں میں فحش نمایاں نہ ہو۔ پس حکم جزئی یعنی حرمت زنٰی حرمت فحش سے ناشی ہے اور حرمت فحش اللہ کی صفت حیاء سے نکلی ہے۔ اس لئے زنٰی کے ساتھ اور بھی تمام فواحش کی حرمت کی علت کلی خدا کی ایک صفت کمال نکلی جو اس کے وجود لامحدود کا ایک حصہ ہے۔ پس جس شخص میں حیاء درجہ حال کو پہنچ چکی ہو اور وہ ظاہراً و باطناً فیمابینہ، و بین اللہ اور فیمابینہ و بین الخلق حیاء کامل کے لئے مضطر ہو چکا ہے۔ ادھر قلب میں ذوق اجتہاد رکھتا ہو اور دماغ میں کمال عقل تو بلاشبہ وہی اس حیاء اور اس کے تقاضٰی سے حرمت فحش اور اس کے تقاضٰی سے حرمت زنٰی اور پھر حرمت زنٰی کے تقاضٰی سے عموماً دواعی زنٰی کو جوہر

زمانہ میں مختلف رنگوں میں نمایاں ہوتے ہیں، پہچان کر حرمت کا حکم لگا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اس اجتہاد سے تشریع کا یہ دائرہ کس قدر وسیع ہو جائے گا اور ایک حکم زنی سے کس قدر احکام پیدا ہو جائیں گے جو مجتہد کی دیانت و امانت اور فقہ و اجتہاد کا ثمرہ ہوں گے۔ پس ایسے احکام میں جہاں یہ علل کلیہ ظاہر نص میں موجود ہوں۔ مجتہد کا کام قیاس ہے کہ علت کے اشتراک سے اس جزئیہ پر دوسرے جزئیات کو قیاس کر کے ان پر حرمت کا حکم لگا دے اور احکام کا دائرہ وسیع تر کر دے۔

(۲) اور کبھی نص میں صرف حکم ہی مذکور ہوتا ہے اور اس کی علت حکم میں مستور و مخفی بھی ہوتی ہے لیکن جن چیزوں پر یہ منصوص حکم لگایا جاتا ہے ان میں خلقی طور پر کچھ اوصاف ہوتے ہیں جو حکم میں موثر ہوتے ہیں۔ گویا علت حکم ان اوصاف میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے جس کو مجتہد کی گہری نظر ان اوصاف میں سے نکھار کر نکال لیتی ہے اور علت حکم کھل جانے پر یہ حکم جزئی کلیہ کے ہو کر دوسری جزئیات میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک مجتہد کے نور اجتہاد سے یہ جزئی حکم ایک وسیع دائرہ پیدا کر لیتی ہے جس سے شریعت کی تفصیلات اور ترتیبات نمایاں ہوتی ہیں۔

مثلاً احادیث ربوا میں اشیاءِ ستہ ۱۔ گندم، ۲۔ جو، ۳۔ چھوہارہ، ۴۔ نمک، ۵۔ سونا، ۶۔ چاندی، میں سُود لینا حرام فرمایا گیا۔ لیکن حرمت کی لِم اور علت کسی حدیث میں مذکورہ نہیں اس لئے مجتہدین متوجہ ہوئے کہ حکم کی حکمت یا وجہ حرمت نیز اشیاء مذکورہ کی وجہِ تخصیص کیا ہے؟ یعنی شارع نے آخر حُرمتِ ربٰوا کے لئے انہی اشیاء کو کیوں خاص فرمایا؟ تو سوائے اصحابِ ظواہر کے جو قیاس کے منکر ہیں۔ ہر ایک نے ان اشیاء کے اوصاف میں قوت اجتہادی سے غور کر کے کچھ ایسے جامع اوصاف نکالے جو علت حکم بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ وہ وصف جامع قدر مع الجنس ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ وہ طعمیت اور ثمنیت ہے۔

امام مالکؒ نے فرمایا کہ وہ اقتیات وادّخار ہے۔

امام احمدؒ نے وہی فرمایا جو امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔

بہر حال ہر ایک نے ایک علتِ حکم برآمد کی جس پر حرمت ربٰوا کا حکم دائر ہے اب جہاں جہاں جس کی نکالی ہوئی علت پائی گئی وہاں وہاں اس نے سُود کی حرمت کا حکم لگایا۔ ایسے مواقع پر مجتہد کا کام پہلے استنباط علت ہے اور پھر قیاس حکم۔

۳۔ کبھی نص میں حکم کے سِوا علت نہ منصوص ہوتی ہے نہ محکوم نہ اس میں کوئی وصف ہی ایسا ہوتا جس سے علت حکم کا استنباط کیا جا سکے۔ ایسی صورت میں مجتہد محض اپنے ذوق اجتہاد سے آگے بڑھتا ہے اور عام قواعد شرعیہ اور وضع تشریع کی مدد سے جن کے استحضار سے مناسبت اور اس کی اجتہادی قوت کی تشکیل ہوتی ہے۔ علت کا استخراج کرتا ہے اور حکم جزئی کو اس سے مربوط سمجھ کر پھر اس علت

سے مختلف ابواب کو احکام قیاس کی مدد سے ظاہر کر دیتا ہے مثلاً حق تعالیٰ نے فرمایا:

وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا

"گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو"۔

اجتہادی ذوق سے اس کا کلیہ جس سے یہ حکم ناشی ہے یہ ہے:

اِفْعَلُو الْاُمُوْرَ عَلٰى مَنْوَالِهَا اَوْضَعُوا الْاَشْيَاءَ فِىْ مَجَالِهَا

"کاموں کو ڈھنگ سے کرو بے ڈھنگے پن سے مت کرو یا ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھو"۔

ظاہر ہے کہ دوازہ ہوتے ہوئے گھروں میں دیواریں پھلانگ کر گھسنا حد درجہ بے ڈھنگا پن بد سلیقگی، ناشائستگی اور بے محل کام کرنا ہے۔ پس اصل میں ممانعت ہوئی ناشائستگی اور بے ڈھنگے پن کی۔ چونکہ یہ بے ڈھنگا پن دیواریں توڑ کر یا پھلانگ کر داخل خانہ ہونے میں پایا جاتا تھا۔ للہذا یہ فعل ممنوع ہوا کہ اس کی علت ممنوع تھی اور علت اس لئے ممنوع ہوئی کہ اللہ کی صفت جمال اور صفتِ عدل کا تقاضا ہے۔ کیونکہ جمال کے معنی حقیقی موزنیت اور کامل توازن کے ہیں اور عدل کے معنی وَضْعُ الشَّىْءِ فِىْ مَحَلِّهٖ ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ بے ڈھنگا پن اور بد سلیقگی اس کے خلاف ہے، اس لئے ناپسندیدہ حق ہوئی کہ ان اللہ جمیل یحب الجمال پس جس کے دماغی قویٰ میں توازن حقیقی حد کمال پر پہنچا ہوا ہو۔ گویا وہ اللہ کی اس صفتِ جمال سے مستنیر اور اس کے اُس خلق سے تخلق ہو ادھر قلب میں وہ وہبی ملکہ اجتہاد بھی رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اس کلیہ کے انکشاف کے بعد صرف اسی جزئی حکم پر قناعت نہیں کرے گا جو آیت میں مذکور ہے بلکہ ہر باب کے ہر اس فعل کو ممنوع قرار دے گا جس میں یہ بے ڈھنگے پن کی علت پائی جائے گی۔ البتہ یہ معلوم کرنا کہ آیا اس میں یہ علت غیر موزونیت ہے بھی یا نہیں؟ نہ ہر ایک کا کام ہے اور نہ ہر ایک کی رائے اس میں معتبر ہے۔

بہر حال علت کے انکشاف پر حکم جزئی کی توسیع موقوف ہے پس اگر یہ علت کلی ہو گی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مجتہد پر ایک کلیہ منکشف ہو گا جس سے بہت سی غیر معلوم جزئیات معلوم ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ مجتہد کے لئے یہ کوئی قابل اعتراض بات نہ ہو گی کہ اس نے کلیات کیوں بنا لئے کیونکہ وہ کلیات بناتا نہیں بلکہ بتاتا ہے۔ بنے ہوئے تو وہ خود ہی موجود ہیں کیونکہ علم میں جتنا خفا بڑھتا جائے گا اتنی ہی کلیت آتی جائے گی پس مجتہد کا کمال یہ ہو گا کہ وہ ان خفیات کو نکال لے نہ یہ کہ کلیات کا پیش کرنا اس کے حق میں کوئی عیب اور نقص سمجھا جائے۔

انکشاف علوم میں نبی اور امتی کا فرق

ہاں! اس موقع پر یہ فرق سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام پر تو بذریعہ وحی اوّل علل وکلیات منکشف ہوتے ہیں اور پھر ان سے متعلقہ احکام کا انکشاف ہوتا ہے۔ یعنی ان کے مصفی اذہان میں مقاصد وکلیات پہلے آتے ہیں اور ذرائع بعد میں کیونکہ ان کا تعلق ابتداءً ہی جاذبہ حق کے ماتحت اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے اور وہ ذات سے صفات کی طرف اور صفات سے افعال واحکام کی طرف آتے ہیں۔ لیکن مجتہدین اور امت کے محدثین کے روشن ضمیروں میں اول بذریعہ درس وتدریس اور روایات کے احکام جزئیہ جمع ہوتے ہیں اور پھر علم وعمل کی مزاولت۔ تزکیہ نفوس اور تصفیہ قلوب کی برکت اور ہمہ وقت کے ذکر وفکر اور استمرارِ تفکر وتدبر سے علل کلیات کا انکشاف ہوتا ہے جس سے ان کے لئے استنباط وقیاس اور اجتہاد کا دروازہ کھلتا ہے کیونکہ امتی کا تعلق ابتداءً ذاتِ حق سے نہیں ہوتا بلکہ نبی وقت اور ان کی لائی ہوئی شریعت کے اتباع سے ہوتا ہے۔ یعنی پہلے احکام سامنے آتے ہیں ان پر پھر عمل کی برکت سے علوم واسرار کا انکشاف ہوتا ہے بفحوائے حدیث:

من عمل بما علم ورثه الله علم مالم يعلم

"جس نے اپنے علم پر عمل کیا تو اللہ اسے ایک ایسے علم کا وارث بناتا ہے جو اب تک اس کے پاس نہ تھا"۔

اور اس پر علم وہبی سے بواسطہ اسرار وکلیات صفات حق سے وابستہ ہوتے ہیں۔ تب کہیں ذات تک رسائی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس کیفیت کے ساتھ امت میں دین بحیثیت مجموعی پہلے تو مجتہدین اور راسخین فی العلم کے اذہان میں مرتب ہوتا ہے اور پھر وہ پوری ترتیب وتنظیم سے اس کی تشکیل کر کے امت کے سامنے رکھ دیتے ہیں جس سے دنیا کو دین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے اور شریعت کا وہ یسر واضح ہوتا ہے جس کے جگہ جگہ قرآن وحدیث میں دعاوی موجود ہیں۔

بہر حال کسی جزئیہ کے واسطے سے اس کلیہ کا سراغ لگانا اور پھر اس کلیہ کے نیچے دوسری جزائیات لانا اور اس مرتبہ سلسلہ کی درمیانی ترتیب اور رابطہ کا پہچان لینا فقہ کا کام ہے۔ گویا فقیہہ کبھی شاہد سے غائب کی طرف جاتا ہے جبکہ واضح جزئیہ سے اس کی مستور علت نکالتا ہے اور کبھی غائب سے شاہد کی طرف آتا ہے جبکہ کلیات سے جزئیات کی طرف لوٹتا ہے اور یہ ایاب وذہاب، عوام اور علماء کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں اس لئے فقہ مجتہد ان کی نگاہوں میں شریعت ذاتی رائے سے متصرف دکھائی دیتا ہے، کوئی ناسمجھ اسے ازراہ طعن قیاس کہتا ہے اور کوئی صاحب الرائے وغیرہ حالانکہ اس کی یہ رائے اور قیاس عقلی محض نہیں ہوتا اور نہ محض قوت فکریہ کا ثمرہ ہوتا ہے، کہ اسے تصرف ذاتی کہا جائے بلکہ اس ذوقی قوت کا ثمرہ ہوتا ہے جو شریعت ہی کے علم وعمل کی مزاولت سے بطور

جذبہ صادق اس کے قلب میں من اللہ تعالیٰ القاء کی جاتی ہے۔

پس وہ تصرف خود شریعت ہی کا عین شریعت میں ہوتا ہے نہ کہ اس کا۔ مگر ہاں اس کا ظہور اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جیسے تمام شرائع سماویہ کا ظہور محض من اللہ ہے۔ مگر ہوتا ہے نبی ہی کے لسان و قلب پر اور نہ یہ طعن کی چیز ہے نہ حیرت و تعجب کی۔ انبیاء کو جو ان کشوف الٰہی اور علم تشریعی تک الہام کے ذریعہ پہنچائے جائیں اصطلاح شریعت میں محدث کہا گیا ہے۔ بہر حال ان محدثین کے ذریعہ حکم شریعت اور اللہ کے درمیان تمام کلیاتی سلاسل منکشف ہوتے ہیں جس سے پوری شریعت کا رابطہ کلیات اور کلی الکلیات سے واضح ہو جاتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ کائنات خلق کی طرف عالم امر کا یہ پھیلاؤ بھی بے جوڑ نہیں بلکہ شریعت کا ہر ہر جزئیہ اپنے نوعی اصلو و علل پھر بالائی جنس معروف و منکر پھر فوقانی جنس کی صفت الٰہی اور پھر جنس الاجناس عدل اور اس میں بھی بالائی علم محیط اور اس سے اوپر لا محدود وجود باجود سے سے ہوتا ہوا ذات بابرکات سے مربوط ہو جاتا ہے گویا جیسے تکوین کی جزئیات زید، عمر، بکر وغیرہ کا آخری مرجع جسم و جوہر سے گزرتا ہوا وجود حق نکلا تھا ایسے ہی تشریع کے تمام مسائل کا سر منشاء بھی ان درمیانی انواع سے ہوتا ہوا وہی نکل آتا ہے اور تکوین و تشریع کا مبداء و معاذات حق ٹھر جاتی ہے جیسا کہ قرآن کا دعوای ابتدا میں ہم نے نقل کیا ہے نیز واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح پوری کائنات آئینہ جمال حق ہے جس میں اس کا فعلی ظہور ہے اسی طرح پوری شریعت آئینہ کمال حق ہے جس میں اس کا قولی اور علمی ظہور ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

نصُوصِ کتاب و سنت کا ظہر و بطن

پس امر و نہی کے اس طویل سلسلہ میں سے امر و نہی یا حکم منصوص کا جان لینا کمال علم نہیں بلکہ اس سلسلہ میں سے اس جزئیہ کی فوقانی علل و کلیات اور پھر ان کی فوقانی شؤن و صفات سے اس کا ربط اور کیفیت ارتباط کا پتہ چلا لینا اور اس حکم کی نسبت اور کیفیت نسبت کا انکشاف کر لینا اس کی معروفیت و منکریت کا درجہ معلوم کر کے صفت و نوعیت وجوب، فرضیت، سنیت اور استحباب وغیرہ کی تعیین کرنا کمالِ علم ہے جو صرف راسخین فی العلم اور دائرہ علم کے اولوالامر اصحاب کے حصہ میں آیا ہے۔

نصوص کے اسی سلسلہ حکم و حکمت یا معانی جلیلہ اور مدلولات خفیہ کو جس طرح عرض کردہ آیت شجرہ نے کلمہ شریعت کو شجرہ سے تشبیہ دے کر پیش کیا تھا کہ جیسے شجرہ میں فروع و اصول ہوتے ہیں فروع نمایاں اور اصول مستور و مبطن اور فروع میں اصول ہی کی کار فرمائی ہوتی ہے۔

گویا فروع در حقیقت مظاہر اصول ہوتے ہیں جن کی صور میں اصول کے قویٰ ظہور کرتے ہیں۔ اسی طرح ذیل کی احادیث ظہر و بطن سے تعبیر کر رہی ہیں۔ قرآنی نصوص کے بارہ میں ارشادِ نبویؐ ہے:

عن ابن مسعود رضی اللّٰہ عنہٗ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ انزل القران علی سبعة احرف لکل آیة منها ظهر و بطن ولکل حد مطلع.

"ابن مسعود رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، ہر آیت کا ایک باطن اور ہر حد کے لئے طریقہ جداگانہ ہے۔

(یعنی مدلولِ ظاہر کے لئے علوم عربیہ اور مدلولِ خفیہ کے لئے قوتِ فہمیہ)"۔

حدیث بالا میں ظہرِ آیت اور بطنِ آیت دونوں کے لئے ایک ایک مطلع کی خبر دی گئی ہے مطلع جھروکے اور جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں، جیسے جھروکوں اور جھانکنے کی جگھوں سے وہ تمام چیزیں نظر آجاتی ہیں جو ان کے مقابل ہوتی ہیں اور ان کے وسیلہ سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی آیات کے ظواہر یعنی مدلولاتِ لفظی معلوم ہونے کے لئے جھروکہ عربیت ہے کہ کلام عرب کی اصناف اور اسالیب کلام پر عبور۔۔۔ محاورات اور محاسن کلام سے واقفیت ہو، قواعد فصاحت و بلاغت زیر نظر ہوں، صیغ اداء اور ان کے تعریفات پر اطلاع ہو تو ان کی مدد سے آیت قرآنی کا صحیح مفہوم سامنے آسکتا ہے بشرطیکہ ذوق سلیم بھی ساز گار ہو۔

لیکن بواطنِ آیت یعنی مدلولاتِ خفیہ اور احکام سریہ جو بطون در بطون کے پردوں میں مخفی ہیں، ان کے لئے مطلع اور جھروکہ بھی علل احکام ہیں جن پر مجتہد اپنے نور فہم اور ذوق اجتہاد سے وقوف حاصل کرتا ہے ان علل کے جھروکوں کے ذریعہ تمام وہ احکام خفیہ منکشف ہو جاتے ہیں جو ان علل کے بالمقابل ہوئے یعنی ان علل کے معلولات ہوئے خواہ یہ علل قریبہ ہوں یا علل بعیدہ یعنی بطنِ آیت قریبی ہوں جیسے علت حکم یا بعید ہوں جیسے کلیات عامئہ یا العبد ہو جیسے صفات حق جو علل اصلی ہیں کیونکہ ثبوت حقوق اللہ یا حقوق العباد کی اصلی مقتضی یہ صفات الٰہیہ ہی ہیں، جیسے خدا کا جمیل ہونا بندہ سے عشق و محبت کا متقاضی ہے اور خدا کا مالک و ملک ہونا بندہ سے انفاق مالی اور صدقات کا مطلب ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض جو شخص بھی اس علل بعیدہ و قریبہ پر مطلع ہو گا وہی عالم اور حکیم کے لقب کا مستحق ہو گا اور اسی کو وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا کا حقیقی مصداق کہا جائے گا بہرحال اس حدیث بالا میں علم کے اس مخفی مرتبہ کو بطن

آیت سے اور اس آیت میں حکمت سے اور آیت شجرہ میں اقتضاء اصل (جڑ) سے تعبیر کیا گیا ہے پھر جس طرح علم کا یہ عمیق مرتبہ آیات قرآنی میں پایا جاتا ہے اسی طرح کلام نبوت میں بھی موجود ہے اور حدیث کا بھی ایک ظہر ہے اور ایک بطن کہ وہ بھی افصح البشر کا کلام ہے چنانچہ حدیث کے بارے میں خود صاحب حدیث ارشاد فرماتے ہیں :

عن ابن مسعود قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نضّر اللّٰہ عبداً سمع مقالتی فوعاها وادّاها فُربّ حامل فقهٍ غیر فقیهٍ ورُبّ حامل فقهٍ الی من هو افقه منه.

”ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ترو تازہ فرماویں اللہ تعالیٰ اس بندے کو جو میری بات سنے اور اس کو یاد کرے اور یاد رکھے اور دوسرے کو پہنچادے کیونکہ بعض پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعضے ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے زیادہ فہیم ہوتے ہیں“۔

اس حدیث میں بعض شاگردوں کا استاذ سے افضل ہونا بیان فرمایا گیا ہے ظاہر ہے کہ صرف ظاہری معنی کے اعتبار سے شاگرد کے استاذ سے افضل واقعہ ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں اس لئے افضلیت کا معیار وہی بطن حدیث یعنی مدلولات خفیہ اور اسرار و علل نکل آتے ہیں جن کو فقہ سے تعبیر کیا گیا۔

پس علم شریعت کے دو درجات ظاہر و باطن اس حدیث سے بھی واضح ہوئے۔ عبداللہ بن مسعودؓ صحابہؓ کی افضلیت تمام اُمت پر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

کانوا افضل هٰذه الامّة ابرّها قلوباً واعمقها علماً واقلّها تکلّفاً.

”صحابہؓ تمام امت سے افضل تھے سب سے زیادہ ان کے قلوب پاک تھے سب سے زیادہ ان کا علم عمیق تھا اور سب سے کم ان کا تکلف تھا“۔

اس سے واضح ہے کہ علم کا ایک درجہ عمقیت اور گہرائی بھی ہے جو علماء کے لئے معیار فضلیت ہے چنانچہ اسی معیار سے صحابہؓ کو افضل فرمایا گیا اور یہ درجہ ہی بطن نص کا ہے جسے مدلولاتِ خفیہ اور اسرار اور عللِ سے تعبیر کیا گیا ہے اسی علم کی بدولت علماء دقیقہ شناس اور مجتہد بنتے ہیں اور اسی سے ان میں فضلیت کے مراتب قائم ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کو قرآنِ حکیم نے لفظ حکم سے تعبیر فرمایا ہے۔ گویا ایک حکم ہے اور ایک اس کی اندرونی حکمت ہے۔

وَمَنْ یُؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْراً کَثِیْراً.

"اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی"۔

پھر حدیث نبوی میں خیر کثیر کو جو یہاں حکمت کا ثمرہ ظاہر کی گئی ہے تفقہ کا ثمرہ کہا گیا ہے" ارشاد نبویؐ ہے :

ومن یرد اللہ بہٖ خیراً یفقّہ فی الدّین

"جس کے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کا فقہ عطاء فرماتا ہے"۔

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حکمت اور فقہ ایک ہی چیز ہے کہ ثمرہ دونوں کا ایک ہے، پس ایک فقیہہ حکیم دین ہوتا ہے اور ایک حکیم اسلام فقیہہ دین۔ بہر حال اس آیتِ کریمہ سے بھی علم کا یہ مستور اور خفی درجہ ثابت ہو گیا جو حکماء اسلام، فقہاء دین اور مجتہدین شرعِ متین کے ساتھ خاص ہے۔

علماء شریعت کے دو طبقات اہلِ ظاہر اور اہلِ باطن

ظاہر ہے کہ جب علم النص کے دو مراتب نکلے ایک ظاہر اور ایک باطن یا ایک مدلول جلی اور ایک مدلول خفی تو لامحالہ علماء نصوص کے بھی دو طبقات ہونے قدرتی تھے۔ ایک عالم جزئیات اور ایک عالم کلیات یا ایک عالم ظاہر اور ایک عالم بطن یا ایک عالم حکم اور ایک عالم حکمت۔ یعنی ایک وہ کہ جس کی نگاہیں نص کے مدلول ظاہر تک رہ جائیں اور ایک وہ کہ جن کی عمیق نگاہیں اس ظاہری جزئیہ کی تہہ تک پہنچ کر اس کلیہ کا بھی پتہ چلا لیں جس کے وسیع سلسلہ میں یہ جزئیہ بطور ایک فرد کے منسلک ہے اور ظاہر ہے کہ جس کی نظر علم کلی تک پہنچ گئی تو اس کا علم اسی ایک نصوص جزئیہ تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ اس علت جامعہ کے سبب ہزار ہا وہ جزئیات بھی اس پر کھل جانی ممکن ہوں گی جو اس منصوص جزئیہ کی طرح اس امر کلی کے عموم میں لپٹی ہوئی پڑی تھیں اس لئے یہ عالم جزئیات اگرچہ ہزار جزئیات کا حامل ہو پھر بھی انصافاً عالم نہیں حافظ کہلائے جانے کا مستحق ہوگا عالم اسے مجازاً ہی کہیں گے ہاں جو شخص کلیات و جزئیات پر حاوی ہو، پھر ان کی باہمی نسبت اور کیفیت نسبت کا مدارک اور مکتشف اور پھر اس نسبت سے سیکڑوں نامعلوم جزئیات کا متخرج ہو گا وہی حقیقی معنی میں عالم کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

پس حافظ آیات و نصوص محض راوی اور محدث ہوتا ہے اور مدرک خفیات و سرائر مجتہد اور فقیہہ ہوتا ہے۔ ان دونوں طبقات کو ذیل کی حدیثوں میں یوں واضح فرمایا گیا ہے۔

عن ابی موسی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثلی و مثل ما بعثنی اللہ بہ من الھدیٰ والعلم کمثل الغیث الکثیر اصاب ارضاً فکانت منھا طائفۃ طیبۃ قبلت الماء وانبتت الکلاء والعشب الکثیر

وكانت منها اجادب امسكت الماء فنفع الله بها النّاس فشربوا وسقوا وزرعوا واصاب منها طائفة اخرىٰ انّما هى قيعان لاتمسك ماءً ولا تنبت كلاءً فذٰلك مثل مَن فُقّة فى دين الله ونفعه بما بعثنى الله به فعلم وعلّم ومثل من لم يرفع بذٰلك ولم يقبل هدى الله الذّى ارسلت به.

"ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال اور میرے لائے ہوئے علم و ہدایت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک موسلا دھار بارش زمین پر برسی تو زمین کا ایک حصہ تو نہایت عمدہ تھا جس نے پانی کو جذب کیا اور طرح طرح کے پھول پتے اور خشک و تر اگایا اور ایک حصہ سخت تھا جس نے پانی تو جمع کر لیا (مگر گھاس وغیرہ اگا نہیں سکا) تو اللہ نے اس زمین سے لوگوں کو پانی ہی کا نفع پہنچایا کہ انہوں نے پانی پیا بھی اور سیراب بھی ہوئے اور ان سے کھیتوں میں آبپاشی بھی کی اور ایک حصہ اور تھا جو بالکل چٹیل میدان تھا۔ نہ پانی کو روکتا ہی تھا اور نہ گھاس پھونس اگاتا ہی تھا۔ بس یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی اور انہیں اس علم نے نفع دیا جسے لے کر میں مبعوث ہوا ہوں اور مثال ہے ان کی جو سرے ہی سے اس انتفاع کے درجہ کو نہ پہنچ سکے اور انہوں نے خدا کی وہ ہدایت ہی قبول نہیں کی جسے لے کر میں آیا تھا"۔

اس حدیث میں علم کو بارش سے اور قلوب بنی آدم کو زمین سے تشبیہ دیتے ہوئے لوگوں کی دو اقسام بیان فرمائی گئیں ہیں ایک دین سے منتفع اور ایک غیر منتفع۔ پھر منتفع کی دو اقسام ارشاد فرمائی گئیں مثبت اور غیر مثبت یعنی ایک وہ کہ جنہوں نے علمِ وحی حاصل کر کے اسے اپنے قلوب میں بھرا جمع کیا اور اس سے استنباط واجتہاد کے ذریعہ طرح طرح کے علوم ومعارف اور علل وحکم نکالے اور نکات واسرار بیان کئے پھر ان باطنی علوم کے ذریعے سیکڑوں نامعلوم مسائل امت کے سامنے لا رکھے جس سے دین منقح اور مدون ہو کر ایک قانون کی صورت میں آگیا اور دوسرے وہ کہ جنہوں نے علم وحی حاصل کر کے اپنے سینوں میں جمع کیا اور پوری امانت داری سے بلا کم وکاست دوسروں تک پہنچا دیا تا کہ ان میں جو بالغ نظر ہو وہ اس سے پھل پھول نکال سکے۔ پہلا طبقہ فقہاء مجتہدین اور علماء راسخین کا ہوا اور دوسرا محدثین کا حفظ کا ہوا۔ محدث اور حافظ کا کام حفظ وامانت اور بلا کم وکاست روایت ہے اور فقیہ مجتہد کا کام فہم اور تفقہ اور محققانہ درایت ہے کہ تخم علم کی آبیاری کر کے دریا کو بصورت باغ و بہار دکھلا دے۔ اسی حدیث میں فکانت طیبۃ کے کلمہ سے مجتہد اور فقیہ محقق کی فضیلت بھی غیر مجتہد حافظ

پر ظاہر فرما دی گئی جس کی وجہ بجز اس علم باطن کے اور کچھ نہیں۔

ان روایات سے علما کے دو طبقات بھی واضح ہوئے۔ مجتہد اور غیر مجتہد اور ساتھ ہی فقیہ مجتہد کی غیر فقیہ و مجتہد پر یا راوی محض پر صاحبِ درایت و تفقہ کی افضلیت بھی نمایاں ہوگئی جس کا راز اس کے سوا کچھ نہیں کہ فقیہ کلامِ الٰہی اور کلامِ نبویؐ کی اس جامعیت اور معجزانہ بلاغت کو کھولتا ہے جو کتاب کے متعلق تبیاناً لکلّ شئی سے اور حدیث کے متعلق اوتیت جوامع الکلم سے واشگاف فرمائی گئی ہے گویا ایک فقیہ کے ذریعہ کلام وحی کی وجوہ اعجاز نمایاں اور فراہم ہوتی ہیں جس سے حضور ﷺ کی نبوت اور مقام ختم نبوت کی حقیقت اور رفعت شان کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

پس علمِ اولیٰ حفظ و روایت ہے تو علم حقیقی فقہ و درایت اور اس لئے طبقاتِ علماء کے سلسلہ میں حافظ حدیث یا اہل حدیث یا محدث مبتدی ہے جو وحی کا مواد جمع کر کے ذخیرہ فراہم کرتا ہے اور فقیہ و مجتہد منتہی ہے جو اس ذخیرہ کی تہہ کی چیزیں نکال کر جسے فقہ کہتے ہیں ہمہ گیر جزئیات سے امت کی تربیت کرتا ہے اور اس مواد سے مختلف صورت کے دینی سامان بنا کر دین کو سجاتا اور امت کے حق میں اسے قابل استعمال بناتا ہے۔

صحابہؓ میں اہلِ علم کے دو طبقات

یہ دونوں طبقات حضراتِ صحابہؓ میں بھی موجود تھے۔ کوئی حافظ حدیث تھا جیسے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ‘اور کوئی فقیہ و مجتہد تھا جیسے عبادلہؓ اربعہ اور حضرات شیخینؓ وغیرہ پھر فقہاء صحابہؓ میں بھی فرقِ مراتب تھا بعض کی رسائی بہت گہری تھی اور بعض کی اس سے کم‘ چنانچہ صحاح کی مشہور روایت ہے:

عن عروة بن زبير قال سالت عائشة عن قوله تعالى اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِاعْتَمَرَ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا قلتُ فواللّٰه ما علىٰ احدٍ جناح ان لايطوف بالصّفا والمروة فقالت بئس ما قلتَ يا ابن اختى ان هذه لو كانت على ما اولتها كانت لا جناح عليه ان لا يطوف بهما و فى الحديث قال الزهرى فاخبرتُ ابا بكر بن عبدالرّحمٰن فقال ا ن هذا العلم ما كنتُ سمعتهٗ.

”عروة ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا” اِنَّ الصَّفَاوَ الْمروةَ الخ“ اور میں نے کہا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص صفا و مرہ کا طواف نہ کرے تو اس کو گناہ نہ ہوگا (جیسا کہ ظاہر ترجمہ سے بھی معلوم یہی ہوتا ہے کہ اس پر کچھ گناہ نہیں

ہے جو طواف کرے تو اس سے متبادر یہی ہے کہ طواف مباح ہے اگر نہ کرے تو بھی جائز ہے) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اے بھانجے! تو نے بڑی غلط بات کہی اگر یہ آیت اس معنی کو مفید ہوتی جو تم سمجھے ہو تو عبارت یوں ہوتی لا جناح علیه ان لا یطوف بهما یعنی طواف نہ کرنے میں گناہ نہیں۔ زہری کہتے ہیں کہ میں نے ابو بکر بن عبد الرحمٰن کو اس کی خبر دی تو انہوں نے فرمایا کہ یہ علم میں نہ سنا تھا"۔

اس سے واضح ہے کہ نصوص کے سمجھنے میں فہم متفاوت ہوتے ہیں کوئی ظہر نص تک رہ جاتا ہے۔ کوئی بطن نص تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں جو دقیقہ تھا باوجود یہ کہ وہ زیادہ خفی نہ تھا مگر حضرت عروہؓ اسے نہ سمجھ سکے اور حضرت عائشہ سمجھ گئیں۔ بات چونکہ لطیف تھی اس لئے ابو بکر بن عبد الرحمٰنؒ نے سن کر اس پر مسرت ظاہر کی اور اسے علم کہا۔ اسی تفاوتِ فہم کو حضور اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ:

رُبَّ حاملِ فقهٍ ورُبَّ حاملِ الیٰ مَن هو اَفقهُ منهُ

"بعضے پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعضے ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے بھی زیادہ فہیم ہوتے ہیں"۔

مگر ساتھ ہی یہ امر بھی مخفی نہ رہنا چاہئے کہ اس تفاوتِ افہام کے سلسلہ میں زیادہ فہم کا ہر درجہ معتبر نہیں یعنی ہر فہیم مجتہد یا فقیہہ نہیں کہلایا جائے گا بلکہ اس بارہ میں فہم کا صرف وہ درجہ معتبر ہوگا جو متعد بہ ہو اور محض موہبت ربانی ہو جو بطور علم لدنی قلب مجتہد میں القاء کیا گیا ہو یعنی جس طرح کائنات خلق کے سلسلے میں نہ ہر چھوٹے بڑے فہم کا آدمی موجدِ ہو سکتا ہے۔ نہ ہر دور میں موجدین کی بھرمار ہوتی ہے بلکہ حق تعالیٰ کی حکمت جب کبھی تمدن کے کسی خاص پہلو میں ترقی دیکھنا پسند کرتی ہے تو قرون و دُہور میں چند مخصوصِ دماغ منتخب کر کے ان سے ایجاد کا کام لیتی ہے اور وہ تمدن کے ان گوشوں کو آراستہ کر دیتے ہیں جن کی زیبائش کی ضرورت تھی۔

اسی طرح کائناتِ امر کے سلسلہ میں نہ ہر فہیم و ذہین مجتہد ہو سکتا ہے نہ ہر دور میں مجتہد پیدا ہوتے ہیں بلکہ حکمتِ ربانی جب کبھی دین کے کسی مخفی گوشہ کو نمایاں کرنا چاہتی ہے تو خاص خاص ذہنیت کے افراد پیدا کر کے ان کے قلوب میں ذوق اجتہاد ڈالتی ہے اور وہ اپنے اس خاص وہبی ذوق سے تدین کے ان پہلوؤں کو واضح اور صاف کر کے اور گویا بال کی کھال نکال کر امت کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جن کے اظہار کی ضرورت تھی۔ فہم خاص یا ذوقِ اجتہاد کے اسی وہبی درجہ کے بارے

میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں:

عن ابی حیفة قال قلتُ لعليٍ یا امیر المؤمنین هل عندکم من سوداء فی بیضاء لیس فی کتاب اللّٰہ عزّوجل قال لا والذی فلق الحبة و براء النّسمة ما علمنا الافهماً یعطیه اللّٰہ رجلاً فی القران۔ (رواہ البخاری والترمذی ونسائی)

"ابی جحیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ کے پاس کچھ ایسے مضامین لکھے ہوئے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں؟ انہوں نے فرمایا نہیں۔ قسم اس ذات کی جس نے دانے کو شگاف دیا اور جان کو پیدا کیا۔ ہمارے پاس کوئی علم ایسا نہیں۔ لیکن فہم خاص ضرور ہے جو اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو قرآن میں عطاء فرمادیں"۔

ملکہ اجتہاد وہبی ہے کسبی نہیں اور بعض اس کے اہل ہیں اور بعض نہیں

اس سے جہاں کتاب اللہ میں دقیق معانی کا ثبوت ہوتا ہے جنہیں غیر معمولی ہی فہم کا آدمی سمجھ سکتا ہے وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ فہم کوئی اکتسابی چیز یا فن نہیں ہے جسے محنت سے حاصل کرلیا جائے بلکہ ایک عطاء الٰہی ہے جو خاص خاص افرادِ امت کو عطاء ہوتا ہے۔ بعینہٖ اس طرح جیسے رسالت ونبوّت کوئی فن نہیں کہ جس کا جی چاہے محنت کر کے نبی بن جائے۔ چنانچہ قرآن نے رسالت کے بارہ میں تو یہ ارشاد فرمایا کہ:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ.

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھتا ہے"۔

اور اس قسم کے صاحبِ فہم یا صاحبِ علم اسرار وحقائق کے بارہ میں حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا:

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْماً.

"اور ہم نے انہیں (خضرؑ کو) اپنے پاس سے مخصوص علم دیا"۔

غرض دونوں امور کو یعنی علم نبوت اور علم حقیقت کو اپنی طرف منسوب فرما کر اشارہ فرمایا گیا ہے کہ علم کا یہ مرتبہ اکتسابی نہیں بلکہ محض عطاء الٰہی اور موہبت ربانی ہے جس کے لئے من جانب اللہ ہی افراد کا انتخاب فرمایا جاتا ہے، چنانچہ ارشاد علوی میں يُعْطِيْهِ اللّٰهُ رَجُلاً سے اسی طرح اشارہ ہے یہی وجہ ہے کہ قرنِ اوّل میں جب اجتہاد وقیاس اور استنباط کا دروازہ کھلا اور حضرت صحابہؓ نے نصوص نہ ہونے کی صورت میں اپنی رائے وقیاس پر عمل کیا تو نبی کریم ﷺ نے دین میں ہر ایک

کی رائے کی تصویب و توثیق نہیں فرمائی۔ بعض کے اجتہاد کو قبول فرمایا اور بعض کے اجتہاد کو رد فرمادیا۔

گویا انہیں اجتہاد کا اہل اور مجتھدہ نہیں سمجھا کہ وہ اس فہم خاص کا وہ وہبی درجہ نہیں رکھتے تھے جس کی رو سے شرعیات میں صحیح حقیقت کو سمجھ کر استدلال کر سکیں چنانچہ ابوداؤد میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خیر القرون میں ایک زخم زدہ شخص کو احتلام ہوگیا ساتھیوں نے اسے غسل کرادیا وہ غسل کرتے ہی مر گیا۔ علم ہونے پر آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کی رائے پر ناگواری کے اظہار کے ساتھ فرمایا کہ خدا انہیں قتل کرے اسے قتل کرڈالا اور اس کے لئے یہ کافی تھا کہ وہ تیمم کرلیتا اور زخم پر پٹی باندھ کر مسح کرلیتا باقی بدن دھولیتا۔ ان لوگوں نے بظاہر غسلِ جنابت کی آیت وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُباً فَا طَّهَّرُوْا کو تو معذور اور غیر معذور کے حق میں عام سمجھا اور آیت تیمم مریض وَاِنْ کُنْتُمْ مَرْضیٰ کو حدثِ اصغر کے ساتھ مخصوص سمجھ کر یہ فتویٰ دے دیا کہ اس جنبی کے لئے تیمم جائز نہیں اور اس لئے اسے غسل کرنے پر مجبور کیا۔

یا مثلاً عدیؓ بن حاتم کے واقعہ میں جسے بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے قرآنی الفاظ خیطِ ابیض خیطِ اسود سے سفید و سیاہ دوڑے سمجھ کر تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور جب تک ان کی سفیدی و سیاہی ممتاز نہ ہو جاتی سحر کا کھانا کھاتے رہتے حالانکہ ان ڈوروں سے مراد رات اور دن تھے پس باوجود اہلِ زبان ہونے کے چونکہ قوت اجتہادیہ نہ تھی اس لئے نفسِ مرادِ قرآنی تک کے سمجھنے میں غلطی کی چہ جائے کہ حقائق تک پہنچتے۔

تو ان کی رائے اور قیاس دین میں کس طرح سند ہو سکتا ہے تھا۔ اس لئے حضور ﷺ نے برنگ مزاح اِنَّ وِسَادَتَكَ لَعَرِيْض " (تمہارا تکیہ بڑا ہی لمبا چوڑا ہے جس کے نیچے ابیض اور اسود یعنی رات اور دن آگئے) کے جملہ سے ان کے فہم پر رد فرمادیا۔ نیز پہلے عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث گزر چکی ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ بعض حاملِ فقہ خود غیر فقیہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے غیر فقیہ کی رائے بھی دین میں معتبر نہیں ہو سکتی۔ پس حضورؐ کا بعض کے رائے و قیاس کو رد فرمادینا اس کی واضح دلیل ہے کہ نہ ہر ایک مجتھد ہوتا ہے اور نہ ہر ایک کی رائے اور قیاس پایۂ اعتبار کو پہنچ سکتا ہے جب تک کہ وہبی طور پر فہم و ذوق کا وہ خاص درجہ نہ پیدا ہو جائے جو شارع کی نظر میں متعین ہے۔ جب صحابہؓ میں یہ تقسیم ہو سکتی تھی تو آج کس طرح ممکن ہے کہ ہر شخص کا فہم معتبر اور حدِ اجتہاد تک پہنچا ہوا تسلیم کیا جائے۔ آج بھی یہ تقسیم لازمی ہوگی پس اسی ذوقی نور اور علم خفیات و سرائر اور تصرف کو شرعی الفاظ میں کہیں بطن سے جیسے حدیث "لكل آية ظهر و بطن" میں ہے کہیں فہم سے جیسے حدیث " اِلاّ فهماً يعطيه الله " میں ہے۔ کہیں روایت ورائے سے جیسے حدیث " رايت فى ذلك الذى راىٰ عمر" میں ہے۔ کہیں تفقہ سے جیسے حدیث "من يّرد الله به خيرا

یفقه فی الدّین "میں ہے---

کہیں حکمت سے جیسے آیت "ومن یؤت الحکمۃ" میں ہے۔ کہیں فرقان سے جیسے آیت "اتقوا اللّٰہ یجعل لکم فرقاناً" میں ہے۔ کہیں شرح صدر سے جیسے حدیث " فشرح اللّٰہ صدری للذی شرح صدر عمر" میں ہے اور کہیں انبات سے جیسے حدیث " قبلت الماء وانبتت الکلاء" میں ہے۔

اور جامع عنوان کے ساتھ کہیں اجتہاد سے جیسے حدیث " المجتهد یخطی و یصیب" میں تعبیر کیا گیا ہے جس پر عام عرفِ شریعت میں یہی اجتہاد واستنباط کا عنوان غالب اور معروف ہو گیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اجتہاد ایک ملکہ اور فہمِ خاص کی ایک قوت اور علم کا ایک مخصوص وہبی درجہ ہے جس کی وساطت سے اس کے اہل، نصوص کے دقیق اور خفی معانی اور احکام کے اسرار و عللِ کو سمجھ کر ان پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے مقتضی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

علمِ باطن ہی مورثِ طمانیت ہے

چنانچہ ظاہر ہے کہ علم کا یہ مرتبہ جس کا تعلق براہ راست شرح صدر اور علم الٰہی سے ہے جس حد تک مورثِ طمانیت اور مسائل میں موجب اطمینان ہو سکتا ہے وہ اکتسابی درجہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن کے بارہ میں صدیق اکبرؓ کو جو مسلم فقیہہ و مجتہد ہیں استدلالی علم سے وہ طمانیت نہ ہوئی جو اس حالی علم سے میسر آئی۔ زید بن ثابت کی روایت سے یہ دقیقہ کافی وضاحت کے ساتھ حل ہوتا ہے۔

عن زید بن ثابت رضی اللّٰہ عنه قال ارسل الی ابوبکر مقتل اهل الیمامة فاذا عمر جالس عنده فقال ابوبکر ان عمر جاء نی فقال ان القتل قد استحرّیوم القیامة بِقْراء القران وانی اخشٰی ان یستحرّ القتل بالقرّاء فی کل المواطن فیذهب من القران کثیر وانی ارٰی ان تامر بجمع القرآن فقلت وکیف افعل مالم یفعله رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فقال عمر واللّٰہ هو خیر فلم یزل یراجعنی فی ذلك حتیٰ شرح اللّٰہ صدری للذی شرح له صدر عمر ورایت فی ذلك الذی رایٰ۔ (رواه البخاری والترمذی)

"زیدؓ بن ثابت کی روایت ہے کہ زمانہ جنگ یمامہ میں حضرت ابو بکرؓ نے میرے بلانے کے لئے آدمی بھیجا وہاں جا . . دیکھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ بھی بیٹھے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے قصہ بیان فرمایا کہ حضرت عمرؓ نے میرے پاس آکر یہ صلاح

دی کہ واقعہ یمامہ میں بہت سے قراء قرآن کام آگئے۔ مجھ کو اندیشہ ہے کہ اگر اسی طرح سب جگہ یہ لوگ کام آتے رہیں تو قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا امر فرمادیں۔ میں نے حضرت عمرؓ کو جواب دیا کہ جو کام رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا وہ میں کس طرح کروں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا' واللہ یہ کام خیر محض ہے اور برابر اسی کو بار بار کہتے رہے حتیٰ کہ جس باب میں ان کو شرح صدر اور اطمینان تھا مجھ کو بھی شرح صدر ہو گیا اور وہی بات مجھے محسوس ہوئی جو انہیں ہوئی تھی"۔

اس سے ظاہر ہے کہ ہے کہ صدیق اکبرؓ کو اولاً جمع قرآن کے بدعت ہونے کا خیال تھا احادیث ذمِ بدعت ان کے سامنے تھیں اس لئے انہیں جمع قرآن میں تردد تھا۔ مگر جب استدلال سے گزر کر ان کے قلب میں باطنی علم منکشف ہوا کہ جمع قرآن کا یہ جزئیہ تحفظ دین کے عام کلیہ کے ماتحت ہے اور ذم بدعت کے ماتحت نہیں آسکتا۔ تو شرح صدر کے ساتھ اس فعل کو کر گزرے اور آج تک دنیائے اسلام ان کے اس احسان عظیم سے مستفید ہو رہی ہے جس سے واضح ہوا کہ مجتہد کے لئے علم کا یہ خفی درجہ بعض اوقات جلی درجہ سے بھی زیادہ موجب طمانینت ہوتا ہے اور وہی اطمینانی کیفیات اس کے متبع افراد میں سرایت کر جاتی ہے جبکہ وہ اس کا اتباع کریں۔

بہرحال اتنا واضح ہو گیا کہ امت کے لئے ایک درجہ علم خفی کا بھی پیغمبر نے وارثت میں چھوڑا ہے جو کلیات سے استخراج کے مسائل اور جزئیات سے استنباط دلائل کا ہے اور اس کے افراد مخصوص ہیں نیز وہ ایسے مواقع کے لئے ہیں جہاں یا نص ہی موجود نہ ہویا ہو مگر معانی مختلفہ کو محتمل ہو یا متعین المحمل ہو۔ مگر یہ محمل دقیق اور غامض ہویا محمل بھی واضح ہو مگر اس کی علت مستور ہو۔ جس کا انکشاف ہر فہم نہ کر سکتا ہو تو ایسے مواقع میں بجز اجتہاد واستباط کے چارہ کار نہیں اور ضرورت تھی کہ امت کو اس فہم خاص کا رتبہ بھی عنایت ہو جو درحقیقت تشریع ہی کا ایک دقیق حصہ ہے اور جو علماء کے لئے علماء امتی کانبیاء بنی اسرئیل کے معزز اور بابرکت خطاب کے ماتحت ثابت کرتا ہے کہ علماء امت انبیاء بنی اسرائیل کے سے کام کریں گے۔

اگر تبلیغ دین اور تربیت خلق کریں گے تو ایک عالم خطوں کو رنگ دے گا اور ہزاروں کو دائرۂ اسلام میں داخل کر دے گا ان میں دینی رنگ پیدا کر دے گا تعلیم مسائل پر آئیں گے تو انبیاء جو امورِ وحی سے کہتے تھے یہ بالہام وحی سے استنباط کر کے کہیں گے یعنی احکام تکلیفیہ کی طرح احکامِ وضعیہ امت کے سامنے لا رکھیں گے اور یہ صورت بغیر اجتہاد وقیاس کے نہیں ہو سکتی تھی اس لئے امت میں یہ علم غامض القاء کیا گیا اور قرن اول ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

صحابہؓ میں اہلِ اجتہاد

چنانچہ جب ان لوگوں کا اجتہاد سامنے آیا جو اس کے اہل تھے اور تشریع کی حقیقت کو سمجھ چکے تھے تو حضورؐ نے بھی ان کے اجتہاد و استنباط کی تحسین فرمائی۔ چنانچہ نص سامنے نہ ہونے کی صورت میں عمومات اور کلیات سے استدلال کرتے ہوئے جب رائے پر عمل کیا گیا اور حضور علیہ السلام نے اس کی تحسین فرمائی اس کی مثال یہ ہے کہ:

عن طارقؓ ان رجلاً اجنب فلم یصل فاتی النبی صلی اللہ علی وسلم فذکر له ذلك فقال اصبت۔۔۔ فاجنب اخر فتیمم وصلی فاتا فقال نحوما قال لاخر یعنی اصبت۔

"حضرت طارقؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو نہانے کی حاجت ہو گئی اس نے نماز نہیں پڑھی۔ وہ رسول اللہ علیہ السلام کے حضور میں حاضر ہوا اور اس قصہ کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا تو نے ٹھیک کیا۔ پھر ایک دوسرے شخص کو اسی طرح نہانے کی حاجت ہوئی اسنے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی۔ پھر وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس کو بھی ویسی ہی بات فرمائی۔۔۔ جو ایک شخص سے فرما چکے تھے یعنی تو نے بھی ٹھیک کیا"۔

اس حدیث سے اجتہاد و قیاس کا جواز صاف ظاہر ہے کیونکہ اگر ان کو نص کی اطلاع ہوتی تو پھر بعد عمل کے سوال کرنے کی ضرورت نہ تھی اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک نے اپنے اپنے قیاس و اجتہاد پر عمل کر کے حضورؐ کو اطلاع دی اور آپؐ نے دونوں کی تصویب و تحسین فرمائی اور ظاہر ہے کہ شارع علیہ السلام کی تقریر یعنی کسی چیز کو سن کر رد نہ فرمانا بلکہ صراحۃً اس کی تصویب فرما دینا اس کی مشروعیت کی واضح دلیل ہے اس لئے نصِ صریح نہ ہونے کی صورت میں جوازِ اجتہاد و قیاس میں کوئی شبہ نہ رہا۔

اسی طرح بروایت ابو داوٗد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غزوہ ذات السلاسم کے موقع پر سردیوں کی ایک رات میں جان کے خوف سے بحالتِ جنابت بجائے غسل کے تیمّم سے نماز پڑھا دی اور حضورؐ کے استفسار پر عرض کیا کہ میں نے اللہ کے قول پر عمل کیا:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ.

"اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو"۔

حضورؐ نے مسکرا کر سکوت اختیار فرمایا۔ جس سے واضح ہے کہ نص صریح نہ ہونے کی صورت میں رائے پر عمل کرنا عمومات و کلیات سے استدلال کرنا یعنی اجتہاد سے کام لینا خلاف حدیث نہیں ورنہ حضورؐ نکیر فرماتے کہ تم لوگ دین میں رائے اور قیاس کو کیوں دخل دیتے ہو۔ یا نص

یا خلافِ حدیث نہیں۔ چنانچہ حدیث ذیل اس پر شاہد ہے۔

عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی علیه وسلم یوم الاحزاب لا یصلّین احد العصر الا فی بنی قریظةَ فادرك بعضهم العصر فی الطریق فقال بعضهم لا نصلّی حتی نآتیها و قال بعضهم بل نصلّی لم یرد ذلك فذکر ذلك للنبی صلی الله علیه وسلم فلم یضعف واحدا.

"ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ احزاب کے موقع پر صحابہؓ سے فرمایا کہ عصر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچنے سے ادھر کوئی نہ پڑھے بعض صحابہؓ کو راہ میں عصر کا وقت آگیا تو باہم رائے مختلف ہوئی۔ بعض نے کہا کہ ہم نماز پڑھیں گے حضورؐ کے ارشاد کا مطلب تاخیر صلوٰۃ نہیں تھا بلکہ مقصود تاکید تھی کہ عصر سے قبل وہاں پہنچنے کی کوشش کرو پھر یہ قصہ آپؐ کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپؐ نے کسی پر بھی ملامت نہیں فرمائی"۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کو بعض نے اپنی قوۃ اجتہادیہ سے قول رسولؐ کی اصلی غرض کو سمجھ کر جو کہ نص کی ایک محتمل وجہ تھی نماز پڑھ لی مگر آپ نے ان پر ملامت نہیں فرمائی کہ تم نے حدیث کے ظاہر الفاظ کے خلاف کیوں عمل کیا؟ یعنی ان کو عمل بالحدیث کا تارک قرار نہیں دیا یا نص صریح بھی موجود ہو اور اس کا محمل بھی متعین ہو مگر مجتہد اس حکم کو کسی علت سے معلول سمجھ کر علت باطنیہ پر عمل کرے اور ظاہر نص کو ترک کر دے تو یہ بھی خلافِ حدیث نہیں۔ چنانچہ حدیث انسؓ اس پر شاہد عدل ہے۔

عن انس رضی الله عنه ان رجلا کان یتهم بام ولد رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال لعلی اذهب فاضرب عنقه فاتا ہ فاذا هو فی رکی یبرد فقال اخرج فناوله یده فاخرجه فاذا هو مجبوب لیس له ذکر فکف عنه واخبر به النبی صلی الله علیه وسلم فحسن فعله (زاد فی روایته) وقال یری الشاهد مالا یری الغائب۔

"انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص ایک لونڈی ام ولد سے متہم تھا آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ جاؤ اس کی گردن مار دو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس آئے تو اس کو دیکھا کہ وہ کنویں میں اترا ہوا بدن ٹھنڈا کر رہا ہے۔ آپؓ نے فرمایا باہر نکل۔ اس نے اپنا ہاتھ دے دیا۔ آپؓ نے اس کو نکالا تو مقطوع الذکر نظر پڑا۔ آپؓ اس کی سزا سے رک گئے اور حضورؐ کو اس کی خبر دی۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کے اس

فعل کو مستحسن فرمایا (اور ایک روایت میں اپنا اضافہ ہے) کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ پاس والا ایسی بات دیکھ سکتا ہے جو دُور والا نہیں دیکھ سکتا"۔

ظاہر ہے کہ اس واقعہ میں رسول اللہ ﷺ کا خاص اور صاف حکم موجود تھا مگر حضرت علیؓ نے اپنے ذوقِ اجتہاد سے اسے ایک علت سے معلول سمجھا اور جب علت کا وجود نہ پایا تو حکم سزا بھی جاری نہیں کیا۔ حالانکہ حضرت علیؓ کا یہ عمل ظاہراً اطلاقِ حدیث کیخلاف تھا۔ اس سے واضح ہے کہ حدیث کی لم اور علت حکم سمجھ کر اس کے موافق عمل کرنا اور الفاظِ حدیث کے ظاہر کو ترک کر دینا خلاف حدیث نہیں بلکہ وہ عمل بالحدیث ہے مگر بطن حدیث پر۔ ہے جو خود حدیث سے ثابت شدہ چیز ہے اس کی نظیر بھی ہے جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضورؐ نے حضرت معاذؓ کو بشارت دی کہ جو بھی صدقِ دل سے کلمہ طیبہ پڑھ لے گا وہ نارِ جہنم پر حرام ہو جائے گا۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں لوگوں کو اس کی بشارتِ عام نہ دے دوں؟ فرمایا نہیں، لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے (اور عمل چھوڑ دیں گے)۔

اس ممانعت تبشیر میں کسی زمانہ کی قید نہ تھی مگر حضرت معاذؓ نے اپنے نورِ اجتہاد سے دوسرے دلائل کلیہ پر نظر کر کے اس ممانعت کو اس زمانہ کے ساتھ مقید سمجھا جس میں اس پر بھروسہ کر بیٹھنے کا احتمال باقی رہے اور وفات کے وقت، جب کہ وہ زمانہ ان کے زعم میں باقی نہیں رہا تھا اس بشارت کا اعلان عام کر دیا۔

یا مثلاً (بروایتِ مسلم) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ایک لونڈی کو جس نے بدکاری کی تھی حضورؐ نے درے مارنے کے لئے مجھے حکم دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ زچہ تھی۔ اس لئے درے نہ لگائے کہ کہیں مر نہ جائے۔ حضورؐ نے اس فعل کی تحسین فرمائی۔ اس سے واضح ہے کہ صحابہؓ نصوص کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کو مذموم نہ جانتے تھے ورنہ ظواہرِ احکام کو مقصود جان کر ان باطنی عللِ اور علومِ کلیہ سے بحث ہی نہ فرماتے۔ چہ جائیکہ ان بواطن پر عمل کرتے۔ یہ نظائر اس پر شاہد عدل ہیں کہ اگر مجتہد اپنی قوتِ اجتہادیہ سے کسی حدیث کے مدلولِ ظاہری کے خلاف یعنی اس سے بالاتر کوئی دقیق معنی سمجھ جائے جس تک عوام علماء کی رسائی نہ ہو تو اس پر عمل جائز ہے۔

اُمت میں اگر اجتہاد ضروری ہے، تو تقلید بھی ضروری ہے

بہر حال جب یہ واضح ہو گیا ہے کہ دین میں نص نہ ہونے یا متعین الوجہ نہ ہونے یا غیر معلول نہ ہونے کی صورت میں اجتہاد و قیاس جائز ہے اور اس کے لئے افراد من اللہ منتخب اور مخصوص ہوتے ہیں۔ ہر ایک اس کا اہل نہیں اور وہ بتصدیق پیغمبر حجت شرعیہ

ہے۔ تو ظاہر ہے کہ غیر اہلِ اجتہاد یعنی غیر مجتہد کے لئے بجز اس کے چارہ کار ہی کیا ہے کہ اس اجتہاد کی متابعت اور پیروی کرے اور جب خود علم نہیں رکھتا تو علم والے کا اتباع کرے خود ان مخفی دلائل اور علل نہیں تک پہنچ سکتا۔ تو دانایانِ اسرار و عللِ کے سامنے جھک جائے کیونکہ مراتبِ علم کے دو ہنی یا خود سمجھنا یا فہمیدہ لوگوں کی اطاعت کرنا۔ چنانچہ یہی وہ دو مراتب بِلا کسی واسطہ کے قرآن نے ہدایت کے رکھے ہیں۔ قیامت کے دن کفار اسی پر افسوس کریں گے کہ ہم نے دین کو نہ خود اپنی عقل سے سمجھا اور نہ عقل والوں کی سنی۔

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِی اَصْحَابِ السَّعِیْرِ.

"اور کہیں گے کفار اے کاش ہم سنتے یا عقل سے سمجھتے تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے"۔

بس یہی درجہ سمع و طاعت جو علم والے کے حق میں ایک لاعلم یا ایک محقق کے سامنے ایک غیر محقق علم میں لاتا ہے، تقلید کہلاتا ہے، جو فی نفسہٖ بھی اور بضرورت اجتہاد بھی جائز اور معقول ہے ورنہ اگر عوام اور غیر اہل اجتہاد کے حق میں اب بھی اہلِ اجتہاد کی تقلید جائز نہ ہو تو اجتہاد کا حجت شرعیہ ہونا لغو ہو جائے اور اس آیت کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہیں کہ :

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

"اگر تم لاعلم ہو تو علم والوں سے سوال کرو"۔

اور اس حدیث کا کوئی مصداق ہی باقی نہ رہے کہ :

الم یکن شفاء العی السوال (رواہ ابوداوٗد عن ابن عباسؓ)

"کیا عاجز کی شفاء سوال نہیں ہے ؟"

پس اگر اجتہاد بنصِ حدیث شرعی چیز ہے اور غیر مجتہد بنص حدیث دنیا میں موجود ہے کہ قرنِ اوّل تک میں موجود تھے۔ ادھر غیر مجتہد کا علاج و شفاء بنص حدیث سوال و تعمیل ہے تو غیر مجتہد کے لئے اجتہادی مسائل میں بجز مجتہد کی تقلید کے کوئی دوسرا چارہ کار ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے تقلید کے بارہ میں حضورؐ کا ارشاد مستقلاً موجود ہے۔

ارشاد نبویؐ ہے۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من افتىٰ بغير علم كان اثمه علىٰ من افتاه ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا جس شخص کو بے تحقیق کوئی فتویٰ دے دیا تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے

کو ہوگا"۔

ظاہر ہے کہ اگر تقلید نہ جائز ہوتی اور کسی کے فتوی پر بدونِ معرفتِ دلیل کے عمل جائز نہ ہوتا جو حاصل ہے تقلید کا تو گنا ہگار ہونے میں مفتی ہی کی کیا تخصیص تھی بلکہ جس طرح مفتی کو غلط فتویٰ دینے کا گناہ ہوتا اسی طرح سائل کو دلیل تحقیق نہ کرنے اور بلا تحقیق عمل کرنے کا گناہ ہوتا۔ پس جبکہ شارع علیہ السلام نے سائل کو باوجود تحقیق دلیل نہ کرنے کے عاصی نہیں ٹھہرایا تو جوازِ تقلید بلاشبہ ثابت ہو گیا۔

صحابہؓ میں بھی تقلید رائج تھی

چنانچہ حضراتِ صحابہؓ میں جیسے اجتہاد رائج تھا ویسے ہی تقلید رائج تھی۔ یعنی غیر مجتہد، مجتہد کے فتویٰ پر بِلا تحقیقِ دلیل محض اس حسنِ ظن کی بناء پر عمل کرتا تھا کہ وہ مجتہد ہے اور بِلا دلیل فتویٰ نہیں دے رہا ہے۔

عن سالم سئل ابنؓ عمرؓ عن رجل یکون له الدین علی رجل الی اجل فیضع عنه صاحب الحق لیعجل الدین فکره ذلك ونهٰی عنه۔ (مؤطا امام مالک)

"حضرت سالمؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابنؓ عمرؓ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ کسی شخص کا دوسرے شخص پر کچھ دین میعادی واجب ہے اور صاحبِ حق اس میں سے کسی قدر اس شرط سے معاف کرتا ہے کہ وہ قبل از میعاد اس کا دین دے دے۔ آپ نے اس کو ناپسند کیا اور منع فرمایا"۔

چونکہ اس مسئلہ جزئیہ میں کوئی حدیثِ مرفوع صریح منقول نہیں۔ اس لئے یہ ابن عمرؓ کا قیاس ہے اور چونکہ سائل نے دلیل نہیں پوچھی اس لئے اس کا قبول کرنا تقلید ہے تو دونوں کا جواز ثابت ہو گیا۔

اسی طرح روایتِ مالکؒ حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے کسی کو غلہ اس شرط پر قرض دے دیا کہ وہ شخص اس کو دوسرے شہر میں ادا کر دے۔ حضرت عمرؓ نے اسے ناپسند فرما کر منع فرما دیا اور فرمایا کہ بار برداری کا کرایہ کہاں گیا؟

چونکہ اس بارہ میں بھی کوئی صریح حدیث مرفوع مروی نہیں لہٰذا حضرت عمرؓ کا یہ جواب قیاس سے تھا اور چونکہ جواب کا ماخذ نہ آپؓ نے بیان فرمایا نہ سائل نے پوچھا بدونِ دریافتِ دلیل قبول کر لیا تو یہی تقلید تھی۔

پس جوازِ قیاس و تقلید حضرت عمرؓ کے فعل سے بھی ثابت ہوا۔ اسی طرح بروایتِ مالکؒ ابو ایوب انصاریؓ حج کے لئے نکلے۔ راستہ میں اونٹنیاں گم ہو گئیں اور حج کا وقت نکل جانے پر پہنچے۔

حضرت عمرؓ سے سارا قصہ بیان کر کے مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ افعالِ عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو اور اگلے سال حج کر کے میسر شدہ قربانی دیدو۔

اس سے واضح ہے کہ جو صحابہؓ اجتہاد نہ کر سکتے تھے وہ مجتہدین صحابہؓ سے استفسار کر کے اس کی تقلید کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے حضرت عمرؓ سے صرف حکم سُن لیا اور دلیل کی تحقیق نہیں کی جو تقلید کا حاصل ہے۔ یہ ہی صورت تابعین میں بھی بکثرت پائی جاتی ہے جیسا کہ کتب ِ احادیث سے مزاولت رکھنے والے جانتے ہیں۔

اس سے صاف واضح ہے کہ قرونِ خیر میں اجتہاد و تقلید دونوں رائج تھے اور دونوں کے افراد واشخاص الگ الگ تھے۔ یہ اگر اس کی دلیل ہے کہ ہر کس وناکس کے لئے اجتہاد جائز نہیں تو اس کی بھی دلیل ہے کہ ان تمام کس وناکس کے لئے تقلید کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں۔

اجتہاد تقلید کی حدود

نیز اس کی بھی واضح دلیل ہے کہ شریعت نے امت میں بیک وقت اجتہاد و تقلید دونوں کی ضرورت محسوس کی جس سے واضح ہے کہ شریعت نہ تو اجتہاد بلا تقلید چاہتی ہے اور نہ تقلید بلا اجتہاد اور یہی اس کی جامعیت اور عدل واعتدال کا تقاضیٰ بھی ہے ورنہ اجتہاد بلا تقلید افراط تھا اور تقلید بلا اجتہاد تفریط تھی۔ عدل کا مقتضی یہی تھا کہ دونوں ہوں اور اپنی اپنی حدود میں پھر ساتھ ہی اس اجتہاد و تقلید کا شریعت ایک نظم بھی چاہتی ہے کہ مقلدین کی اکثریت مجتہدین کی مطیع رہ کر اپنے دین کی حفاظت کرے جس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت اسلام چونکہ کمال اعتدال اور جامعیت کی شان رکھتی ہے اور اس لئے یہ امت بھی اعدل الام اور جامع اقوام ہے جس کا لقب ہی قرآنی زبان میں امت وسط ہے۔ اس لئے منشاء شریعت یہ ہے کہ امت میں ہر ایک کام جامعیت کے ساتھ اجتماعی رنگ میں ہو اور یہ اجتماعی نظام لئے ہوئے ہو۔ خواہ وہ نظام سیاسی ہو۔ خواہ دینی اس انداز کا ہو کہ نہ اس میں تشتت اور پراگند گی ہو جو بد نظمی ہے اور نہ جمود واستبداد ہو جو اجتماعیت اور جموریت کے منافی ہے۔ اس لئے اس نے امت کے سیاسی اور دینی دونوں نظامات میں یہی معتدل صورت قائم کی ہے۔ مثلاً امت کے سیاسی نظام میں ایک طرف تو امارت رکھی تاکہ قوم میں فوضویت اور لامرکزیت نہ آنے پائے جو پراگندی اور بد نظمی کی روح ہے۔ اس سے تو حکومت میں شخصیت قائم ہوئی۔

ادھر اس امارت کے لئے شوریٰ لازم قرار دیا تاکہ امیر میں استبداد بھی نہ پیدا ہو سکے اور قوم کے اجتماعی فکر کے قوی معطل اور بے کار نہ ہوں۔ اس صورت سے قوم میں جمہوریت باقی رہے۔ پس اسلامی امارت میں نہ تو ایسی شخصی حکومت ہے جس میں جمہور کی کوئی مداخلت نہ ہو اور نہ ایسی

جمہوریت ہے کہ وہ لامر کزیت کی حد تک پہنچ کر امیر کو معطل اور بے کار بنادے اور عوام بھی اس پر حکومت کرنے لگیں۔

پس امیر کی شخصیت اور آمریت سے تو قوم کی طوائف الملوکی اور پراگندگی دفع کی اور قوم کی شورائی تشکیل سے امیر کے استبداد کی روک تھام کر دی۔ اس طرح شخصیت اور جمہوریت دونوں کو ایک معتدل درجہ کے ساتھ امت کے سیاسی نظام میں شامل کر دیا گیا یعنی دونوں کے مضر پہلوؤں کو نکال پھینکا اور دونوں کے نافع پہلو اختیار کر لئے گئے جو کمال اعتدال ہے۔ ٹھیک اسی طرح امت کے دینی نظام میں شریعت نے نص نہ ہونے کی صورت میں نہ تو عام افکار کو اس درجہ آزاد چھوڑا کہ امت کا ہر شخص مجتہد ہو اور کتاب وسنت میں ہر کس وناکس کے آراء وقیاسات کا دروازہ کھل جائے اور نہ اس امت کو ایسی تقلید جامد میں چھوڑا کہ اس کے قویٰ فکر واجتہاد سرے ہی سے معطل ہو جائیں بلکہ ایک طرف تو جنس اجتہاد کو باقی رکھا جس کی انواع حسب اقتضاء زمانہ آتی اور مختتم ہوتی رہیں گی تا کہ امت کے قویٰ فکر وتدبیر سست نہ ہونے پائیں۔

اور ایک طرف تقلید کو قائم رکھا تا کہ عامی اور ناواقف اپنی اپنی رائے کو دین کا لباس پہنا کر سارے دین ہی کو آراء وقیاسات کا مجموعہ نہ بنادے اور اس طرح دین میں تشتت وپراگندگی کے جراثیم نہ پھیل جائیں پس امت کے علمی تشتت کو تقلیدی سمع وطاعت سے رفع کر دیا اور تقلیدی جمود کو شان اجتہاد و تحقیق سے دفع کیا اس طرح اجتہاد و تقلید کے مضر پہلوؤں سے بچا کر امت کو درمیان کے معتدل نقطہ پر قائم فرمادیا جس میں نافع پہلو سب قائم ہیں۔ چنانچہ امت اگر مقلد بھی ہے تو وہ اس تقلید میں محقق بھی ہے اور اگر وہ اجتہادی فکر بھی رکھتی ہے تو میں اسوہ سلف کی اس مقلد بھی۔ غرض اس اعتدالی درجہ کا یہ اثر ہے کہ ان کے اجتہاد میں تقلید اور تقلید میں شان تحقیق نمایاں ہے۔ اس لئے نہ تو تقلید کو ایک مستقل شریعت بنا کر اس سے جنس اجتہاد کی تردید کوئی موزوں فعل ہو سکتا ہے اور نہ اجتہاد کو ایک مسلک عام مان کر اس سے تقلید پر رد وانکار کوئی خوبی قرار دی جاسکتی ہے۔

اجتہاد کی ایک نوع ختم ہو چکی ہے اور اس کی واضح دلیل

باقی یہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اجتہاد کی وہ نوع جو استنباط علل اور اجتہاد فی الدین سے تعلق رکھتی ہے آج اس لئے نہیں پائی جاتی کہ اس کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ ائمہ نے اس اس حد تک مکمل کر دیا ہے کہ آئندہ اس سے نفع اٹھانے کی صورت تو باقی رہ جاتی ہے لیکن اس میں مزید تلاش و تحقیق کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ یہ ایک قدرتی اصول ہے کہ جو مقصد دنیا میں مکمل ہو جاتا ہے اس کی متعلقہ قوت بھی ختم کر دی جاتی ہے۔ دین کی بنیادی دو ہی

ستونوں پر قائم تھیں۔ روایت اور درایت۔۔۔ روایت کا تعلق حافظہ سے ہے اور درایت کا تعلق فہم سے۔ اوئل اسلام میں جب کہ اسلام کا روایتی حصہ مکمل ہو رہا تھا' اللہ تعالیٰ نے محدثین کو جو مخصوص حافظہ عطاء فرمایا کہ آج اسے بجز کرامت اور خرق عادت کے کسی دوسرے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا' ایک ایک محدث کو لاکھوں کی تعداد میں احادیث یاد ہوتی تھیں اور نہ صرف متون و حدیث بلکہ مع اسانید ور جال اور نہ صرف رجال کے اسماء بلکہ ان کی سوانح اور صفات بھی ازبر ہوتی تھیں جیسا کہ کتب طبقات سے واضح ہے۔ انہیں سینوں سے وہ سفینے مدون ہوئے جو آج کتب حدیث کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

جب دین سینوں کے ذریعہ سے سفینوں میں منضبط ہو گیا اور محض حفظ پر مدار نہ رہا تو قوت حافظہ قدرتی عوامل کے ماتحت گھٹنی شروع ہوئی اور آج اس حد پر آگئی کہ اگر ہم روزانہ کی معاشرتی زندگی میں نوٹ بک اور ڈائری جیبوں میں نہ رکھیں تو کاروبار صفر ہو جائے۔

پس جس حد تک اس محیر العقول قوت حافظہ کا کام پورا ہو گیا جو اس امت کو بطور اعجاز کے دی گئی تھی تو قوت کی وہ نوع بھی قدرتی طور پر ختم ہو گئی۔ گو جنس حافظہ آج بھی موجود ہے جس کی باقی ماندہ نوعیت مناسب وقت کام کر رہی ہے۔

دور روایت کے بعد اس طرح جب کہ اسلام کا درایتی حصہ مکمل ہونا شروع ہوا اور روایات سے دین کا استنباط کر کے مبوب اور مفصل کرنے کا نوبت آئی تو حق تعالیٰ نے اس امت میں وہ ارباب درایت و فقہ اور ائمہ اجتہاد پیدا کئے کہ ان کے مصفی اذہان کا سرعت انتقال و نفوذ انکے حیرتناک استنباطات اور ان کے فقہ نفس کے عجائبات بھی خرق عادت ہی کی صورت سے دنیا میں ظاہر ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف مسائل ہی مستنبط کئے بلکہ وجوہ استنباط بھی علی وجہ البصیرۃ ظاہر کیں۔ کیفیت استنباط پر بھی روشنی ڈالی۔ پوری شریعت کی جزئیات کا ان کی کلیات سے ارتباط بھی معلوم کیا اور اس ربط کے واسطہ کے ہزاروں نئے مسائل کلیات سے اور ہزارہا علل کلیہ جزئیات سے استخراج کیں جس سے پوری شریعت شاخ در شاخ ہو کر ایک ہی شجرہ اور متصل واحد شئے دکھائی دینے لگی اور یہ سب کچھ اس شان سے ہوا کہ ارباب فہم آج ان حضرات کی رسائی فہم پر انگشت بدنداں ہیں اور اسے ان کا کوئی اکتسابی کارنامہ نہیں بلکہ محض وہبی عمل کہنے پر مجبور ہیں جس کے لئے خدا نے انہیں منتخب کر لیا تھا۔

جب دین کا یہ فقہ اپنی مکمل صورت میں آگیا۔ امہات مسائل حقیقی تنقیح کے بعد باب وار مرتب ہو گئے اور ائمہ فقہ کے سینوں سے نکل کر سفینوں میں مدون بھی ہو گئے تو ان ہی قدرتی عوامل کے ماتحت وہ خاص قوت فہم بھی کم ہونی شروع ہو گئی کہ اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور رفتہ

رفتہ زمانہ آج اس درجہ پر پہنچ گیا کہ جدید استنباط تو بجائے خود ہے مستنبط شدہ مسائل کے خفی رشتہ کو جو متعلقہ کلیات سے قائم ہے بلکہ جزئیات وکلیات کے سلسلہ کے تسلسل اور صورت انسلاک کو بھی پوری طرح سمجھنے کا فہم عامہ خلائق میں باقی نہیں رہا ہے۔ اس لئے اجتہاد کی وہ نوع بھی باقی نہیں جس کا تعلق استخراج علل واستنباط مسائل سے تھا کہ یہ ضرورت زمانہ نے پوری کر کے ختم کر دی اور اس بناء پر وہ قوت بھی مضمحل ہو گئی۔

ختم شدہ اجتہاد کے استعمال کے نتائج بد

اس فقدان قوت کے بعد بھی اگر مدعیان زمانہ کو اجتہاد کی اس نوع میں آزادی مل جائے جس کے لئے لوگ تڑپتے ہیں تو قطع نظر استنباط مسائل کی ضرورت وعدم ضرورت کے فساد مذاق، غلبہ ہوا وہوس اور جذبہ خود مختاری کے ماتحت ہر ایک فاضل، ہر ایک گریجویٹ، ہر ایک وکیل، ہر ایک بیرسٹر ہر ایک ایڈیٹر جو چند پیسوں میں لوگوں کا کچھ وقت خرید سکتا ہے بلکہ ہر ایک خواندہ ناخواندہ مجتہد عصر ہو گا اور اجتہادات کے ایسے ایسے انوکھے نمونے دنیا کے سامنے آئیں گے کہ اسلام کی اصل شکل پہچاننی بھی مشکل ہو جائے گی۔

چنانچہ حسب مضمون "الاقتصاد" ایک شخص کہے گا کہ جس طرح سابق مجتہدین نے نصوص کو کسی علت سے معلول سمجھا اور بسا اوقات ظاہر نص کو چھوڑ کر باطنی علت پر عمل کیا اور کرایا، مجھے بھی اس کا حق ہے لہٰذا میرے نزدیک مثلاً وضو کا حکم معلل ہے جس کی علت یہ تھی کہ عرب کے اکثر لوگ اونٹ، بکریاں چراتے تھے۔ ان کے ہاتھ پیر ان جانوروں کے بول و براز کی چھینٹوں سے آلودہ ہو جاتے تھے وہی ہاتھ منہ پر بھی لگ جاتا تھا اس لئے ان کو وضو کا حکم دیا گیا تھا۔ اس لئے اعضاء وضو وہی رکھے گئے جن کی آلودگی عادتاً اکثر وبیشتر تھی۔ لیکن ہم ضروریات تمدن کے ماتحت روزانہ غسل کرتے ہیں، محفوظ مکانوں میں کرسی نشین رہتے ہیں اور وہ آلودگی کی علت ہم میں نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا وضو ہم پر واجب نہیں۔ ایک کہے گا کہ مثلاً نکاح میں شہود اور اعلان نکاح فی نفسہٖ ضروری نہیں بلکہ اس علت سے تھا کہ زوجین میں اختلاف ونزاع کے وقت تحقیق حال میں سہولت ہو۔

پس جہاں اس کا احتمال نہ ہو وہاں بلا شہود نکاح جائز ہے وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ آج کہا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی علل واسرار دین کے ہوں گے اور ان ہی علل پر احکام مبنی ہوں گے تو ان مجتہدین عصر کی بدولت غریب اسلام کو تو منہ چھپانے کی بھی جگہ نہ ملے گی کیونکہ اس کا انجام احکام کی تحریف، اجماع کی مخالفت و تخریب، نصوص کی تبدیلی اور اصلی اسلام کا انہدام ہے۔ یہ آج کے اجتہادات کے عریاں نمونے ہیں جنہیں ہر شخص ادنیٰ تامل سے پہچان سکتا ہے اور بعض نمونے علمی

رنگ کے ہوں گے جن کے کو خواص پہچان سکیں گے مگر اس قسم کے اجتہادی مفاسد پیش آنے کی وجہ وہی ہے کہ تکوینی طور پر وہ استخراج علل کی قوت تو بوجہ انقضاء ضرورت کے ختم ہو چکی ہے اور یہ علم کہ کون سا حکم معلل ہے علت کے ساتھ اور کون تعبدی ہے جس قوۃ فہم پر مبنی تھا وہ رفتہ رفتہ زائل ہو چکی ہے۔ پھر بھی اس ادعاء اور اوپر سے استعمال ایسے ہی نتائج پیدا کرے گا جو تمثیلاً عرض کئے گئے۔ ہاں اس خاص نوع کو چھوڑ کر جس نوع کے پردہ میں اج بھی جنس اجتہاد باقی ہے وہ عام تحقیق و تلاش کتاب و سنت میں تدبر، ان کے لطائف، وحقائق کا استخراج، ہر زمانے کے تکوینی حوادث سے تشریعی مسائل کو تطبیق دے کر مناسب فتویٰ دینا۔ معاندین اسلام کے نئے نئے شکوک وشبہات کی تردیدات نصوص سے استنباط کرنا، اصول اسلام کے اثبات و تحقیق کے لئے کتاب و سنت سے مویدات پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ ہے۔ اجتہاد کی یہ نوع کل بھی تھی ور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی کہ قرآن کی شان لاتنقضی عجائبہ فرمائی گئی ہے جس میں کسی زمانہ کی تخصیص نہیں۔

پس جس طرح کتب روایت میں آج کسی جدید چھان بین اور رواۃ پر نئی جرح اور تعدیل کی کوئی ضرورت نہیں۔ حسب ضرورت صرف ائمہ فن سے ان کی عرق ریزیوں کا ثمرہ پیش کر دینا کافی حجت ہے ورنہ تحصیل، حاصل ہو گی۔ اس طرح کتب درایت میں بھی آج پھر سے اجتہاد کی ضرورت نہیں رہی جو کیا جا چکا ہے۔

. بلکہ حسب ضرورت ائمہ درایت سے ان کی کاوشوں کے ثمرات کا نقل کر دینا اور اس پر عمل کر لینا کافی ہے۔ وہاں ہم روایت میں تقلید ائمہ پر مجبور ہیں۔ یہاں درایت میں مجبور ہیں۔ گویا نہ نئی حدیث کی ضرورت ہے نہ نئے فقہ کی۔ محدثین نے کوئی روایت نہیں چھوڑی جس کا صحت و سقم کھول کر نہ رکھ دیا ہو۔ فقہاء نے کوئی درایتی احتمال اور بعید سے بعید صورت عمل ایسی باقی نہیں چھوڑی جس کو نکھار کر بدلائل سامنے نہ رکھ دیا ہو اور کسی جویائے عمل کے لئے تشنگی کی کوئی ادنی صورت بھی باقی رہ گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نئے سے نئے مسائل پیش آئے اور آرہے ہیں مگر مفتیین کو فتاویٰ کے لئے اب تک کسی جدید فقہ مرتب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اسی فقہ سے جو ایک لاء اور قانون کی صورت میں مدون ہے اور ان ہی اصول سے جس کے ماتحت یہ فقہی ترتیبات عمل میں آئیں زمانہ کی ساری ضروریات پوری ہوتی رہیں اور ہوز ہی ہیں خواہ اس کے منصوص حصہ سے اور خواہ اس کے اجتہادی حصہ سے۔ یہ خود اس کی ایک مستقل دلیل ہے کہ اجتہادی دور اپنا کام پورا کر کے منقضی ہو چکا ہے جو لوٹ کر آنے والا نہیں ہے۔

مگر ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اجتہاد فی الدین کا دور ختم ہو چکا تو ہو جائے مگر اس کی تقلید کا دور کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ تقلید ہر اجتہاد کی دوامی رہے گی خواہ وہ موجود ہو یا منقضی

شدہ کیونکہ تقلید عین اجتہاد میں نہیں کی جاتی بلکہ اس سے پیدا شدہ مسائل میں کی جاتی ہے اور وہ مسائل آج بھی موجود ہیں اور رہیں گے۔ اس لئے تقلید پر کوئی دور بھی اختتام وانقضاء کا نہیں آسکتا۔ خلاصہ یہ کہ جنس اجتہاد و تقلید میں سے کسی کو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کسی وقت بھی دنیا سے منقطع ہوئے ہیں اس لئے آج بھی وہ دونوں اپنی اسی نوعیت کے ساتھ جس کی تفصیل ابھی عرض کی گئی دنیا میں موجود ہیں کہ دین کی جامعیت تو ان دونوں کے وجود کو مقتضی ہے جبکہ یہ دونوں شرعی چیزیں ہیں اور دین کا اکمال واتمام ان دونوں کے درجہ اعتدال کو مقتضی ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر ختم نہ کیا جائے بلکہ درمیانی نقطہ پر لاکر دونوں کو قائم رکھا جائے جس کی صورت ابھی عرض کی گئی۔

اختلاف ائمہ باعث رحمت ہے

یہاں سے بحث کا ایک اور نقطہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب اجتہاد شرعی چیز ہے جس میں رائے اور فہم کا دخل ہوتا ہے اور آراء بتفاوت افہام متعدد اور مختلف ہوسکتی ہیں تو ہوسکتا ہے کہ ایک ہی اجتہادی مسئلہ میں آراء کئی ہوجائیں اور اجتہادات مختلف رنگوں کے ظاہر ہوں تو کیا اس اختلاف رائے کا دروازہ کھلنا امت کی تفریق بلکہ تخریب اور تمذہب کا باعث نہ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ یہ صورت اختلاف نہ فی نفسہ مضر ہے نہ دین کے لئے مضر ہے نہ امت کے لئے مضر ہے۔ بلکہ علم' علماء اور پوری امت کے خواص و عوام کے لئے موجب ترقی اور باعث سود بہبود ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ترقی بغیر تصادم و تزاحم کے نہیں ہوتی بلکہ ترقی نام ہی دو متخالف چیزوں کے ٹکرانے کا ہے۔ اس لئے علم کی وسعت بھی بغیر تزاحم آراء اور تصادم افکار کے نمایاں نہیں ہوسکتی۔ ایک حکیم کا مقولہ ہے۔

القلب میت و حیاته' بالعلم والعلم میت و حیاته' بالبحث والمناظرة.

"دل آدمی کا مردہ ہے اس کی زندگی علم سے ہے اور علم انسان کا مردہ ہے اس کی زندگی بحث ومناظرہ سے ہے"۔

ظاہر ہے کہ بحث ومناظرہ علم کو علم سے ٹکرانے کا ہی نام ہے جس سے علم کے مختلف و مخفی گوشے کھل جاتے ہیں۔ تکوین الٰہی نے اسی لئے اسلام کے مقابلہ میں کفر کی طاقتیں کھڑی کیں تاکہ فکر باطل جتنے پہلوؤں سے اسلام سے ٹکرائے' اسلام کے اتنے ہی حقانی پہلو نمایاں ہوجائیں اور انجام کار حق کا غلبہ سب دیکھ لیں۔ علم کے مقابلہ پر شبہات کا لشکر اسی لئے صف آراء کیا گیا کہ جہل اپنے جس جس حصہ سے علم سے ٹکراتا رہے علم کے اتنے ہی مخفی گوشے دنیا کے سامنے ہوتے رہیں۔ پھر علم کو علم سے جتنی بھی ٹکر دی جائے معلومات کے اتنے ہی بوقلموں نقشے کھلتے رہیں۔

شریعت نے مشورہ کا اصول اسی لئے رکھا کہ آراء کے تصادم سے مسئلہ کے موافق اور

مخالف پہلو کھل جائیں اور بات چھن چھنا کر منقح ہو جائے۔ غرض اگر اصول کے مقابلہ پر اضداد نہ ہوں اور متخالف اشیاء کے سامنے ان کے متخالفات نہ ہوں تو نہ ان کے مخفی حقائق اور قوی واشگاف ہو سکتے ہیں اور نہ بے حقیقت اضداد کی قلعی کھل سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے دین میں ایک حصہ محل فکر و بحث رکھ کر اجتہاد و تحقیق اور تزاحم آراء کے لئے چھوڑ دیا تا کہ اسلام کا وہ باطنی علم جو وسیع ترین کلیات اور مخفی علل اور اسرار پر مشتمل ہے لاَ تَقِفُ عِنْدَ حَدٍّ کی حد تک کھلتا چلا جائے اور امت کے مخصوص دماغوں کی جولانیاں اور قلوب صافیہ کی رسائیاں سارے عالم کے لئے نفع بخش ثابت ہوں۔

ساتھ ہی اسلامی علوم کی جامعیت اور اسی کے ساتھ کتاب و سنت کی ہمہ گیری بھی کھل جائے۔ اس کی مختصر مختصر نصوص میں کتنے کتنے علوم بھرے پڑے ہیں کہ ہر مصفی قلب و دماغ کے لئے اس میں ہر وقت اور وقت کے مناسب علم کا جدید سے جدید سامان تیار ہے جس سے اُوتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ اور وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ تِبْیَانًا لِکُلِّ شَیْءٍ کا پورا پور ظہور ہو جائے۔ ہاں ایسے ساتھ یہ بھی واضح ہو جائے کہ کتاب و سنت کے بلیغ جملات اور ذی وجوہ فقرات جس قدر بھی شرعی احتمالات اپنے اندر رکھتے ہیں جو قواعد عربیہ اور اصول لسان کے اعتبار سے ان میں سے حقیقۃً پیدا ہوئے ہیں۔ وہ تمام محتملات بعض احتمالات میں نہ رہیں۔ بلکہ ہر ایک محتمل قابل عمل اور ایک مستقل اسوہ بن جائے اور احتمال کی طرف جانے والا چل نکلے اور اسے اپنا مسلک ٹھہرائے تا کہ کلام الٰہی اور کلام رسالت پناہی کا کوئی گوشہ بھی مہمل نہ رہے بلکہ کسی نہ کسی امام کے اختیار کر لینے کے سبب وہ امت کے زیر عمل آجائے۔ پس آج اختلاف ائمہ کی بدولت احادیث کا جز ہر محل اجتہادی مسائل کی صورت میں امت میں معمول ہے اور کلام پیغمبر ؐ کا کوئی گوشہ نہیں ہے جو ایک مستقل مذہب اور مسلک بنا ہوا نہ ہو۔۔۔ اسی لئے اس اختلاف کو رحمت واسعہ فرمایا گیا کہ اس کی بدولت کلام نبوت کا اعمال ہوتا ہے اہمال نہیں رہتا والاعمال اَولیٰ من الاھمال نیز امت کے لئے اور سہولت بھی بہم پہنچتی ہے کہ ہر مذاق کا طبقہ ہر مذاق کا امام اپنا مناسب مذاق علمی پہلو کو لے کر اپنی آخرت سنوار سکتا ہے اس صورت میں یہ ایک ایسے دریا کی مانند ہو گا جس کا ایک ہی گھاٹ نہ ہو بلکہ متعدد ہوں کہ جو راہ گیر جس جانب سے بھی گزرے سیراب ہو سکے اور اسے کسی ایک ہی گھاٹ کی طرف گھوم کر آنے کی مجبوری لاحق نہ ہو کہ ہر گھاٹ پر پانی بھی وہی ہے' مزہ بھی وہی ہے۔ البتہ سمت اور رخ بدلا ہوا ہے ایک عظیم الشان درخت کے مشابہ ہو گا جس کی ہزاروں شاخیں ہوں اور ہر سمت میں ہوں تا کہ جدھر سے بھی کوئی آئے پھل کھا سکے۔ یہ نہیں کہ شاخ ایک ہی ہے اور ہر جانب سے آنے والے کو ناگریز طریقے پر ایک ہی سمت خاص میں پہنچ کر پھل سے انتفاع کا موقع ملتا ہے یا ایک ایسے عظیم ایوان کی طرح جس میں ہزاروں دروازے ہیں کہ ہر جہت سے آنے والے ہر سمت سے مکان میں داخل

ہو سکتے ہیں اور اس کے سامان سے راحت اٹھا سکتے ہیں جو مجبور نہیں ہیں کہ گھوم پھر کر ایک ہی دروازے سے داخل ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولت اختلاف ائمہ ہی کی بدولت امت کو حاصل ہو سکتی تھی اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اختلاف ائمہ اصول کا نہیں بلکہ اتحاد اصول کے ساتھ سمتوں اور جہات و کیفیات کا اختلاف ہے تاکہ علم کی اس وسعت سے اسلام کی ہمہ گیری اور امت کے لئے عمل کی تیسیر ہو جائے۔ نیز ہر مذاق کے انسان کو الوان فہم کے مذاق کے مطابق مربی اور سامان تربیت بھی میسر آجائے۔

بس اس حکمت بالغہ کے ماتحت حق تعالیٰ نے آئمہ اجتہاد میں تعدد بھی پیدا فرمادیا اور ان میں متعدد حضرات کے مذاق اجتہاد میں الوان کا بھی اختلاف ڈال دیا۔ اصول استنباط بھی مختلف ہو گئے اور ان کے ماتحت مستنبط شدہ مسائل کی لمیات اور پھر ان لمیات کے ماتحت حکمیات بھی مختلف ہو گئیں اور یہ سارے اختلافات سمٹ کر اس اختلاف ذوق سے پیدا ہوئے جو ائمہ کو قدرت الٰہی نے تکوینی طور پر بخشا تھا۔ اس کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی رونما ہوا کہ ان ائمہ کی مختلف شئون سے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف اور متنوع شئون نبوۃ واشگاف ہوئیں۔ گویا وہ ساری شئون جو ایک ذات بابرکات نبوی میں مجتمع تھیں اور ان سب کا کوئی ایک امتی انفرادی طور تحمل نہیں کر سکتا تھا۔ پوری امت کے راسخین فی اعلم پر منقسم ہو کر مختلف رنگوں میں ظاہر ہوئیں اور اس شان سے کہ ہر شان نبوۃ نے ایک ایک مجتہد کے ذریعہ ایک مستقل مسلک اور تہذیب کی صورت اختیار کر لی جس پر امت کے کروڑوں افراد چلنے کے لئے تیار ہوئے۔ نظر بریں فقہاء امت کا یہ اختلاف امت کے حق میں نہ صرف غیر مضر بلکہ علماً و مفید ثابت ہوا۔ فہیم شخصیات کے مکنون جوہر کھلے کتاب وسنت کی بلاغت و جامعیت کے مستور پہلوؤں کا اعلان ہو گیا۔ امت کے لئے عملی آسانیاں بہم پہنچ گئیں۔ پیغمبر کے متنوع علم کی شئون واضح ہو گئیں، غرض امت، پیغمبر، دین، مذہب سب کے لئے اجتہادی اختلاف اور فروعی تنوع بہر نہج مفید اور رحمت ثابت ہوا اس لئے شریعت نے کھلے الفاظ میں اس اختلاف کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسے رحمت واسعہ کہا۔ ارشاد نبویؐ ہے،

اختلاف اصحابی رحمة واسعة.

(رواه البيهقى فى المدخل عن ابن عباس ورواه الدارقطنى والدارمى وابن عساكر عن ابن عمر وصححه الحاكم (قاسم العلوم مسئله، امامت)

"میرے صحابہؓ کا اختلاف بڑی رحمت ہے"۔

پھر اسی پر قناعت نہیں فرمائی گئی بلکہ اس اجر وثواب کے مواعید دے کر امت کو اس کی رغبت دلائی گئی۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

عن عمرو بن العاص انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول اذا حكم الحاكم فاجتهد فاصاب فله اجران واذا حكم ثم اجتهد ثم اخطا فله اجر. (رواه البخاری (الاقتصاد)

"عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب کوئی حکم والا حکم کرے اور اجتہاد میں مصیب ہو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور اگر خطاء ہو جائے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے"۔

قرآن کریم نے بھی اپنے نظم میں اختلاف کی مشروعیت کی طرف اشارہ فرمایا گیا فروعی اختلافات کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَاجَآ ئَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاُولٰئِكَ لَهُم عَذَاب" عَظِيْم". (القرآن الكريم) .

"اور تم لوگ ان کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا واضح احکام پہنچ جانے کے بعد اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہو گی"۔

مِنْ بَعْدِمَاجَاءَ هُمُ الْبَيِّنَاتُ کی قید سے واضح ہے کہ اختلاف مطلقاً مذموم نہیں بلکہ صرف وہی اختلاف مذموم ہے جو دلائل کھل جانے کے بعد کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا اختلاف یا تو اصول کا اختلاف ہو سکتا کیونکہ اصول خود فی نفسہٖ کھلے ہوئے اور واضح ہوتے ہیں اور یا ان فروع کا ہو سکتا ہے جن کے دلائل واضح ہو جائیں۔ پس اصول واضحہ اور فروع واضحۃ الدلائل میں اختلاف آیت بالا سے مذموم اور ممنوع ثابت ہوا کہ وہ اختلاف محض نفسانی ہوتا ہے لیکن ان فروع میں اختلاف جن کے دلائل ہی ابھی تک واضح نہ ہوئے ہوں خواہ اس طرح کہ ان کے بارہ میں کوئی نص ہی نہ آئی ہو یا نص ہے مگر اس سے متعارض ایک دوسری نص بھی ہو جن میں وجہ تطبیق صریح اور واضح نہ ہو۔ تو اس قسم کی فروعات میں اختلاف ظاہر ہے کہ وضوح بینات سے پہلے پہلے کا ہو گا اس لئے مذموم بھی نہیں ہو سکتا یہی وہ اجتہادی اختلاف ہو گا جو اتحاد اصول کے ساتھ محض فروعاتی ہو گا اور مجبوری ہو گا جسے لسان نبوت سے رحمت واسعہ کہا گیا ہے اور جس کی خطاء پر اجر کا وعدہ دیا گیا ہے پس ایسے اختلاف کی مشروعیت حدیث کے تو منطوق اور قرآن کے مفہوم سے ثابت ہو گئی۔

مسائل فقہیہ کی تدوین مذموم نہیں ہو سکتی

بہر حال جبکہ اجتہاد مشروع بھی ہوا، اجتہادی اختلافات بھی شرعی اور

مطلوب شرعی ٹھہرے تو آئمہ اجتہاد کے ذریعے ایسے اجتہادی اختلافات کا ظہور بھی نہ قابل ملامت ہوسکتا ہے نہ ایسے مسائل کی تدوین ہی قابل طعن ہوسکتی ہے۔ اگر کسی مجتہد کے تلامیذ اپنے عمل کے لئے اس کے اجتہادات کو ایک جگہ جمع کرلیں گویا بالفاظ دیگران شرعیات کے مسائل کی تدوین کرنے لگیں تو آخراس میں کونسی شرعی قباحت ہے؟ کہ اس پر انہیں قابل سرزنش شمار کیا جائے۔ بس ایسے ہی اجتہادی مسائل کے ایک جگہ جمع شدہ مجموعہ کا نام فقہ ہے جس کو کسی مجتہد کے متوسلین نے باب وار اوراق میں ذخیرہ کرلیا ہو۔ پھر یہ نام بھی کوئی اختراعی نام نہیں بلکہ حدیث نبوی سے ثابت شدہ اور اللہ اور اس کے رسول کا تجویز فرمودہ نام ہے جیسا کہ حدیث رب حامل فقه اور حدیث مثل من فقه فی دین اللہ اور حدیث من یرد الله به خیرا یفقهه فی الدین سے تفصیلی طور پر اس فقہ کی نوعیت عرض کی جاچکی ہے۔

متبعین فقہ کے لقب "اہل السنّت والجماعۃ" کا ماخذ

ہاں پھر چونکہ یہ فقہ مجموعہ سنن تھا جس میں سنن نبوی تو بطور ماخذ کے شامل تھیں اور سنن صحابہؓ بطور ماخذ کے جمع تھیں اس لئے اس میں سنیت کا بھی نور تھا اور جماعت صحابہؓ کا جماعتی نور بھی مجتمع تھا اس لئے عاملین فقہ نے اپنا نام اہل السنۃ والجماعۃ رکھ لیا تو برا کیا بلکہ غور کرو تو یہ نام بھی حدیث ہی سے ماخوذ ہے عمروؓ بن عاص کی روایت کی ارشاد نبوی ہے۔

> وان بنی اسرائیل تفرقت علیٰ ثنتین وسبعین ملة و تفترق امتی علیٰ ثلث وسبعین ملة کلهم فی النار الا واحدة قالوا من هی یا رسول الله؟ قال ما انا علیه واصحابی۔ (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ باب الاعتصام)
>
> "اور بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرق پر منقسم ہو جائے گی سب فرق ناری ہونگے بجز ایک کے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ وہ فرقہ کون سا ہے؟ فرمایا جس طریقہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں اس پر چلنے والا ناجی ہے"۔

ظاہر ہے کہ اصحاب کے لفظ سے جو جمع لایا گیا ہے اس سے جماعت مفہوم ہورہی ہے اور ما سے مراد طریقہ اور سنت ہے جو پیغمبر اور صحابہؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس لئے فرقہ ناجیہ کا ترجمہ ہوا "سنت نبی وجماعت نبی" ظاہر ہے کہ جب اہل فقہ کی فقہ میں یہی سنت نبی اور جماعت نبی جمع ہے اور انہوں نے اس لفظی اور معنوی مناسبت سے اپنا لقب اہل سنت والجماعت تجویز کرلیا تو اس میں کیا برائی ہے کہ یہ لقب ان کے حق میں مستوجب ملامت شمار کیا جائے بلکہ اس لقب کی ترکیب پر غور کیا جائے تو ایک اور شرعی حقیقت بھی اس لقب سے واشگاف ہوتی ہے جو دینی جماعت کے جسم کے

لئے بمنزلہ روح کی ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اہل سنت اور اہل الجماعت کہنے والے گویا یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم سنن نبوی کو محض الفاظ حدیث سے اخذ نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے ساتھ صحابہ کی شخصیات کو ملا کر معانی لیتے ہیں جو حاملین حدیث ہیں جن کی زبانوں پر تو حدیث و قرآن کے الفاظ ہیں اور سینوں میں ان الفاظ کے مخفی حقائق و دقائق ہیں۔ گویا لفظ کتاب و سنت کے ساتھ صحبت و معیت اساتذہ بھی ضروری ہے۔

اگر صحابہؓ نے حضور ﷺ کی زبان سے قران و حدیث سنا اور ان کے حقائق کو حضور ﷺ کے سینہ مبارک سے لیا پھر تابعین نے صحابہؓ کی زبان سے تو قرآن و حدیث لیا اور ان کے قلوب سے اس کی صفائی و اسرار کو حاصل کیا بَلْ هُوَ اٰيَات" بَيِّنَات" فِیْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ

تو ہم بھی اس توارث کے ماتحت الفاظ کتاب و سنت تو کتب سے لیتے ہیں اور ان کے حقائق ان روشن ضمیر اساتذہ کے قلوب سے جو خلفاً عن سلف اس باطنی نور کو اخذ کرتے چلے آئے ہیں۔ پس اہل السنّت والجماعت کے لفظ سے طریقہ اور مذہب بھی نکلتا ہے اور طریقہ کے ساتھ اہل طریق کی معیت ملازمہ بھی مفہوم ہوتی ہے جو حقائق کے سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے دینی سلسلہ میں تعلیم و تربیت کے بھی دو اصول ذکر فرمائے ہیں۔ ایک کتاب اور ایک استاذ۔ گویا کتاب کے ساتھ ایک عالم کتاب رسول ضرور لازم رکھا ہے تاکہ وہ کتاب کے جلی و خفی حقائق سمجھائے بھی اور کر دکھلائے چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ.

"بلا شبہ ہم نے اپنے رسول بھیجے کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور میزان تاکہ لوگ عدل کے ساتھ ہوں"۔

اس لئے اہل السنّت والجماعت کا عنوان ایسا جامع عنوان نکلا کہ اس میں دینی تربیت کے ان دونوں بنیادی اصول (کتاب اور شخصیت) کی طرف اشارہ گیا جن سے ایک سچی جماعت یا صادق فرقہ کی تشکیل ہوتی ہے کہ اس کے لقب میں طریق اور اہل طریق دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔۔۔۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جو اہل السنّت والجماعت ہے وہ اہل حدیث اور اہل قرآن بھی ہے کہ یہ کتاب کا مرتبہ ہے۔ اہل عترۃ بھی ہے کہ یہ شخصیت کا درجہ ہے لیکن ہر اہل حدیث اور اہل قرآن کا اور اہل عترۃ کا اہل السنّت والجماعت ہونا ضروری نہیں کہ ان القاب میں کسی میں فقط کتاب کی طرف اشارہ ہے اور کسی میں محض شخصیت کی طرف۔ پس حدیث میں جہاں بھی مسلمانوں کو اہل حدیث فرمایا

گیا جیسے حدیث انسؓ سخاوی سے نقل کی جاتی ہے کہ اس میں مسلمانوں کو "انتم اہل الحدیث" سے خطاب کیا گیا یا قیامت میں کیا جائے گا یا کسی حدیث میں مسلمانوں کو اہل قرآن کہا گیا ہے جیسے حدیث علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ہے کہ۔

انّ اللّٰه وتر یحب الوتر وترّوا یا اهل القران.

(رواہ الترمذی والنسائی وابوداؤد مشکوۃ باب الوتر)

"اللہ وتر ہے، وتر کو پسند کرتا ہے پس وتر پڑھوائے اہل قرآن"۔

یا کسی حدیث عترت کے اتباع کی دعوت دے کر گویا انہیں اہل عترت کہا گیا یہ سب اسماء جزوی اور نسبتی ہیں کہ یا مسلمانوں کو کتاب اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے یا سنت نبوی کی طرف یا اصحاب واہل بیت کی طرف ایک اشارہ بلکہ صراحۃً موجود ہے۔ اس حال میں کہ اہل حدیث۔۔۔۔یا اہل قرآن کے القاب والی روایات میں اس لقب سے کسی اصطلاحی جماعت کی طرف اشارہ نہیں ورنہ چکڑالوی اہل قرآن اور شیعان اہل عترت کو اپنی حقانیت پر استدلال لے آنے کا کافی موقع مل جائے گا۔۔۔۔

بلکہ واقع یہ ہے کہ یہ ایک نسبت محض ہے جو ملابست کی وجہ سے فرمائی گئی ہے جیسے جنت میں مختلف دروازوں باب الصلوٰۃ، باب الجہاد، باب الریان وغیرہ سے داخل ہونے والوں کو محض ان اعمال یا ان دروازوں کی طرف منسوب ہو جانے کے سبب مختلف القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ بعض کو اہل الصلوٰۃ کہا گیا، بعض کو اہل الصیام کہا گیا اور بعض کو اہل الجہاد کہا گیا۔ یا بعض روایات میں انہیں اہل دین کہا گیا ظاہر ہے کہ ان القاب سے فرق اور مذہبی گروہ مراد نہیں ہیں بلکہ محض نسبتوں کا اظہار ہے جس سے مسلمانوں کی امتیازی شان اور تشریف مقصود ہے نہ کہ عقائد و مسائل کے مختلف گروہوں کی طرف اشارہ فرمانا۔ اسی طرح حدیث میں اہل الحدیث، اہل القرآن فرمانے سے اصطلاحی جماعتیں چکڑالوی یا امرتسری مراد نہیں بلکہ نسبتوں کا اظہار مقصود ہے کہ مسلمانوں کو کتاب سے بھی نسبت ہے۔ حدیث سے بھی ہے۔ صحابہؓ سے بھی ہے، صلوٰۃ سے بھی ہے صیام سے بھی ہے، جہاد سے بھی ہے، دین سے بھی ہے، کلمہ طیبہ سے بھی ہے۔ پس ایک مسلمان اہلحدیث بھی ہے، اہل قرآن بھی ہے، اہل عترت بھی ہے" اہل صلوٰۃ بھی ہے، اہل صیام بھی ہے۔ اہل جہاد بھی ہے، اہل دین بھی ہے، اہل علم بھی ہے اور اہل لَآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ بھی ہے۔ لیکن "ماانا علیه واصحابی" کا جملہ جس سے اہل السنّت والجماعت کا لقب مستنبط ہوتا ہے بولا ہی گیا ہے فرق کے تذکرہ کے سلسلہ میں اور اس لقب سے ایک ہی فرقہ کی تشخیص منظور جو عند اللہ فرقہ ناجیہ ہے۔ پس یہ لقب محض نسبت ہی نہیں بلکہ ایک جماعت کا شرعی سرنامہ اور عنوان ہے، اس لئے میرے خیال میں اہل السنّت والجماعت نے اس لقب کو اپنے لئے اختیار

کر کے اپنے کمال تفقہ کا ثبوت دیا ہے کہ مسلک کا لقب بھی منصوص ہی انتخاب کیا یعنی اہل السنّت والجماعت اور پھر لقب بھی وہ اختیار کیا جو لقب ہی کے طور پر حدیث میں مذکور ہوا ہے نہ کہ محض نسبت کے طور پر فما احسن فقههم و احسن بدرایتهم پس جس طرح حدیث کی اس نسبت "اہل حدیث" سے "اہل قرآن" کی نفی نہیں ہوتی اور اہل قران کے لفظ سے اہل حدیث کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اہل حدیث کے لفظ سے آخر اہل السنّت والجماعت کے لقب کی یا ان کے مسلک فقہ کی یا اس کے لوازم اجتہاد و تقلید کی نفی کیسے ہو جائے گی اور حدیث کی یہ مراد ہی کب ہے کہ اہل حدیث یا اہل قرآن کے لقب کو بمقابلہ لقب اہل السنّت والجماعت استعمال کیا جائے؟ نہیں بلکہ سوچا جائے کہ اگر فرقہ ناجیہ کے لقب (اہل السنّت والجماعت) سے نسبت محض اہل حدیث یا اہل قرآن کی نفی کی جاتی تو موقع بھی تھا لیکن نسبت محض کے عنوان سے ایک جماعتی لقب کے عنوان کی نفی کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے جبکہ وہ منصوص بھی ہو۔ بہر حال اہل السنّت والجماعت بحمد اللہ فرقہ ناجیہ ہے۔ فرقہ ضالہ نہیں۔ اس کا لقب شرعی ہے بدعت نہیں۔ اس کے دستور العمل کا لقب (فقہ) منصوص ہے' اختراعی نہیں۔ اس لئے اگر یہ شرعی جماعت اپنے شرعی مسلک کے مسائل کو بنام فقہ ایک جگہ مرتب اور جمع کر دے تو اس میں ملامت کی کیا بات ہے؟ چنانچہ آئمہ مجتہدین کے فقہیات مرتب ہوئے اور اپنی اپنی جگہ کروڑوں مسلمانوں کے لئے دستور العمل بنے ہوئے ہیں اور کبھی بھی امت نے ان کو ذریعہ مطاعن و ملامت نہیں بنایا۔

بلکہ ہر طبقہ نے امت کی اس محنت کی قدر کی اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ ساتھ ہی اسے قرآنی معجزہ کی حجت سمجھا کہ اس کے ذریعے سے قرآن کے علوم سربستہ جو اس کے اعجاز کی روح اور وجوہ اعجاز کا اہم جزء تھے' کھل گئے اور کتاب و سنت کے جوامع کلم کی اعجازی بلاغت و جامعیت نمایاں ہو گئی۔

تقلید شخصی اختلافی مسائل میں ناگزیر ہے

بہر حال جب کہ یہ واضح ہو گیا کہ اجتہاد مشروع' ان کا مجموعی ذخیرہ فراہم کیا جانا شرعی چیز' اس کا نام رکھنا شرعی بات اور ان سارے اجتہادات میں غیر مجتہد کے لئے تقلید ناگزیر اور ساتھ ہی یہ کہ ہر اجتہادی مسئلہ میں دو آراء کا ہونا ممکن اور دائرہ شرع میں داخل بلکہ مستحسن اور مطلوب ہے۔ تو یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے اختلافی مسائل میں پھر تقلید شخصی بھی ناگزیر طریقہ پر ضروری ہو کیونکہ ایک مسئلہ دو متضاد جانبین میں دائر و سائر کبھی رہ ہی نہیں سکتا' نہ اعتقاداً نہ عملاً آخر ایک ساعات میں ناسخ و منسوخ' راجح و مرجوح' اولیٰ غیر اولیٰ' حقیقت و مجاز' مشترک' موول' واجب اور مکروہ' فرض اور حرام پر عمل یا اعتقاد کیسے سمجھ میں آسکتا ہے؟ چار و ناچار ایک ہی

جانب کا اختیار کرنا پڑے گا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس غیر مجتہد کو اختلافیات میں کسی ایک ہی مجتہد کی تقلید کرنا پڑے گی۔ حتی کہ اگر ایک مسئلہ میں ایک امام کی تقلید ہو اور دوسرے میں دوسرے کی تو میں کہوں گا کہ جس مسئلہ میں بھی کسی کی تقلید ہوئی ایک کی ہوئی اور وہی تقلید شخصی پھر باقی رہی۔ زیادہ سے زیادہ امام کئی ہو گئے۔ مگر ہر ہر مسئلہ میں امام ایک ہی رہا اور تقلید بھی واحد ہی کی رہی۔ یہ تو نہ ہوا کہ کسی ایک مسئلہ میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی۔ تقلیدات متعددہ ہو گئیں امام متعدد ہو گئے مگر جس میں بھی جس امام کی تقلید واقع ہوئی وہ رہی شخصی ہی۔ یا اگر ایک شخص ایک مسئلہ میں صبح کو ایک امام کا مقلد ہے اور اسی مسئلہ میں شام کو دوسرے کا، جبکہ وہ دونوں مختلف الرائے بھی ہیں۔ تو میں عرض کروں گا کہ اب بھی وہ تقلید شخصی ہی رہی کیونکہ جس صبح کو اس نے ایک امام کی تقلید کی تو اس صبح کو وہ یقیناً دوسرے امام کے نظریہ سے ہٹا ہوا اور اس کے عمل سے الگ تھلگ۔ شام کو جب اس نے دوسرا امام اختیار کیا، تو یقیناً صبح کا مذہب اور صبح کا امام بھی بدل دیا۔ اس لئے صبح کو تقلید شخصی ہی کی اور شام کو بھی تقلید شخصی ہی رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں تقلید شخصی کے سوا عقلاً کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ خواہ کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تقلید شخصی میں کونسی مذموم ہے اور کونسی مستحسن؟ مگر مختلف فیہ مسائل میں کوئی نوعیت ہی لی جائے تقلید شخصی کے سوا عامی کے لئے اور تحقیق شخصی کے سوئی مجتہد کے لئے کوئی چارہ کار نہیں جس کا راز یہ ہے کہ عقلاً آدمی بیک وقت نقیضین میں دائر وسائر کبھی نہیں رہ سکتا۔ نیز دین میں شرعاً تناقض غیر ممکن ہے۔

جو بھی کسی ایک جانب کو اختیار کرے گا خواہ وہ مجتہد ہو جو فقہی نظریہ سے علماء کی ایک جانب کو بڑھا ہے یا وہ مقلد ہو جو اعتقاداً و عملاً مسئلہ کی ایک جانب کو اختیار کر رہا ہے وہ ناگریز ہے کہ اس مسئلہ کی دوسری جانب کو ترک کرے ورنہ وہ اور اس کا دین تناقض کا شکار ہو جائے گا۔ جو عقلاً و شرعاً محال ہے جس کی دین میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ہاں اس کے نظائر ملیں گے کہ ایک جانب سے رجوع کر کے دوسری جانب اختیار کر لی جائے۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں پہلی جانب کو ترک کرنا پڑے گا۔ اور وہ تقلید شخصی یا تحقیق شخصی پھر آجائے گی۔ غرض یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نقیض کو مانتے ہوئے دوسری نقیض بھی مانی جائے یا ایک کے زیر عمل ہوتے ہوئے دوسری بھی معمول بن جائے۔

تقلید شخصی کونسی مطلوب ہے اور وہ کیوں ضروری ہے؟

رہا یہ کہ ان ساری شخصی تقلیدات میں مطلوب کونسی

تقلید ہے یا عقلاً اور نقلاً قابل قبول بلکہ قابل وقوع کونسی ہے؟ سو اس کے متعلق اگر انصاف سے غور کیا جائے تو صرف ایک ہی صورت معقول ہو سکتی ہے کہ عمل کے دائرہ میں ایک ہی فقہ کے تمام مسائل پر عمل کیا جانا یا بالفاظ دیگر کل مسائل اجتہادیہ میں ایک ہی امام کی تقلید کیا جانا ضروری ہے کیونکہ علمی نظر میں یہ غیر ممکن ہے کہ اجتہادیات میں تقسیم کر کے بعض مسائل میں ایک امام کی اور بعض میں دوسرے کی تقلید کی جا سکے۔ بلکہ جس فقہ کو بھی اختیار کیا جائے گا اسے پورے ہی کو اختیار کرنا پڑے گا ورنہ وہی تناقض محال کسی نہ کسی جہت سے سر پر پڑ جائے گا۔ بعض مسائل میں جزئیات تناقض نمایاں ہوگا۔ بعض میں ان جزئیات کے مبادی اور تعلقات کا تناقض رونما ہوگا اور بعض میں ان جزئیات کے کلیات اور اصول میں تناقض پیدا ہو جائے گا کیونکہ۔۔۔۔

(۱) بعض مسائل اجتہادیہ تو وہ ہیں کہ خود ان ہی میں کھلا تناقض ہوتا ہے جسے ایک عامی سے عامی آدمی بھی پہچان سکتا ہے۔ مثلاً مس مراۃ (عورت کا چھودینا) کہ حنفیہ کے یہاں ناقص وضو نہیں اور شوافع کے یہاں ہے یا خارج من غیر السّبیلین شوافع کے یہاں ناقص وضو نہیں اور حنفیہ کے یہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک کھلا ہو تناقض ہے جو حکم کے لحاظ سے بھی ہے اور بناء حکم یعنی دلائل وغیرہ کے اعتبار سے بھی۔ پس ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ وہ ان مسائل کی ان دو متناقض جہات کو متناقض مانتے ہوئے بیک وقت نہ دونوں پر عمل کر سکتا ہے نہ دو اعمال کے درمیان دائر سائر رہ سکتا ہے کہ دین میں ایسے تناقض کی کوئی حجت اور کوئی نظیر ہی موجود نہیں الا یہ کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے دو متناقض باتوں میں صراحۃً امت کو خیار دیدیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں دو فقہیات یا دو فقہا میں دائر سائر رہنا کھلا تناقض قبول کر لینا ہے گویا دو متعارض چیزوں کو بیک وقت حق جان کر قابل عمل ماننا ہے جو عقلاً بھی باطل ہے اور شرعاً بھی محال ہے اس لئے ناگریز ہے کہ اس قسم کے مسائل میں ایک عامی آدمی کھلے طور پر مسئلہ کی ایک ہی جانب اختیار کر کے ایک ہی امام کی تقلید پر مجبور ہوگا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مسئلہ کی دو متخالف جانبین میں سے ایک وقت ایک پر عمل کیا جائے اور دوسرے وقت دوسری پر۔ یا ایک امام اور ایک فقہ کا پابند رہتے ہوئے اسی نوع کے کسی ایک آدھ مسئلہ میں دوسرے امام کی تقلید کر لی جائے اور جبکہ اس مسئلہ کی وہ جانب ہی چھوڑ دی جائے گی جو اپنے امام کی اختیار کردہ تھی اور صرف وہی جانب لی جائے گی جو دوسرے امام کی مختار ہے تو اس میں وہ مذکور تناقض حکم بھی پیدا نہ ہوا اور ایک امام کی تقلید سے بھی آدمی باہر نہ ہوا کہ بہر حال اکثر و بیشتر بلکہ تقریباً کل ہی مسائل میں بجز اس ایک آدھ مسئلہ کے اپنے ہی امام کی تقلید موجود ہے تو ایسی معدودے چند جزئیات میں دوسرے امام کی تقلید کرنے میں کیا حرج ہے؟ مثلاً ایک حنفی تمام مسائل

فقہیہ میں حنفی رہتے ہوئے مفقود کے مسئلہ میں مالکیہ کے مذہب پر عمل کرنے لگے اور حنفیہ کا مسلک اس بارے میں ترک کر دے تو اس میں وہ تناقض یا جمع بین الضدین کب لازم آیا جس سے بچنے کے لئے دو تقلیدیں غیر معقول سمجھی گئی تھیں لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو تناقض اب بھی موجود ہے اس خاص جزئیہ میں نہیں تو اس کے مبادی اور متعلقات میں موجود ہے وجہ یہ ہے کہ ہر ایک امام جب کسی مسئلہ میں کوئی اجتہادی رائے قائم کرتا ہے تو اس کے سامنے اس باب کے تمام مسائل کا ایک سلسلہ متحضر ہوتا ہے اور وہ اپنے مخصوص ذوق اور اصول سے ان تمام مسائل باب میں ایک خاص تناسب محسوس کرتے ہوئے اور اپنے ذوق اجتہاد سے اسی تناسب کو قائم رکھ کر اس باب کے تمام مسائل کی کڑیاں جوڑتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے امام کی ذوقی نظر میں بھی مذکورہ تناسب کا مذہبی رنگ قائم ہو بلکہ وہ تناسب و توازن کا کوئی اور رنگ لئے ہوئے ہو جو اس رنگ سے بالکل جداگانہ ہو اس لئے اگر ایک امام کا مقلد کسی ایک مسئلہ میں بھی دوسرے امام کی تقلید کرے گا تو اس خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اس کے ہم رنگ اور مبادی دوسرے مسائل میں تناقض رونما ہوگا اور اس نئے مقلد کے سر ان متعلقات مسائل کی تقلید بھی لازم آجائے گی جن میں تقلید کا اس نے ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ مفقود کے مسئلہ میں یہی صورت ہے کہ مالکیہ کے یہاں چار سال میں تفریق اس پر دائر ہے کہ ان کے یہاں اکثر مدت حمل چار سال ہے اس لئے چار سال تک براءۃ رحم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ نیز چار سال کے بعد اعسار بھی موجب تفریق ہو جاتا ہے لیکن فقہ حنفی میں اکثر مدت حمل دو سال سے زائد نہیں اور اعسار موجب تفریق نہیں پس مفقود کے اعتبار سے چار سال پر تفریق کا فتویٰ دیا جانا گویا مدت حمل بھی چار سال مان لینا اور اعسار پر تفریق کا ترتب کر لینا ہے حالانکہ یہ حنفی بحیثیت حنفی ہونے کے اکثر مدت حمل دو سال مانے ہوئے ہے جس سے ابھی تک منکر نہیں اور اعسار کو موجب تفریق ہی نہیں کہتا

پس وہ مسئلہ مفقود کے معانی میں حنفی بھی ہے اور مالکی بھی ہے۔ دو سال کا بھی قائل ہے اور چار سال کا بھی، تفریق اعسار کا بھی قائل ہے اور عدم تفریق کا بھی قائل ہے اگر نفس مسئلہ مفقود کے فتویٰ میں وہ گرفتار تناقض نہ ہوا تو اس کے مبانی اور متعلقات میں ہو گیا جس کے رفع ہونے کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ہر مسئلہ میں حنفی رہے یا ہر مسئلہ میں مالکی بن جائے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ نہ ایک مسئلہ کی دو جانبین میں دائر رہے نہ ایک مسئلہ کے دو اجتہادی پہلوؤں میں دو وقتوں میں دائر رہا جائے بلکہ دو باب کے الگ الگ مسائل میں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو دو اماموں کی تقلید کی جائے مثلاً فروع صلوٰۃ میں ایک امام کے اجتہاد پر عمل کیا جائے اور فروع حج میں مثلاً دوسرے کے اجتہاد پر تو اس میں بظاہر تناقض کی بھی کوئی صورت پیدا

نہیں ہوتی اور تقلید شخصی کی مصیبت سے بھی نجات مل جاتی ہے۔۔۔۔۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو اس صورت میں گو جزئیاتی تعارض نہیں مگر اصول اور کلیاتی تعارض سے یہاں بھی مفر نہیں ہو سکتا کہ کیونکہ ہر امام کے اصول استنباط الگ الگ ہیں جو اس کے فطری مذاق اور افتادِ طبع سے سرزد ہوئے ہیں۔ اس لئے وہی رنگ اس کے پورے فقہ میں رچا ہوا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح شرائع میں انبیاء کا رنگ سمایا ہوا ہوتا ہے۔ ایک شریعت جبکہ نبی کے دل و دماغ سے ہو کر ظہور پذیر ہوتی ہے تو نبی کا فطری رنگ شریعت میں جھلکنا ناگزیر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی شان جلالی تھی تو شریعت کے احکام میں بھی تشدد اور شدت غالب ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی شان جمالی اور رافت و رحمت کی تھی تو ان کی شریعت میں بھی لین (نرمی) کا غلبہ ہے۔ حضور اقدس ﷺ کی شان جامع شئون تھی جن کا غالب رنگ عدل و اعتدال اور رحمت و یسر تھا تو شریعت محمدی کے ہر ہر مسئلہ میں یہ جامعیت اور مظاہرہ عدل و رحمت بھی نمایاں ہے۔۔۔۔ غرض مذہب کے اصول و فروع میں صاحب مذہب کی فطری ذہنیت کا الگ رنگ اس لئے جھلکنا ضروری ہے کہ یہ تمام الہامی اصول و فروع اسی ذہنیت کے راستے سے گزر کر آتے ہیں۔ اس لئے باوجود دین انبیاء کے واحد ہونے کے ہر نبی کی شریعت کا ایک ممتاز رنگ ہے اور اس کے کمالات و کرامات کا ایک خاص لون ہے جو دوسروں میں نہیں۔۔۔ اور اس رنگ کے ماتحت اس کے تربیت یافتوں میں بھی وہی رنگ سرایت کرتا ہے جو مقتداء اعظم کا ہوتا ہے چنانچہ مختلف امم کی شئون اور آثار و خواص بالکل ممتاز اور باہم متخالف بھی ہیں اور اپنے اپنے نبی کی شئون کا مظہر اتم بھی ہیں۔ اس کی مثال ایسی سمجھئے جیسے ایک دریا باوجود ایک ہونے کے جس جس خطہ زمین سے گزرتا ہے اس کی خصوصیات اور وہاں کی ہواؤں کے مخصوص اثرات لیتا جاتا ہے اور اس کے سیراب ہونے والوں کے مزاج میں بھی وہی کیفیت سرایت کرتی ہے۔

پس شرائع تکلیفیہ کی طرح ہی شرائع وضعیہ (اجتہادی مسالک) بھی وجود متحد الاصول ہونے کے جس امام کے دل و دماغ سے گزر کر باجود کا جامہ پہنتی ہیں اس کا ذوق رنگ لئے ہوئے ہوتی ہیں اور اس کے ذوق سے نکلے ہوئے اصول استنباط سے مستنبط ہوتی ہیں۔۔۔۔ پس اس مجتہد کا پورا فقہ اور فقہ کے سارے ابواب اسی ایک رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو انجام کار ان عملی جزئیات کے واسطہ سے اس فقہ کے ہر متبع میں سرایت کرتا ہے۔ گویا اس فقہ کے تربیت یافتوں کی ذہنیت بھی اسی رنگ کی ہو جاتی ہے جو اصلی مربی اور بانی فقہ کی ہوتی ہے۔ مثلاً کسی مجتہد کے مزاج میں توسیع کا غلبہ ہے اور کسی کے مزاج میں احتیاط کا۔۔۔ کسی میں شدت ہے اور کسی میں لین۔۔۔۔ کسی میں جمعیت کا غلبہ ہے اور کسی میں جامعیت کا۔۔۔۔ کسی میں دیانات کا وفور ہے اور کسی میں اس کے ساتھ سیاست و نظم اور اجتماعیات کا بھی اعلیٰ شعور ہے۔۔۔۔ کسی میں ظاہریت کا غلبہ ہے۔۔۔۔ اور کسی میں باطنیت کا۔۔۔۔

کسی میں تأسی یا اسوۃ السلف کا غلبہ ہے۔۔۔۔اور کسی میں رجحانات کے تتبع واستقراء کا۔ ظاہر ہے کہ جہاں ظاہریت غالب ہوگی وہاں سب سے بڑا مرجح ظواہر روایت ہوں گے اور جہاں باطنیت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح بواطن روایت یعنی درایت ہوگی، جہاں تأسی کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح تعامل سلف ہوگا اور جہاں شرعی جمہوریت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح سلف کی اکثریت ہوگی۔ بہر حال جس امام کی جو بھی ذہنی خصوصیات ہوں گی وہی اس کے اصول استنباط سے چھنیں گی اور پھر وہی خصوصیات ان اصول کے ماتحت مستبط شدہ جزئیات سے بھی مترشح ہوں گی اور ان ہی خصوصیات کا خاص رنگ بالآخر ان افراد کی تربیت کرے گا جو اس فقہ پر عمل ہوں گے۔

حاصل یہ ہے کہ ایک فقہ کا مقلد بظاہر تو جزئیات فقہ کی تقلید کرتا ہے لیکن بنظر حقیقت وہ ان اصول کی تقلید کرتا ہے جن سے وہ فقہ بنتا ہے اور اسے راہ عمل پر حقیقۃً وہ کلیات چلاتی ہیں جو ان جزئیات فقہیہ کو بروئے کار لاتی ہیں۔

پس اگر دو فقہوں پر چلنے والا مثلاً ایسی جزئیات کا انتخاب کرے جو بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نہ ہوں اور دونوں فقہوں کی تقلید ان غیر متعارض جزئیات میں شروع کر دے تو گو وہ جزئیاتی تناقض میں گرفتار نہ ہو مگر در حقیقت اس کلیاتی تناقض کا شکار بنے گا جو ان جزئیات کی تشکیل کی ضامن ہیں اور ان میں رچی ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب وہ اصولاً متناقض اور ذوقاً متخالف ہیں تو اس مقلد میں بھی یقیناً دو ذوقی رنگ اپنے تناقض سمیت بھرے جائیں گے۔ اندریں صورت ناگزیر ہے کہ باطنی طور پر اس کے روحانی مزاج میں فساد پیدا ہو اور وہ متضاد اثرات کی کشاکش کا شکار ہو کر پراگندہ حال بن جائے اگر فی الحال تناقض مضر ہے اور وہ جزئیات کو ناقابل عمل بنا سکتا ہے تو وہی تناقض کلیات کو ناقابل نظر کیوں نہیں بنادے گا؟

اور جبکہ عمل نظر کے تابع ہے تو بالواسطہ اس کے عمل میں مفاسد پیدا ہوں گے جو بعد چندے ظاہر ہونے لگیں گے۔

ائمہ کے اختلاف مذاق سے پیدا شدہ مختلف اصول

ائمہ کے اس اختلاف مذاق کو امثلہ سے واضح طور پر سمجھنے کے لئے اس پر غور کیجئے کہ مثلاً تعارض روایات کے وقت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق اور اس سے پیدا شدہ قوت سند ہے وہ روایات متعارضہ میں عموماً قوت سند کے معیار سے ترجیح دیتے ہیں۔ پس جس حدیث کی سند اصول روایت کر کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہوگی وہ اسی روایت کو اپنے مذہب کی اساس قرار دے کر دوسری ضعیف السند روایات کو جو اس کے خلاف ہیں یا ترک کر دیں گے یا مرجوح قرار دیں گے یا اس کی کوئی توجیہ کریں گے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دار الہجرۃ کا ایسی صورت میں سب سے بڑا اصول

تأسی باسوۃ السلف ہے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان دو متخالف روایات میں اہل مدینہ کا تعامل کس طرف ہے۔ یہ تعامل جس روایت کے ساتھ ہوگا وہ اختلافی مسائل میں اسی روایت کو اپنے مذہب کی اساس قرار دیں گے اور بقیہ روایات کو ترک کر دیں گے ان کی کوئی توجیہہ کریں گے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق اور اصول معیار ایسے اختلافی مواقع پر رجحانات سلف کا تتبع ہے کہ کثرت سے فتاویٰ صحابہؓ و تابعینؒ کس طرف ہیں۔ جدھر بھی یہ صورت ہوگی وہ اسی روایت کو مذہب کی اصل قرار دے کر بقیہ روایات کا اسی سے فیصلہ کر دیتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کا مذاق اور اس سے پیدا شدہ اصول ایک خاص جامعیت کے ساتھ تطبیق و توفیق بین الروایات ہے۔ یعنی وہ ایکباب کی تمام متعارض روایات کو جو قابل احتجاج ہوں بیک دم سامنے لا کر ان کے مجموعہ سے شارع علیہ السلام کی غرض وغایت کا پتہ چلاتے ہیں اور نور اجتہاد سے یہ دیکھتے ہیں کہ آخر اس مسئلہ سے شارع کا منشاء کیا ہے۔ یہ منشاء جس روایت میں زیادہ واضح ہوتا ہے اس کو مذہب کی اساس قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ سنداً کچھ ضعیف ہی ہو اور بقیہ روایات کو اس طرح اس کلی غرض وغایت سے جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ وہ ساری روایات اپنے اپنے محل پر چسپاں نظر آنے لگتی ہیں اور واضح ہوتا ہے کہ تمام روایات میں مسئلہ ایک ہی ہے مگر کسی روایت میں اس کا حکم ہے کسی میں اس کی حکمت ہے اور کسی میں اس کی کیفیت ہے اور کسی میں اس کی کمیت ہے، کسی میں اس کی اصلیت ہے اور کلیت ہے اور کسی میں اس کے احوال و عوارض ہیں۔

غرض روایات کو غرض شارع کے سلسلہ سے ترتیب وار جوڑ کر انہیں جمع کر دینا امامؒ کا اصل اصول ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کلام پیغمبر کا ہر گوشہ تا بحد امکان زیر اعمال آجائے زیر اہمال نہ رہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے تفقہ کی چند امثلہ

مثلاً صوم سفر کے سلسلہ میں مختلف احادیث وارد ہوئیں کسی حدیث میں نمایاں ہے کہ سفر میں صوم افضل ہے افطار سے۔ چنانچہ حمزہؓ ابن عمرو اسلمی کی روایت ہے کہ جب انہوں نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! سفر میں روزہ رکھنا گناہ ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا۔

هی رخصة من الله عزوجل فمن اخذبها فحسن و من احب ان یصوم فلاجناح علیه۔ (مشکوٰۃ)

"افطار کرنا اللہ کی طرف سے رخصت ہے جو اسے اختیار کرے گا تو یہ خوبی کی بات ہوگی اور جو روزہ رکھنا پسند کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں"۔

اس حدیث میں افطار کو رخصت فرما کر اس کو حسن فرمایا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ عزیمت

روزہ ہی رکھنا ہے مگر جائز افطار بھی ہے۔ بعض روایات سے واضح ہوتا ہے کہ افطار افضل ہے صوم سے۔۔۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ کسی غزوہ میں بزمانہ رمضان ہم سب حضورؐ کے ساتھ تھے کہ حضورؐ نے ایک ہجوم دیکھا کہ ایک شخص پر سایہ کیا جارہا ہے۔ فرمایا یہ کہ ہے؟ عرض کیا گیا کہ ایک روزہ دار کی حالت گرمی سے بہت بگڑ رہی ہے۔ فرمایا۔

لیس من البرّ الصیّام فی السّفر۔ (مشکوٰۃ کتاب الصوم)

"سفر میں روزہ رکھنا کوئی خوبی نہیں"۔

دوسری حدیث میں ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک سفر میں ہم حضورؐ کے ساتھ تھے۔ کچھ لوگ روزہ دار تھے، کچھ بے روزہ، منزل پر پہنچ کر روزہ دار تو بے دم ہو کر گر پڑے اور بے روزہ لوگوں نے کام کئے، خیمے گاڑے، جانوروں کو پانی پلایا تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

ذهب المفطرون بالاجر۔ (مشکوٰۃ)

"بے روزہ لوگ اجر سمیٹ لے گئے"۔

اور بعض روایات میں صوم اور افطار میں تخییر معلوم ہوتی ہے کہ خواہ روزہ رکھ لو خواہ افطار کرلو، دونوں برابر ہیں۔ چنانچہ ان ہی حمزہؓ ابن عمرو اسلمی کی روایت ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ

ان شئت فصم و ان شئت فافطر۔ (مشکوٰۃ)

"بحالت سفر جی چاہے روزہ رکھ لو جی چاہے افطار کرلو"۔

امام احمدؒ و اوزاعیؒ نے حدیث انسؓ کو اختیار کر کے کہا کہ میں سفر میں افطار افضل ہے تو انہوں نے افضل صوم اور تخییر کی نفی کر دی۔ بعض افضلیت صوم کے قائل ہوئے تو انہوں نے افضلیت افطار اور تخییر کی نفی کر دی۔ بعض تخییر کے قائل ہوئے تو انہوں نے افضلیت افطار اور افضلیت صوم دونوں کی نفی کر دی اور معیار انتخاب روایات ان حضرات کے یہاں وہی حدیث کی سند کی قوت و ضعف یا تعامل مطابقت وغیرہ ہے۔ لیکن امام صاحبؒ نے اسی تطبیق و توفیق روایات کے ماتحت تینوں قسم کی روایات کو جمع فرما کر سب کو قابل عمل بنا دیا اور کسی ایک جہت کی نفی نہیں کی۔ انہوں نے نور اجتہاد اور ذوق تشریع سے دیکھا کہ ان مختلف روایات سے شارع علیہ السلام کی غرض مختلف احوال میں مختلف احکام دینا ہے نہ کہ ایک حکم سے دوسرے کی نفی کرنی ہے۔ پس حدیث تخییر کو تو مساوات فی الجواز پر محمول فرمایا کہ اس سے شارع کی غرض صوم و افطار دونوں کو بلا کراہیت جائز بتلانا ہے کہ نفس جواز صوم و جواز افطار میں کوئی تفاوت نہیں اور افضلیت صوم کی روایت کو اصل پر محمول فرمایا کہ بالذات صوم ہی افضل ہے کیونکہ رمضان زمانہ ہی صوم کا ہے اس میں افطار کسی طرح اصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اصلی افضلیت صوم ہی کو حاصل رہے گی جس کو اس روایت سے ظاہر فرمانا مقصود ہے اور

افضلیت افطار کی روایت کو عوارض پر محمول فرمایا کہ جب حالت پریشان کن ہو جائے اور روزہ رکھنے میں تعب حد اعتدال سے گزرنے کا خطرہ ہو تو پھر عارضی فضلیت افطار ہی میں ہے۔ پس تخییر ہوئی جواز میں۔ افضلیت صوم ہوئی اصلیت صوم اور وقت میں اور افضلیت افطار ہوئی احوال صائم میں اور ظاہر ہے کہ جب مسافر پر یہی تین احوال آسکتے تھے تو شارع نے تینوں حالات کا حکم بیان فرمادیا پس ان تین حالات کی تفسیر نے ساری روایات کو ایک نقطہ پر جمع کر کے ان کے تعارض کو اٹھادیا۔ تخییر بھی باقی رہی۔ افضلیت صوم بھی قائم رہی اور افضلیت افطار بھی ثابت رہی کسی ایک حکم سے دوسرے حکم کی نفی نہ ہوئی۔۔۔۔۔

پس امام صاحبؒ نے اس علم دقیق سے ساری احادیث کو جمع کر کے قابل عمل بنادیا نہ ان میں اور نہ کسی حدیث میں دور از کار تاویل و توجیہ کی ضرورت پیش آئی۔ یا مثلاً شک کے بارہ میں تین قسم کی احادیث وارد ہوئیں۔ ایک یہ کہ جب شک ہو جائے کہ کتنی رکعات پڑھی ہیں تو نماز کا اعادہ کرنا چاہئے

اذاشك احدكم فليستأنف

جب کسی کو نماز کی رکعات میں شک پڑ جائے تو نماز لوٹا لے"۔

دوسری یہ کہ بصورت شک نماز ہی میں تحری کرنی چاہئے یعنی اٹکل لگا کر غور کرنا چاہئے کہ کتنی رکعات ہوئیں۔ جدھر غلبہ ظن ہو اسی پر عمل رکنا چاہئے۔ چنانچہ عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت میں ہے۔

اذاشك احدكم في اصلوٰته فليتحرّ الصواب فليتمّ عليه الحديث

جب کسی کو تم میں سے نماز کی رکعات کے بارہ میں شک پڑ جائے تو اٹکل لگانی چاہئے۔

اور اسی پر (جو اٹکل میں غلبہ ظن سے دل میں آجائے) نماز پوری کر لینی چاہئے"۔

تیسری روایت میں ہے کہ جب شک ہو جائے اور اٹکل سے غلبہ ظن بھی کسی جانب سے حاصل نہ ہو کہ تین رکعت ہوئی ہیں یا چار تو جانب اقل کو اختیار کر کے اس پر نماز کی بناء کرو۔ تین اور چار میں اقل عدد تین کو ہونا بہر صورت یقینی ہوگا۔ اس لئے یقینی جہت لے لو۔ چنانچہ عطاء بن یسار کی حدیث میں ارشاد نبویؐ ہے کہ

اذا شك احدكم فی صلوٰته فلم يدركم صلّى ثلثاً اواربعاً فليطرح الشك وليبن على مااستيقن۔ (الحدیث مشکوٰۃ)

"جب تم میں سے کسی کو نماز کی رکعات کے بارہ میں شک پڑ جائے کہ تین رکعت پڑھی ہیں یا چار، تو شک کو چھوڑ کر جو جانب یقینی ہے (یعنی اقل) اسی پر بنا کرنی

چاہئے“۔

ان تینوں احکام میں سے ایک ایک کو ایک ایک مجتہد نے اختیار کر لیا ہے بعض نے شک کی صورت میں اعادۂ صلوٰۃ کا حکم اختیار کر لیا ہے تو انہیں قدرتی طور پر تحری (عمل بغلبہ ظن) اور بناءِ علی الاقل کی نفی کر دینی پڑی ہے۔ جمہور نے تحری اور غلبہ ظن کا اعتبار کیا ہے تو انہیں استیناف اور بناء اقل کا حکم ترک کر دینا پڑا ہے لیکن جب کہ یہ تینوں صور۔۔۔۔ حدیث میں آچکی ہیں تو امام صاحبؒ نے اسی جمع بین الروایات کے اصول کے ماتحت تینوں احکام کو بیک دم اختیار کر کے تینوں قسم کی روایات کو جمع فرمادیا۔ اگر عمر میں پہلی بار شک پڑا تو اس کے لئے اعادہ صلوٰۃ کا حکم ہے کیونکہ بار بار کے شک اور اعادہ سے جب شک کا وقوع عادۃً ہے نماز وبال جان ہو جائے گی جو تیسیر دین کے خلاف ہے اور حرج شرعاً مدفوع ہے اگر ایک سے زائد بار شک پڑنے لگے تو تحری کا حکم ہے کہ غلبہ ظن پر عمل کیا جائے اور اگر غلبہ ظن کسی جانب نہ ہو بلکہ دونوں جانبین میں شک مساوی رہے تو جانب اقل کو اختیار کیا جائے جو یقینی ہے۔ اس صورت میں اعادہ صلوٰۃ۔ تحری اور بناء اقل تینوں حکم جمع ہو گئے اور روایات میں کسی کا رد اور کسی کا قبول لازم نہ آیا جس کی فقہی روح یہ ہے کہ شک ہو جانے پر اعادۂ صلوٰۃ، تحری، اختیار اقل در حقیقت حصول یقین اور دفع شک کے لئے ہیں اور ظاہر ہے کہ بالکل ابتدائی شک میں جو ایک مرض ناآشنا کی طرح نماز میں طاری ہوئی حصول یقین اعادہ صلوٰۃ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے کہ پچھلی مشکوک نماز ترک کر دی جائے۔ کیونکہ جس کے لئے شک کا مرض ہی نیا ہے وہ ابتداءً ہی اس کے علاج پر غور کر سکتا ہے۔ ہاں بار بار کے شک میں جبکہ عادۃً اس کی حقیقت کھل گئی اور وہ عادت بھی بن گئی۔ نماز میں رہتے ہوئے بھی اس کا علاج ممکن ہو گیا اور وہ تحری اور اٹکل سے غلبہ ظن معلوم کر لینا ہے جدھر بھی غلبہ ہو گیا خواہ تین رکعت کی طرف یا چار کی طرف۔ پس امام صاحب کے طریق کے مطابق حدیث کے یہ تینوں احکام ایک دوسرے کی نفی اور تردید کے لئے نہیں رہتے بلکہ مختلف حالات کے مختلف احکام بن جاتے ہیں جن میں نہ تعارض ہے نہ تدافع اور تینوں احادیث اپنی اپنی جگہ چسپاں ہو کر قابل عمل ہو جاتی ہیں۔ غرض امام صاحبؒ کا ذوق اجتہادیات میں یہ ہے کہ تا بحد امکان ہر حدیث زیر اعمال آئے۔ زیر اہمال نہ رہے۔ اس لئے وہ عامۃً متعارض روایات میں سند کی قوت وضعف کے معیار سے ترجیح وانتخاب کی صورت اختیار نہیں فرماتے کہ اس میں کسی نہ کسی جہۃ سے ترک حدیث یا ترک عمل بالحدیث لازم آجانا یقینی ہو جاتا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ضعیف سے ضعیف حدیث بھی ترک ہو۔ جس کی صورت انہوں نے یہی اختیار فرمائی کہ ایک باب کی تمام احادیث سے وہ پہلے شارع کی غرض وغایت کا سراغ لگاتے ہیں اور پھر اسی بنیادی غرض پر تمام احادیث کو دائر فرمادیتے ہیں۔ متعارض روایات میں امام صاحبؒ کی اس تطبیق اور جمع بین الروایات اور دوسرے

حضرات ائمہ کی ترجیح و تعلیل روایات کی امثلہ بکثرت ہیں جن سے فقہ حنفی بھرا پڑا ہے۔ نمونہ کے طور پر دو مثالیں جو اس وقت سامنے آ گئیں عرض کی گئیں۔

اس طولانی بحث سے غرض یہ ظاہر کرنا ہے کہ اصول اجتہاد ائمہ کے فطری مذاق کا رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ طبیعت میں جامعیت ہے تو اصول بھی جامعیت کے وضع ہوں گے۔ طبیعت میں ظاہریت ہے تو اصول میں بھی ظاہریت کا رنگ رہے گا اور طبیعت میں تاسی بالاسوہ کا مذاق ہے تو اصول میں بھی وہی رنگ نمایاں ہوگا اور ان ہی اصول پر مجتہد کا پورا فقہ مرتب ہوتا ہے جس سے متبعین فقہ اور مقلدین کی ذہنی اور عملی تربیت ہوتی ہے۔ پس اصول میں تخالف ہوگا تو مقلد کی ذہنیت پر عملی جزئیات کا اثر بھی متضاد ہی پڑے گا۔ گو ابتداء سے کوئی جزئیاتی تخالف اور تضاد محسوس نہ ہو کیونکہ یہ غیر ممکن ہے کہ مربوب میں سامان تربیت اثر انداز نہ ہو یا مثلاً متعارض روایات میں امام صاحب کا ایک خاص اصول یہ بھی ہے کہ وہ کسی باب کی ایسی حدیث کو جو کلیہ اور ضابطہ عامہ کا رنگ لئے ہوئے ہو اصل قرار دے کر اس باب کے جزئی افعال کو جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہوں اور اس کلیہ کے خلاف پڑتے ہوں اس کلیہ کے تابع کرتے ہیں کلیہ کو افعال جزئیہ کے سبب توڑنا پسند نہیں کرتے کہ وہ معلوم السبب اور معلوم العلت ہے اور افعال جزئیہ واقعہ حال ہوتے ہیں جن میں کوئی عموم نہیں ہوتا کلیہ کو اصلیت پر باقی رکھ کر ان جزئی واقعات کی کوئی ایسی توجیہ فرما دیتے ہیں کہ وہ اس کلیہ کے مخالف نہ رہیں بخلاف دوسرے آئمہ کے کہ وہ ان جزئیات کی محض سندی قوت دیکھ کر ان سے کلیہ کی تخصیص کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً آداب خلاء کے سلسلہ میں ابوایوب انصاریؓ کی حدیث میں ایک کلیہ ارشاد فرمایا گیا۔

اذا اتیتم الغائط فلاتستقبلوا القبلة ولا تستدبروها ولکن شرقوا اوغربوا. (بخاری و مسلم)

"جب تم استنجاء کے لئے جاؤ تو نہ قبلہ رخ ہو کر بیٹھو اور نہ قبلہ پشت ہو کر لیکن شرقاً غرباً بیٹھو (تاکہ قبلہ بغل میں رہے)"۔

یہ ایک حکم عام ہے جس میں استقبال و استدبار کو کسی مکان کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا کیونکہ یہ حکم عظمت بیت اللہ کے سلسلہ میں دیا گیا ہے تاکہ افعال خسیسہ کے وقت قبلہ کا استقبال و استدبار نہ ہو کہ وہ صورت توہین بیت اللہ ہے اور تعظیم بیت اللہ فی نفسہٖ حسن اور ہر زمان و مکان میں مطلوب ہے۔ چنانچہ حکم کی یہ علت ایک دوسری حدیث مین صراحتاً مذکور بھی ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے۔

اذا اتی احدکم البراز فلیکرم قبلة الله عزوجل فلا یستقبل القبلة.

(التعلیق الصبیح جلد اول صفحہ ۱۹)

"جب تم میں سے کوئی استنجاء کے لئے جائے تو چاہیئے کہ قبلہ الٰہی کا اکرام کرے اس کا استقبال نہ کرے یعنی قبلہ رخ ہو کر نہ بیٹھے"۔

پس جبکہ اکرام بیت اللہ کی علت سے بحالت بول و براز استقبال واستدبار قبلہ ممنوع تھا اور یہ علت فی نفسہٖ مطلوب ہونے کے سبب کسی قید سے مقید نہ تھی تو امام صاحبؒ نے مذہب کی اساس اس کلیہ کو قرار دے کر مطلقاً استقبال واستدبار کی حرمت کا فتویٰ دیدیا خواہ مکان ہو خواہ جنگل ہو بحالت قضاء حاجت استقبال قبلہ اور استدبار دونوں غیر جائز ہیں جس کیلئے اس حدیث کو بطور ایک کلی ضابطہ اور دستور العمل کے پیش فرمایا۔ مگر اس کلیہ کے خلاف حضور کے کچھ افعال ثابت ہوئے۔ چنانچہ حسب روایت بخاریؒ و مسلمؒ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ 'فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت حفصہؓ کے مکان کی چھت پر حضور کو قبلہ کی طرف پشت کئے ہوئے اور شام کی طرف رخ کئے ہوئے پیشاب کرتے خود دیکھا۔ امام صاحب نے اپنے ذوق خاص سے جن کا ذہن کلی انضباط اور تعلیمات کی طرف زیادہ دوڑتا ہے۔ اس جزئیہ سے متاثر ہوئے بغیر ضابطہ کلیہ کو اپنی جگہ برقرار رکھا اور اس جزئی واقعہ کی ایسی توجیہات فرمادیں کہ وہ اس کلیہ کے خلاف نہ رہے کیونکہ کلیہ کا حکم جس علت پر دائر ہے یعنی تعظیم بیت اللہ وہ مکان اور صحراء ہر جگہ موجود ہے تو اس کو کسی ایسے جزئی واقعہ سے کیوں توڑا جائے جس کی نہ علت کا پتہ ہے نہ سبب کا۔ لیکن دوسرے ائمہ نے جن کا ذہن تخصیصات کی طرف زیادہ چلتا ہے اس کلیہ کو اہمیت نہیں دی بلکہ امام شافعیؒ نے اس کلیہ کا ہم پایہ جزئیات کو بناتے ہوئے یا اس جزئی واقعہ سے کلیہ سابقہ کی تخصیص کرتے ہوئے فرمایا کہ استقبال واستدبار مکان میں جائز اور اور صحرا میں غیر جائز۔ امام احمدؒ نے فرمایا کہ استدبار ہر جگہ جائز اور استقبال ہر جگہ غیر جائز۔

بہر حال یہ اختلاف اسی اصول استنباط کے اختلاف کے تابع ہے کہ اور حضرات نے صرف حکم حدیث پر نظر فرمائی اور امام صاحب نے حکمت حدیث پر 'اوروں نے ظہر حدیث لیا اور امام نے بطن حدیث کو آگے رکھا اور شارع علیہ السلام کا یہ منشاء پا کر کہ اصل مقصود حرمت بیت ہے اسے ہی بنیاد قرار دیدیا اب جو روایت اس کے خلاف آئی اس کی وجہ سے بنیاد کو منہدم نہیں ہونے دیا بلکہ اسے ہی بنیاد سے جوڑ دیا۔ پس ایک مقلد جو اس مسئلہ میں امام کی تقلید کرے گا وہ در حقیقت ان اصول کی تقلید کرے گا جو ان مسائل میں سمائے ہوئے ہیں اور جبکہ ان میں تخالف ہے تو ان کی جزئیات میں بھی ہے یا مثلاً کہیں کہیں امام صاحب کسی ایک باب کے اصل موضوع کی روح پر مطلع ہوتے ہیں جو نصوص کتاب وسنت سے ان پر منکشف ہوتی ہے اور اس کو بنیاد قرار دے کر اس باب کی تمام روایات کے انتخاب کا معیار اسی روح کو قرار دیتے ہیں اور خلاف روایات کی ایسی توجیہ فرمادیتے ہیں کہ اس روح پر کوئی اثر نہ پڑے لیکن دوسرے ائمہ مثلاً اس باب کی روح دوسری سمجھتے ہیں تو احکام میں

اختلاف اس روح کے تفاوت سے پڑ جاتا ہے۔

مثلاً صلوٰۃ کے بارے میں جب فعلی اور ترک احادیث آتی ہیں تو امام صاحب اکثر و بیشتر ترکی احادیث کو اختیار کرتے ہیں اور فعلی احادیث کو ان کے تابع کرتے ہیں جیسے قراۃ فاتحہ خلف الامام اور ترک قرآۃ فاتحہ کی روایات میں ترک قراۃ کو' رفع یدین اور ترک رفع یدین میں ترک رفع کو' جہر آمین اور ترک جہر میں ترک جہر کو جہر بسم اللہ اور ترک جہر میں ترک جہر کو' نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو روکنے کے لئے جمع بین الاشارۃ والتسبیح کی بجائے ترک جمع کو اختیار فرمایا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ امام کے نزدیک نماز میں فعل پر ترک کو یا حرکت پر سکون کو ترجیح ہے۔ شاید اس بناء پر کہ امام کے نزدیک نمازی کی بناء سکون پر ہے حرکت پر نہیں اور یہ لطیفہ امام پر آیات و روایات اور نماز کے انداز تشریع سے منکشف ہوا۔ مثلاً نماز کی اصلیت کے بارہ میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ

"نماز بھاری ہے مگر خشوع والوں پر"۔

اور خشوع کی حقیقت سکون ہے جو اولاً قلب میں آتا ہے اور پھر قالب پر' پھر اسی کے ساتھ امام نے نماز کی رفتار تشریع پر نظر فرمائی ہو کہ اس میں بھی حرکت سے سکون کی طرف آئے مثلاً پہلے نماز میں نقل و حرکت جائز تھی بعد میں نص حدیث سے منسوخ ہوئی اور سکون آگیا' پہلے سلام کلام جائز تھا بعد میں بنص حدیث اس سے روک کر سکوت کا حکم دیا گیا' پہلے التفات (ادھر ادھر دیکھنا) جائز تھا بعد میں منسوخ ہو کر اس بارہ میں سکوت پیدا کر دیا گیا' اولاً نشہ کی حرکات کے ساتھ نمازیں جائز تھیں بعد میں انہیں منسوخ کر کے نماز میں سکون پیدا کر دیا گیا۔

بہر حال رفتار تشریع حرکت سے سکون کی طرف آنا تھا تو امام کے اس قلب صافی نے جو ایک اساسی رنگ تشریع سے مصبغ اور افتاد شریعت کا محرم راز تھا یہ اخذ کیا کہ نماز میں اصل چیز سکون ہے۔ للذا جتنا سکون ترقی کرتا جائے گا نماز کی حقیقت سے انتفاع زیادہ ہوتا جائے گا۔ شارع کی اس غرض کو پیش نظر رکھ کر امام کے نزدیک جب امام کے فعلی اور ترکی امور میں اختلاف و تزاحم واقع ہوا تو انہوں نے اس رفتار اور لون اجتہاد کے ماتحت جانب سکون کو ترجیح دی اور تمام وہ روایت اختیار کر لیں جو اس رنگ پر مشتمل تھیں کہ ان کے نزدیک یہی روایات غرض شارع سے زیادہ موافق تھیں۔ خواہ سنداً وہ کسی درجہ کی ہوں' مگر قابل احتجاج ہوں۔ لیکن اس کے برخلاف امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے فعلی اور ترکی روایات میں سے عموماً فعلی روایات کو ترجیح دی ہے۔ قراۃ فاتحہ کو اختیار کیا' رفع یدین کو ترجیح دی' جہر آمین کو منتخب فرمایا' جہر بسم اللہ کو اولیٰ کہا وغیرہ وغیرہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ نے نماز کی ہیئت کذائی پر غور کر کے اسے فعل سمجھا ہے اور جب وہ از قسم فعل ہے تو اس میں

افعال جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی اس کا حسن بڑھتا جائے گا۔

حج میں اس کے برعکس قصہ ہے۔ امام صاحبؒ نے دیکھا کہ حج کی عبادت ہی حرکت ہے گھر سے نکلنا' بیت اللہ کے گرد گھومنا' صفامروہ میں دوڑنا' عرفات کا سفر اختیار کرنا' منیٰ میں رمی جمار کرنا وغیرہ۔ غرض پوری عبادت ایک مستقل سفر اور متعدد انواع حرکات کا مجموعہ ہے۔ پس جتنے بھی افعال اور حرکات زائد ہوں گے' حج میں حسن پیدا ہوگا۔ اس لئے اس عبادت میں ان روایات کو ترجیح دی ہے جو کسی حرکت اور فعل پر مشتمل ہیں بخلاف امام شافعی رحمہ اللہ کے انہوں نے حج میں اس کے برعکس جانب سکون اور تقلیل حرکت کی جہت کو اختیار فرمایا ہے شاید اس لئے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک حج مظاہرہ محبت ہے اور محبت کا ثمر ربودگی اور ترک ہے۔ ترکِ وطن' ترک لباس' ترک زینت '' ترکِ خوشبو' ترک راحت' ترک لذت وغیرہ اس لئے اس عبادت میں جتنے تروک بڑھتے جائیں گے۔ مثلاً قارن کے حق میں امام صاحب کے یہاں دو طواف اور سعی ہے اور شوافع کے یہاں ایک طواف اور سعی ہے وہ تکثیر فعل کی طرف گئے اور یہ تقلیل فعل کی طرف۔ اس قسم کی صدہا امثلہ کُتبِ فقہ سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ بہر حال حجت احوال یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کی غائر نظر ہمیشہ اصول اور تہ کی طرف دوڑتی ہے اور وہ ہر مسئلہ کی لم اور اس کی اندرونی بنیاد تک پہنچ کر غرض شارع کا پتہ چلاتے ہیں۔ اسی باطنی غرض اور حکمت کے معیار سے روایات کے احکام کے درجات قائم کرتے ہیں اور ان میں تطبیق و توفیق دیتے چلے جاتے ہیں اسی لئے ان کے فقہ میں کلیات' تعمیمات اور ہمہ گیری بہت زیادہ ہے' دوسرے حضرات حکم دیکھتے ہیں اور اسی کو اصل قرار دے کر روایات پر نظر کرتے ہیں تو احکام میں تعداد اور تکثیر تو زیادہ ہوتی ہے مگر انضباط تسلسل اور ترتیب اس طرح کی نہیں آتی کہ ہر ہر جزئیہ کسی نہ کسی اصل اصل سے جڑا ہوا نظر آئے اور ہر ہر حکم کسی نہ کسی حکمت سے مربوط دکھائی دے۔

ظاہر ہے کہ تسلسل اور ترتیب میں انضباط ہوتا ہے اور دوسری صورت میں تکثیر احکام' اسی لئے فقہ حنفی میں ترتیب و تسلسل اور جامعیت واجتماعیت کا رنگ غالب ہے اور دوسری فقہیات میں تکثیر احکام اور تکثیر جزئیات کا رنگ غالب ہے اور کلیاتی دائرہ محدود ہے' ظاہر ہے کہ جب یہ مخصوص رنگ کے اصول اپنے اپنے فقہ کے تمام ابواب اور ساری ہی اجتہادی فروع میں رچے ہوئے ہوں گے گویا ایک فقہ کے سارے مسائل کی تشکیل یہ ایک ہی رنگ کے اصول کریں گے تو اس پوری فقہ کا ایک مزاج قائم ہو جائے گا جو اپنے امام کے ذہنی مزاج کے مطابق ہوگا۔ پھر وہی ذہنی مزاج ان کا بھی بنے گا۔ جو اس فقہ کی تقلید کریں گے' کیونکہ مربوب کی ذہنیت مربی ہی کی ذہنیت سے بنتی ہے۔ اس صورت میں دو فقہوں ہیں کی جزئیات خواہ کتنی ہی غیر متبائین ہوں اور بظاہر سطح تناقض سے کتنی ہی

بعید ہوں، مگر یہ ذوقی الوان اور اصول استنباط کا تناقض ان میں رچ کر انہیں اصولی طور پر متضاد بنا دے گا اور یہ میں عرض کر چکا ہوں کہ تقلید حقیقۃً جزئیات کے پردہ میں ان اصول کی ہوتی ہے جو ان جزئیات کو پردہ ظہور پر لاتے ہیں اور وہ متعارض ہیں تو وہی تضاد پھر باقی رہا جزئیاتی نہ سہی کلیاتی سہی اور جبکہ یہ اصول و کلیات ہی اصل میں محل تقلید ہیں تو خاص کی نظر میں یہ تضاد پھر باقی رہا۔ جزئیاتی نہ سہی کلیاتی سہی اور جبکہ یہ اصول و کلیات ہی اصل میں محل تقلید ہیں تو خاص کی نظر میں یہ تضاد اس سے اشد ہوگا جو جزئیاتی تھا کہ جزئیات تقلید کے بارہ میں اصل ہی نہ تھیں۔ یہ اصول ہی اصل تھے اور اصل کا فساد فرع کے فساد سے عقلاً و شرعاً مہلک تر ہوتا ہے۔

پس ایسے اصولی اختلاف کے ہوتے ہوئے دو فقہین کا بیک دم تقلید کیا جان کا بالفاظ دیگر ایک فقہ کی تربیت کے ہوتے ہوئے دوسرے فقہ کی تربیت کا رنگ اس پر چڑھایا جانا علاوہ تربیت کی دو عملی اور تضاد حالی کے ہر مربی امام کی تربیت کو ناقص اور نکما بنالینا ہے۔

مثلاً اگر امام ابو حنیفہؒ ان ہی اصول استخراج پر نماز کے ذریعہ سکون اور حج کے ذریعہ حرکت کا ذوق حامل فقہ میں راسخ کرنا چاہتے ہیں اور شافعیؒ اس کے برعکس اور اس ہر جائی مقلد نے نماز حنفی اصول پر پڑھ کر حج شوافع کے طریق پر کر لیا تو ذوق حرکت اسے کسی طرف سے بھی نہ مل سکے گا کیونکہ اس کی نماز تو ساکن رہا شافعی اصول پر۔ حالانکہ جو امام اپنے ذوق اجتہاد سے اس میں نماز کا سکون پیدا کرنا چاہتا تھا وہ اسی ذوق سے اس میں حج کی حرکت بھی راسخ کرنا چاہتا تھا رہی حنفی اصول پر اور حج ساکن کی حرکت بھی راسخ کرنا چاہتا تھا کہ اس مجموعہ ہی سے اس کے نزدیک مقلد کی ذہنیت میں صحیح توازن پیدا ہو سکتا تھا اور اسی میں اس کی روحانی فلاح تھی لیکن جبکہ اس مقلد نے آدھی تربیت ایک سے کرائی اور آدھی ایک سے اور وہ بھی دونوں جانبین کے سکون عبادت ہی کی جہت لے لی تو اول تو کسی امام کے رکن پر بھی اس کی تربیت مکمل نہ ہوئی اور جتنی ناقص بھی ہوئی وہ بھی دورخی مقام کی طرح ایک ہی جانب پر مشتمل رہی گویا یہ مقلد ناقص بھی رہا اور ایک جہت سمجھنے سے بھی خالی رہا اور اوپر سے کلیاتی تضاد حال کا شکار بھی ہو گیا جو اس کے فساد مزاج کا پورا پورا سامان ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مریض، یونانی طبیب کا علاج کراتے ہوئے بعض ڈاکٹری ادویہ بھی استعمال کرنے لگے ظاہر ہے کہ ادویہ میں کوئی تعارض نہیں لیکن ادویہ کے مخفی سلسلہ میں جس کو روش علاج اور طریق تدبیر کہنا چاہئے اصولی تعارض ضروری موجود ہے جو مریض کے مزاج کو فاسد کر دینے کے لئے کافی ہے کیونکہ کوڈاکٹر اپنے اصول اور روش علاج کے ماتحت مثلاً مریض کو۔۔۔ دودھ کی تاکید کرے گا اور طبیب اپنی روش فن کے لحاظ سے اس سے روکے گا، ڈاکٹر مثلاً پھلوں کا استعمال ضروری قرار دے گا طبیب اس سے مانع آئے گا ڈاکٹر ایک غذا تجویز کرے گا طبیب اس کے خلاف دوسری غرض

ایک جزوی دوا کے استعمال میں تو بظاہر کوئی حق نہیں ہوتا تھا مگر یہ دوا جس مجموعی روش اور جس ڈاکٹری اصول کے نیچے آئی ہوئی ہے وہ یقیناً اس روش واصول کے معارض ہے جو طب یونانی کی ادویہ کی پشت پر ہیں اس ایک جزوی دوا کے راستہ سے یہ اصولی تعارض مریض پر متضاد آثار ڈالے گا اور مریض اس حالت میں زیادہ دن اپنی خیر نہیں منا سکے گا مگر اس مخفی مضرت کو عوام نہیں صرف اطباء ہی پہچان سکتے ہیں جن کے قول پر اعتماد کرنے کے سوا مضرت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

عدمِ تقلید یا نقیضین میں دائر سائر رہنے کے چند واضح مفاسد

ساتھ ہی اس پر غور کی کیجئے کہ اس ہر جای پن اور نقیض میں دائر رہنے کی عادت کا طبعی اثر ایک دوسری نوعیت مفاسد کی یہ ہوگی یہ شخص کئی کئی ائمہ اور مفتیین کی طرف رجوع کرتے رہنے کی حالت میں اپنے نفس کے لئے سہولیات تلاش کرنے کا عادی ہو جائے کا جدھر سہولت دیکھی ادھر ہی سے فتوی لے لیا اور ادھر کا مقلد بن گیا اس صورت میں گویا یہ تقلید غیر معین غلبہ ہوا و ہوس کے ماتحت اس کی مطلب بر آری کا ایک آلہ اور حیلہ ہوگی اور ان کئی ائمہ کے پردہ میں درحقیقت مقلد اپنے نفس کا ہو گا جس کے سامنے طاعت حق نہ ہوگی۔ بلکہ صرف اپنی راحت و سہولت و نفسانی شہوت ہوگی مثلاً ایک شخص نے وضو کیا اور پھر خون نکلوایا جس پر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وضو ٹوٹ گیا تو اس نے کہا کہ میں امام شافعیؒ کا فتوی لیتا ہوں کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس کے بعد عورت کو شہوت سے ہاتھ لگایا جس سے امام شافعیؒ کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے تو اس نے کہا کہ میں امام ابو حنیفہؒ کا فتوی لیتا ہوں کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا اور بلا تجدید وضو نماز پڑھ لی چونکہ اس شخص کا وضو بالاجماع ٹوٹ چکا ہے گو سبب مختلف ہوئے اس لئے اس کی نماز سب کے نزدیک باطل ہوئی مگر یہ اپنے نزدیک پھر بھی اپنے کو متوضی اور مصلی سمجھ رہا ہے جس سے علاوہ خرق اجماع کے مفسدہ کے اس شخص کی ساری تحقیق اور تقلید کا حاصل حظ نفس اور مطلب بر آری کے سوا کچھ نہ نکلا گویا اس کا دین اس کے ہوا کے تابع ہو گیا نہ کہ ہواء نفس دین کے تابع ہوئی حالانکہ صریح ارشاد نبویؐ ہے:

عن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا یو من احد کم حتیٰ هوا ٔ تبعاً لما جئت به۔

"عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے تم میں سے کوئی شخص ایماندار نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے"۔

پھر فروع میں اس قسم کی آزادی کا خوگر ہو جانے سے اصول میں ایسی آزادی کا آجانا غیر مستبعد نہیں رہتا بلکہ عادۃً ایسا ہوتا ہے حالانکہ بنصِ حدیث شبہات میں پڑنے والا بالآخر حرام میں پڑ کر رہتا ہے۔

بہر حال ایسا مقلد عام جو بلا تعیین مختلف ائمہ کی تقلید کا خوگر ہے وہ یقیناً نقیضین میں دائر سائر رہے گا خواہ وہ تناقض جزئیاتی ہو یا کلیاتی۔ ساتھ ہی ان متخالف اجتہادات کے آثار سے اس کا روحانی مزاج بھی فاسد ہوئے بغیر نہ رہے گا یا ہواء نفس اس کے دین پر غالب آجائے گی یا وہ رضاء حق کا طالب نہ رہے گا یا اجماع امت کا ربقہ گلے سے نکل پھینکے گا اور نتیجہ فروعات کی آزادی اصول تک پہنچ جائے گی اور اصول کو بھی حظ نفس اور مطلب بر آری ہی کا ذریعہ بنا کر بالآخر سرے سے دین کو کھو بیٹھے گا یہی وجہ ہے کہ روحانی تربیت اور نفسانی معالجہ کے سلسلے میں جس کے اطبا انبیاء علیہم السلام ہیں ایک نبی کی شریعت پر عمل کرتے ہوئے دوسری شریعت اور نبی کو حق جاننے کے باوجود اس پر عمل کرنے کی خاص طور سے ممانعت فرمائی گئی ہے ادب تو اتنا کہ ایک نبی اور اس کی شریعت کے انکار پر پورا دین حبط لیکن احتیاط اس پر یہ کہ اس سچے نبی کے ایک جزئیہ پر بھی بلا اجازت نبی زمان عمل غیر جائز اور ممنوع جس کا راز یہی ہے کہ ہر شریعت کی تربیت کا رنگ جدا جدا ہے۔ نفس میں ان کے متضاد آثار پیوست ہونے سے اس نفس کی ہلاکت ہے نہ کہ تقویت' چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضورؐ کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہود کی بعض باتیں ہمیں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں. اگر اجازت ہو تو لکھ لیا کریں؟ تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

اَمُ تُهَوِّ كُوْنَ انتم كما تهوكت اليهود والنصارىٰ لقد جئتكم بها بيضاء نقيةً ولو كان موسىٰ حيًا ما وسعهُ الا اتباعی.

(رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

"کیا تم اپنے احکامِ دین کے بارہ میں ابھی تک حیرت میں پڑے ہوئے ہو کہ دوسروں کی باتیں لکھنا چاہتے ہو؟ بلاشک میں تمہارے پاس ایک صاف اور روشن شریعت لے کر آیا ہوں اگر موسیٰ بھی آج زندہ ہوتے تو انہیں میرے اتباع کے سوا چارہ کار نہ تھا تو پھر تمہیں ان کا اور ان کی شریعت کا اتباع کب جائز ہے؟"

اس اصول پر مربیان باطن، حضرات صوفیا کرام قدس اللہ اسرارھم نے اپنے طریق تربیت کی بنیاد بھی توحید مطلب پر رکھی جس کا حاصل یہی ہے کہ ایک شیخ سے وابستہ ہو کر دوسرے کی طرف عملی رجوع کرنا باعث تباہی نفس ہے۔ ادب و تعظیم بالا ستثناء سب کا ضروری ہے لیکن اتباع

صرف ایک کا کہ ہر مربی باطن کا رنگ ذات ہی الگ ہے۔ اس سے پیدا شدہ اصولی تربیت کا رنگ بھی جدا جدا ہے اور اسی رنگ کے مطابق پروردوں کے نفوس پر احوال و کیفیات بھی اسی رنگ کے طاری ہونے ضروری ہیں۔ پس اگر توحید مطلب باقی نہ رہے بلکہ طالب و سالک اپنے تلون کے تحت مختلف مشائخ میں دائر سائر پھرتا رہے تو اس میں یکسوئی، ایک رنگی اور دل جمعی کی دولت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو تمام کمالات باطن کی اساس ہے اور اس لئے اسے تمام عمر کبھی بشاشت و تمکین میسر نہیں اس آسکتی جس کے لئے ساری ریاضات کی جاتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ طریق نبوت ہو یا طریق ولایت دونوں میں توحید مطلب کے بغیر تربیت کا کام نہیں چل سکتا، پھر اسی طریق کی روشنی میں اطباء جسمانی، کو بھی توحید مطلب بنام توحید مطب اختیار کرنی پڑی کہ اس کے بغیر مریض کی صحت ہی متوقع نہیں ہو سکتی۔۔۔

پس جو انتظام انبیاء علیہم السلام نے اپنی شان تربیت کو موثر بنانے کے لئے کیا اولیاء نے اپنی شان معالجہ کو کامیاب بنانے کے لئے کیا۔ اطباء نے اپنے طریق علاج کو نتیجہ خیز کرنے کے لئے کیا جس کا نام توحید مطلب یا توحید مطب ہے وہی انتظام بعینہ فقہاء ملت نے اپنی شرعی راہنمائی اور دینی تربیت کو پراثر اور مثمر بنانے کے لئے فرمایا اور اپنی فقہی توحید مطلب کا نام تقلید شخصی یا تقلید معین رکھ کر یہ شرعی مطب کھول دیا تاکہ ایک ہی فقہ کو اپنا دستور زندگی ٹھیرا کر اور کئی کئی فقہیات اور فقہاء کے مخالف آثار تربیت کا شکار نہ بن کر اپنے دین پر یکسوئی اور طمانینت سے عمل پیرا رہے کہ اس کے بغیر تشویش و پراگندگی اور مذکورہ مفاسد کے بچاؤ کی کوئی دوسری صورت نہیں یہی وجہ ہے کہ قرون خیر گزر جانے کے بعد دانایان امت نے نظم ملت قائم رکھنے اور اسے تشتت و پراگندگی سے بچانے کے لئے نئے اجتہاد و تقلید کا یہ ایک خاص نظام قائم کیا کہ نہ امت کو اجتہاد میں آزاد چھوڑا کہ ہر شخص مجتہد بن کر کتاب و سنت کو اپنے آراء و قیاسات کا کھلونا بنالے اور نہ تقلید میں آزاد چھوڑا کہ جس کی چاہے اور جتنوں کی چاہے تقیدات میں چکر کھا کر اپنے نفوس کو تباہ کرلے بلکہ اجتہاد کا دائرہ بھی محدود رکھا جیسا کہ وہ تکویناً بھی محدود تھا اور تقلید کا دائرہ بھی تنگ کیا جیسا کہ وہ عقلاً تنگ ہی تھا کہ غیر معین نہ ہو اور معین ہو کر بھی ایسے فرد کی ہو جو علم و عمل، ورع و تقویٰ، شعور تشریع علم لدنی، ادراک خواص و احکام اکتشاف اسرار و علل وجدان ظواہر و بواطن، احساس و جزئیات و کلیات، شریعت میں یگانہ ہو، حاذق ہو اور اوپر سے اس کی یہ علمی و عملی قوت اسباب سے بالاتر ہو کر ایک موہبت الٰہی ہو جس کے ماتحت وہ اس آیت کا سچا مصداق ہو کہ:

وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ

”اور ہم نے انہیں امام بنایا جو ہمارے امر کی ہدایت کرتے ہیں جبکہ انہوں نے صبر

اختیار کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے ہیں"۔

یہاں صبر کے لفظ سے قوت عملیہ کی طرف اشارہ ہے کہ تمام طاعات کا مبداء صبر ہے یعنی وہ صبر علی الطاعات ۔۔۔ اور صبر بین الشہوات میں راسخ القدم ہو جو مطلق عمل سے آگے کا مرتبہ ہے جس کو حدیث جبریل میں احسان سے تعبیر فرمایا گیا ہے، ادھر ایقان سے قوت علمیہ کی طرف اشارہ ہے کہ علوم کی اساس یقین صادق ہی ہے، یعنی وہ پوری شریعت اور اس کے جزوی اور کلی مقاصد کے بارہ میں کمال یقین کے ساتھ درجہ معرفت پر آیا ہوا ہو جو ایمان سے آگے کا مرتبہ ہے جس کو قرآن نے اطمینان سے تعبیر کیا ہے۔

سلف میں تقلیدِ معین عام تھی

چنانچہ سلف سے لے کر خلف تک اخلاقی مسائل میں ایسے ہی جامع افراد کی تقلید معین بطور دستور العمل کے شائع ذائع رہی اور قرن صحابہؓ ہی سے اس کا وجود شروع ہو گیا تھا مثلاً حدیث حذیفہؓ میں جس کو ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے:

انی الا ادری ماقدر بقائی فیکم فاقتدوا بالذین من بعدی و اشار الی ابی بکرؓ و عمرؓ۔

" مجھے نہیں معلوم کہ تم لوگوں میں کب تک زندہ رہوں گا؟ سو تم لوگ ان دونوں کا اقتدا کیا کرنا اور اشارہ سے ابو بکرؓ و عمرؓ کو بتلایا"۔

ظاہر ہے کہ مِنۢ بَعۡدِیۡ سے ان دونوں حضرات کی حالت خلافت مراد ہے کیونکہ بلا خلافت تو ہر دو حضرات حضورؐ کے سامنے بھی موجود تھے، مطلب یہ ہوا کہ ان کے خلیفہ ہونے کی حالت میں ان کا اتباع کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ خلیفہ ایک ہی ہوں گے نہ کہ دونوں اکٹھے۔۔۔

اس لئے حاصل یہ ہوا کہ صدیق اکبرؓ کی خلافت میں ان کا اور خلافت فاروقی میں ان کا اتباع کرنا۔ پس حضورؐ نے ایک زمانہ خاص تک ایک معین شخص کے اتباع کا دین میں حکم فرمایا۔ یہ نہیں فرمایا کہ ان سے دلیل بھی ہر مسئلہ کی تحقیق کیا کرنا اور نہ یہ عادۃ مستمرہ تھی۔ یہی تقلید شخصی ہے کہ عملی مسئلہ پیش آنے پر کسی ایک عالم سے رجوع کر کے اس کے فتوی پر عمل کیا جائے لیکن دلائل کے پوچھنے کا کوئی التزام نہ تھا چنانچہ لوگوں کے سوال کرنے پر ان کے جو فتاوی روایات میں مذکور ہیں ان میں دلیل کا سوال ہے نہ دلیل کا اظہار۔ یہی تقلید شخصی تھی کہ ایک پورا ملک جمع ہو گیا اور بلا استفسار دلیل کے اس کے فتاوی پر عمل کرنے لگا بخاری کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مسئلہ پوچھا۔ پھر وہی مسئلہ حضرت ابن مسعودؓ سے پوچھا۔ تو انہوں نے ابو موسیٰ کے خلاف بتایا جب حضرت ابو موسیٰ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ جب تک یہ حبر تم میں موجود ہے مجھ

سے مسئلہ مت پوچھا کرو۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو تمام مسائل میں ایک طرف لگا دینا اور لوگوں کا اس پر عمل درآمد کرنا جس میں مطالبہ دلیل کا کوئی سوال نہیں پس یہی تقلید شخصی ہے۔

اہل مدینہ عموماً حضرت زید بن ثابتؓ کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ عکرمہؒ کی روایت بخاری میں ہے کہ لوگوں نے ابنِ عباسؓ سے کہا کہ ہم زید بن ثابتؓ کے قول کے خلاف آپ کے قول پر عمل نہیں کریں گے جس سے ظاہر ہے کہ اہل مدینہ کے امام و مفتی حضرت زید بن ثابت تھے اور لوگ ان کے فرمودہ کے مطابق عمل کرتے تھے خواہ وہ نص سے حکم دیں یا عدم نص کی صورت میں قیاس سے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرآن کے سبعہ احرف کو حرف واحد پر مقتصر فرما دینا اور تمام محروسہ ہائے اسلامی میں صحابہؓ و تابعینؒ کا اسی کو عملاً قبول کر لینا اِتباع و تقلیدِ معین نہیں تھا اور کیا تھا؟۔۔۔ کیونکہ اس کے بارہ میں کوئی صریح حکم حدیث تو موجود نہ تھا۔ ایک علت پر جس کو حضرت ذی النورین کے تفقہ نے ادراک کیا یہ حکم دائر تھا جبکہ ان کے نزدیک اس علت کا زمانہ ختم ہو گیا تو وہ حکم سبعۂ احرف بھی ختم ہو گیا۔ چنانچہ اس واقعہ کی روایت کے الفاظ پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس قیاسی قرن حکم کو سب نے قبول کر لیا اور کسی نے بھی مطالبہ دلیل نہ کیا۔ اسی طرح اور قیاسی احکام میں بھی قرآن صحابہؓ میں تقلید شخصی کی گئی ہے جیسا کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غلہ اس شرط پر قرض دینے کو ناپسند کیا کہ وہ دوسرے شہر میں ادا کیا جائے اور فرمایا کہ کرایہ بار برداری آخر ادا کرنے والا کس سے لے گا؟ اس فتوی پر لوگوں نے عمل کیا۔ اور یہ قیاس سے فتوی دیا تھا۔ کیونکہ اس کے بارہ میں کوئی صریح نص موجود نہیں۔

پس تقلید بھی ہوئی اور ہوئی قیاسیِ حکم میں۔۔۔

بہر حال تقلید شخصی کا عمل قرنِ سلف میں رائج تھا آج چونکہ اس کے بغیر لوگ طرح طرح کے علمی و عملی مفاسد کا شکار ہیں جن کی تشریح ابھی عرض کی گئی کہ اجتہاد کی آزادی سے فتنہ شبہات پھیلتا ہے اور تقلید کی آزادی سے فتنہ شہوات بڑھتا ہے۔ اس لئے قدرۃً اس میں وجوب کی شان پیدا ہو گئی کہ وہ واجب کا مقدمہ بن گئی اور اس کے بغیر اتباع ہواء سے محفوظ رہنا عادۃً محال ہو گیا اس لئے تقلید شخصی بھی ضروری اور واجب ہو گئی ہے۔ مگر واجب بالغیر۔ قرونِ اولیٰ میں یہ غیر یعنی فتنہ شبہات و شہوات شائع نہ تھا۔ اس لئے یہ تقلید معین جواز کے درجہ میں تھی۔ آج شائع ہے اس لئے واجب کے درجہ میں ہے، الحاصل مطلق تقلید معین کتاب و سنت کی روشنی میں ایک ثابت شدہ اور معمول بہ مسئلہ واضح ہوئی۔ مطلق تقلید تو بنص قرآنی:

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔

"علم والوں سے سوال کرو اگر تم علم نہیں رکھتے"۔

اور تقلید معین بوجہ مفاسدِ مذکورہ اصول کتاب و سنت، حدیث باب، تعاملِ سلف، اجماع امت اور نبض شناسان امت مرحومہ کے تجربات وغیرہ سے واجب ثابت ہوئی اور غیر مجتہد کے حق میں ضروری نکلی۔ مگر صرف مسائل اختلافیہ میں نقیضین کا اجتماع یا نقیضین میں دائر سائر رہنے کی صورت پیدا ہوتی تھی جو دین کے نقطۂ نظر سے محال ہے کہ دین میں تناقص محال ہے۔

اسی لئے عامہ تمام اکابر امت اور ہر قرن کے علماء فحول جو اجتہادی شان تک رکھتے تھے تقلید معین کے دائرے سے باہر نہیں ہوئے بڑے بڑے حفاظ حدیث اور اکثر و بیشتر ارباب سنن و جوامع مقلد ہی ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے عام محققین اور خصوصاً ولی اللہی خاندان اور سلسلہ کے تمام وہ اکابر جن کی تحقیقات اور لطائف و معارف ائمہ اجتہاد کا دور یاد دلاتی ہیں۔ خود اپنے لئے اور اپنے حلقہ اثر کے لئے تقلید معین ہی ضروری سمجھتے رہے اور کبھی اس کے حلقہ سے باہر نہیں ہوئے۔

دین کے بارہ میں یہی وہ اسوہ ہے جو بطور توارث علماء دیوبند تک پہنچا اور اسی راہ پر امن پر دارالعلوم دیوبند نے راہ روی اختیار کی۔ حضرت حجت الاسلام قاسم العلوم مولانا محمد قاسم سرہٗ بانی و سرپرست اول دارالعلوم۔ حضرت مولانا محمد رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ سرپرست ثانی دارالعلوم۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ صدر مدرس اول و سرپرست ثالث دارالعلوم، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ صدر مدرس ثانی و سرپرست رابع دارالعلوم۔ حضرت علامہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سرپرست خامس دارالعلوم۔ حضرت علامہ محمد انور شاہ قدس سرہ صدر رابع دارالعلوم وغیرہ وغیرہ جن کی تقاریر اور تحریرات دریائے اجتہاد کی نہریں معلوم ہوتی ہیں بایں تحقیق نظر و فکر تقلید معین کے دائرے سے نہ کبھی خود باہر ہونے نہ اپنے حلقہ ہائے اثر کو باہر ہونے دیا۔ پھر ان حضرات کے ہزارہا تلامذہ اور شاگردان رشید۔ پھر دارالعلوم کے ہزارہا فروعی مدارس جو ہندو بیرون ہند میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے محقق علماء اور ان کے حلقہ ہائے اثر اسی پرانے مسلک پر جمے رہے اور لوگوں کو جماتے رہے۔

بالخصوص حضرت بانی دارالعلوم (قاسم العلوم والخیرات) نے اپنے مخصوص رنگ سے امام ابو حنیفہؒ کی تقلید بھی کی اور ساتھ ہی محققانہ انداز سے تمام فقہ اور کلام اور اصولی فلسفہ بھی اسی انداز سے کھل کر دکھلایا کہ تقلید ایک مستقل تحقیق نظر آنے لگی اور جس کی بدولت دارالعلوم کے یہ ہزارہا فضلاء اور شاگردان شاگرد بھی رہے اور محقق فی التقلید بھی ہوئے اسی طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان حضرات نے اسی مسئلہ تقلید کے ذریعے سے لوگوں کے دین کی حفاظت کی۔ ورنہ ایک طرف سے ملک کا جاہل طبقہ جس کی ملک میں اکثریت تھی فکر و خیال پر اس درجہ قید و بند عائد کر چکا تھا کہ

اپنی آبائی رسوم کو اسلام اور انہی کی کورانہ تقلید کو پیروی اسلام سمجھ کر ہر کس و ناکس کی تقلید میں کرتا رہتا تھا جس سے ان میں طرح طرح کی بدعات و محدثات رچ گئی تھیں۔

اور دوسری طرف سن ۱۸۵۷ء کے بعد جدید تعلیم اور اس سے پیدہ شدہ آزاد خیال کے سبب فکر و خیال کی وہ آزادی پھیل چکی تھی کہ ہر شخص مجتہد مطلق ہونے کا مدعی اور اسے اپنا جائز حق سمجھ رہا تھا۔ جزئی عقول دماغوں پر اس درجہ مسلط ہو چکی تھیں کہ مذہبی نقل روایت کے ردو قبول کا معیار ہی یہ عقول رہ گئی تھیں۔ غرض ایک طبقہ تقلید جامد کا شکار تھا اور ایک طبقہ اجتہاد مطلق کے خیال میں غرق تھا۔ ایک طبقہ نے تقلید بلکہ ربقہ تقلید ہی کو گلے سے اتار پھینکا تھا۔

ایک نے تقلیدی افراط میں گرفتار ہو کر ہر ہر صاحب سجادہ و دلق بلکہ ہر ہر مدعی کی تقلید مطلق کرنے کا نام دین رکھ چھوڑا تھا۔ پس جامد مقلد یا بہت سوں کے سامنے جھکنے والے بہت سوں کے افعال کی اقتدا کرتے کرتے بدعات و محدثات کا شکار ہوئے اور فتنہ شہوات میں جاگرے اور آزاد خیال کسی ایک کے بھی سامنے نہ جھکنے کی خو پیدا کر کے اپنی عقل کے بندے بن گئے تھے، جو ان کی عقل میں آیا مان گئے جو نہ آیا انکار کر بیٹھے اور اس طرح یہ لوگ فتنہ شبہات میں جا پھنسے تھے۔

اگر یہی لیل و نہار رہتے تو ہندوستان کی پوری دنیا شبہات و شہوات میں پھنس کر کلیۃً اپنا دین کھو چکی ہوتی۔ خدا رحمتیں نازل کرے ان اساطین امت اور مجددین پر کہ انہوں نے اجتہاد و تقلید کا وہی معتدل اور درمیانی نکتہ پکڑ کر جو حقیقتہً کتاب و سنت کی روح تھا اس امت کو سنبھالا اور ہند اور بیرون ہند میں حنفیت اور حنفیت کی جڑیں مضبوط کر دیں، دائرہ تقلید معین کو بھی نہ چھوڑا اور شانِ تحقیق کو بھی ہاتھ سے نہ دیا اور پھر ایک طرف کتاب و سنت کے علم وسیع کا روشن مینارہ دلیل راہ بنایا اور دوسری طرف ریاضت و مجاہدات کر کے معرفتِ نفس اور معرفتِ ربّ کی منازل طے کیں جس سے ان کا علم منقول سے معقول بنا اور پھر معقول سے محسوس ہو کر مشاہدہ میں آگیا یعنی جو علم اوپر والوں سے سنا تھا پہلے اسے استدلال سے سمجھا اور پھر اس کے استعمال سے اسے اپنا حال بنالیا جس سے پوری شریعت پانے ظہر و بطن کے ساتھ ان پر منکشف بھی ہوئی اور ان کا حال ہو کر ان کی طبعیت بھی بن گئی۔

لیکن غور کیجئے کہ اس انکشاف تام اور کمالات ظاہر و باطن کے ہوتے ہوئے بھی جبکہ ان جیسے مانے ہوئے محققین اور عارفین نے بھی تقلید کا دامن دینی تحفظ کی خاطر کبھی نہ چھوڑا تو ایک ایسے دور میں جبکہ ہم لوگوں کا علم تو مضمحل ہو کر رسمی سا رہ گیا ہے اور اسلام کمزور ہو کر اسمی سا ہو گیا ہے، تقویٰ و طہارت اور عمل کے جذبات سرد پڑ چکے ہیں۔ فہم عالی گویا کہ دنیا سے اٹھ چکا ہے۔ کام کا وجود نہیں ہے اور دعاوی بے شمار ہیں۔

حیرت ہے کہ آج کے بہت سے بزرگوار اس سیدھے سادھے محافظ دین طریق عمل یعنی تقلید معین سے جو سلف کے وقت سے اسی تحفظ دین کی خاطر معمول بہ ہے کس سہولت سے رو گردانی فرمارہے ہیں ؟--- مناسب تو یہ تھا کہ خود بھی اس طریق عمل کو اختیار فرماتے کہ اس میں کوئی برائی نہ تھی لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا تو کم از کم اس رہ کے اختیار کرنے والوں پر ملامت نہ فرماتے کہ اختیار کرنے والوں نے بہر حال کسی بدعت شاشرعی مذموم کو اختیار نہیں کیا تھا بلکہ ایک حجت کے ساتھ اس لئے اختیار کیا تھا کہ اپنے دین کی حفاظت کر سکیں جیسا کہ سلف نے بھی اور بعد میں پوری امت نے بھی امن اسی میں دیکھا تھا۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ اس مسلک اور اس کے سالکین کو ہر طعن کا مخاطب بنایا گیا اور کسی قسم کے حملوں سے احتراز بھی نہیں کیا گیا۔

کہیں کہا گیا کہ مقلد جھگڑالو ہوتے ہیں اور لڑتے ہیں، کہیں کہا جاتا ہے کہ مقلدین نے غیر مسلک والوں پر تعدیات کیں جس کے لئے تاریخی شواہد لائے جاتے ہیں تاکہ منافرت کا تخم کافی مضبوطی کے ساتھ دلوں میں جم جائے اور برگ لے آئے ؛ کہیں کہا جاتا ہے کہ مقلدین یا احناف نے حکومت کے زور سے اپنے مسلک کو پھیلایا ہے گویا فقہ حنفی یا دوسرے فقہیات عیاذ اًباللہ خرافات کا مجموعہ تھے جن میں نہ کوئی معقولیت تھی نہ کشش اس لئے جبری اشاعتوں کی بدولت زور زبردستی سے دنیا میں پھیلائے گئے ؟

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے خیالات ہیں جو مذاہبِ اربعہ اور ان کے ماننے والوں کی نسبت شائع کئے جاتے ہیں۔ مجھے ان خیالات کا اس تحریر میں جواب دینا نہیں ہے کیونکہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اس تحریر کا موضوع کوئی ردو قدح یا مناظرہ نہیں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس قسم کے خیالات وافکار کم سے کم محقق علماء اور مربیانِ امت کے شایان شان نہیں۔ اگر کسی فرد یا جماعت میں شخصی یا جماعتی کمزوریاں ہوں تو اس میں مسلک یا مذہب کا کیا دخل ہے کہ وہ اس کی طرف منسوب کر دی جائیں ؟ اگر آج مسلمان اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر آپس میں سر پھٹول روا رکھتے ہیں تو اس میں اسلام کا کیا دخل ہے اور کس طرح جائز ہو گا کہ مسلمانوں کی ان کمزوریوں کو اسلام کا ثمرہ کہا جائے گا ؟

بہر حال مقلد یا غیر مقلد کسی وقت بھی باہم غیر مناسب انداز سے باہم آویزش کرنے لگیں تو اس میں تقلید اور عدم تقلید کا کیا دخل ہو سکتا ہے ؟ یہ محض ان کے جذبات ہیں جو اپنے ہی رنگ میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ ان جذبات کا نہ کسی شرعی مسئلہ سے تعلق ہے نہ کسی شرعی مسلک سے، اجتہادو تقلید جیسے شرعی مسائل اپنی جگہ ہیں اور یہ کمزوریاں اپنی جگہ 'ان کمزوریوں پر اعتراض اپنی جگہ کتنا ہی صحیح ہو مگر ان شرعی مسائل یا ان کے ماننے والوں پر کسی حالت میں بھی وارد نہیں

ہو سکتا۔

بلا شبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ پر ہر وقت حاصل ہے لیکن اسی حد تک کہ مبتلیٰ متنبہ ہو جائے نہ اس حد تک کہ یہ امر بالمعروف ہی ایک مستقل نزاع بن کر محاذ قائم کردے اور باہمی منافرات کی تخم ریزی اور آبیاری کرنے لگے۔

اس لئے میری دردمندانہ گذارش ہے کہ مسائل کو مسائل کے درجہ میں رکھ کر تمام حضرات خواہ وہ تقلید سے تعلق رکھتے ہوں یا ترک تقلید سے تعلق رکھتے ہوں۔ نفس دین کے تحفظ میں اجتماعی جدوجہد صرف کرنے کی فکر فرمائیں اور فروعی مسائل کے اختلافات میں جو آج سے مختلف فیہ نہیں صحابہ ہی کے وقت سے مختلف فیہ چلے آرہے ہیں۔ ایک اختلافی جہت کے ماننے والوں کی طرف سے یہ حجت کافی خیال فرمالیں کہ فلاں طبقہ، فلان فقیہ کے فتاویٰ پر عمل کررہا ہے۔ مخترع اور مبتدع نہیں ہے۔ حجت کو قاطع نزاع ہی بنائے نہ کہ موجبِ نزاع۔ ضرورت ہے کہ سب حضرات باہمی اشتراک عمل سے پوری قوم کی تعمیر کی فکر فرمائیں اور یہ سب مل کر ایسے لائحہ عمل پر غور کریں جو مسلمانوں کو ایک سطح پر لاسکے اور معاندین اسلام کی مخفی ریشہ دوانیوں کا کسی حد تک سدِ باب کرسکے۔

حضرات! اپنے باہمی اتحاد میں کم سے کم حضرات صحابہؓ کے اس اُسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بنالینا چاہئے کہ قرآن کریم کی بعض شاذ آیات جن کو صحابہؓ کے اجماع نے قرآن کریم کا جزو تسلیم نہیں کیا۔ بعض حضرات صحابہؓ کے پاس موجود نہیں جو انہیں خلافِ اجماع قرآن کا جزو جانتے تھے لیکن کسی روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ارباب اجماع نے مخالفین کے خلاف یا مخالفین اجماع نے اربابِ اجماع کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا ہو۔

پس حضرات مقلدین جبکہ ترکِ تقلید کو خلاف اجماع سمجھتے ہیں تو وہ تارکین تقلید کے بارہ میں ان حضرات صحابہؓ کا اُسوۂ اختیار فرمائیں۔ جنہوں نے اپنے اجماع کے باوجود مخالفین اجماع کے خلاف نہ کوئی محاذ قائم کیا اور نہ کسی جنگ کا آغاز کیا۔ بلکہ تفہیم کا حق ادا کردینے کے بعد ان کی تحقیق پر انہیں معذور سمجھ کر ہمیشہ چھوڑے رکھا۔

ادھر حضرت منکرینِ تقلید اگر تقلید کو باجود اجماعِ امت کے قابلِ قبول نہیں سمجھتے تو وہ ان حضرات صحابہؓ کا راستہ اختیار فرمائیں جنہوں نے شاذ آیات کے بارہ میں اپنی تحقیق نہیں چھوڑی تو اجماع کنندوں کے مقابلہ میں بھی نہیں آئے اور انہیں ان کے عمل کے لئے آزاد چھوڑا۔ تقلید کے فریقین بلکہ تمام فرق اسلامیہ جب تک حضرات صحابہؓ کی اس پر حوصلہ رواداری کا اسوہ اختیار نہیں فرمائیں گے۔ امت کے اجتماعی مسائل کا حل کبھی نہیں ہو سکتا۔

آج امت مسلمہ کو تعلیم عام کی شدید ترین ضرورت ہے کہ جہالت کے جراثیم نے اس کے قومی جسم کو مثل ایک بے جان لاشہ کے کردیا ہے۔ اسی طرح آج تبلیغ عام کی شدید ترین ضرورت ہے کہ مسائل سے عدم واقفیت نے انہیں اندھیرے میں ڈال رکھا ہے۔ اسی طرح امت کو اصلاحِ اخلاق کی قوی ترین ضرورت ہے کہ بداخلاقیاں ناسُور ہو کر اس قوم کو لگ گئی ہیں۔

اسی طرح صفائی معاملات کی آج حد درجہ ضرورت ہے کہ بد معاملگی نے قوم کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کردی ہے۔

اسی طرح سیاسی حقوق کے تحفظ کی بھی اشد ضرورت ہے کہ اس کے فقدان نے قوم کی شوکت و قوت کو قطعاً زائل کردیا ہے۔

لیکن سارے اجتماعی معاملات آپ حضرات جب ہی پایہ تکمیل کو پہنچا سکتے ہیں جبکہ ان فروعی اختلافات کو نزاعات نہ بنائیں اور رواۃ کے بادیانت اختلافات کو اس کی حدود میں قائم رکھ کر اسلام کی سرحدوں کو محفوظ کرنے کی فکر کریں اور امت کی اس اجتماعی ساکھ کو پھر از سر نو قائم کرنے کی کوشش کریں جو بہت حد تک پامال ہو چکی ہے اور ان نزاعات کے ذریعہ روبزوال ہو رہی ہے۔ میں اس کی امید رکھوں گا کہ "آل انڈیا احناف کانفرنس" ان عمومی اور اجتماعی مہمات کو اپنے بنیادی مقاصد میں شامل کر کے انہیں زیادہ سے زیادہ اپنے دائرہ عمل میں لے لے گی۔

مجھے آل انڈیا احناف کانفرنس کے دعوتی پوسٹر کو دیکھ کر جس میں غیر مسلک کے علماء کو بفراخ دلی و فراخ حوصلگی دعوت دی گئی ہے۔ یقین کامل ہے کہ اس کانفرنس کے مخلصانہ جذبات عمل انفرادیت سے بالاتر اجتماعی روح اپنے اندر لئے ہوئے ہیں اور اس کے مخلص کارکن اتحاد بین المسلمین کے زیادہ سے زیادہ خواہش مند ہیں۔ اس لئے اس کانفرنس سے یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ عرض کردہ مقاصد اس کے اساسی مقاصد قرار پا سکیں گے اور اس کے ہاتھوں پھلیں پھولیں گے۔

آخر میں تمام ذمہ داران کانفرنس کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی فراخ دلی سے مجھ ناچیز کو اپنے کج مج خیالات کے اظہار کا موقع عنایت فرمایا اور میری انتہائی بے بضاعتی کے باجود مجھے قبول فرما کر میری انتہائی عزت افزائی فرمائی۔۔۔ حق تعالیٰ شانہ' ذمہ دارانِ کانفرنس' کارکنان جلسہ اور تمام حاضرین اجلاس کی ان مخلصانہ مساعی کو قبول فرمائے اور اپنی مرضیات کی توفیق دے اور ہم سب کو حسنِ خاتمہ کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام

میں نے کوشش کی ہے کہ آزادی کے پروگرام کے اجزاء صرف کتاب وسنت سے پیش کئے جائیں۔ میرے خیال میں جو شرعی رہنمائی سے قائم شدہ ہے ضروری ہے کہ کوئی بھی پروگرام عصری سیاست کے ڈھچر پر اور اس سے اخذ کر کے نہ لیا جائے۔ یہ پر فریب سیاست رد کرنے کے قابل ہے جس نے دنیا کا امن وسکون برباد کر دیا ہے نہ کہ معمول بنانے کے لائق ہے۔۔۔ البتہ سمجھ لینے کے قابل ضرور ہے۔ اس کو سمجھ کر پھر صرف شرعی سیاست سے ہمارے پروگراموں کا تعلق ہونا چاہئے۔ جس سے اس پر مکر عصری سیاست کی ظلمت دور ہو سکے اور قلوب پر سے اس کا استیلاء اٹھ جائے۔

(از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ')

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهٗ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا............... اَمَّابَعْدُ.................

فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ٥ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِىْ صَدْرِىْ ٥ وَيَسِّرْلِىْٓ اَمْرِىْ ٥ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِىْ يَفْقَهُوْا قَوْلِىْ ٥ وَاجْعَلْ لِّىْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِىْ ٥ هٰرُوْنَ اَخِى ٥ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِىْ ٥ وَاَشْرِكْهُ فِىْٓ اَمْرِىْ ٥ كَىْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ٥ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ٥ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ٥ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ٥ (ثم قال تعالٰی)

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِىْ ٥ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِىْ وَلاَ تَنِيَافِىْ ذِكْرِىْ ٥ اِذْهَبَ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّه، طَغٰى ٥ فَقُوْلاَ لَه، قَوْلاً لَّيِّنًا لَّعَلَّه، يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰے ٥ قَالَ رَبَّنَا اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَا اَوْ اَنْ يَّطْغٰے قَالَ لاَ تَخَافَا اِنَّنِىْ مَعَكُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰى ٥

فَاْتِيَاهُ فَقُوْلاَ اِنَّا رَسُوْلاَ رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِىْ اِسْرَآئِيْلَ ٥ وَلاَ تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلاَمُ عَلٰے مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰے ٥ اِنَّا قَدْ اُوْحِىَ اِلَيْنَا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰے مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى.

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِىُّ الْعَظِيْمُ.

(ترجمہ) ”اے موسیٰ تم فرعون کے پاس جاؤوہ بہت حد سے نکل گیا ہے عرض کیا اے میرے رب میرا حوصلہ فراخ کیجئے اور میرا کام آسان فرمادیجئے اور میری زبان پر سے بستگی ہٹادیجئے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔۔۔۔اور میرے واسطے میرے کنبہ میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو کہ میرے بھائی ہیں ان کے ذریعہ سے میری قوت مستحکم کر دیجئے اور ان کو میرے کام میں شریک کر دیجئے کہ تاکہ ہم دونوں آپ کی خوب کثرت سے پاکی بیان کریں اور آپ کا خوب کثرت سے ذکر کریں بلاشبہ آپ ہم کو خوب دیکھ رہے ہیں۔

ارشاد ہوا کہ تمہاری درخواست منظور کی گئی اے موسیٰ (پھر آگے حق تعالیٰ نے فرمایا) اور میں نے (اے موسیٰ) تم کو اپنے لئے منتخب کیا تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یادگاری میں سستی مت کرنا۔

دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل چلا ہے۔ پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔

دونوں نے عرض کی کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے۔یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔ارشاد ہوا کہ تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سنتا ہوں اور سب دیکھتا ہوں۔

سو تم اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں۔ سو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشان لائے ہیں اور ایسے شخص کے لئے سلامتی ہے جو راہ پر چلے۔ ہمارے پاس یہ حکم پہنچا ہے کہ عذاب اس شخص پر ہوگا جو

جھٹلائے اور روگردانی کرے۔

میری سب سے بڑی عزت وسعادت

بزرگان محترم!

آپ حضرت نے ایک سال بعد پھر مثل سابق عزت افزائی فرما کر مجھے اسی جگہ لا بٹھایا ہے جس جگہ گزشتہ سال مجھے بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس حوصلہ افزائی پر آپ سب بزرگوں کا شکریہ ادا کروں۔

فجزاکم عنیّ خیرا

لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری سب سے بڑی عزت افزائی یہ ہے کہ خواہ میری ذات کو حقیر ترین سمجھا جائے جیسا کہ واقعہ میں وہ ہے لیکن اس پیام کو گوش ہوش سے سن کر دل کی گہرائیوں میں جگہ دی جائے جو میں اس کرسی پر بیٹھ کر دینا چاہتا ہوں تو یہی میری سب سے بڑی عزت وسعادت ہوگی۔ گوذات کسی نگاہ سے بھی دیکھی جائے۔

سلاطین کا پیغام عام پبلک کے کانوں عموماً بھنگی کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے لیکن اس کے قبول کرنے میں بھنگی کی ذاتی حقارت کبھی مانع نہیں آتی۔

مجھے آپ ختمی مآب حضرت محمد ﷺ کی بارگاہ کا ایک ادنیٰ بھنگی تصور کریں۔ بلکہ وہاں کے بھنگی کا مرتبہ بھی یہاں کے سلاطین سے بڑھ کر ہے۔ میں کیا چیز ہوں' تاہم ایک معمولی بھنگی کی بے حیثیتی اگر پیغام حکومت ماننے سے مانع نہیں ہو سکتی تو میری کم حیثیتی بھی پیغام خدا اور رسولؐ سننے اور ماننے سے مانع نہ ہونی چاہئے۔

میں اپنے لئے اس وقت وہی مثال دے سکتا ہوں جو ایک تبلیغ خاص کے موقع پر مولانا اسمٰعیل شہید کی ہوئی کہ وہ طوائفوں کو تبلیغ حق کرنے پہنچ گئے تو ان کے خدام ومتوسلین نے یہ کہہ کر روکا کہ حضرت ایسے بدنام گروہ کے سامنے تبلیغ کے لئے جانا علم کی عزت کو گھٹانا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا تھا کہ۔

> ”خدا کی قسم اگر اسمٰعیل کو گدھے پر سوار کر کے اس کا منہ کالا کیا جائے اور جوتیوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا جائے اور اس کے پیچھے بچے ہر لو دیتے ہوئے اسے شہر سے باہر نکال رہے ہوں اور اسمٰعیل قال اللہ وقال الرسول کہتا ہوا جارہا ہو تو یہی اس کی انتہائی عزت وسربلندی ہے جس کے بعد اس کسی عزت کی ضرورت نہیں“۔

تو میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ آپ اگر کسی درجہ میں بھی میری کوئی توقیر نہ فرماتے اور اپنے اخلاق کریمانہ کا کسی درجہ میں بھی ثبوت نہ دیتے مگر اس پیغام کی عظمت کرتے جو میں

پیش کرنا چاہتا ہوں تو بلاشبہ یہی میری ایک انتہائی عزت افزائی ہوتی کہ اس کے بعد مجھے کسی عزت کی ضرورت نہیں۔

تذکیر قدیم

حضرات! مجھے جمعیت العلماء صوبہ بمبئی کے اس پلیٹ فارم سے کوئی نیا اور انوکھا پیغام دینا نہیں ہے جو اب تک نہ دیا گیا ہو کیونکہ اول تو پیغام قرآنی ہے اور قرآن چودہ صدی کی پرانی کتاب ہے تو اس کا پیغام نیا کب ہو سکتا ہے؟

پھر قدامت کی یہ محدود مدت بھی قرآن کے کلام لفظی ہونے کے لحاظ سے کی ہے۔ جس کی عمر چودہ سو برس ہے۔ ورنہ کلام نفسی کے درجہ میں تو کلام اللہ اور اس کا پیغام ازلی اور قدیم مطلق ہے کہ صفت الٰہیہ ہے جس کی قدامت کی کوئی حدونہایت ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ سر تا پا قدیم اور ازلی محض ہے اس لئے میرے پیغام میں کوئی ادنیٰ جدت نہ ہوگی۔

اور پھر اس پرانے پیغام کو بھی دینے والے بارہا دے چکے ہیں کہ اس چودہ صدی میں قرآن اور اس کے ضمن میں یہ پیغام ہر عالم وعامی کی زبان پر ہزار بار آیا ہوا ہے۔ اس لئے بلحاظ تبلیغ بھی یہ پیغام نیا نہیں۔ ہاں صرف عنوان بیان اور طریق استدلال کے لحاظ سے شاید نیا ہو اور اس لحاظ سے بھی نیا نہ ہو تو نہ سہی۔ مقصود اصلی تو تذکیر ہے اور تذکیر ہمیشہ پرانی ہی بات کی ہوتی ہے۔

اجمالی پیغام

یہ پیغام قرآن حکیم کی مرقومہ بالا آیتوں سے چند نمبروں میں پیش کرنا چاہتا ہوں جنہیں آیات مذکورہ کے الفاظ اور سیاق وسباق سے استنباط کر کے نمبروار مرتب کر دیا گیا ہے تفصیلات سے پہلے پیغام کا اجمالی خلاصہ یہ ہے کہ ہم غلامی کے مصائب میں گرفتار ہیں۔ ہمیں مکمل آزادی کی نعمت حاصل کرنی چاہئے۔ اس لئے میری اس ساری عرضداشت کا حاصل غلامی اور آزادی کی شرعی بحث شرعی حیثیت سے غلامی اور آزادی کا مفہوم دونوں کے اثرات حصول آزادی کی ضرورت اور طریقہ حصول وغیرہ کی تفاصیل چند نمبروں میں عرض کرنا ہے۔

پیغام اور اس کی نمبروار دفعات

برطانیہ کی سرکشی

آیات مندرجہ عنوان کا ترجمہ آپ نے سمجھ لیا اب سلسلہ وار ان آیات کے مدلولات پر غور کیجئے۔ بنی اسرائیل کو فرعون اور قبطیوں کی غلامی کرتے ہوئے جب ایک مدت گزر گئی تو رحمت خداوندی جوش میں آئی اور موسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کو یہ غلامی شکن حکم ملا کہ

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى.

"اے موسیٰ! فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے"۔

اس حد سے نکل جانے کی سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔

(۱) پس قرآن کا اس غلام سازی کو اور فرعون کے استعبادی جذبہ کو طغیان سے تعبیر کرنا اس کی واضح دلیل ہے کہ کسی قوم کا کسی قوم کو اپنا غلام بنانا خالق کائنات سے بغاوت اور سرکشی ہے جو جو مورد قہر و عتاب ہے کیونکہ طغیان مورد غضب ہی ہو سکتا ہے نہ کہ مورد رحمت و شفقت' اس سے یورپ کی ان اقوام کی پوزیشن سامنے آجاتی ہے جن کے شب و روز کا ذکر و فکر اور مشغلہ ہی دنیا کی اقوام کے گلے میں یورپ کی غلامی کے پھندے ڈالتے رہنے کی اسکیمیں سوچتے رہنا اور انہیں عمل میں لاتے رہنا ہے۔ جس میں برطانیہ کو بالخصوص ید طولیٰ حاصل ہے اسی کو قرآن نے فساد انگیزی سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلاَ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْھُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَائَھُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَائَھُمْ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ.

"فرعون سرزمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں کر رکھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا واقعی وہ بڑا مفسد تھا"۔

اسباب غلامی

(۲) اسی سے دوسرا مسئلہ یہ بھی واضح ہو گیا کہ عِندَ اللہ خود غلامی بھی قابل نفرین چیز ہے کیونکہ جب اس کے برپا کرنے والے کو طاغی اور سرکش کہا گیا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اس کی برپا کردہ چیز (غلامی) کسی درجہ میں بھی مستحسن اور پسندیدہ ہو۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی غلامی قوموں کے لئے ہر ممکن بے عزتی کی جڑ اور ہر محتمل بے وقعتی کی بنیاد ہے کیونکہ دنیا میں ایک قوم کے لئے اسباب عزت چار ہوتے ہیں۔

(1) ایک اس کا اپنا اساسی علم جس سے اس کی معنویت قائم ہوتی ہے۔

(2) دوسرے اس کی اقتصادی اور مالی حیثیت جس سے اس کی مادیت بنتی ہے۔

(3) تیسرے اس کی عرفی حیثیت جس سے اس کا وقار قائم ہوتا ہے۔

(4) چوتھے اس کے اندرونی اور بیرونی تعلقات کی نوعیت جس سے اس کے حلقہ اثر میں وسعت اور بنیادوں میں مضبوطی آتی ہے۔

ایک مسلط قوم جب کسی ملک یا قوم کو اپنا غلام بنالیتی ہے تو غلام قوم کی عزت کے یہ چاروں سوت بند کر دیتی ہے جس سے اس قوم کی معنویت' مادیت' وقعت اور نیک شہرت سب ختم ہو جاتی ہے اور پھر نتیجہ کے طور پر اس محکوم قوم میں پستی اخلاق و کردار کے ایسے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ مخلوق ہی کی نہیں خالق کی نگاہوں سے بھی گر جاتی ہے۔ تا آنکہ غیرت خداوندی جوش میں آئے۔ اس کا حال زبوں اور بد سے بدتر ہوتا رہتا ہے۔ اس کے اپنے قومی علم کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ جس سے نہ اسے اپنی قومی روایات یاد رہتی ہیں نہ قومی مذاق ملحوظ رہتا ہے اور نہ قومی مزاج ہی باقی رہتا ہے اور

اگر اسے علم کی تلاش بھی ہوتی ہے تو فاتح قوم کا علم سیکھ لینا ہی اسکے نزدیک سب سے بڑا فخر بن جاتا ہے جس کے لئے وہ مجبور کر دی جاتی ہے ۔۔۔۔ اور اب اگر اس جدید علم کی بناء پر اس کی کوئی رسمی عزت ہوتی ہے تو وہ در حقیقت خود اس کی قومی عزت نہیں بلکہ حکمران قوم ہی کی عزت کا ایک ظل ہوتی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ اس کی مالی حیثیت کچل دینے کے لئے ایسے قوانین بنا دیئے جاتے ہیں کہ روز بروز محکوم قوم افلاس کے گڑھے میں گرتی رہے اور اس کی سیر چشمی استغناء اور غیرت وحمیت کا خون اس گڑھے کے کناروں پر بہتا رہے تا آنکہ اس افلاس و بے مائیگی کی بے چارگیوں میں اس کا ایمان سستے داموں خرید لیا جائے اور انجام کار خودداری واستغناء کا اس میں تصور بھی باقی نہیں رہتا۔ جب تک کہ وہ خود مشکلات کا مقابلہ کر کے اسے باقی رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ حیثیت عرفی اور ساکھ مٹانے کے لئے اسکے قوائے عمل کم مرتبہ امور اور ذلیل پیشوں میں مصروف کر دیئے جاتے ہیں۔ ملک کی اونچی سوسائٹی اور بلند عہدوں میں نہ خود اس کی جگہ رہتی ہے نہ اس کا اپنا علمی واخلاقی سرمایہ ہی کوئی اونچا مقام حاصل کر سکتا ہے۔۔۔۔ اور آخر کار اس غلامی کی پیدا کردہ جہالتوں اور بداخلاقیوں نیز حکمران قوم کی مخفی خواہش و مساعی کی بدولت محکوم قوم کے باہمی روابط بھی خراب ہو جاتے ہیں اور بیرونی تعلقات بھی مضمحل پڑ جاتے ہیں اسے اپنوں سے منقطع کر کے ایسا بے دست وپا کر دیا جاتا ہے کہ کوئی اس کا ہمنوا باقی نہیں رہتا اور اس کی ساری زندگی حکمران قوم کے رحم وکرم پر دائر ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کے داخلی اور خارجی وسائل منقطع ہو جائیں جس کی بقاء وترقی کے مادی معنوی اسباب مفقود ہونے لگیں اس کے مریض جسم وروح کے گھل گھل کر قریب بہ مرگ ہو جانے میں تامل کسے باقی رہ سکتا ہے؟

چونکہ غلامی یہ چار مہلک اسباب اپنے ساتھ لاتی ہے جس سے قوموں کے تختے الٹتے ہیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے غلامی کو بدترین عذاب فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کی اس غلامی کا جو فرعون اور قبطیوں کی آقائی سے پیدا ہوئی۔ قرآن نے ذیل کے الفاظ میں تذکرہ فرمایا ہے۔

وَاِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ. (القرآن)

”وہ وقت یاد کرو (اے بنی اسرائیل) جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی جو کہ تمہیں بدترین عذاب (غلامی) کا مزہ چکھاتے تھے“۔

علم کی تباہی

چنانچہ فرعونی قوم نے فاتح بن کر بنی اسرائیل کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کیا جو ہر آقا قوم اپنی غلام قوم کے ساتھ اختیار کرتی ہے۔ یعنی غلامی کے عناصر اربعہ پورے ہو کر رہے۔ سب سے اول بنی اسرائیل کا آبائی علم ختم ہوا۔

فرعون کو کیا ضرورت تھی کہ بنی اسرائیل کی روایتی تعلیم کو رواج دیتا۔ اس کی اشاعت کے

لئے مدارس جاری کرتا یا ابراہیمی اور اسرائیلی طریق زندگی کے مطابق تربیت گاہیں قائم کرتا ورنہ اس کی خدائی کو کب فروغ حاصل ہوتا؟ اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہی ہونا تھا کہ ان کے اسلاف اولین جب تک زندہ رہے پیغمبروں کی پندونصائح بھی انکے ذہنوں میں زندہ رہیں۔ جوں جوں وہ رخصت ہوتے گئے اسی حد تک وہ روایتیں بھی ختم ہوتی رہیں تا آنکہ بنی اسرائیل کے افق پر جہالت کی گھنگھور گھٹا چھا گئی جسے فرعون نے بڑھا چڑھا کر انتہاء تک پہنچادیا تاکہ وہ اپنی خاندانی روایات کو سرے سے بھول جائیں اور ان میں قومی خوداختیاری کا احساس پیدا نہ ہو۔

یہی توجہ ہے کہ غلامی سے نجات پانے کے بعد بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے ایک قانون زندگی کے علم و عمل کی درخواست کی اور تورات لا کر دی گئی جس سے واضح ہے کہ ان کے پاس کوئی قانون اور اس کا علم باقی نہ تھا ورنہ اس درخواست کی ضرورت نہ ہوتی۔ چنانچہ یہی برس ہا برس کی جہالت اور مصری بت پرستوں کی صحبت جو زمانہ غلامی کی یادگار تھی۔ باوجود صحبت موسی کے پھر بھی جاہلانہ حرکات پر انہیں کہ گاہ بگاہ آمادہ کر دیتی تھی۔ اریحاء پر گزر ہوا اور گائے کی صورت کے پیتل کے بت پجتے ہوئے دیکھے تو جھٹ فرمائش کر دی کہ۔

يَامُوْسٰى اجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ.

"اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایسا ہی خدا بنا دیجئے جیسے (ان اریحاء والوں) کے خدا ہیں"۔

جس پر موسیٰ علیہ السلام نے ان کی جہالت کا پردہ یہ کہہ کر فاش کیا کہ۔

اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ.

"تم ایسی قوم ہو جو جہالت کی باتیں کرتی ہے"۔

اس پر بھی جہالت کا یہ عالم تھا کہ جب سامری نے سونے چاندی کا بچھڑا بنایا تو قوم کا ایک بڑا حصہ اسی کی پوجا پاٹ میں مصروف ہو گیا۔ نہ انہیں موسیٰ علیہ السلام کی آنکھیں یاد رہیں نہ ان کے توحیدی پندونصائح کا کوئی دھیان رہا۔ ایمان باللہ کے لئے کہا گیا تو کہنے لگے کہ ہم تو اس وقت تک ایمان نہیں لا سکتے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔

کلام الٰہی کی خبر دی گئی تو بولے کہ ہم کلام خداوندی کو کیسے مانیں جب تک کلام خود نہ سن لیں۔۔۔ توریت لا کر دی گئی تو عبادت کے لئے آمادہ نہ ہوئے حتی کہ پہاڑ سروں پر لا کھڑا کیا گیا کہ مانو ورنہ کچل دیئے جاؤ گے۔ تب کہیں عمل پر آمادہ ہوئے۔

غرض برس ہا برس کی جہالت کا یہ اثر تھا جو زمانہ غلامی کی یادگار تھا کہ ان کا تصور جب کبھی جاتا تو اللہ کی بجائے غیر اللہ ہی کی طرف جاتا تھا۔ معنویت کی بجائے صورت و حسیات کی طرف اور لطیف و خبیر خدا کی جگہ محسوس و مصور خدا ہی کی طرف طبائع چلتی تھیں جو لاعلمی کا قدرتی نتیجہ ہے۔

حیثیت عرفی کی بربادی

ادھر جب کہ اپنا علم نہ رہا اور ہوتا تو اس کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی جب کہ حکومت اس علم کی نہ تھی تو مالی حیثیت کیسے درست رہ سکتی تھی۔ مفلس ونادار ہوئے۔ احساس خودداری نہ رہا۔ اولاً تو مجبور ہو کر اور بعد میں خود طبیعت کی جدید افتاد سے ذلیل خدمات سے پیٹ پالنا شروع کیا۔ یعنی چپراسی' خانساماں' بیرا' مزدور وغیرہ بن کر گزران کی اور اونچی سوسائٹی میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ رہی حتی کہ وہ اسی کو بہت کچھ جاننے لگے۔

فرعون کی سیاست نے صورت حال یہ کر دی کہ قبطیوں کے لئے تمام اونچے عہدے تھے بڑی بڑی تنخواہیں تھیں۔ زمینداریاں تھیں اور سبطیوں کے لئے یہ ذلیل خدمات تھیں۔ وہ مثل اچھوت کے تھے جیسا کہ آیت گزشتہ میں یَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ کا یہی مفہوم سامنے آچکا ہے۔ ہاں سبطیوں میں سے اگر کوئی ترقی پا سکتا تھا تو نہ اپنے خاندانی علم وروایات کے لحاظ سے بلکہ وہی فرعونی حکومت کے قانون کے علم سے۔ چنانچہ قارون بنی اسرائیل میں سے تھا اور ایک روایت کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کے بنی اعمام میں سے تھا۔ فرعون کا پیش کار بنا۔ اس کا علم کوئی پیغمبری علم نہ تھا۔ ورنہ اس علم سے اسے یہ عہدہ فرعونی حکومت میں کیسے مل سکتا تھا بلکہ وہ علم وہی غیر سماوی علم تھا جو فرعونی ماحول کا نتیجہ تھا۔ قرآن نے اسی علم کی طرف قارون کے قول میں اشارہ فرمایا جب کہ اس نے کہا تھا۔

إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي.

"یہ مال ودولت مجھے میرے علم وہنر کے بدولت دیا گیا ہے جو خود میرا اپنا ہے"۔

جو ظاہر ہے کہ فرعون کے عہد کے رائج شدہ رسمی علم کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا تھا ورنہ یہ عزت افزائی ممکن نہ تھی بلاشبہ اس کے لئے مال اور خزائن کے دروازے کھل گئے اور اس نے بے شمار مال سمیٹا جس کی قرآن نے شہادت دی ہے اس سے واضح ہے کہ مسلط طاقت چونکہ اپنا تمدن اپنا کلچر اور اپنا علمی سرمایہ پھیلاتی ہے' اس لئے مفتوح اقوام کے علوم کی حوصلہ افزائی کے دروازے بند کر کے اعزاز وتکریم سب اپنے ہی رائج کردہ علم کے لئے مختص کر دیتی ہے تاکہ اس کا کلمہ گھر گھر میں داخل ہو جائے اور محکوم قوم کی حیثیت عرفی' حیثیت اقتصادی سب اس نئے علم کے تابع ہو جائے اور محکوم قوم اس علم سے عزت بھی پائے تو اپنی نہیں بلکہ فاتح کی عزت کا سایہ حاصل کرے۔

اقتصادی تباہی

اور اسی غلامی کی بدولت بنی اسرائیل کی عام اقتصادی حالت بھی تباہ ہوئی۔ چنانچہ بنی اسرائیل جب مصر سے بھاگ کر نکلے تو اپنے قبطی محلّہ داروں سے ہی ان کا زروزیور لے کر باہر جانے کی ان میں ہمت ہوئی جو بنام قرض وعاریۃً لیا گیا ورنہ اگر خود اپنا مال ومتاع کافی ہوتا تو انہیں اسے ہی منگوانے سے فرصت نہ ملتی' اگر ان کی اپنی اقتصادی حالت اعلیٰ ہوتی تو کیا وہ

اسی طرح مفلس وقلاش ہوتے جس کا انہوں نے مصر سے ہجرت کرتے ہوئے ثبوت دیا۔

خارجی تعلقات سے محرومی

پھر بیرونی تعلقات بھی بنی اسرائیل کے منقطع تھے حتیٰ کہ خود ان کا اصل وطن اور ابراہیم علیہ السلام کا مدفن (شام اور بیت المقدس) تک ان کے لئے اجنبی ہو گیا تھا اگر وہ خود اپنے وطن جا سکتے اور وہاں کا رابطہ قائم رہتا تو موسیٰ علیہ السلام کو اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کے فرمان پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی پس نہ وہ جا سکتے تھے نہ عزت سے رہ سکتے تھے اور اسی کے لئے بعد نجات فتح بیت المقدس کے لئے انہیں مستقلاً ارض مقدس پہنچنے پر آمادہ کیا گیا اور کہا گیا۔

یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ.

”اے قوم! ارض مقدس میں داخل ہو جسے اللہ نے تمہارے حصہ میں لگایا ہے“۔

بہر حال فرعون کی حکومت نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر ان کی علمی حیثیت اور تعلیمی منصب کو برباد کیا جس سے ان میں قومی روایات باقی نہ رہیں۔ ان کی منصبی حیثیت باطل کی جس سے اس میں احساس خودداری باقی نہ رہا۔ ان کی اقتصادی حالت برباد کی جس سے ان میں استغناء نہ رہا جو اخلاق فاضلہ کی اساس ہے۔ ان کے تعلقات ساری دنیا سے منقطع کئے رکھے حتیٰ کہ ان کے وطن اصلی سے بھی انہیں منقطع کر دیا جس سے ان میں غربت اور بے کسی قائم ہو گئی۔

برطانیہ کا طرز عمل

اگر حقیقۃً یہ چار چیزیں غلامی کے عناصر اربعہ ہیں اور ضرور ہیں کہ قرآن حکیم نے ان کی طرف اشارے کئے ہیں تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہندوستان کے مسلمان غلام نہیں ہیں؟ اور کیا ان پر ایک اجنبی شہنشاہی مسلط نہیں؟ ضرور ہے اور جب ایسا ہے تو کیا فی الحقیقت مسلمان بلکہ تمام ہندوستانی باشندوں کے ہاتھ پیروں میں غلامی کے انہی ارکان اربعہ کی چار میخیں ٹھکی ہوئی نہیں ہیں؟ ضرور ہیں اور بلا شبہ خصوصیت سے مسلمانوں کو ان چار مقاصد کے لحاظ سے اس وجہ سے زیادہ کچلنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حکومت ان کے ہاتھوں سے چھینی گئی تھی۔

پس سب سے پہلے مسلمانوں کی روایتی تعلیم برباد کرنے کی کوشش کی گئی؟ کہا گیا کہ جب تک یہ قرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے ان کا مذہبی جنون کم نہیں ہو سکتا، جب تک اسلامی روایات ان کے ذہنوں میں زندہ ہیں یہ احساس خودداری سے بیگانہ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ابتدائے عہد حکومت میں تو مسلط حکومت نے مسلمانوں ہی کے طرز تعلیم جاری رکھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جدید طریق تعلیم رائج کر کے قدیم تعلیم اور طرز تعلیم کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

مسلمانوں کا نظام تعلیم برباد کرنے کی برطانوی سازش

اس سلسلہ میں خود انگریزوں کی شہادت زیادہ وقیع ہو سکتی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور چہار گانہ شعبہ ہائے زندگی میں انہیں کس درجہ تک کچلا ہے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر آئی۔ سی۔ ایس بنگال نے ۱۸۷۱ء میں کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" لکھ کر اس سلسلہ کے بہت سے حقائق سرکاری کاغذات سے واشگاف کر دیئے ہیں۔ موصوف مسلمانوں کی تعلیمی سلسلہ کی بابت ایک جگہ لکھتا ہے۔

"ہم اپنے دور حکومت کے پچھلے ۷۵ سالوں میں انتظام ملک کی خاطر اسی طریقہ تعلیم (مسلمانوں کے طرز تعلیم) سے متواتر فائدہ اٹھاتے رہے۔ گو اس دوران ہم نے اپنا طریقہ تعلیم بھی رائج کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر جونہی ایک نسل اس نئے طریقہ سے ماتحت پیدا ہو گئی۔ ہم نے مسلمانوں کے پرانے طریقہ کو خیر باد کہہ دیا جس سے مسلمان نوجوانوں پر ہر قسم کی سرکاری (سیاسی) زندگی کا دروازہ بند ہو گیا"۔

(ہمارے ہندوستان مسلمانی صفحہ ۲۴۷)

پھر اسی ہنٹر کی کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ ۔
مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا دارومدار معافیات اور اوقاف پر تھا جو اسی مقصد تعلیم کے لئے مسلمان امراء اور حکام وقف کر جاتے تھے۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ ۔

"صوبہ ل پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افسر مال (مسٹر جیمز گرانٹ) کا بیان ہے کہ اس وقت تخمیناً صوبہ کی آمدنی کا ایک چوتھائی حصہ (جو ان معافیات کے سلسلہ میں تھا) حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا ۱۷۷۲ء میں وارن ہسٹنگز نے ان علاقوں کی واپسی کی مہم شروع کی مگر ناکام رہی ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو اٹھایا مگر اس وقت کی طاقتور حکومت بھی اس پر قابو نہ پا سکی۔ بیالیس برس بعد ۱۸۱۹ء میں حکومت نے پھر اس معاملہ کو زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرات نہ ہوئی۔ آخر کار ۱۸۳۸ء میں ۸ لاکھ پونڈ کے خرچ و مقدمات چلا کر ان معافیات اور اوقاف تعلیم پر حکومت نے قبضہ پالیا اور صرف ان معافیات سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ گویا تقریباً ۴۵ لاکھ روپے کا اضافہ ہو گیا"۔

یہ آمدنی جب مسلمانوں کے قدیم صیغہ تعلیمات کے ہاتھ سے نکل گئی اور تعلیم قدیم کا

اسٹاف اس سے محروم ہو گیا تو ڈبلیو' ڈبلیو ہنٹر کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۔

"سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار انہی معافیات پر تھا' تہ وبالا ہو گیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے"۔

(کتاب ہمارے ہندستان مسلمان صفحہ ۲۵۷)

آگے چل کر لکھتا ہے۔

"لیکن مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جاسکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کے چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائیداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو ل میں ان کے پاس آج بھی نہایت اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے"۔ (ایضا صفحہ ۲۵۷)

اندازا کیجئے کہ اسلامی حکومت میں جب ایک صوبہ میں تعلیمات پر ۴۵ لاکھ روپیہ صرف ہوتا تھا تو دوسرے صوبوں میں کیا کچھ ہوتا ہوگا اور جب ۴۵ لاکھ کی رقم ایک صوبہ سے اڑائی گئی تو دوسرے صوبوں سے آمدنی کیا کچھ ہوتی ہوگی اور اس سے جدید تعلیم کی ترویج میں کس درجہ مدد ملی ہوگی۔

پھر جدید تعلیم اور جدید طریقہ تعلیم رائج کیا گیا اس میں مسلمانوں کے رجحانات کی رعایت کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ انگریز اپنے رجحانات رائج کرتے یا مسلمانوں کے رجحانات کی پرواہ کرتے جن کے مٹانے ہی کے لئے قدیم تعلیم مٹائی گئی تھی۔ اس لئے مذہبی تعلیم کا کوئی جزو اس تعلیم میں رکھا گیا ہنٹر ایک جگہ اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبہ کی غیر معمولی قلت کی وجوہات گناتے ہوئے لکھتا ہے۔

"تیسرے ہمارے طریقہ تعلیم میں نوجوان مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں"۔ (کتاب مذکور صفحہ ۲۵۲)

آگے چل کر اس سے زیادہ صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ ۔

"ایک اعلیٰ افسر لکھتا ہے کیا اسکے بعد بھی یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ مسلمان اس طریقہ تعلیم سے پرہیز کر رہے ہیں جو ان کے طبعی رجحانات کے لئے کوئی رعایت نہیں رکھتا۔ نہ اس تعلیم کا کوئی انتظام کرتا ہے' جس کو وہ اپنے لئے از حد ضروری سمجھتے ہوں بلکہ جو قطعی طور پر ان کے مفاد کے خلاف ہے اور ان کی جماعتی روایات کے باطل برعکس ہے"۔ (کتاب مذکور صفحہ ۲۵۳)

بہر حال مسلمانوں کی قدیم تعلیم مٹا کر اور جدید تعلیم کو اسلامی رجحانات سے کلیۃً خالی رکھ کر مسلمانوں کو جس تعلیم میں لگایا گیا اس کا مقصد لارڈ میکالے کے مشہور الفاظ میں اس کے سواء کیا تھا کہ:۔

"ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے لحاظ سے انگریز ہوں"۔

چنانچہ یہ ثمرہ نمایاں ہو گیا آج اس تعلیم کے بعد کون سا ہندوستانی ہے جو مشرقیت یا ایشیائیت کا دلدادہ ہو۔ تہذیب انگریزی' تمدن انگریزی' لباس انگریزی' خیالات انگریزی' عقائد انگریزی اور مذہب تک انگریزی ہے۔

برطانیہ کی لوٹ کھسوٹ

بہر حال مسلمان علم سے تو یوں گئے اب مالی حیثیت ہو سکتی تھی جس سے دنیا میں انہیں فارغ بالی ہو سکتی تو اس کو ختم کر ڈالنے کی انتہائی سعی یہ کی گئی کہ صوبہ ل کے متعلق ہنٹر کہتا ہے۔

"آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے ل کے خاندانی مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ غریب ہوں لیکن آج کل یہ ناممکن ہے کہ وہ بدستور امیر رہیں"۔

(کتاب مذکور صفحہ ۲۲۱)

آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"گزشتہ پچھتر سال سے ل کے مسلمانوں کے گھرانے (وسائل دولت منقطع کر دیئے جانے کے سبب) یا تو صفحہ ہستی سے بالکل نابود ہو گئے ہیں یا ان لوگوں کے مقابلہ میں حقیر اور پست ہیں جن کو ہماری حکومت نے (وسائل دولت سے) سربلند کیا ہے"۔

اسی کتاب کے صفحہ ۲۲۶ پر ۱۷۶۳ء کے دوامی بندوبست کے بارے میں جو اس وقت مسلمانوں کو کچلنے کے لئے حکومت کی ایک خاص پالیسی کے تحت کیا گیا لکھتا ہے۔

"بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پر فریب تھی کہ اس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو"۔

اس پر فریب پالیسی کا اثر کیا ہوا؟ خود کہتا ہے:۔

"اس بندوبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمین دار بنا دیا ہے ان کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اس دولت کو سمیٹ رہے رہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا

حق تھا"۔ (صفحہ ۲۲۴)

آگے آخری نتیجہ لکھتا ہے جو اس سارے تغیر و تبدل کا انتہائی مقصد تھا۔

"مثلاً خود مختار تعلق داروں کی علیحدگی ہی سے بہت سے مسلمان خاندانوں کی عظمت خاک میں مل گئی"۔ (صفحہ ۲۲۷)

اس دور میں مسلمانوں کی آمدنی کے دو ہی بڑے ذرائع تھے محکمہ فوج اور محکمہ دیوانی دونوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کئے گئے تا کہ وہ مالی حیثیت سے انتہائی طور پر پست ہو جائیں۔ ہنٹر لکھتا ہے۔

"ہم نے مسلمان امراء کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہماری عافیت ان کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے ہم نے ان کو دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لئے خارج کر دیا کہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لئے ازحد ضروری تھا"۔ (صفحہ ۲۳۸)

آگے ملازمتوں اور عہدوں کا ایک نقشہ دیا ہے جس میں مسلمانوں کو دوسری اقوام ہند کے مقابلہ میں میں صفر کے برابر کر دیا گیا۔ جب ان پر خود ان کے علم کے دروازے ہی بند کر دیئے گئے اور دولت بھی ان کی پر فریب طریقوں اور کھلے اندازوں سے چھین لی گئی تو ظاہر ہے کہ ان کا وقار منصب اور حیثیت عرفی کیا باقی رہ سکتی تھی۔

چنانچہ ہنٹر لکھتا ہے کہ

'دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپراسی' دواتوں میں سیاہی ڈالنے یا قلموں کو ٹھیک کرنے والے کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں"۔

(صفحہ ۲۳۶)

وہاں جو ان کی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر دل و دماغ انہیں دینے پر پختہ ہو گیا اور اس نے حکومت کی ڈگریاں حاصل کر لیں وہ بلا شبہ ان کا منظور نظر ہوا۔ اس نے مالی حیثیت سے ترقی کی اور غلامی کے باوجود کچھ مناصب پائے' جیسا کہ قارون بھی فرعون کے دربار میں بار پا گیا تھا۔ ان اقتباسات کو پڑھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہنٹر نے یہ احوال صوبہ ل کے متعلق پیش کئے ہیں۔ ہندوستان کے بقیہ خطوں کو ان پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ چونکہ اولاً صوبہ ل ہی کی سرداری انگریزوں کے قبضہ میں آئی' اس لئے انہوں نے سب سے اول صوبہ ل ہی کو تباہ و پامال کیا اور غداری سے تباہ کیا۔ جس کا ہنٹر کو کھلا اقرار ہے۔ جب ان کی روش ایک صوبہ میں یہ رہی اور ایک مقرر شدہ پالیسی کے ماتحت یہ صورتیں عمل میں آئیں جو حکومت کی پالیسی تھی تو کیسے ممکن تھا کہ یہ پالیسی دوسری صوبوں

میں بدل جاتی۔ لہٰذا جہاں بھی یہ حکومت پہنچتی وہ ایسا ہی کرتی چنانچہ اس کا جواب ہنٹر ہی اپنے الفاظ میں دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

"میں یہ بھی بتادوں کہ میرے بیانات کا تعلق جنوبی ل سے ہے کہ کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اٹھایا ہے۔ پھر میں اگر دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہے کہ یہ بیانات مسلمانان ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف کیا جائے"۔ (صفحہ ۲۱۰)

اس سے واضح ہے کہ یہ حال صرف صوبہ ل ہی کا نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا ہے۔ ل صرف نقش اولین کا محل رہا ہے۔ نقش ثانی اس سے زی زیادہ مکمل ہو کر دوسرے صوبوں میں پڑا۔

ہندوستانی مسلمانوں کو عالم اسلام کی حمایت سے محروم رکھنے کے لئے برطانیہ کا گھناؤنا کردار

بہر حال ہندوستان کے مسلمانوں کی داخلی حالت تو علم "دین" دیانت منصب' دولت کے لحاظ سے اس طرح برباد کی گئی۔ مگر خارجہ پالیسی اس سے بھی زیادہ برباد کن رہی ہے کیونکہ یہ ممکن تھا کہ وہ مسلمانوں کے بیرونی تعلقات اس داخلی پالیسی پر کسی وقت اثر انداز ہوتے۔ کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق بیرونی دنیائے اسلام سے بھی تھا اور افغانستان سے لے کر ٹرکی تک مسلمانوں کی حکومت کا ایک مستقل سلسلہ قائم تھا احتمال تھا کہ وہ باہر سے ان کے لئے کوئی وزن دار آواز اٹھاتے یا کسی قسم کی اخلاقی یا مادی مدد دیتے۔ اس لئے پوری دنیائے اسلام کو کمزور کرنے کے لئے تمام ممکن ذرائع استعمال کئے گئے اور ان کے لئے بہت سے ایسے غم مہیا کئے گئے جن میں وہ مبتلا رہیں۔

چنانچہ اختلافات وغیرہ کی جو خلیج داخل ملک میں حائل کی گئی وہی پوری دنیائے اسلام میں بھی رائج کی گئی۔ کہیں ایران وافغانستان کا مسئلہ' کہیں ایران وٹرکی کا مسئلہ' کہیں ٹرکی وعربستان کا مسئلہ' کہیں شام وفلسطین کا مسئلہ' کہیں خلافت اسلامیہ کا مسئلہ۔ چنانچہ اس آپس کی آویزش سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف ٹرکی کے حصے بخرے ہوتے رہتے تھے۔ دوسری طرف خلافت اسلامیہ کے مٹانے کا مسئلہ چھڑا رہتا تھا۔ کہیں افغانستان پر دانت رہتا تھا۔ کہیں ایران جو بالاخر ہضم ہو کر رہا خلافت مٹ کر رہی۔ ایسے ایسے مسلمان کھڑے کئے گئے جو ان مسائل کو خود اٹھاتے اور آخر میں فیصلہ برطانیہ کے ہاتھ میں آجاتا۔ برطانوی شہنشاہی سے دوستی کے رنگ میں وہ احکام صادر ہوتے جس سے نہ مدعی باقی رہتا نہ مدعا علیہ بلکہ دونوں کی میراث جج کے ہاتھ میں آجاتی۔۔۔۔

آزادی پسند مسلمانوں کو بدنام کرنے کی اسکیم

ادھر ہندوستان میں جن دردمندوں نے دین اور ملک کی آزادی کے لئے آوازی کے لئے آواز اٹھائی اور کھڑے ہوئے تو ان کے تعلقات عام مسلمانوں سے منقطع کرنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کی گئیں۔ سو وہ ہنٹر کے کتاب دیکھنے سے واضح ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ادنیٰ درجہ کی تدبیر یہ تھی کہ ان آزادی پسند جماعتوں کو حسب بیان ہنٹر انگریزوں کی طرف سے باغی اور آخر میں وہابی کا لقب دے کر بدنام کرنے کی مہم جاری کی گئی جس کی تفصیلات اس کتاب کے پڑھنے سے واضح ہو سکتی ہے۔ یہ اسکیم عملاً آج تک جاری ہے۔ اب کیا کوئی اس کے خلاف بھی یقین کر سکتا ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہند کی پوری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی حکومت' ثروت' شوکت' حشمت اور دولت اور دیانت و دین اندرون و بیرونی تعلقات میں جو گھن لگا اور وہ بالآخر ان تمام چیزوں کو کھا گیا وہ برطانوی شہنشاہی اور اس کے نظام حکومت کے سوا کوئی اور چیز تھا؟

پس فرعون نے جو معاملہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا کہ انہیں ان کے علم سے بے بہرہ کیا پھر ان کی دولت کے چشمے خشک کئے پھر ان کی حیثیت عرفی زائل کر کے انہیں قلی' چپراسی' اور معمولی خدمت گاروں کے درجہ پر پہنچایا اور پھر ان کے تعلقات باہمی و بیرونی منقطع کئے وہی معاملہ برطانوی شہنشاہی نے مسلمانوں کے ساتھ کیا جس کی تفصیلات میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب سے خود انگریزوں کے مسلمات پیش کر چکا ہوں۔ غلامی کے ان اثرات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ غلامی پر کسی غلام قوم کا قناعت کئے رہنا موت کے مترادف نہیں ہے؟ اس لئے قرآن نے اس بدترین عذاب اور اسے برپا کرنے والوں کو بدترین طاغی اور سرکش کا لقب دیا ہے۔ جیسا کہ آیت بالا کے ابتدائی کلمات ہی سے واضح ہو گیا۔

بنیادی مسئلہ

ساتھ ہی یہ چیز بھی نمایاں ہو گئی کہ مسلمانوں کے لئے بنیادی مسئلہ نہ رفع جہالت کا ہے نہ اقتصادیات کا نہ اپنے اور ابنائے وطن کے تعلقات کا نہ منصبی اور عرفی حیثیت کا بلکہ اصل مسئلہ ان سب مصائب کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کا ہے اور وہ غلامی ہے جس کا ایک سرا ہندوستان کے مسلمانوں کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور دوسرا سرا پوری دنیائے اسلام کے گلے میں ہے۔ آج ہندوستانی مسلمانوں اور پوری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر قانونی اور بین الاقوامی قوانین کی جکڑ بندیوں اور ساتھ ہی اندرونی ریشہ دوانیوں کی پھانسیاں لٹکی ہوئی ہیں جو دنیائے اسلام کو پنپنے نہیں دیتیں جس میں بلاشبہ ایک ہی ہاتھ کام کر رہا ہے اور وہ برطانوی شہنشاہی اور استبداد و استعباد ہے جس کی گرفت کھول دینے کی ضرورت ہے۔

اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لئے نہ اولاً تورات اترنے کی دعا کی جس سے ان کا تعلیمی مسئلہ متعلق تھا نہ ان کی اقتصادی حالت کی طرف کچھ زیادہ توجہ فرمائی جس سے مالی حالت

درست ہوتی نہ اور امور کی طرف زیادہ التفات فرمایا جن سے حیثیت وعزت کا تعلق تھا بلکہ سب سے اول ان مفاسد کے سرچشمے (غلامی) کی جڑ پر تیشہ لگایا اور فرعون کو خطاب کیا کہ ؂

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ.

"بنی اسرائیل کو آزاد کر اور میرے ساتھ بھیج"۔

تاکہ یہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں اور اپنی مذہبی اور سیاسی تعمیر باختیار خود کرنے پر قادر ہو جائیں۔

پس آج بھی ہندوستانیوں کے لئے بنیادی مسئلہ آزادی ہند اور آزادی دنیائے اسلام کا ہے جو آزادی ہند سے متعلق ہے تاکہ مسلمانان عالم اپنے دین ومذہب' اپنی سیاست اور اپنی اقتصادی و معاشرتی حالت کو اپنی مرضی کے مطابق درست کر سکیں۔ پس مسلمانوں کے لئے حصول آزادی کی جدوجہد کوئی رسمی سیاست نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لئے انہیں اپنی پوری اجتماعی قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

جدوجہد آزادی ایک مذہبی فریضہ

(۳) ادھر جب کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا یعنی ان کی بعثت کی اولین غرض ہی یہ تھی کہ فرعون کے پاس جا کر کہو ؂

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ.

"کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے اور غلامی کے عذاب سے انہیں نجات دے"۔

تو آیت سے صراحۃً یہی واضح ہوا کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لئے جدوجہد ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لئے مستقلاً ایک اولوالعزم پیغمبر کی معیت عمل میں آئی کیا اس آیت کی رو سے ہمارے لئے استخلاص اور تحصیل آزادی کی جدوجہد تقریباً ضروری اور ایک دینی وظیفہ نہیں ٹھہرتی؟ اگر اس وقت کی مصر کی اجنبی حکومت سے بنی اسرائیل کی آزادی تقریباً ضروری تھی تو آج ہندوستان کی اجنبی حکومت سے بھی مسلمانوں کی آزادی مذہباً ضروری ہے۔

بہرحال اس آیت اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ سے غلامی کا اپنی ذات اور آثار کے لحاظ سے امر قبیح ہونا بھی واضح ہوا اور ساتھ ہی اس کے دفعیہ کی جدوجہد کا مشروع اور وظیفہ شرعی ہونا بھی نمایاں ہو گیا۔

حصول آزادی کا پروگرام

اس کے بعد حصول آزادی کے پروگرام کا سلسلہ رہ جاتا ہے تو قرآن نے انہی آیات میں اصولاً اس پر بھی روشنی ڈال دی ہے۔ چنانچہ اس خطاب خداوندی اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ سے جو بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے سلسلہ میں موسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ازالہ غلامی کی تدبیر کے وقت اولاً

غلام قوم کو اس مرض کے سرچشمہ کی طرف نظر دوڑانی چاہئے کہ یہ غلامی کے جراثیم چلتے کہاں سے ہیں؟

آیت نے واضح کیا کہ بنی اسرائیل کی غلامی کا سرچشمہ فرعون کا طغیان تھا۔ جس کے رکن تھے استبداد اور استعباد۔ استبداد کے ماتحت اس نے اپنی شخصی حاکمیت مطلقہ کا جال پھیلا رکھا تھا جس کا انتہائی ثمرہ اس کا دعوائے الوہیت تھا جس میں حاکمت مطلقہ کے تمام حقوق اس نے اپنے لئے ثابت کئے اور کہا۔

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى

"میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں"۔

پھر اپنے سوا ہر ایک غیر سے اس منصب کی نفی کرتے ہوئے کہا۔

ماعلمت لکم من الٰہ غیری.

"میں اپنے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں سمجھتا ہوں"۔

پھر جس ذات بابرکات کا یہ واقعہ تنہا حق تھا یعنی حق جل مجدہ' اس سے نہ صرف مقابلہ ہی کی ٹھانی بلکہ معاذ اللہ اس کی الوہیت کو بزعم خود مٹانے پر تل گیا اور اپنے وزیر ہامان سے کہا۔

فاوقد لی یاھامان علی الطین فاجعل لی صرحاً لعلیّ اطلع الی الٰہ موسیٰ وانّی لاظنہٗ من الکٰذبین.

"تو اے ہامان! تم ہمارے لئے مٹی کو آگ میں پکواؤ (یعنی پختہ اینٹیں بنواؤ) پھر میرے واسطے ایک عمارت بنواؤ تاکہ میں موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں"۔

اور استعباد کے ماتحت بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کا جذبہ تھا جو فرعون میں کام کر رہا تھا۔ قرآن نے موسیٰ علیہ السلام کے مقولہ کے ضمن میں اس کی بھی حکایت فرمائی اور کہا۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَىَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ.

"اور (مجھے پرورش کرنے کا احسان جتلانا)"

سو وہی یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ (اس کے بدلہ میں) تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا (حالانکہ وہ نعمت نہیں وہ بھی تیرے ظلم ہی کا نتیجہ تھا نہ تو بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرتا نہ میری ماں مجھے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہاتی نہ وہ تیرے محل میں پہنچتا اور نہ تو مجھے پرورش کرتا۔ پس میری پرورش کا منشاء قتل اولاد بنی اسرائیل تھا جو تیرا انتہائی ظلم تھا۔

برطانیہ" کا جمہوری استبداد ان آیات سے واضح ہے کہ استعباد (بنی اسرائیل کی غلام سازی کا) منشاء فرعون کا استبداد یعنی اس کی شہنشاہی تھا جس پر موسیٰ علیہ السلام کو اِنہ' طَغٰی سے متنبہ فرمایا گیا۔

اسی طرح آج غلام ہندوستان کو محسوس کرنا چاہئے کہ اس کی غلامی کا منشاء برطانوی شہنشاہی

اور اس کا استبداد ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں استبداد شخصی تھا یہاں قومی ہے۔ وہاں انفراد تھی یہاں اس پر جمہوریت کا پردہ پڑا ہوا ہے، مگر استبداد و استعباد کا جذبہ وہی ہے جو فرعون میں کار فرما تھا۔ فرعون نے اگر ملک مصر کی سلطنت پر مغرور ہو کر خدائی کا دعویٰ اور خدائے برترے سے مقابلہ کی ٹھانی تو آج کی یورپین مغرور بدمست قومیں بھی اسی سر یر آرائی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر خدائے حقیقی کے مقابلہ پر پڑی ہوئی ہیں۔ بالشویک کے ہاتھ میں طاقت آئی تو انہوں نے بالفاظ خود اپنی سلطنت میں خدا کا داخلہ ممنوع قرار دیئے جانے کا اعلان کیا۔۔۔ جرمنوں کے ہاتھ میں خدا کی بخشی ہوئی حکومت آئی تو انہوں نے وطنی تعصب کے جذبہ سے کہا کہ اگر خدا جرمن ہوتا تو جرم قوم اسے مان سکتی تھی۔ برطانیہ کے ہاتھ میں وسیع ملک آیا تو اس کے بعض ذمہ داروں نے اپنی سلطنت کے طول عرض کو دیکھ کر کہا تھا کہ اگر آسمان بھی ہمارے ملک پر گرنا چاہے گا تو ہم اپنی سنگینوں کی نوک پر اسے رکھ لیں گے۔

غرض یہ استبدادی دعوے وہی ہیں جو فرعون نے کئے تھے۔ ادہر جو استعبادی جذبہ اس کا تھا وہی آج کی بدمست اقوام کا بھی ہے جس کے ماتحت آج دنیا کی اقوام کو غلام بنائے رکھنے اور بنائے جانے کے منصوبے گانٹھے جاتے رہتے ہیں اور اس معاملہ میں آپس میں سودا بھی ہوتا رہتا ہے جو کہیں کھلے قبضہ کی صورت میں کہیں انتداب کی صورت میں اور کہیں مداخلت اور داخلی اثرات کی صورت میں نمایاں ہے اور یَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ کا وہی ظہور ہو رہا ہے جو فرعون کے وقت میں ہوا تھا۔ غرض سرچشمہ غلامی یہاں سے متعین ہو جاتا ہے۔

پیغمبرانہ قیادت کی ضرورت

(۵) بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کا کا انتخاب اور مبعوث من اللہ ہونا اور انہیں: اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ کا حکم دیا جانا اس کی صاف دلیل ہے کہ آزادی کا راستہ طے کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر اختراعی راستے نہیں بتاتا بلکہ وحی الٰہی سے پیش کرتا ہے جس سے خدا کا بتلایا ہوا پروگرام سامنے آتا ہے۔ اس نکتہ کے ماتحت حصول آزادی کے تمام سیاسی نظریات و فکریات جو اختراع محض سے منصہ ظہور پر آتے ہیں اور آرہے ہیں۔ ختم ہو جاتے ہیں اور منشاء خداوندی یہ نکلتا ہے کہ اس سلسلہ کی لیڈر شپ کسی فلسفی یا طبیعی یا معاشی عالم کے ہاتھ میں ہونے کے بجائے کسی ربانی اور حقانی فرد کے ہاتھ میں ہونی چاہئے جو وحی الٰہی کی مدد سے پروگرام بنانا جانتا ہو تا کہ وہ قوم کو نجات دلانے کے ساتھ ساتھ اس کی اصلاح بھی کر سکے جس کے فساد ہی سے یہ غلامی کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں ورنہ بلا اصلاح نفوس نجات کے بعد اس مرض کے عود کر آنے کا خطرہ پھر قریب ہی رہتا ہے۔

پس جو شخص بھی قرآن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے حصول آزادی کی تدبیر کی پہلی کڑی صرف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ نبوت وقت یعنی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی قیادت

میں گامزن ہو۔ جس کا واضح ترین پروگرام یہ قرآن اور اس کی مدونہ شریعت ہے جس کا ایک بازو اس کی اولین تفسیر یہ حدیث رسول اور دوسرا بازو اس کی فقہی تشریحات ہیں۔ للذا مسلمان کسی ایسی قیادت کو تسلیم نہیں کر سکتے جو کتاب وسنت سے الگ کوئی نیا راستہ بناتی ہو۔

ہاں کتاب وسنت کے معیار پر پرکھ کر بلا شبہ اس کے ردو قبول کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ؎

غاصب وم سے حکم جہاد

(۲) اب حصول آزادی کے لئے نبوت کا لایا ہوا پروگرام ظاہر ہے کہ اصولاً دو ہی نوعوں میں منقسم ہو سکتا ہے۔ تشدد اور عدم تشدد۔ سو اس کے مواقع اور محل میں تفصیل ہے اگر فاتح قوم نے مفتوح قوم کو اس کے وطن سے نکال باہر کیا ہو اور اس کے ملک ہی نہیں املاک پر بھی قبضہ کر لیا ہو جس سے وہ بے یار ومدد گار ہو کر وطن سے بے وطنی ہو کر در بدر بھٹکتی پھر رہی ہو تو اس صورت مین استخلاص وطن کی صورت بقیادت پیغمبری تشدد ہے کہ قتال وجہاد کے ذریعہ اس ظالم اور غاصب قوم سے نبرد آزما ہوا جائے اور اپنا وطن واپس لیا جائے۔ چنانچہ ارض مقدس (بیت المقدس) کے استخلاص کے لئے (جس پر عمالقہ نے قابض ہو کر بنی اسرائیل کو بے وطن بنادیا تھا) جہاد کا حکم ملا مگر بنی اسرائیل نے اس کی تعمیل نہ کی اور چالیس برس تک میدان تیہ میں سر گردانی اور حیرانی کی زندگی بسر کرنے کی سزا بھگتی جیسا کہ قرآن پاک نے چھٹے پارہ میں اس کی پوری تفصیلات بیان فرمادی ہیں یا جیسے حضرت سموئیل کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے وطن پر جب جالوت نے قابض ہو کر انہیں ان کے دیار سے نکال باہر کیا تو بحکم پیغمبر طالوت کی قیادت میں انہیں استخلاص وطن کے لئے قتال وجہاد کا حکم ملا ؎

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاءِ مِنْ بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكاً نُّقَاتِلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَنْ لَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَنْ لَّا نُقَاتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا.

”(اے مخاطب) تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تحقیق نہیں ہوا؟ جب ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں۔ ان پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو؟ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کون سا سبب ہو گا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں۔ حالانکہ اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں“۔

یا جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے قرن خیر میں جبکہ آپ کو مکہ سے نکالا گیا اور آپ وطن سے

ہجرت پر مجبور ہو گئے تو مدینہ سے قوت فراہم کر کے استخلاص وطن کے لئے قتال کا حکم ملا تا کہ مکہ کو کفار سے آزاد کرا لیا جائے۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ن الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ.

ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے"۔

بہر حال بے وطنی کی صورت میں استخلاص وطن کی صورت بعد فراہمی قوت تشدد ہے جو پیغمبر یا مورین پیغمبر کی قیادت میں کیا جائے۔

عدم تشدد کے ذریعہ احتجاج

لیکن اگر فاتح قوم نے محض سلطنت وحکومت چھینی ہے محکوم قوم کو ان کے گھروں سے نہیں نکالا وہ بدستور اپنے وطن میں آباد ہیں مگر غلام بن کر نہ انہیں باختیار خود باہر جانے دیا جاتا ہے اور نہ داخلی آزادی سے انہیں زندگی بسر کرنے دی جاتی ہے تو اس کا حل بقیادت پیغمبر عدم تشدد ہے یعنی پرامن رہ کر حصول آزادی کی جدوجہد کی جائے۔

فرعون کی شہنشاہی میں بنی اسرائیل کی یہی نوعیت تھی کہ نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن یوسف علیہ السلام کے وقت سے حکومت مصر ان کی تھی۔ مصر ان کا تھا جس پر فرعون نے قبضہ پایا اور بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا۔ انہیں مصر سے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ورنہ موسیٰ علیہ السلام یہ خواہش کیوں کرتے کہ

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ.

"(اے فرعون بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے)"

اور مصر میں امن وراحت سے رہنے کی بھی اجازت نہ تھی ورنہ موسیٰ علیہ السلام کیوں فرماتے کہ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (اور بنی اسرائیل کو ستامت)۔

پس ایسے ہی برطانوی شہنشاہی میں بھی مسلمانوں کے لئے نہ جائے رفتن ہے نہ پائے ماندن، تو استخلاص وطن کے لئے بھی موسوی طریقہ عدم تشدد اختیار کرنا پڑے گا اور حکومت سے احتجاج کیا جائے گا کہ انہیں آزاد کر دو۔

عدم تشدد کے پانچ ہتھیار

(۵) مگر جس طرح تشدد کے اسلحہ تیر و تفنگ اور توپ و بندوق ہیں ایسے عدم تشدد کے بھی کچھ اسلحہ ہیں۔ جو اس جنگ آزادی کے لئے موسیٰ علیہ السلام نے اللہ جل ذکرہٗ سے طلب فرمائے اور اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى کی تعمیل کے لئے جواب میں عرض کیا کہ مجھے چند اسلحے درکار ہیں۔ جو اس جابر بادشاہ کے مقابلہ کے لئے ناگزیر ہیں جن کو رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ سے شروع فرمایا۔

یہاں صرف ان معنوی اور اخلاقی اسلحہ کی تفصیل پر نظر ڈالئے جو آیت عنوان میں موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے طلب فرمائے ہیں۔ یہ عدم تشدد کے پانچ ہتھیار ہیں جو مانگے گئے۔

پہلی چیز شرح صدر ہے کہ کیونکہ جب تک کسی مقصد کے لئے سینہ نہ کھل جائے اور وہ مقصد دل کے اندرونی داعیہ اور جذبہ سے نہ ابھرے حوصلہ بلند نہ ہو آدمی زور قوت اور وزن دار آواز سے اسے پیش نہیں کر سکتا۔

دوسری چیز تیسیر امر ہے کیونکہ اگر باوجو انشراح صدر کے ادھر سے اعانت و توفیق اور تہیأ اسباب ووسائل نہ ہو تو محض جذبہ اندرون کام نہیں دے سکتا۔

تیسری چیز حل عقدہ لسان ہے کہ اگر بلیغ انداز میں مافی الضمیر کی ادائیگی پر قدرت نہ ہو کلام میں فصاحت اور شیرینی نہ ہو تو مخاطب پر مقصد کا اثر نہیں پڑ سکتا اور اس اجتماعی مقصد میں نہ اپنوں کی جمعیت بن سکتی ہے نہ دشمن کی سوسائٹی ٹوٹ سکتی ہے بلکہ وہ تصدیق کی بجائے اور تکذیب پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

چوتھی اعانت کار اور اشتراک عمل ہے کہ اگر کام میں اشتراک عمل نہ ہو اور کوئی بھروسہ کا معین و یاور ساتھ نہ ہو تو انفرادیت کے ساتھ یہ اجتماعی کام نہیں چل سکتا۔ نیز طبع بشری تنہائی کے ساتھ جب کہ وہ بے معین و مددگار ہو قرار بھی نہیں پکڑ سکتی۔ ساتھ ہی قلبی و باطنی مقاصد میں انفراح واستقلال بھی میسر نہیں آسکتا؟ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت ﷺ نے بھی عمرین میں ایک عمر کے اسلام کی دعا فرمائی تھی جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حق میں مقبول ہوئی کہ انہی سے حضور ﷺ کی ایک وزارت کا قلمدان مکمل ہونے والا تھا۔

اور پانچویں چیز جو ان سب کی روح اور معنوی قوت ہے وہ ذکر اللہ اور ذات بابرکات حق کی تسبیح و تقدیس ہے کیونکہ اگر توجہ الی اللہ نہ ہو تو نہ شرح صدر ہو نہ تیسر امر نہ حل عقدہ ہو نہ اشتراک عمل کی توفیق و تاثیر۔

یورپ کی غلامی سے نجات کا راستہ

(الف) اس سے صاف ظاہر ہے کہ استخلاص وطن کی مساعی کا آغاز ذکر اللہ، دعا، یاد حق اور توجہ الی اللہ سے ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ کے اجتماعات کی تقریریں مکالمے وغیرہ سب میں ذکر حق کی روح دوڑی ہوئی ہونی

چاہئے اور ساری جدوجہد کا رجوع اور رخ بالآخر ذات حق کی طرف ہونا چاہئے تاکہ اس اخلاص کی بدولت یہ کام نتیجہ خیز بھی ہو اور ظاہر و باطن کی صلاح و فلاح کی راہیں خدا کی طرف سے کھلتی رہیں۔

خلاصہ یہ کہ استخلاص وطن کی مہم دینی رنگ اور اسلامی ڈھنگ سے شروع کی جائے نہ کہ یورپ کی نقالی اور نمائشی مظاہروں سے کام ٹھوس ہونا چاہئے نہ کہ رسمی۔ ورنہ جس غلامی سے گلو خلاصی کے لئے حرکت کی جائے گی وہی غلامی اور گلوگیر ہو جائے گی۔ گویا یورپ سے بچنے کے لئے یورپینیت کا پھندا گلے میں آپڑے گا جو بچنا نہیں کہلائے گا بلکہ اور پھنسنا کہلائے گا اور ثمرہ ہوگا کہ ظاہر کی غلامی کے ساتھ باطن کی غلامی بھی سر پر پڑ جائے گی۔

اشتراک عمل کی ضرورت

ان مرادوں میں کچھ چیزیں تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذات کے لئے طلب کیں جیسے شرح صدر، تیسیر امر، حل عقدہ لسان۔ لیکن جو چیز سب سے اہم طلب کی وہ اَشْرِکْهُ فِیْ اَمْرِیْ ہے یعنی میرے اس کام میں میرے بھائی کو شریک کر دیا جائے جس سے واضح ہے کہ سعی آزادی کے سلسلہ میں اشتراک عمل اولین منزل ہے اور وہ بھی اپنوں کے ساتھ۔ اس سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ آج مسلمانون کو باہمی اشتراک عمل کی اشد ضرورت ہے۔ غیروں سے پہلے انہیں اپنوں کو اپنانا چاہئے۔ جمعیت العلماء سے زیادہ کون اس کا حق دار ہے کہ وہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں کی طرف ودادو محبت کا ہاتھ بڑھائے اور درمیانی رکاوٹوں کو آئینی اور رسمی انداز سے نہیں بلکہ واقعاتی انداز سے دور کر کے ٹوٹے ہوؤں کو ملانے کے لئے خود اقدام کرے۔ معاذیر نہ پیش کرے۔ بلکہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اجتماعیت کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی دے اور خود جھک کر دوسروں کو اپنے سامنے جھکا دے۔ خواہ وہ لیگی ہوں یا احراری۔ حق تعالیٰ نے یہ تمام باطنی اسلحہ موسیٰ علیہ السلام کو عطاء فرمادیئے اور ارشاد ہوا۔

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُئْوْلَكَ يٰمُوْسٰى.

"فرمایا بلاشبہ تمہاری مراد تمہیں دی گئی اے موسیٰ"۔

اور اس کے بعد تسلی آمیز کلمات فرما کر پھر اس ابتدائی حکم کو اس طرح دہرایا گیا۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى.

"اور میں نے تم کو (اے موسیٰ) اپنے لئے منتخب کر لیا تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں لے کے جاؤ اور میری یادگاری میں سستی مت کرنا۔ دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت چل نکلا ہے"۔

معیارت قیادت

(۸) اس سے واضح ہوا کہ اس اجتماعی کام کے شرکاء اور وہ بھی منصب داران قیادت ذاکرین کی جماعت ہو' غافلین کی نہ ہو جنہیں نہ اللہ کی معرفت ہو نہ اس کی محبت ہو اور نہ اس کے طرق اور راہ سے واقفیت ہو وہ مسلمانوں کے کام اسلامی حیثیت سے کبھی نہیں بنا سکتے۔ مگر ساتھ ہی اسے فراموش بھی نہ کرنا چاہئے کہ قوم میں جو لوگ کسی نہ کسی ہیئت سے بڑائی پیدا کر چکے ہیں اور مخلص بھی ہوں ان کی ادنیٰ توہین یا بے وقعتی بھی گوارا نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ اجتماعی کام میں افراد ہی کا نہیں اجتماعات کا وابستہ رکھا جانا بھی ناگزیر چیز ہے۔ ورنہ اجتماعیت عامہ پیدا نہیں ہو سکتی جو قومی حریت کے لئے اولین زینہ ہے۔ ہاں ان کی تقویم اور غلط روش کی اصلاح' شفقت و محبت اور خلوص کے ساتھ ضروری ہے تاکہ وہ بھی بلا کسی جھجک کے امر حق کی طرف جھک آئیں اور لاعلمی کے سبب ان میں جو بعد سوء اتفاق سے پیدا ہو گیا تھا وہ مبدل بہ قرب ہو جائے۔

غرض اس طرح سے دو پیغمبروں کو قائد بنا کر فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا۔

مذاکرات کی بنیاد

(۹) یہیں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حکمران کے پاس جانے والے (جو آزادی مانگنے کے لئے جا رہے ہوں) بحیثیت فرستادہ خدا جائیں نہ کہ ذاتی تقاضے سے روانہ ہوں جیسے موسیٰ و ہارون از خود نہیں گئے' بھیجے ہوئے گئے۔ اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ نتائج کی تمام تر ذمہ داری حکومت الٰہی پر عائد ہو جائے گی۔ قوم پر کوئی برائی اور آنچ نہیں آئے گی۔ غرض ان تمام کیفیات کے ساتھ ارشاد ہوا کہ فرعون کے پاس پہنچو۔ اسی موقع کے لئے دوسری جگہ قرآن میں یوں ارشاد ہے۔

وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰٓی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ہ قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا یَتَّقُوْنَ.

"اور جب آپ کے ربّ نے موسیٰ کو پکارا کہ تم ان ظالم لوگوں یعنی قوم فرعون کے پاس جاؤ۔ کیا یہ لوگ نہیں ڈرتے"۔

حکومت اور قوم سے افہام و تفہیم کی ضرورت

(۱۰) اس سے واضح ہوا کہ سعی آزادی کے سلسلہ میں نہ صرف حکمران ہی کے پاس جانے بلکہ حکمران قوم کے پاس بھی جانے اور ان سے مل کر گفت و شنید کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض دفعہ حکومت اپنے غرور میں مدعا پر کان نہیں دھرتی مگر حکومت کی قوم سمجھ جاتی ہے اور کبھی برعکس بھی ہو جاتا ہے۔ بہرحال حکومت اور قوم دونوں سے اس بارے میں گفت و شنید ضروری ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو ان دونوں احکام سے دو خطرے لاحق ہوئے جن کو انہوں نے صفائی سے عرض کر دیا۔ حکومت سے تو زیادتی اور تعدی کا کہ فرعون کوئی جابرانہ کارروائی نہ کر بیٹھے کیونکہ اس کے ہاتھ میں طاقت تھی تو عرض کیا۔

قَالَا رَبَّنَا اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَا اَوْ اَنْ یَّطْغٰی.

"دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے"۔

اور قوم سے خطرہ ہوا تعصب اور ہٹ دھرمی کا کہ بات نہ مانے اور مجھے چھوڑ دے کیونکہ وہ مستغنی تھی تو عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ.

"کہا اے میرے پروردگار مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلانے لگیں"۔

حق تعالیٰ نے جواب میں تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

قَالَ لَا تَخَافَا اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی.

"اور ارشاد ہوا تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں"۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

کَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَا اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ.

"کیا مجال ہے سو تم دونوں ہمارے احکام لے کر جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں"۔

اس سے واضح ہوا کہ اگر فرستادہ خدا ہونے کی حیثیت سے احکام اور حکمران قوم سے ملا جائے گا تو مضرت کی ذمہ داری اللہ پر ہو گی۔

یعنی کام خدا کے نام اور اس کے دیئے ہوئے پروگرام پر شروع کیا جائے تو پھر اس کے اثرات و نتائج دوسرے ہوں گے۔ اگر ہم اپنے اختراعی پروگراموں اور خود اپنی ذوات کے بل بوتہ پر کام شروع کریں تو اس کے نتائج اور ہیں۔ ان میں وہ قوت نہیں آسکتی جو پہلی صورت میں ممکن ہے۔

شعار قیادت

(۱۲) اس لئے آیت بالا میں موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو نہ صرف یہی حکم دیا گیا کہ بحیثیت فرستادۂ خدا ہونے کے دربار فرعونی میں جاؤ۔ اپنی طرف سے مت جاؤ اور نہ صرف یہی کہ ہمارا ہی پیغام پہنچاؤ اپنی طرف سے کچھ نہ کہو یعنی اختراعی پروگرام مت اختیار کرو بلکہ یہ بھی ارشاد ہے انداز پیام رسانی بھی ہمارا ہی متعین کردہ اختیار کرو بطور طریق ابلاغ بھی متعین نہ کرو اور وہ یہ کہ۔

قُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا

"پھر اس (فرعون) سے نرمی کے ساتھ بات کرنا"۔

یعنی مکالمہ میں بھی تشدد کا پیرایہ نہ آنے پائے۔ جبکہ یہ جنگ عدم تشدد کی جنگ ہے۔ یہ اس لئے فرمایا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام جو اس جنگ آزادی کے قائد اعظم تھے طبعاً تیز مزاج تھے اور ان

کی شان جلالی واقع ہوئی تھی۔ افتادی طبع میں حدت اور شدت تھی۔

چنانچہ اس تشدد پسندی کے چند واقعات بھی ان سے ظاہر ہو چکے تھے قبطی کو جوش میں تھپڑ مارا تو اس کی گردن الگ جا پڑی اور مر گیا بچپن میں فرعون کا دعوائے الوہیت سن کر ایک دو چپت اسے بھی رسید کئے اس کی داڑھی پکڑلی وغیرہ تو اندیشہ تھا کہ فرعون کے بے باکانہ اور گستاخانہ جوابات سن کر موسیٰ علیہ السلام اپنی طبعی رفتار پر کہیں اکھاڑ پچھاڑ کر کے نہ چلے آئیں اور نصیحت و شفقت یا اتمام حجت کا معاملہ ہی درہم برہم ہو جائے اس لئے بہ تاکید دونوں حضرات کو شیریں زبانی اور نرم گوئی کا حکم دیا گیا تا کہ یا دشمن اس خوش اخلاقی سے مسخر ہو جائے اور یا پھر برملا اس کی تعدی واضح ہو کر کھلے بندوں اس پر حجت تمام ہو جائے۔

کون نہیں جانتا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ جوش و خروش عیاذاً باللہ نفسانی نہ تھا کہ نبوت کی بارگاہ اس سے پاک ہے بلکہ وہ بغض فی اللہ تھا جو شرعاً مطلوب ہے لیکن موقعہ کی نزاکت اور اجتماعیات کی تکمیل کے سلسلہ میں ضروری تھا کہ اس جذبہ کو اگر چہ وہ دینی تھا مستور کر کے دوسرے دینی جذبہ رافتہ فی اللہ اور صبر و تحمل کو بروئے کار لایا آجائے کیونکہ مقصود اصلی صرف اتنا ہی نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام تبلیغ کر کے اپنا ذمہ بری کرلیں اور فرعون کو کہہ سن کر فارغ ہو جائیں بس فرض تبلیغ ادا ہو جائے آگے فرعون اور فرعونی جنت میں جائیں یا جہنم میں، نہیں بلکہ مقصود اصلاح اور تکمیل کار تھی اور فرعون کے پاس اس جذبہ کے ساتھ جانا تھا کہ وہ کسی طرح راہ راست پر آجائے نہ یہ کہ ہم پیام پہنچا کر بَری اُلذمہ ہو جائیں۔

اور ظاہر ہے کہ قصدِ اصلاح و تربیت کے ساتھ مخاطب کے احوال کی رعایت کی جاتی ہے نہ کہ اپنے احوال کی۔ اس صورت حال سے یہ مسئلہ نمایاں ہوتا ہے کہ آج بھی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے قائدین اور زعماء کا خواہ وہ کسی اجتماعی ادارہ کے ذمہ دار ہوں یا خود اپنے کام کے 'شعار رافتہ ورحمتہ ہونا چاہئے قول لین اور نرم گوئی ان کی شان غالب ہو تا کہ اپنے ٹوٹنے نہ پائیں اور غیر بیگانے نہ رہیں، غلظت قلب اور شدت ہمیشہ قطع کا باعث ہوتی ہے اور رافت ولینت ہمیشہ وصل و ملاپ کا سبب بنتی ہے بشر طیکہ اس میں مداہنت اور استرضاء غیر اللہ نہ ہو۔ پس زعماء مسلمین زیادہ احق ہیں کہ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کے مصداق بنیں اور اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ ہو کر حکمت اور رافت اور نصیحت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

اِقتدار کے فرعون سے طرزِ گفتگو

اس لئے کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان میں حکومت متسلطہ کے مظالم اور آئینی انداز کی چیرہ دستیاں مسلمانوں کی شوکت کو تباہ کرنے کی وسیع کاریاں، بلادِ اسلامیہ کو چُن چُن کا پامال کرنا اور اسلامی شوکت کو

مٹا کر نصرانی عظمت واقتدار کو قائم کرنا۔ مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی کرنا۔ ہندوستان کے بارے میں مسلمانوں سے کئے ہوئے معاہدوں کو پس پشت ڈال کران کی صریح خلاف ورزی کرنا، ہندوستانی اقوام سے جھوٹے وعدے کر کے انہیں احمق بنانا اور اپنا الو سیدھا کرتے رہنا انہیں لڑالڑا کر حکومت کی بنیادیں استوار کرنا وغیرہ وہ امور ہیں کہ حمیت اسلامی کے ماتحت ان پر مسلمانوں اوران کے زعماء کو جس قدر بھی جوش ہو کر ہے اور جس قدر بھی وہ غیظ و غضب کا اظہار کریں انہیں حق ہے۔۔۔ فان لصاحب الحق مقالا لیکن ساتھ ہی یہی پہلو بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ مقصود اصلی جوش کا مظاہرہ کر لینا نہیں بلکہ اپنی آزادی اور متقابل قوم کو حق سے متاثر کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ مخاطب میں تاثر اور سیلان اظہار غضب سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ رقت ولین سے، موسیٰ علیہ اسلام سے زیادہ ہم بغض فی اللہ کے حامل نہیں ہوسکتے لیکن انہیں بھی عدم تشدد کی جنگ کی صورت میں قول لین کا حکم دیا گیا۔

جناب رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کون بغض فی اللہ سے متخلق ہو سکتا ہے اور وہ بھی بمقابلہ مشرکین مکہ جنہوں نے اللہ کے رسول کو ایذائیں پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی حتی کہ آخر کار وطن اور گھر بار تک سے محروم کر دیا لیکن مکہ کی زندگی میں جو عدم تشدد کی زندگی ہے، خود حضور کو بار بار حکم ملتا رہا کہ صبر سے کام لو، تحمل سے کام لو، کسی جذبہ کا اظہار نہ کرو۔ شفقت و خیر خواہی خلق اللہ کو ہاتھ سے رہاں مالیاں کھا کے بے مزہ مت ہو۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوالْعَزْمِ مَنَ الْرُسُلِ وَلاَ تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلِ۔ فَاصْدَعْ بِمَاتُؤمَرْ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينْ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ۔

"سو آپ صبر کیجئے جیسے اُولوالعزم انبیاء نے صبر سے کام لیا اور جلدی نہ کیجئے۔۔۔
سو آپ خوبی کے ساتھ در گزر کیجئے۔ غرض آپ کو جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کو صاف صاف سنا دیجئے اوران مشرکین کی پرواہ نہ کیجئے یہ لوگ جو ہنستے ہیں"۔

چنانچہ آپؐ کا خطاب ہی رحمت اللعالمین ہوا۔ آپؐ کا لقب ہی رحمتہ مھداۃ ہوا اور اس کے بعد آپ کی شفقت اور خیر خواہی خلق اللہ کا یہ عالم ہوا کہ حق تعالیٰ کو اس غیر معمولی شفقت سے روک کر اس کی تعدیل فرمانی پڑی کہ :

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤمِنِيْنَ۔

"شاید آپؐ ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دے دیں گے"۔

بہر حال یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اس عدم تشدد کی جنگ میں دشمنوں اور فرعون صفت دشمنوں کے سامنے قول لین کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار غیظ و غضب کی اور خود انہیں بھی ہدایت

کرنے کی ضرورت ہے نہ تنہا اپنی گلو خلاصی کی اس پر بھی موسیٰ علیہ السلام نے خطرہ ظاہر کیا کہ فرعون ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے۔ یعنی باوجود اس نرمی اور لینت کے بھی اس سے مان جانے کی توقع نہیں۔ بلکہ تمرد اور ڈھٹائی کا ہی خطرہ ہے گویا ایسے سرکش کے لئے پھر نرمی کی کیا ضرورت ہے؟ مگر پھر بھی ارشاد ہوا کہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں کہ تم پر اس کی کوئی زیادتی اثر انداز نہ ہوگی۔ ہم دیکھتے سنتے ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں۔ تم تو ناصحانہ اور مشفقانہ انداز ہی سے بات کرو۔ مصلحت اور حکمت یہی ہے۔

بلند بانگ دعوؤں کی ممانعت

۱۳۔ اسی سے یہ بھی واضح ہوا کہ جنگ آزادی کے سلسلہ کے قائدین متواضع اور بے تکلف ہونے چاہئیں جو اپنے دل کی ہر کھٹک کا بے تکلف اظہار کر سکیں حتی کہ اپنی کمزوری صاف صاف کہہ سکیں اور کوئی رسمی وقار انہیں اظہار حال سے مانع نہ ہو نہ کہ فخرو شیخی خورے ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے بایں قوت نبوت اپنے خوف کا اور دشمن کی طرف سے متوقع زیادتیوں کا جو خطرہ دل میں گزرا اس کا برملا اور بے تکلف اظہار فرمادیا کہ مجھے فرعون سے زیادتی کا خطرہ ہے اور اس کی قوم سے تکذیب اور ہٹ دھرمی کا۔

اس لئے آج ہمارے لئے بھی جبکہ ایک جابر حکومت کے سامنے مطالبے لے کر جانے کا ارادہ رکھتے ہوں اِدّعاء اور یہ فخریہ لب ولہجہ یا شیخی کے کلمات کا اظہار کسی طرح مناسب نہیں ہوسکتا، ہمارے لئے یہ دعوے کبھی زیب نہیں دیں گے کہ نہ ہم حکومت سے ڈرتے ہیں نہ ہم پھانسی سے خوف کھاتے ہیں نہ ہمیں جیل کا ڈر ہے، ہم یہ کر ڈالیں گے اور وہ کچھ کر گزریں گے۔ خدا کرے ہمارے قلوب غیر اللہ سے ایسے ہی نڈر اور بے باک ہوں لیکن اعادء تو پھر بھی ممنوع ہے جب تک کہ ادعا کی کوئی شرعی ضرورت ہی پیش نہ آجائے۔ ہمیں عموماً ہر حالت میں اور بالخصوص قوی دشمن کے سامنے بڑ کر اللہ کے لئے اعلان تواضع اور اعتراف ناتوانی میں ہرگز کوئی ادبی باک نہ کرنا چاہئے اور پروردگار کے سامنے بلا ریب وشک اپنی صحیح حالت کا نقشہ رکھ کر ادھر سے امداد کی استدعاء کرنی چاہئے کیونکہ تصنع کی بہادری کار آمد ہے نہ تصنع کا مظاہرہ ہمارا راستہ حقیقت واقعہ ہونا چاہئے۔ جیسا کہ آیت بالا میں موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ سے واضح ہے تاکہ ساری ذمہ داری حکومت پر رہے اور ہم محض خدا کے ایک کارندے اور کارگزار کی حیثیت سے حکومت متقابل کے سامنے پیش ہوں۔

مُسلم قیادت کا اولین فرض

ان ابتدائی معاملات کے طے ہو جانے کے بعد موسیٰ وہارون کو حکم ہوا:

فَاْتِيَاهُ فَقُوْلَا اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ۔

"سو تم دونوں (فرعون) کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار

کے فرستادہ ہیں"۔

۱۴۔اس سے واضح ہوا کہ قائدوں کی جماعت دربار حکومت اور قوم کے ایوانوں میں پہنچ کر سب سے پہلے اپنی پوزیشن صاف صاف واضح کر دے کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں؟ موسیٰ وہارون علیہما السلام کو حکم ہوا کہ جاتے ہی پہلے فرعون کو یہ بتلاؤ تم کون ہو؟ یعنی صاف صاف کہہ دو کہ ہم رسول ہیں اور فرستادۂ خدا ہو کر آئے ہیں یعنی ہم خود نہیں آئے بھیجے ہوئے آئے ہیں ہم مذہبی پیغام لے کر آئے ہیں۔اپنی کوئی رائے یا اپنی جماعت کی کوئی پاس کردہ تجویز پیش کرنے نہیں آئے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان قائدوں کو جو اوصاف مذکورہ سے متصف ہوں اولین فرض یہ ہے کہ وہ ارباب حکومت اور حکمران قوم سے ملتے وقت صفائی سے اپنی پوزیشن واضح کر دیں کہ ہم مسلمان ہیں یعنی ہم بحیثیت ہندوستانی کے وطنی جذبہ سے نہیں آئے بلکہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی جذبات سے آئے ہیں، ہم اول و آخر مسلمان ہیں نہ کہ اول مسلمان اور پھر ہندوستانی۔ ہم مذہبی اشارات پر آئے ہیں نہ کہ آراء واختراعات پر۔ ہم ذاتی افکار و قیاسات سے کوئی پاس کردہ رزیولوشن لے کر نہیں آئے بلکہ اس مذہب کی دفعات لے کر آئے ہیں جو خدائے حاکم اور ملک الملوک کا بھیجا ہوا ہے اور جس کو آزاد رکھنے کے تم بھی اپنی زبان سے مدعی ہو۔

اس صورت حال کا سب سے بڑا مفاد تو یہ ہوگا کہ ہماری پوزیشن وزنی اور موثر ہو جائے گی کیونکہ ترجمانی حق کی پوزیشن کا جو اثر مخاطبوں پر پڑ سکتا ہے وہ خود ہماری اپنی بنائی ہوئی رسمی پوزیشن کا خواہ وہ انفرادی یا اجتماعی ہو نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ اسلامی پوزیشن بے ساختہ اور قدرتی ہے اور غیر اسلامی پوزیشن بہر حال بنائی ہوئی ہے اور بہ تکلف اپنے اندر پیدا کی جاتی ہے اور وہ بھی انہی غیروں کی نقالی سے جن کے سامنے ہم احتجاج کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ مخاطب اس سے کسی عظمت و میلان کا اثر نہیں لے سکتے۔ بلکہ تضحیک کا جو ہمارے لئے مفید ہونے کی بجائے مضر اور سخت خطرناک ہے کہ اس میں ہوا خیزی ہے، کا اثر لے لیں گے۔

قیادت، علماء کے لئے کیوں ناگزیر ہے

نیز اسلامی اور خالص دینی پوزیشن لے کر جانے اور اسے صاف لفظوں میں پہلے ہی واضح کر دینے کا دوسرا مفاد یہ بھی ہوگا کہ قیادتِ عامہ مخلوط نہ رہے گی بلکہ نکھر جائے گی اور قدرتی طور پر اس نوع کی قیادت اور دعوت لے کر وہی اٹھ سکیں گے جو حقیقۃً اس پوزیشن کے اعلان کی قوت اور اہلیت رکھتے ہوں گے، ہر کس و ناکس کو اس کی جرات نہ ہوگی کہ وہ پیغام بردار الٰہی بن کر اپنے یا اغیار کے پلیٹ فارم پر پیش ہو اور اس قیادت کی اہلیت صرف انہی افراد میں پائی جاسکے گی جو دینی اور روحانی رنگ میں اس پیغام کے اثبات و ایضاح اور اس کی طرف سے دفاع کی قدرت اور عملی ہمت رکھتے ہوں گے۔

اس سے نہ سمجھا جائے کہ میں ایک طالب علم یا علماء کا نام لیوا ہونے کی حیثیت سے کسی جماعتی تعصب سے کام لے رہا ہوں اور خواہ مخواہ علماء کی قیادت اور مطاعیت کا پروپیگنڈہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ الزام اس وقت صحیح ہو سکتا ہے کہ میں امت کو علماء کی ذوات کا پابند ہو جانے کی دعوت دوں۔ حالانکہ میری غرض علماء کی ذوات کی اطاعت پر مجبور کرنا نہیں اور نہ مجھے اس کا حق ہے بلکہ میں علماء حق کی زبان پر جاری شدہ قانون الٰہی کی اطاعت پر مجبور ہو جانے کی دعوت دے رہا ہوں اس صورت میں قیادت قانونِ الٰہی کی آنکلتی ہے نہ کہ علماء کی۔ مگر چونکہ قانونِ علماء کی ہی زبان سے مسموع ہوتا ہے اور کتابِ الٰہی کی صحیح ترجمانی وہی کر سکتے ہیں اس لئے ضمناً ان کی اطاعت و قیادت بھی نکل آتی ہیں مگر نہ بالذات بلکہ بالغیر۔

ساتھ ہی تعصب کا الزام دینے والے اس پر بھی غور کریں کہ علماء کا کوئی مخصوص خاندان یا قبیلہ نہیں کہ دوسرے قبائل کو ان کی طرف جھکنے پر مجبور کیا جائے، علم الٰہی کا دروازہ ہر مسلمان کے لئے کھلا ہوا ہے اور ہر مسلمان ہر وقت عالم دین بن سکتا ہے پس اگر کسی غیر عالم کو کسی عالم کی اطاعت سے عار آئے تو اس کا علاج یہ نہیں کہ قانونِ الٰہی کو رد کرنے لگے بلکہ یہ ہے کہ خود عالم بن کر قائدوں کی جماعت میں شامل ہو جائے اور قانونِ حق کی اطاعت کر کے دوسروں سے اطاعت کرائے مگر بہر صورت مسلمان رہتے ہوئے قوانین الٰہی کی اطاعت کرنا ناگزیر ہے۔ خواہ عالم ہو یا غیر عالم۔

پس جہاں میں غیر علماء کو پابندی قانون الٰہی کی دعوت دے رہا ہوں وہیں وہ دعوت علماء کے لئے بھی ہے، اس لئے تعصب کا الزام بے معنی ہوگا۔

ترجمانِ رسالت حاملِ معرفت ہونا چاہئے

۱۵۔ یہاں سے مسئلہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جب موسیٰ ہارون علیہما السلام بجوائے:

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ

"ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں"

فرعون کے سامنے بحیثیت رسول کے پیش ہوئے نہ کہ بحیثیت اسرائیلی ہونے کے اور رسول مربی مخاطبین اور ناصح اقوام ہوتا ہے۔ وہ جس طرح اپنی قوم کی گلو خلاصی چاہتا ہے، اسی طرح مخاطب اقوام کی بہبود و فلاح و فکر بھی ہمدردانہ کرتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ اسلام جس طرح بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے چھڑانے کے لئے فرعون کے پاس گئے اسی طرح خود فرعون اور فرعونیوں کی اصلاح و بہبود بھی ان کے پیش نظر تھی کیونکہ رسول کے معنی ہی مربی خلائق اور ناصح مشفق کے ہیں تو اس سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوا کہ مسلمانوں کے قائد بحیثیت ترجمان رسالت حکومت کے سامنے پہنچے وہ صرف اپنی قوم کی گلو خلاصی پیش نظر نہ رکھیں بلکہ حکمران اقوام کی اصلاح

وبہبود بھی ان کے سامنے رہے اور وہ جس طرح پیغام الٰہی کے واسطے سے وہاں پہنچیں اسی طرح اس پیغام الٰہی سے خود اس قوم کو بھی آشنا اور متاثر بنانے کی فکر کریں وہ صفائی سے مگر بحکمت یہ کہیں کہ ہم جس اسلام کو اور اس کے واسطہ سے مسلم قوم کو آزاد کرانے آئے ہیں، اسی اسلام کا تحفہ خود تمہارے لئے بھی لے کر آئے ہیں۔ مغلوب کا محارب کی صورت سے سامنے آنا اور اثر رکھتا ہے اور اپنی خیر جوئی کے ساتھ مقابل کی اصلاح کا پرواز اختیار کرنا اور اثر رکھتا ہے۔

آج کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ حکمران قوم تک محکوم قوم کے پیغامات اور مطالبے یا پہنچتے ہی نہیں یا پہنچتے ہیں تو کورے سیاسی رنگ میں پہنچتے ہیں اور وہ سیاسی رنگ بھی خود حکمران قوم کا ہوتا ہے جس سے حکمرانوں پر ان مطالبات کی اصل دینی حیثیت واضح ہی نہیں ہوتی اور کسی درجہ میں ہوتی بھی ہے تو صرف ادّعاء کے رنگ میں نہ کہ کیفیت اور حال کے درجہ میں یا کم از کم استدلال کے درجہ میں جو انہیں اس حیثیت میں متاثر کرسکے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مطالبات پہنچانے والے جو مسلمانوں کی نمائندگی کا فخر اپنے قلوب میں محسوس کرتے ہیں نہ خود دین سے واقف ہوتے ہیں نہ دین کا کوئی رنگ اور حال و کیفیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس لئے مسلم قوم کے اصلی مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق وہ پیغام پہنچانے پر قادر ہی نہیں ہوتے بلکہ جیسے اور مختلف اقوام کی سیاسی پارٹیوں کے مطالبات بھی قومی اور سیاسی رنگ میں انگریزیت کے ساتھ انگریز کے سامنے آجاتے ہیں جن میں کوئی حقیقی اسلامی روح نہیں ہوتی جو دوسروں کو متاثر کرے۔

پس جو لوگ حکومت کے کانوں تک قوم کا پیغام لے کر جاتے ہیں وہ دین سے نا آشنا اور انگریز سے اس کی زبان میں بات چیت کرنے کے عادی اور ادھر جو لوگ دین سے واقف اور اس کا رنگ ڈھنگ لئے ہوئے ہیں وہ انگریز کی زبان اور اس کی ذہنیت سے ناواقف پھر اس پر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے بعید اور الگ تھلگ جن میں باہم کوئی سنگم نہیں بلکہ ہے تو بے اعتماد باہمی ہے اور اسے بھی بڑھاتے رہنے کی کوششیں اپنوں اور اغیار کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں نہ کہ کم کرنے کی۔ ادھر ایسے جامع افراد مفقود ہیں جو دونوں رخوں کی پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اس لئے نتیجہ یہ ہے کہ قوم کا صحیح پیغام اپنے اصلی رنگ میں مدعیان حکومت کے سامنے نہیں پہنچتا۔

طرز نبوت اپنانے کی ضرورت

ہاں ان سب کا نعم البدل یہ ہے کہ علماء میں سے صرف وہ افراد جو عالم باللہ اور عالم بامر اللہ یعنی عارف ہوں روحانیت سے بھرپور ہوں، باخدا ہوں۔ اس پیغام کو لے کر اٹھیں اور اپنے مخلصانہ اور بے غرضانہ رنگ میں بطرز انبیاء اس پیغام کو اپنوں اور متسلطہ اقوام کے دلوں میں اتارنے کا عزم باندھ لیں اور عامہ علماء ان کے نقش قدم پر چلیں تو پھر وہ جس زبان میں بھی کہیں گے تاثیر نمایاں ہوگی۔ دل معترف ہوں گے۔

خواہ زبانیں اعتراف کریں یا نہ کریں۔

پارسی گوگرچہ تازی خوشتر است
عشق راخود صد زبان دیگر است
بوئے او دلبر چو پراں می شود
ایں زبان ہا جملہ حیران می شود

پس اگر صحابہؓ کی طرح عرفاء اس میدان میں آ جائیں اور استدلال کے بجائے حال سے کام لیں رسمیات کی بجائے حقائق استعمال میں آنے لگیں اور رسمی لوگ ان کی پیروی کریں۔ تو زبانوں اور ذہنیتوں کی بحیثیت ہی درمیان سے اٹھ جائیں گی لیکن یہ ضروری ہے کہ اس صورت میں تحریکات کا قالب اور ڈھانچہ کچھ بدل جائے گا اور روح بھی اس میں اسی کی مناسب پیدا ہو جائے گی اور پھر انداز حضرات صحابہؓ کی مساعی کا ہو جائے گا جس میں جذب وکشش باہمی بھی پیدا ہو گی اور دشمنوں پر ہیبت بھی پڑے گی۔

بہر حال جب تک اسلامی تحریک میں تبلیغی رنگ اور ناصحانہ و رحیمانہ انداز نہ ہو اور دین کو آگے بڑھا کر رسمیانہ انداز مغلوب نہ کیا جائے اسلامی رنگ کا نتیجہ نہیں نکل سکتا مگر صد حسرت کہ یا اب ایسے افراد عنقاء ہیں یا سامنے نہیں ہیں یا ان کی پرسش نہیں ہے۔

قوت کے گھمنڈ میں جائز مطالبات تسلیم نہ کرنے والوں کا انجام

۱۶۔ پھر اس پیغام اور مطالبہ کا ابلاغ

کیا ایک آدھ دفعہ کافی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے اس تبلیغ میں برسہا برس گزارے اور مختلف اندازوں سے مدعا سمجھایا اور واضح کیا۔ اسے ثابت کر کے خدا کی طرف سے اتمام حجت کیا اس مستمر اور مسلسل مطالبہ و تبلیغ کا اثر یہ ہوا کہ حق مختلف جہتوں سے واضح ہو گیا۔ منکر فرعون اور فرعونیوں پر خدا کی حجت تمام ہوتی گئی اور بالآخر پھر بھی اس کے انکار و جمود پر خدا کی طرف سے تنبیہات اور عذابوں کا سلسلہ شروع ہوا قحط سالیاں اور مال و دولت وغیرہ کی تباہیوں نے فرعون پر یہ واضح بھی کر دیا کہ یہ ساری بلائیں ان شرعی اور خدائی مطالبات نہ ماننے ہی سے نازل ہو رہی ہیں۔

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے وقتاً فوقتاً اعترافِ قصور کر کے فرعون دعا اور معافی کا طالب بھی ہوا مگر ساتھ ہی چر چل کی پالیسی پر جما رہا اور سارے ہی مطالبے ٹھکرا دیئے جس سے موسیٰ اور موسویوں کے صبر و استقلال میں کوئی فرق نہ پڑا اور ان کی مظلومیت سورج سے زیادہ نمایاں ہو گئی۔ آخر کار قبطیوں اور سبطیوں دونوں کے اعمال کے مطابق نتائج دونوں کے سامنے آ گئے ضعیف قوم

غلامی سے رہا ہو کر بر سر اقتدار آئی اور قوی قوم غلامی نفس میں گرفتار ہو کر دنیا و آخرت کے مصائب کا شکار ہوئی۔ قرآن حکیم نے اس سلسلہ کے واقعات کا جو جامع نقشہ کھینچا ہے اسے ملاحظہ فرمایئے اور ترجمہ غور سے دیکھئے جو در حقیقت حاصل طلب اور مختصر سی تفسیر ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ فَاِذَا جَآئَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ اَلَا اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

"اور ہم نے فرعون والوں کو مبتلا کیا قحط سالی میں اور پھلوں کی کم پیداواری میں تاکہ وہ سمجھ جائیں۔ سو جب ان پر خوشحالی آجاتی تو کہتے یہ تو ہمارے لئے ہی ہونا چاہئے اور اگر ان کو کوئی بدحالی پیش آتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے، یاد رکھو ان کی نحوست اللہ کے علم میں ہے اور اس میں اکثر لوگ نہیں جانتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ کیسی ہی عجیب بات ہمارے سامنے لاؤ کہ اس کے ذریعہ ہم پر جادو چلاؤ جب بھی ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں"۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ۔

"تو پھر ہم نے (کثرت بارش کا) طوفان بھیجا (اس سے گھبرا کے موسیٰ سے فرعونیوں نے عہد و پیمان کیا مگر طوفان کھلنے پر پھر اسی انکار پر اڑے رہے تو ہم نے ان پر) ٹڈیاں مسلط کیں (جو کھیتوں کو چاٹ گئیں پھر عہد و پیمان کئے مگر یہ بلا دور ہونے پر پھر بدستور اسی سرکشی پر جمے رہے تو ہم نے لائے ہوئے غلہ میں) گھن کا کیڑا پیدا کر دیا (پھر موسیٰ سے دعا کرائی اور یہ بلا دور ہو کر جب مطمئن ہوئے کہ اب غلہ بیٹھ کر کھائیں گے تو ہم نے ان پر) مینڈک مسلط کئے (جو ہجوم کر کے کھانے اور برتنوں میں گرنا شروع ہوئے جس سے سب کھانا غارت ہونے لگا اور گھروں میں رہنا بھی مشکل ہو گیا، پھر پینا یوں مشکل ہو گیا کہ) ان کا پانی خون ہو جاتا یہ سب کھلے کھلے معجزے تھے سو وہ تکبر کرتے رہتے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جرائم پیشہ"۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ۔

"اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو یوں کہتے کہ اے موسیٰ ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے

اگر آپ اس عذاب کو ہم سے اٹھادیں تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل (آزاد کر کے) آپ کے ساتھ کر دیں گے"۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰى اَجَلٍ هُمْ بَالِغُوْهُ اِذَاهُمْ يَنْكُثُوْنَ۔

"پھر جب ان سے اس عذاب کو ایک وقتِ خاص تک (کہ اس تک ان کو پہنچنا تھا) اُٹھا دیتے تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَ غْرَقْنَا هُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غَافِلِيْنَ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بَارَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْ اِسْرَآئِيْلَ۔۔۔ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ۔

"پر ہم نے ان سے بدلہ لیا یعنی ان کو دریا میں غرق کر دیا اس سبب سے کہ وہ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی بے توجہی کرتے تھے اور ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے اس زمین کے پورب پچھم کا مالک بنادیا جس میں ہم نے برکت رکھی اور آپ کے رب کا نیک وعدہ نبی اسرائیل کے حق میں۔۔۔ ان کے صبر (یعنی مصائب سے نہ گھبرانے اور احکام نبوت پر جمے رہنے) کی وجہ سے پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پر داختہ کارخانوں اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا"۔

فرعون اور بنی اسرائیل کے معاملات کا یہ قرآنی نقشہ سامنے رکھئے پھر برطانیہ اور ہندوستان کے کمزور غلاموں کے باہمی معاملات پر غور کیجئے۔ جس درجہ میں انہوں نے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالنے میں مطالبات اور احتجاج سے کام لیا گو کہ وہ عشر عشیر بھی ابھی تک زیر عمل نہیں آیا اور نہ کچھ پورے صحیح اُسلوب پر پیش کیا گیا تاہم جس حد تک بھی کیا اور اس میں قید و بند کے مصائب کو جھیل کر صبر و استقلال سے کام لیا گیا۔ اسی حد تک ظالم قوم پر حجت قائم ہو کر خدا کی طرف سے تنبیہات اور ظالم قوم کی طرف سے تھوڑا بہت مُڑ مُڑ کر دیکھنے اور کبھی کبھی جھک جانے کا ظہور ہوتا رہا گو ساتھ میں انکار وجود بھی بدستور قائم رہا۔

گذشتہ جنگِ عظیم اور موجودہ جنگِ اعظم تنبیہات کا ایک سلسلہ اپنے اندر رکھتی ہیں۔ موجودہ جنگ کے ذریعہ فرعونی دور کی طرح حکمران قوم کے ساختہ پر داختہ کارخانوں اور صنعت

گاہوں کو وقتاً فوقتاً تباہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کی اونچی اونچی سربفلک عمارتیں زمین بوس بھی کی گئی ہیں۔

ان لاکھوں بڑوں اور چھوٹوں کو دریا برد بھی کیا گیا اس سلسلہ میں جب کبھی شکست کا رخ سامنے آتا ہے تو یہ قوم فوراً مڑ کر غلام ہندوستان کی طرف دیکھنے بھی لگتی ہے اور دفع الوقتی کے طور پر کچھ پارلیمنٹری پارٹیاں آزادی ہند کا مسئلہ بھی چھیڑ دیتی ہیں۔ ہندوستانیوں کی ہمدردی بھی حاصل کی جانے لگتی ہے۔ کبھی کرپس صاحب نمائشی آزادی کا کھلونا لے کر ہندوستان کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ کبھی سیاسی اسیروں کی رہائی کا مسئلہ بھی زیر غور آ جاتا ہے۔ کبھی ہندوستان کو طفل تسلی دینے کے لئے انہیں اختتامِ جنگ پر کسی حد تک نام کی آزادی کے وعدے دے دیئے جاتے ہیں لیکن جوں ہی شکست کا پہلو کمزور ہو کر فتح مندی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں تو پھر وہ سارے عہد و پیمان سارے رجوع ایسے کافور ہو جاتے ہیں کہ گویا کسی زبان و قلم پر کبھی آئے ہی نہ تھے وہی ایک چرچلی رٹ اور ہٹ سامنے رہ جاتی ہے یعنی جب عذاب سامنے آتا ہے تو فرعونیوں کی طرح مظلوموں کی طرف دیکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ :

وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ

”ہم عنقریب آزادی دینے والے ہیں“۔

اور جب وہ ایک تھوڑی سی مدت کے لئے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور یہ قوم اطمینان کا سانس لیتی ہے تو اِذَاهُم يَنكُثُونَ پھر وہی عہد شکنی اور اِلغاءِ مواعید۔ لیکن اس لَيتَ ولعَلَّ اور ان حقیقت پوشیوں سے خدا کا آخری انتقام ٹلنے والا نہیں ہے۔ ضرور بالضرور یہ ہو کر رہے گا کہ جو لوگ کمزور شمار کئے جا رہے ہیں انہیں کو اس زمین کے پورب اور پچھم کا مالک بنایا جائے گا مکمل آزادی ظاہر ہو کر رہے گی اور جو قوت پر گھمنڈ کر کے کسی مطالبہ پر غور نہیں کرتے ان کے ساختہ پرداختہ کارخانہ کلیۃً درہم برہم ہوں گے۔ ان کی اونچی اونچی بلڈنگیں سرنگوں ہو کر رہیں گی اور خدا کا نیک وعدہ کمزور اقوام کے حق میں پورا ہو کر رہے گا۔۔۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى

بشرطیکہ ان اقوام نے اُسوہ اور اُسوۂ محمدی سے روگردانی نہ کی۔

جُہدِ مسلسل سے ہی نتائج یقینی بنتے ہیں

اور وہ یہی کہ خدا کے بھروسہ پر اور اس کے بتائے ہوئے رنگ ڈھنگ پر تبلیغ اور اظہار مطالبات میں ایک آدھ دفعہ پر قناعت نہ کی جائے بلکہ موسوی انداز پر تسلسل کے ساتھ یہ مساعی زور اور ہمت باطنی کے ساتھ جاری رکھی جائیں۔ غرض تبلیغ پیغام میں اگر تسلسل اور دوام پیدا ہو جائے اور مطالبات کا زور بندھا رہے ادھر اپنی قوم کی تعمیر بھی ممکنہ حد تک ہوتی رہے تو قدرتی طور پر اِتمامِ

حجت اور فیصلہ کن نتائج کی ایسی صورتیں سامنے آجائیں گی جن کا فی الحال بظاہر اسباب تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهِ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجاً وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لاَ يَحْتَسِبْ
وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ علماء حقانی کے بتائے ہوئے قرآنی پروگرام پر چلنے سے پہلے ہی دن میں کامیابی سامنے جائے گی یا ساری مشکلات اگلے ہی دن ختم ہو جائیں گی یا مشق وتعب سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ اس پر صبر واستقلال کے ساتھ جم جانے سے غیبی امداد ساتھ ہو گی اور نتائج یقینی اور قطعی ہوں گے۔ اُسوۂ موسوی میں اس حقیقت کو بھی دیکھئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:

قَالَ مُوسىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔

" موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ خدا کا سہارا رکھو اور مستقل رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے جس کو چاہیں مالک بنادیں اپنے بندوں میں سے اور اَخیر کامیابی انہی کو ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں"۔

اس پر قوم موسیٰ نے ذرا گھبرا کر بے صبری سے کہا جیسے آج بھی کمزور دل کے انسان لگتے ہیں:

قَالُوْا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَاجِئْتَنَا۔

"قوم کے لوگ کہنے لگے کہ ہم تو ہمیشہ مصیبت میں ہی رہے آپ کی تشریف آوری کے قبل بھی (یعنی آپ کی پیروی سے آخر نتیجہ کیا نکلا؟ غلامی بھی بدستور باقی ہے اور فرعونی چیرہ دستیاں بھی)"۔

تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۔

" موسیٰ نے فرمایا بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کریں گے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنادیں گے۔ پھر تمہارا طرز عمل دیکھیں گے یعنی ایسے کاموں میں جلد بازی نہیں چاہئے کام کئے جاؤ اور غیبی لطائف کے منتظر رہو"۔

پس آج بھی بنی اسرائیل کی طرح پیروی نبوت کے سلسلہ میں ابلاغ عام اور مسلسل مطالبات اور ضروری جدوجہد کی طویل مدت سے نہ گھبرانا مناسب ہے نہ تبلیغ کے تسلسل میں سستی دکھانا مفید وعدہ الٰہی پر بھروسہ اور اس کے جوارح کی حیثیت سے جنگ آزادی میں حصہ لینا اور لیتے رہنا اور دینی انداز میں آگے بڑھنا اپنی قومی گلو خلاصی کے ساتھ مقابل قوم کو خدا کا سچا پیغام موثر پیرایوں میں پہنچاتے رہنا ہی اصل مشن ہے، جس پر وعدہ الٰہی کے مطابق کامیابی یقینی ہے۔

دینی پیشواؤں کی قیادت میں آکر اگلے ہی دن کہنے لگنا کہ:

اُوذِینَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَأتِینَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا۔

"آپ کی رہنمائی سے قبل بھی یہی مصائب تھے۔ اور آپ کی رہنمائی کے بعد بھی ان میں کچھ فرق نہ پڑا"۔

منشاءِ نبوت کے بھی خلاف ہے اور فطری اُسوۂ حسنہ (صبر واستقلال) کے بھی خلاف ہے پس خدا پر بھروسہ کر کے اور رسمیات سے گزر کر حقائق کا دامن سنبھالتے ہوئے احتجاجی تبلیغی اُسوۂ اور تسلسل تبلیغ کی ضرورت ہے تاکہ اُمتِ اسلامیہ کا پیغام ہر کان میں گونج اٹھے اور گونجتا رہے۔

مطالبۂ آزادی کے ساتھ تبلیغ کی ضرورت

آج ہم تبلیغی سلسلوں میں اگر سوچتے بھی ہیں تو صرف اسی حد تک کہ اپنی قوم کو تبلیغ مسائل کر کے اس کی اصلاح کی فکر کریں اور بلاشبہ یہ بھی اہم فرائض میں سے ہے یا کوئی اونچا قدم اٹھاتے ہیں تو یہ کہ یورپ وامریکہ میں ہمارے مبلغ پہنچنے چاہئیں اور کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بھی مضائقہ نہیں لیکن کیا ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ سارے یورپ وامریکہ کا خلاصہ جو ہندوستان اور اس کی اقوام کو جونک بن کر چوس رہا ہے اور دیمک کی طرح چاٹ گیا ہے۔ ہمارے بدبختی سے ہندوستان ہی کے تختہ پر جمع ہے کیا وہ اس کا مستحق نہیں کہ اس کے کان حقیقی انسانیت کے پیغام سے آشنا کئے جائیں تاکہ وہ خود بھی اس انسان نما حیوانیت کی دلدل سے باہر آئے اور اسی کے واسطے سے پھر پورا یورپ وامریکہ بھی متاثر ہو، کیا آج ہمیں ضرورت نہیں کہ جس اسلام کو ہم دنیا کا جامع ترین قانون سمجھتے ہیں، اور جسے ہم محض دیانتی ہی نہیں بلکہ سیاسی دین بھی جانتے ہیں ہم اسی شدومد سے اس کو آج کی سیاست کے بنائے ہوئے اڈوں تک بھی پہنچائیں اور ڈپلومیٹک دماغوں میں بھی اسے اتارنے کی کوشش کریں جنہوں نے دنیا کو فطری سیاست سے ہٹا کر عیاری اور فریب بازیوں کی مصنوعی اور مہلک سیاست کے کیچڑ میں پھانس دیا ہے؟

ضرورت ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں جہاں اپنی قوم کو سیاسی ابھار ادیں اور سیاسی جمود تعطل کو دور کرنے کی فکر کریں وہیں ایک مستقل مشن اور مقصد کی حیثیت سے ان کا دائرہ عمل یہ بھی ہو کہ

قوم کے قابل افراد کرسی حکومت پر بیٹھنے والوں کے کانوں کو نہ صرف مطالبہ آزادی ہی سے بلکہ اس خدائی قانون سے بھی آشنا کرتے رہیں۔ یعنی تبلیغ دین بھی کریں۔ اور نہ صرف دس بیس دن بلکہ مطالبہ آزادی اور احتجاج کے تسلسل کے ساتھ یہ پیغام رسانی بھی اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ ان مطالبوں کے نتائج خاطر خواہ بر آمد نہ ہو جائیں۔

مثلاً دس پانچ برس مسلسل طریق پر اسلام کے قانونی اور سیاسی پہلو اس کے ساتھ دینی و روحانی پیغام اخلاقی رنگ میں ان کے ذہنوں میں ڈالے جاتے رہیں اور اس تسلسل تبلیغ کے طبعی اثر سے دیانتدارانہ طور پر یہ سمجھ جائیں کہ امن عالم کا راز اسی قانون الٰہی کے اجراء میں مخفی ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ خود حکمران قوم کے بہت سے فہیم افراد دل سے ہمارے ہمنوا بن جائیں؟

اور پھر وہ کام جو حکومت سے باہر رہ کر ہم انجام دے رہے تھے خود حکومت کے دفتروں سے انجام پانے لگے اور جو امور قومی پلیٹ فارم سے ہم بمشکل حکمت کے دل میں اتار سکتے تھے وہ حکومت ہی کے اپنے امور بن جائیں۔ ہاں اگر اپنی ان تھک مساعی کے باوجود پھر بھی ایسا نہ ہو یعنی فرعونی حکومت کی طرح موجودہ حکومت کا انحراف واستکبار ہی بڑھتا رہے تو پھر یہ ہو کہ اس تسلسل پیغام رسانی سے من اللہ اتمام حجت ہو کر ایسی غیبی صورتیں نمودار ہوں کہ یہ قوم یا جھک جائے یا اس کا کرو فریک لخت خاک میں مل جائے اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائے اور اس وعدہ الٰہی کا ظہور ہو جائے کہ:

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ. (سورۂ روم)

”سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو مرتبہ جرائم ہوئے تھے اور ایمان والوں کا غالب کرنا ہمارے ذمہ تھا“۔

لیکن یہ منصوبہ صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ترجمان ملت خود دینی اور اخلاقی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ ان کے کردار اور رفتار وگفتار نیز وضع وقطع وغیرہ سے بندگی کے آثار نمایاں ہوں۔ چہروں پر قلبی صداقت چمک رہی ہو اور زبان پر کلماتِ حق وحکمت جاری ہوں۔ وہ اپنے ظاہر سے فرشی ہوں اور باطن سے عرشی ہوں اور پھر ان کا دیا ہوا پیام سیاسی اتار چڑھاؤ ڈپلومیسی اور قول کے خلاف قلب کے مخفی اغراض لئے ہوئے ہونے کے بجائے واضح صداقت وحقانیت اور دیانت و للّٰہیت کا نشان لئے ہوئے ہو جس میں واقع طور پر اپنی اور ساری اقوام عالم کی سچی خیر خواہی ملحوظ خاطر ہو جیسا کہ اُسوۂ موسوی سے ابھی واضح ہو چکا ہے کہ فرعون اور فرعونیوں کے پاس حصول آزادی کے لئے بھی جا رہے ہیں اور ساتھ ہی کمال روحانیت وتقدس کے ساتھ پیغام الٰہی خود فرعون کو بھی پہنچا رہے ہیں اور اسے ربوبیت الٰہی سے آشنا بنا رہے ہیں اس کے دلائل ذکر فرما رہے ہیں کہ:

رَبُّنَا الَّذِىْ اَعْطٰى كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔

رسالت کی حقیقت سمجھا رہے ہیں پھر فرعون سے شفقت فرما رہے ہیں اور دلی خیر خواہی سے فرمائے رہے ہیں جس میں کسی رسمیت اور ضابطہ پری کا ادنی شائبہ نہیں۔

فرعونانِ وقت کو قیادتِ موسوی ہی شکست دے سکتی ہے

پھر عنوان بیان میں کوئی ادنی جابرانہ یا تحکمانہ انداز نہیں کہ۔

هَلْ لَكَ اِلٰى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى۔

”کیا تجھ کو اس کی خواہش ہے کہ درست ہو جائے اور تجھ کو تیرے رب کی طرف راہنمائی کروں تو تو ڈرنے لگے؟“

ظاہر ہے کہ اس صاف وصریح اور مقدس طریق خطاب کا جو اسوہ موسوی اسوہ محمدی اور اسوہ جمیع انبیاء و نائبانِ نبوت ہے جو قدرتی اثر عام صلاحیت مند قلوب پر پڑ سکتا ہے وہ ہمارے سیاسی اتار چڑھاؤ کا کبھی نہیں پڑ سکتا کہ ان رسمی طریقوں میں دشمن ہم سے زیادہ ماہر اور زیادہ چالاک واقع ہوا ہے چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

انکم لن تسعوهم باموالکم ولکن تسعوهم باخلاقکم۔

”تم اقوام دنیا پر اپنے مالوں (یعنی مادی وسائل) سے غالب نہیں آسکتے البتہ اپنے اخلاق (یعنی معنویت) سے غالب آسکتے ہو“۔

پس ایک شخص کی رائے یا ایک جماعت کی پاس کردہ تجویز پھر انفرادی و اجتماعی ڈپلومیسی زیر بحث لائی جاسکتی ہے لیکن خدائی پیغام میں جو صاف وصریح ہو آسانی اور معقولیت سے کوئی بحث پیدا نہیں کی جاسکتی۔ آراء و قیاسات کے اختراع کردہ پروگراموں کے سلسلہ میں ایسے سرکاری افراد کھڑے کئے جاسکتے ہیں جو ان تجاویز میں بحثیں اٹھانے، انہیں رلانے کے لئے اپنی دماغی قابلیتیں جو اسی دن کے لئے ان میں پیدا کی جاتی ہیں صرف کریں یا ان کے خلاف مطالبات لے آئیں تاکہ حکومت کو گریز کے لئے سہارا مل جائے لیکن مذہب کے صاف وصریح پیغام کا جب کہ ہمہ گیر اصلاحی رنگ اور روحانیت لئے ہوئے ہو ان رسمی افراد سے معارضہ کرالیا جانا آسانی سے ممکن نہیں۔

ہاں اس صورت میں یہ ضرور ممکن ہے کہ استبدادی شان سے سرے سے پیغام ہی رد کر دیا جائے اور فرعون کی طرح موسیٰ صفت افراد کو یہ کہہ کر سامنے سے ہٹا دیا جائے کہ:

وَاِنِّي لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔

”میں تو موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں“۔

یا فرعون کی طرح یہ کہہ کر آزادی خواہوں کو دھمکا دیا جائے کہ:

لَاَ جْعَلَنَكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ۔

"ہم تمہیں جیل بھیج دیں گے"۔

یا یوں کہہ دیا جائے کہ:

وَلَاُ صَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ.

"تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر پھانسی لگوا دیں گے"۔

یا یہ دھمکی دی جائے کہ:

سَنُقَتِّلُ اَبْنَآئَهُمْ وَنَسْتَحْيِ نِسَآءَ هُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ.

"ہم ابھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے کیونکہ ہم کو ہر طرح کا غلبہ حاصل ہے"۔

یہ سب کہا جاسکتا ہے اور کہا گیا لیکن حقیقی حجت کو حجت سے رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس صورت سے پیغام کی جڑیں اور مضبوط ہوتی ہیں اور مخاطب قوم کی جڑیں غیر محسوس طریق پر کھوکھلی ہوتی رہتی ہیں۔

چنانچہ فرعون نے اگر مذکورہ دھمکیاں دیں تو اس سے خدائی پیغام یا پیغام لے جانے والے کا سر کب نیچا ہوا؟ بلکہ یہ ساری شکست و مغلوبیت آخر کار اس فرعون کے حصہ میں آئی جو قہر و غلبہ کا دعوے دار تھا۔

پس اگر آج بھی امت اسلامیہ کا پیغام اسی کے قائد موسیٰ صفت بن کر فرعونانِ وقت کے پاس لے جائیں اور لے جاتے رہیں تو یہ ممکن ہے کہ انہیں جیل، پھانسی، قتل وغیرہ کی دھمکیاں دی جائیں لیکن اس سے خدائی پیغام اور پیغام بروں کا سر نہیں نیچا ہو سکتا اور نہ پیغام میں کوئی معقول حجت نکالی جاسکتی ہے بلکہ یہ امت کی جیت اور انکے دشمنوں کی کلی ہار ہو گی جس سے غیبی نتائج کا برملا ظہور ہو گا اور یہ حقیقت کھل جائے گی کہ:

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَاكَانُوْا يَعْمَلُوْنَ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صَاغِرِيْنَ.

"پس حق ظاہر ہو گیا اور انہوں نے جو کچھ بنایا تھا سب اکارت گیا پس وہ لوگ ہار گئے اور خوب ذلیل ہوئے"۔

خلاصہ یہ کہ عدم تشدد کی جنگ کے سلسلہ میں سب سے بڑا ہتھیار مطالبہ آزادی کے ساتھ مخاطب قوم کو پیغام حق مسلسل طریق پر پہنچاتے رہنا اور مقابل کی بھبکیوں سے اور ہم چشموں کے استہزاء و تمسخر سے بے نیاز ہو کر نبوی رنگ میں ہدایت دیتے رہنا جس کے نتائج قطعی موعودہ حق ہیں اور ساتھ ہی نصرت غیبی یقینی ہے۔

اسلام میں آزادی کی غرض وغایت

بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کو رسول الٰہی بتلا کر تعارف کرانے اور اپنی پوزیشن واضح کر دینے کے بعد فرعون کو اولین پیغام یہ پہنچایا کہ

فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ.

"(اے فرعون) بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ کر دے۔ انہیں آزاد کر دے اور انہیں ستا مت"۔

(۱۷) اس سے صاف واضح ہے کہ اسلام میں محکوم قوم کو حکمران قوم کے سامنے مکمل آزادی کا مطالبہ پیش کرنا اور علامی کے بدترین عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا فرض ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے آزاد کرانے کے لئے ہی اللہ نے ایک اولوالعزم پیغمبر کو مبعوث فرمایا۔ جنہوں نے فرعون کے بھرے دربار میں پہنچ کر یہ مطالبہ صریح الفاظ میں پیش کیا جیسا اس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔

(۱۸) اس موقع پر ایک نکتہ اور سمجھ لینا چاہئے اور وہ یہ کہ اس قومی استخلاص یعنی بنی اسرائیل کے آزاد کرانے کی غرض کوئی وطنی یا قومیت کی آزادی نہ تھی بلکہ مذہب کی آزادی تھی قوم کو بھی آزاد کرانا تھا تو مذہب ہی کی آزادی کے لئے بالفاظ دیگر اس آزادی سے کوئی دنیوی ترفہ یا لذائذ دنیا کی تحصیل وتکمیل یا کسی قسم کا رسمی جاہ ومنصب مقصود نہ تھا کیونکہ اول تو حصول آزادی کے لئے پیغمبر کا انتخاب کیا گیا اور ظاہر ہے کہ پیغمبر سر تاپا دین ہوتا ہے اس کے افعال بھی دین اور ان کی غرض وغایت بھی دین۔ اس لئے پیغمبر کا آزادی مانگنا دنیوی اغراض کی خاطر قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ اس کو عنوان آیت سے یوں سمجھئے کہ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ------ میں ارسال بنی اسرائیل کو دعوائے رسالت پر بذریعہ فا کے متفرع فرمایا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ میں پیغمبر ہوں اس لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کرتا ہوں اس سے واضح ہوا کہ مطالبہ آزادی کا منشاء پیغمبری ہے اور ظاہر ہے کہ دنیوی آزادی یعنی آزاد ہو کر متاع دنیا سے آزادانہ انتفاع خطوط دنیا کی ہوسناکیاں' تعیش اور ترفہ وغیرہ کی آزادی پیغمبری کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی اس لئے پیغمبر ایسی آزادی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا۔

اس سے یہ مسئلہ صاف نکل آتا ہے کہ اسلام میں حصول آزادی کی غرض وغایت نہ روٹی ہے نہ مال ومنال۔ اگر آج ہم اپنے اسٹیجوں سے روٹی اور معاشی رفاہیت کی خسیس اغراض لے کر اٹھیں اور انہی فانی اور چند روزہ بہاروں کی کمزور بنیادوں پر اپنی مساعی کی عمارتیں کھڑی کرنے لگیں تو وہ دن دور نہیں ہے کہ ہمیں اس بے جڑ تعمیر سے نادم ہونا پڑے گا اور ہم عیاذاً باللہ اس کے مصداق ٹھہریں گے کہ

اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا.

یہی وجہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے استخلاص قوم کی مساعی کا آغاز تبلیغ دین سے شروع کیا۔ ربوبیت ورسالت کو بیچ میں لا کر آزادی کا مطالبہ کیا گیا غم وغصہ اس کا نہ تھا کہ ہماری دنیا آزادی نہیں بلکہ اس کا تھا کہ دین آزاد نہیں، ربوبیت ورسالت کے شعائر بلند نہیں ہیں۔ ربوبیت ورسالت کے منکر دنیا پر غالب آ گئے۔ انہوں نے لادینیت کا فساد دنیا میں برپا کر دیا کہ جس سے دنیا مادیت کی خسیس اغراض میں پڑ کر سرکشی اور بغاوت حق میں مبتلا ہو گئی۔ اور وہ دیانت کے احکام کو دنیا میں پھیلانے سے عاجز رہ گئے اور دین کے اجراء میں دست وپابستہ ہوئے ہیں۔ پس یہ شکایت نہ تھی کہ ہماری دنیوی راحت وآرام یاروٹی اور رہائش میں فرق پڑ گیا ہے۔

ہمیں کوٹھی اور بنگلے میسر نہیں رہے۔ ہمارے گھروں پر موٹر کاریں کھڑی ہوئی دکھلائی نہیں دیتیں یا ہم اقلیت میں ہیں اور اکثریت ہمیں فنا کر دے گی۔ یا ہماری توہین ہو رہی ہے اور عزت وجاہ دوسروں کے حصہ میں آ گئی ہے بلکہ شکایت فی الحقیقت صرف دیانت کے مغلوب ہو جانے اور آزاد نہ رہنے کی تھی اور جس حد تک اکثریت کی طلب یا عزت وجاہ کی طلب یا غلبہ واقتدار کی طلب تھی وہ بھی صرف غلبہ دین کی خاطر تھی ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کو تو مشاغل دنیا کے انہماک کی وجہ سے عذاب خداوندی سے ڈراتے اور پھر خود ہی اپنے مطالبہ آزادی کی غرض وغایت وہی شغل دنیا قرار دیتے عیاذاً باللہ۔

پس موسیٰ علیہ السلام کے مطالبہ آزادی کا حاصل یہ ہوا کہ اور فرعون! چونکہ تو خدا پرست نہیں اس لئے تیری ماتحتی میں بنی اسرائیل بھی خدا پرست نہیں رہ سکتے نہ ان کا شرعی علم باقی رہ سکتا ہے نہ ان کی روایات مذہب قائم رہ سکتی ہیں نہ ان کے عملی شعائر بلند ہو سکتے ہیں نہ ان کے مادی وسائل باقی رہ سکتے ہیں جو تقویت دین میں استعمال ہوں۔ اس لئے بنی اسرائیل کو آزاد کر اور میرے ساتھ کر دے تا کہ میں انہیں خدا پرستی کی راہ پر پختہ کر سکوں اور تو بھی اپنے رب اور اس کے فرستادہ رسول کو پہچان اور مان۔

اس سے صاف واضح ہوا کہ مسلمانوں کے مطالبہ آزادی میں شکایت دنیا یا اقلیت واکثریت کی بحثیں یاروٹی اور بوٹی کے مقاصد کا دخل نہ آنا چاہئے اگر یہ باتیں آئیں بھی تو غلبہ دین کے وسائل کی حیثیت سے نہ کہ مقاصد کے درجہ میں۔

مطالبۂ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر ہونا چاہئے

پس مسلمانان ہندوستان کو صاف وصریح الفاظ میں مطالبہ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر کرنا چاہئے ان کے نزدیک مصائب دین اہم ہونی چاہئے نہ کہ مصائب دنیا کہ وہ دینی مصائب زائل ہونے پر خود بخود زائل ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اغیار کے تسلط واقتدار کو اگر ہولناک باور کرایا ہے تو وہ دینی مصائب کی وجہ سے نہ کہ دنیوی مصائب کی

بناء پر۔ چنانچہ ذیل کی دعاء نبوی میں گو اقلیت واکثریت اکرام وتوہین اور غلبہ ومغلوبیت کا ذکر ہے مگر مقصود اولین مصائب دین کے ازالہ کو قرار دیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ ان سارے دنیوی مصائب کو بھی اگر تکلیف دہ سمجھا ہے تو دین کی خاطر نہ کہ دنیا کی خاطر۔ ارشاد نبوی ہے۔

ربّ لاتجعل مصیبتنا فی دیننا ولا تجعل الدنیا اکبر ھمنا ولا مبلغ علمنا ولا غایت ولاتسلط علینا من لایرحمنا.

"اے پروردگار ہمارے دین میں مصیبت نہ ڈال اور دنیا کو ہمارا اہم مقصود نہ بنا اور نہ اسے ہمارا مبلغ علم بنا (کہ اس کے مادی اکتشافات واختراعات اور دنیوی زندگی کے جوڑ توڑ ہی کو سب سے بڑا علم سمجھنے لگیں) اور نہ ہماری رغبتوں کی آخری حد دنیا کو کر اور ہم پر کسی ایسے کو مسلط نہ فرما جو ہم پر رحم نہ کھائے"۔

اللّھم زدنا ولا تنقصنا وواکرمنا ولاتھناً واثرنا ولا توثر علینا.

"اے اللہ ہماری تعداد زیادہ کر کم نہ کر ہمیں اکرام نصیب فرما' توہین سے بچا' ہمیں غالب کر مغلوب نہ کر"۔

ذیل کی حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ روٹی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور فقر و فاقہ کوئی بنیادی مصیبت نہیں اصلی مصیبت یہ ہے کہ دنیا کے دروازے کھل کر دین ضائع ہو جائے ارشاد نبوی ہے۔

واللّٰہ ما اخشی علیکم الفقر ولکن مما اخشی علیکم من بعدی زھرۃ الدنیا تفتح علیکم فتھلککم کما اھلکتھم.

"خدا کی قسم مجھے تمہارے فقر وفاقہ کا کوئی ڈر نہیں لیکن جو چیز مجھے اپنے بعد خائف بنا رہی وہ ہے دنیا کی سر سبزیاں ہیں جو تم پر کھلیں گی اور تمہیں اس طرح ہلاک کریں گی جس طرح پچھلی اقوام کو انہیں نے ہلاک کیا (اور جیسے آج کی قوموں کو برباد کر رہی ہے)"۔

اس حقیقت کو حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ' پر ظاہر فرمایا جبکہ ایلاء کے موقعہ پر آپؐ ایک ماہ تک خانہ نشین رہے ہیں اور حضرت عمرؓ نے حاضر ہو کر دیکھا کہ بیت نبوت میں کل سامان ایک چمڑے کا مشکیزہ ہے جس میں کچھ شہد ہے اور ایک چٹائی ہے جس پر حضور ﷺ آرام فرما ہیں اور اس کی تیلیاں بدن مبارک پر ابھر آئی ہیں تو آزردہ ہو کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ قیصر وکسریٰ دشمنان حق تو نرم نرم گدیلوں پر آرام کریں اور اللہ کے رسول کو چارپائی بھی میسر نہ ہو۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر کشائش فرمائے تو حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو خطاب فرماتے ہوئے تنبیہ کے طور پر فرمایا۔

افی شك انت یا ابن الخطاب؟ هولاء الذین عجلت لهم طیباتهم فی الحیوة الدنیا ولاخلاق لهم فی الاٰخرة (او کماقال)

”اے خطاب کے بیٹے! کیا تو ابھی تک شک میں پڑا ہوا ہے (یہ قیصر و کسریٰ) تو وہ لوگ ہیں جن کی نعمتیں دنیا ہی میں دے کر ختم کر دی گئی ہیں اور آخرت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے (کیا یہ بھی اس قابل ہیں کہ ان پر رشک کیا جائے)۔“

اہل اللہ چونکہ وارثان نبوت ہوتے ہیں اس لئے ان پر بھی انبیاء ہی کی یہ شان غالب ہوتی ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو جب مکہ کے حرم محترم میں برطانیہ کے کارندوں نے اسیر کیا اور گرفتاری کا پروانہ دیا گیا تو فرمایا کہ الحمد للہ۔

بہ مصیبتے گرفتار آمدم نہ بہ معصیتے

”خدا کا شکر ہے کہ میں مصیبت میں گرفتار ہوا نہ کہ معصیت میں“۔

جس سے واضح ہے کہ معصیت دینی مصیبت ہے اس لئے اس میں مبتلا نہ ہونے پر شکر الٰہی ادا فرمایا۔ اس سے نمایاں ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دنیا کی مصیبت کوئی چیز نہیں نہ وہ کوئی قابل شکایت امر ہے کہ تغیرات دنیا ہیں اور منجانب اللہ بنی آدم کی ہی مصالح کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔ کبھی ان سے کفارہ سیات مقصود ہوتا ہے اور کبھی ترقی درجات۔

اہم مصیبت دینی مصیبت ہے اور دینی مصیبتوں کا انتہائی اور جامع درجہ یہ ہے کہ دین آزاد نہ رہے اور دین دار غلامی میں مبتلا ہو کر شعائر دین کو آزادانہ برپا نہ کر سکیں۔۔۔۔پس آج بھی جبکہ ہندوستان میں دین آزاد نہیں۔ اس کے شعائر کو مسلمان خاطر خواہ قائم نہیں کر سکتے نہ اپنے اختیار سے شعائر دین کو بلند کر سکتے ہیں۔ تو آیت بالا کی رو سے حسب اسوہ موسوی ان کا اسلامی فرض ہے کہ مکمل آزادی کی جدوجہد کریں دین کے نام پر کریں۔ دینی رنگ میں کریں' دینی افراد کے ذریعہ کریں' عام افراد میں دن اور دین کی اہمیت کے جذبات پیدا کریں کہ مطالبہ آزادی کی غرض وغایت ہی اسلام میں دین کی آزادی ہے۔ جس پر دنیا کی آزادی بطور خاصیت کے خود بخود مترتب ہوتی ہے۔

اسلامی آزادی کے دو راستے

چنانچہ اسلام میں حصول آزادی کے دو ہی راستے ہیں۔ جہاد اور ہجرت پھر ان دونوں کے دو دو فرد ہیں۔ جہاد بالسنان یعنی اسلحہ سے جنگ کرنا اور جہاد باللسان یعنی کلمہ حق ظالم بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دینا۔

ایسے ہی ہجرت کے بھی دو ہی فرد ہیں۔ ایک ہجرت مکانی یعنی دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف منتقل ہو جانا اور دوسرے ہجرت ارکانی معاصی چھوڑنا اور موطن طبیعت سے منتقل ہو کر موطن

شریعت میں جانا ظاہر ہے کہ ان دونوں امور جہاد اور ہجرت میں سے کسی ایک کی غرض وغایت بھی روٹی یا لذائذ دنیا یا رفاہیت و تنعم یا حظوظ عاجلہ نہیں بلکہ صرف دین کی آزادی و برتری کا قیام ہے۔ جہاد کی غرض تو واضح ہی ہے کہ صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہے جیسا کہ کتاب وسنت کی سینکڑوں تصریحات اس بارے میں موجود ہیں۔ ہجرت بھی اس لئے نہیں کرائی گئی کہ لوگوں پر وسائل معاش تنگ ہو گئے تھے اور ان کی روٹیوں میں گھاٹا آنے لگا تھا تو انہیں دار الکفر ترک کر دینے کا حکم ملا ہو بلکہ صرف اس لئے کہ ان کے دین پر مصیبت آنے لگی تھی۔

چنانچہ اوائل اسلام میں دو ہی ہجرتیں ہوئی ہیں۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ۔ مگر دونوں کی غرض مشترک تحفظ دین تھی نہ کہ تحفظ معاش۔

چنانچہ ہجرت مدینہ میں چونکہ یہ غرض زیادہ علو مرتبہ کے ساتھ نمایاں ہوئی اس لئے ہجرت مدینہ، ہجرت حبشہ سے افضل ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ہجرت حبشہ میں تو مہاجرین کو صرف اپنا دین محفوظ کرنا تھا اور اس کی صورت فرار عن الفتن کی تھی یعنی دین میں فتنہ مخل ہوتا تھا تو جائے فتنہ کو چھوڑ دیا گیا تا کہ دین محفوظ رہ جائے اور ہجرت مدینہ میں نصرت رسول ﷺ اور دین کی شوکت کا مقصد سامنے تھا یعنی محض اپنا دین بچا لیجانا مقصود نہ تھا بلکہ شوکت کے ساتھ دوسروں تک دین کی منادی اور تبلیغ کر دینا بھی مقصود تھا بلحاظ مقصد دونوں ہجرتیں محمود و مستحسن تھیں کہ محض اپنا دین محفوظ رکھ لینے کی خاطر دار الکفر کو چھوڑنا بھی عین دین ہے اور دین کو سربلند کرنا بھی دین ہے۔ لیکن پہلی صورت میں ایک حد تک اپنے ضعف اور کمزوری کا اعلان بھی ہے جس کو براہ راست اعلاءِ کلمۃ اللہ نہیں کہہ سکتے اور دوسری صورت میں نصرت نبی کی خاطر گھر بار چھوڑنا ہے۔ جو بلاواسطہ اعلاء دین ہے۔ اس لئے یقیناً ہجرت مدینہ ہجرت حبشہ سے افضل ثابت ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہجرت کا لفظ بول کر تبادر کے ساتھ علی الاطلاق ہجرت مدینہ ہی سمجھی جاتی ہے کہ وہی ہجرت کا فرد کامل ہے۔ غرض کوئی سی بھی ہجرت لے لی جائے کسی ایک کا مقصد بھی تنگی معاش سے بچنا یا مصائب دنیا سے تنگ آکر گھر چھوڑنا نہ تھا اور کسی حد تک یہ چیزیں اگر پیش نظر بھی ہوئیں تو صرف دین کی غرض سے ہوئیں اس لئے ہجرتین کا مقصد بھی آخر کار وہی اعلاء کلمۃ اللہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نے ہجرت فرماتے ہوئے اس کا کوئی افسوس ظاہر نہیں فرمایا کہ میرا آبائی وطن اور جدی گھر مجھ سے چھوٹ رہا ہے۔ عزیز و قرباء چھوٹ رہے ہیں۔ مانوس سرزمین چھوٹ رہی ہے بلکہ بیت اللہ کو حسرت سے دیکھ کر یہ فرمایا کہ:

"اگر میری قوم مجھے وطن سے نہ نکال دیتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا"۔

جس سے واضح ہے کہ ہجرت کے سلسلہ میں نہ حضور کو وطن پیش نظر تھا نہ قبیلہ وخاندان بلکہ اللہ اور بیت اللہ مکہ کا شہر یا ملک حجاز اور قوم بھی اگر کسی درجہ میں نگاہوں کے سامنے تھی تو وہ اللہ

اور ذکر اللہ یعنی دین اور اعلاءِ دین کے لئے تھی نہ کہ براہ راست اور بالذات۔

خلاصہ یہ کہ جہاد اور ہجرت حسی ہوں یا معنوی اور ان کا کوئی سا فرد ہو صرف اس بناء پر عمل میں آتے ہیں کہ لادین قومیں جمعہ وجماعات، تبلیغ و موعظت، اقامت حدود اور سد ثغور وغیرہ میں حارج ہوئیں اور دین کے سر بلند ہونے میں آڑے آئیں نہ اس لئے کہ وسائل معاشی کی تنگی روٹی اور کپڑے کی گرانی۔ عیش ولذت، راحت کی کمی اور اس کی تحصیل و تکمیل میں فرق آگیا تھا اور اس سے بچنا مقصود تھا۔ اگر اس سے بچنا مقصود ہوتا تو اسلام میں فقر وفاقہ اور خشونت عیش کے فضائل ہی کیوں بیان کئے جاتے۔

اس لئے آج جو جہاد اکبر یعنی اعلاء کلمہ حق عند سلطان جائر کا مقصد لے کر مسلمان کھڑے ہوں اور کھڑے ہیں تو اس میں بھی ایک لمحہ کے لئے ان کے قلوب میں شکایت معاش یا شکایت ترفہ وتنعم پیش نظر نہ رہے۔ صرف تحفظ دین اور اعلاء کلمہ حق ملحوظ رہنا چاہئے اور وہی ساری جدوجہد کی غرض وغایت ہو جسے غیر مشتبہ الفاظ میں بھی واضح کر دیا جائے۔ پھر ایسے ہی تدابیر کے سلسلہ میں اقلیت واکثریت یا اہانت و تکریم کا سوال پیدا نہ ہونا چاہئے یعنی ان رسمیات سے مغلوب نہ ہونا چاہئے بلکہ ان پر غالب آنا چاہئے جس انداز سے بھی ممکن ہو جیسا کہ آیت بالا کے اشارہ اور نصوص وحدیث سے واضح کر دیا گیا ہے۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی دربار میں جو کچھ نیابت الٰہی میں ارشاد فرمایا وہ حجت ودلیل سے فرمایا اور اپنی رسالت پر خدا کی آیات پیش کیں یعنی معجزے دکھلائے۔ عصاء موسوی دکھلائی جو لاٹھی سے سانپ اور سانپ سے لاٹھی بن جاتی تھی۔ ید بیضاد کھلایا جو گریبان میں ڈالنے سے سورج کی طرح روشن ہو جاتا تھا اور پھر اصلی حالت پر لوٹ آتا تھا جس کی جواب دہی سے فرعون عاجز ہوا اور اسکے سوا اسے کچھ بھی جواب نہ بن پڑا کہ موسیٰ علیہ السلام پر جادوگری کا الزام لگائے۔ چنانچہ یہی کیا اور ملک کے جادوگر جمع کر کے مقابلہ کرایا۔

اور انہوں نے بھی اس لاٹھی کے سانپ کی شکل کے ہزارہا سانپ جادو کے زور سے بنائے مگر چوں کہ ان میں حقیقت کچھ نہ تھی اس لئے جادوگر سب کے سب عاجز ہو گئے اور انہیں تسلیم ورضا کے سوا چارہ نہ رہا۔

مطالبہ آزادی میں اعجازی حجت کی ضرورت

(۱۹) اس سے صاف ظاہر اور واضح ہوا کہ آج بھی جبکہ استخلاص قوم کے لئے متسلط اقوام کے حلقوں میں قائدین اسلام جائیں اور تو ہر دعوے کے ساتھ حجت بھی پیش کریں اور وہ بھی معجزہ کی تا کہ مخاطب قومیں اس کے ماننے پر عقلاً مجبور ہو جائیں اور جواب نہ لا سکیں۔ فرق اتنا ہے کہ فرعون کے سامنے معجزہ موسوی پیش کیا گیا تھا جو لاٹھی کا تھا اور فرعونان وقت کے سامنے معجزہ

محمدی پیش کرنا چاہئے جو کہ قرآن کریم ہے اور تمام دلائل و براہین کا مجموعہ۔ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً کیونکہ فرعون کا رنگ حاکمانہ تھا تو وہ لاٹھی ہی سے قائل ہو سکتا تھا اور فرعونانِ وقت کا رنگ حکیمانہ ہے تو علم و حکمت سے ہی قائل ہو سکتے ہیں۔

فرعون نے اپنے ملکی جادوگروں کو تقریب درباری، کرسی اور انعام و اکرام کے وعدوں کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ڈال کر عصاءِ موسوی کے سانپ کے ہم شبیہ لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بنوائے مگر وہ محض "تخیلاتی تھے۔

فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ.

"بس یکا یک ان جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں (جو سانپوں کی صورت میں ان کی نظر بندی ہے) موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے چلتی دوڑتی ہوں"۔

اس لئے یہ سب کید و مکر ختم ہو گیا اور سارے سانپوں کو موسوی اژدھا نگل گیا۔ معجزہ کے سامنے سب جادوگروں نے سپریں ڈال دیں۔

بعینہٖ آج بھی یہی صورت ہو گی کہ جب فرعونانِ وقت کے سامنے معجزہ محمدی (قرآن) کے دلائل و براہین پیش کئے جائیں گے یا پیش کئے گئے ہیں تو انہوں نے اسی ملک کے جاہل مولویوں مگر جادو بیان لیکچراروں کو کھڑا کر دیا کہ وہ مضامین قرآن ہی کے ہم شبیہ مضامین اور اسی کے استنباطات کے مشابہ وجوہ مستنبطہ پیش کر کے تلبیس ابلیس کریں جس پر ان کے لئے انعام و اکرام اور ہر قسم کی سرکاری رعایتوں کے وعدے ہوتے ہیں۔ مخفی نالیوں سے اس روپیہ کا یہ گندہ پانی ان کے گھروں میں بہتا ہوا پہنچتا رہتا ہے۔ ان ائمہ مضلین سے فرقے بنتے ہیں وہ کتاب و سنت ہی کے نام پر اہل حق کے مقابلہ پر آتے ہیں اور عصاءِ قرآنی کے مشابہ ہزار ہا عصی (لاٹھیاں) تخیلاتی بنا بنا کر میدان میں پھینکتے ہیں۔ ہزاروں ٹریکٹ رسالے اور تفسیریں، قرآنی تفسیروں اور فقہیات کے مشابہ سامنے آتی ہیں۔ حتیٰ کہ نبی قرآن کی طرح انبیاء بھی کھڑے کر دیئے جاتے ہیں جو اہل حق کو کذاب و مبطل کہہ کر اپنی گورنمنٹ کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری بعثت ہی اس حکومت کی حمایت کے لئے ہوئی ہے۔ ہم اگر اس کے فضائل بیان کریں تو پچاس الماریاں بھر جائیں۔

کوئی کہتا ہے کہ قرآن میں مومن قانت، متقی وغیرہ کے الفاظ کا مصداق ہی موجودہ گورنمنٹ کے افراد و اجزاء ہیں۔ ان جادوگروں اور ان کی میدان میں ڈالی ہوئی ان لاٹھیوں اور سانپوں سے جو اہل حق کے خیال میں کبھی کبھی چلی دوڑتی دکھلائی دینے لگتی ہیں۔ مسلمانوں میں خیالات کا تشتت اور تفریق پیدا ہوتا ہے۔ ان کی دل جمعی خاک میں مل کر قوت منتشر ہو جاتی ہے اور حکمرانوں کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ حکومت کے قدم کچھ اور جم گئے۔ لیکن جب یہ ثعبان قرآن اپنی پوری شان کے

ساتھ کسی موسیٰ صفت عالم کے ہاتھ پر نمایاں ہوتا ہے تو بالآخر ان سارے سانپوں کو نگل لیتا ہے اور فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ کا ظہور ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ جادو بیان لیکچرار گورنمنٹ سے کٹ کر حق کے سامنے سر بھی جھکا دیتے ہیں اور اعلان کر دیتے ہیں کہ ہم اب تک غلطی اور تلبیس میں پھنسے ہوئے تھے اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى جس سے اس قسم کی تلبیسات کا آئے دن پردہ چاک ہوتا رہتا ہے۔ بہر حال مقصد یہ ہے کہ آزادی خواہ طبقہ جو مطالبہ اور جو نصیحت بھی فرعونی درباروں میں پیش کرے، سلف کے انداز میں پیش کرے۔ اس تمسک واستدلال کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہونی چاہئے کہ اس کے ہر ہر جملہ کی دلیل کتاب وسنت وہو تا کہ اس کا منجانب سرکار الٰہی ہونا ظاہر ہو جائے اور اس کی بات مذہبی سمجھی جائے جس کا کسی سے بھی جواب نہ بن پڑے اور جواب دیا تو جواب کی جادوگری کا پردہ اسی آیت الٰہی سے چاک ہو جائے۔

پس ہمارے لئے اس میں کوئی فخر نہ ہونا چاہئے کہ ہم نے اپنی تقریر وتحریر کو عین اس سیاسی اور معاشی انداز میں پیش کیا جس انداز سے عصری سیاست کے وکلاء اپنے مقابلے پیش کرتے ہیں۔ جن کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ ان میں قرآن وحدیث کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ہوتا نہ تصیصاً نہ استنباطاً اور محسوس ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ مقالہ کسی طالب علم اور منہمک کتاب وسنت کا ہے کیونکہ اس کا آغاز وانجام قومیت محضہ، معاش، خالص ملکی مفاد اور صرف رسمی تعاون سے ہوتا ہے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے اول وآخر اور ظاہر وباطن کی ہر ایک جنبش صرف کتاب وسنت اور اس کے صحیح استنباط سے ہو اور یہی رنگ ہماری طرف خواص وعوام میں منسوب ہو جائے کیونکہ ان کے ہر خطاب وابلاغ ہر پیام اصلاح وتہذیب اور ہر ایک مطالبہ واحتجاج کے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ:

قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى.

"ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشان لائے ہیں اور سلامتی ایسے شخص کے لئے ہے جو راہ پر چلے"۔

یعنی نہ خود آئے نہ کوئی اختراعی حجت لے کر آئے بلکہ دونوں چیزیں من اللہ ہیں اور اسی لئے صحیح وسالم وہی رہے گا جو اس رسالت الٰہی کی پیروی کرے گا ورنہ ہمارے ہی ہاتھ پر اس کی تباہی من اللہ نمایاں ہوگی کیونکہ:

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى.

"ہمارے پاس خدا کی طرف سے یہ حکم پہنچا ہے کہ (قہر خداوندی) کا عذاب اس شخص پر ہوگا جو جھٹلاوے اور روگردانی کرے"۔

بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے اس ساری پیغام رسانی میں جو منجانب اللہ اور بامر اللہ تھی، اولین مقصد فرعون سے یہ بھی ظاہر فرمایا کہ اَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ (بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج۔۔۔۔اور اپنے پنجہ ظلم سے انہیں رہا کر کے انہیں آزادی دے)

ظاہر ہے کہ اس ارسال بنی اسرائیل اور انہیں موسیٰ کے ساتھ بھیج دینے کا یہ مطلب نہ تھا کہ انہیں مصر سے شام بھیج دے یا ہم ملک مصر چھوڑنے کے لئے بنی اسرائیل کو تجھ سے لینے آئے ہیں بلکہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنا پابند اور غلام رکھنے کی بجائے میرے ساتھ ہونے دے تاکہ وہ میرے ساتھ ہو کر جس طرح چاہیں آزادی سے زندگی بسر کر سکیں۔

انتخاب امیر اور تشکیل مرکزیت (۲۰) اس سے واضح ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام قوم بنی اسرائیل کے اوپر سے فرعون کی امامت ہٹا کر رسول خدا کی امامت و امارات قائم فرمانا چاہتے تھے کیونکہ فرعونی امارت سے ان میں غیر اللہ کی پرستش کے مہلک جراثیم سرایت کر جاتے اور موسوی امامت سے ان میں صرف خدائے واحد کی اطاعت و عبادت کے پاک جذبات گھر کرتے۔ تو کیا اس سے یہ مسئلہ واضح نہیں ہوتا کہ حصول آزادی کے سلسلہ میں مسلمان اپنا ایک امام اور امیر منتخب کریں جو ایک طرف تو حسب استطاعت اطاعت شریعت کے ساتھ ان کی دینی تربیت کرے ان کی اسلامی تنظیم کرے ان کے معاملات و محاکمات کو شرعی دائرہ میں رکھے اور ایک طرف دشمنان دین سے جائز مطالبات بھی کرے اور نہ صرف اپنے مامورین بلکہ ان ناجائز آمرین کو بھی راہ حق دکھلائے۔ رب اعلیٰ اور اس کی رسالت حقہ سے انہیں بھی آشنا بنائے۔ اگر مسلمان فوضویت اور لامرکزیت کی زندگی بسر کرتے رہے تو نہ ان کا دینی تشتت زائل ہو سکے گا نہ دنیوی تفرق۔ یہ غرض نہیں کہ مسلمان اس مغلوبیت کے عالم میں خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین بنائیں کہ اس کے لئے طاقت اور قہر غلبہ شرط ہے بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ ایک مرجع الامر تسلیم کر لیں جو ان میں دینی تشتت اور افتراق نہ ہونے دے اور حتی الامکان ان کو اخلاقی قوت سے معاملات شرعیہ پر جمائے رکھے تاکہ وہ جب بھی غلبہ پائیں تو انہیں اس انقلاب کے تشویش ناک دور میں از سر نو کسی نظام اور مرکزیت کی تشکیل کرنی نہ پڑے بلکہ پہلے ہی سے ان کا ایک قائم شدہ نظام کا ڈھانچہ بنا بنایا موجود ہو اور وہ اسی میں حسب غلبہ و طاقت، طاقت کی روح پھونک دیں۔ چنانچہ آزادی کے سلسلہ میں چونکہ خدا کے حکم کے مطابق بنی اسرائیل کو مصر چھوڑنا پڑا تو موسیٰ علیہ السلام کی زیر قیادت ان کے نظام کی تشکیل ایسی قائم شدہ موجود تھی کہ ایک اشارۂ موسوی پر چھ سات لاکھ بنی اسرائیل نے راتوں رات مصر چھوڑ دیا اور صبح ہوتے ہوتے ہو بحر قلزم کے کنارے پر تھے۔

پھر فرعون اور فرعونیوں کے غرقابی کے بعد جب کہ بنی اسرائیل کی طاقت کی داغ بیل پڑ

رہی تھی۔ انہیں کوئی نیا نظام بنانا نہ پڑا تھا۔ امام موسیٰ علیہ السلام تھے جن سے قوم میں مرکزیت قائم تھی اور مقتدی سارے بنی اسرائیل تھے جس سے سمع وطاعت کا نظام قائم تھا' ڈھانچہ موجود تھا۔ روح آتے ہی وہ زندہ ہو گیا اور پھر جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے اوراق میں موجود ہے۔

اسی طرح آج کے دور غلامی میں اشد ترین ضرورت ہے کہ حسب طاقت مسلمان بھی اپنے لئے کسی ایک شخصیت کو پہلے ہی سے امیر تسلیم کئے رہیں اور اس کے ذریعہ اپنی شرعی تنظیم کئے رہیں۔ آج وہ اخلاقی ہے کل کو وہ رسمی ہو جائے گا جس میں قہر وغلبہ پیدا ہو جائے گا۔

صفات قیادت

(۲۱) مگر ہاں اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ امیر موسیٰ صفت ہونا چاہئے یعنی دور نبی کے بعد امیر وامام نائب نبی اور وارث نبی ہونا چاہئے جس میں اوصاف نبوت کا پورا پورا ظل ہو اور ظاہر ہے کہ نبی کے بے شمار اوصاف کمال کا خلاصہ دو چیزیں ہوتی ہیں۔

ایک علم لدنی جس پر نبوت کا مدار ہے یعنی وہ علم اکتسابی اور کتابی نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے بلا توسط اسباب القاء خدا ہوتا ہے جس کا چشمہ نبی کے قلب سے پھوٹتا ہے جو محسوساتی علوم کے اوہام وظنون اور شبہات سے پاک ہوتا ہے اور قطعیت ویقین کی ٹھنڈک لئے ہوئے ہوتا ہے جس سے سینے معمور ہو جاتے ہیں اور سکون وطمانیت قبول کرتے ہیں۔

دوسرے معصومیت کہ نبی کی ہر نقل وحرکت حظ نفس سے پاک ہوتی ہے ہر چیز اللہ کے لئے کی جاتی ہے جس میں غیر اللہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ گمراہی کا شائبہ ہوتا ہے نہ ضلالت کا۔ غرض علم خدائی ہو جو اس کے مخفی راستوں سے آیا ہو اور عمل عبدیت خالصہ کا ہو جس میں ضلالت نہ ہو تو یہی کمالات نبوت کا سر منشاء ہے جس سے آگے تمام کمالات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے پس حقیقی ورثہ انبیاء بنص حدیث ۔

العلماء ورثة الانبياء.

”علماء وارثان نبی ہیں“۔

علماء ہیں تو ان سے اس قیادت وامارات کے سلسلے میں وہی علماء مراد ہو سکتے ہیں جن میں یہ دونوں باتیں حسب درجہ واستعداد پائی جاتی ہوں جن کا علم لدنی ہو' جن میں علم کے ساتھ معرفت بھی ہو' جن کا قلب مورد علم خفی ہو' وہ اسرار تشریع کے مفکر اور مبصر ہوں اور علوم ظاہری کے ساتھ انہیں علم باطنی سے بھی کافی مناسبت ہو' وحی کی بجائے القائے ربانی اور الہام باطنی ان کا مربی ہو اور ساتھ ہی نبض شناس امت بھی ہو۔ حوادث ووقائع اور مخاطبین کی ذہنیتوں پر انہیں عبور حاصل ہو اور جو مصداق ہوں حضرت عارف رومی کے اس شعر کے ۔

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید واستاد

گویا مطلقاً عالم ہونا یا کتابوں کے درس و تدریس پر قادر ہونا کافی نہیں بلکہ باین معنی ان میں وراثت نبوت کی شان ہونی چاہئے کہ ان کا علم خود بینی اور ترددات سے بالاتر ہو۔

ادھر ان علماء میں عصمت کی شان بصورت محفوظیت پائی جاتی ہو۔ تقویٰ وطہارت اور احتیاط وحزم کی وجہ سے ان کا رویہ نہ ذاتی گمراہی کا ہو نہ دوسروں کو گمراہ کرنے کو وہ ضلّوا واضلّوا دونوں قسم کی ناپاکیوں سے پاک ہوں۔ پھر جبکہ ان دونوں اوصاف انکشاف باطن اور محفوظیت کے علماء کوئی اجتماعی شان بھی پیدا کر لیں تو ان میں فی الجملہ عصمت کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

لاتجتمع امتّی علی الضلالۃ.

''میری امت گمراہی پر جمع نہ ہو گی (یعنی ساری امت کامل کر کسی گمراہی پر اجماع کر لینا ناممکن ہے بلکہ ایک جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے گی وہی جماعت منصور ہو گی)''۔

جس سے واضح ہے کہ اہل حق اور ان میں بھی علمائے حق کہ جن کی بدولت لوگ اہل حق بنتے ہیں اور ان میں بھی پھر جماعت علماء جبکہ خود ایک اجتماعی شان بھی پیدا کر لے یعنی جمعیت بنا لے وہ انشاء اللہ سب کے سب مل کر امت کو گمراہی کی لائن پر نہیں ڈال سکتے۔

پس اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ حقیقی معنی میں نبی کا صحیح قائم مقام پوری امت اجابت اور اس امت میں بھی اس کی بقاء کی اصلی روح علماء ربانی کی جماعت ہوتی ہے اور اسی کو امت کا امام یا امیر کہنا چاہئے لیکن مرکزیت قائم کرنے کے لئے اگر یہی جماعت اپنے میں سے کسی ممتاز شخصیت کو امیر بنا لے اور خود اپنے اسی محفوظ بلکہ ایک حد تک معصوم اجتماعی علم فہم سے اس کی مشیر و معین ہو جائے تو صحیح معنی میں یہی امیر بواسطہ جماعت کا مجموعہ اور اس جامعیت کمالات کے سبب نبی کے ان دونوں اوصاف کمال باطن اور عصمت کا وارث ہو گا۔ اسے حق ہو گا کہ امت کی قیادت اور شرعی تربیت کرے اور ان کا امیر کہلائے۔

پس امت کے لئے سہل علاج یہی ہے کہ مبصر اور مفکر اور تقویٰ وطہارت کے پیکر علماء ربانی کی قیادت میں رہے اور ان کے زیر سایہ یہ اپنی شرعی زندگی بسر کرے۔

صالح قیادت سے روگردانی کی پاداش

یہ جماعت اگرچہ نبوت کی سی معصومیت نہیں رکھے گی چہ جائیکہ ان میں کوئی ایک شخصیت' البتہ

اس کی شان محفوظیت کا یہ ثمرہ قدرتی ہوگا کہ وہ جو امر بھی طے کرے حظ نفس اور ذاتیاتی مفادات کے لئے نہ کرے بلکہ لوجہ اللہ اور مفاد مسلمین کے لئے کرے پھر بھی اگر اس کے فیصلوں میں کوئی گوشہ خطاء فکری کا نکل آئے تو مسلمانوں کے لئے کسی حالت میں بھی یہ زیبا نہ ہوگا کہ وہ اس خطاء کے بسبب اس کے سارے صوابات سے محرومی اختیار کرلیں اور اصل جماعت ہی کو غیر معتبر ٹھہرا کر سرے سے اس کی قیادت ہی سے باہر آجائیں بلکہ مزید برآں وقار کو زائل کرنے کے منصوبے باندھنے لگیں اور اگر چند نااہلوں میں اس بے توقیری کی مقبولیت ہو جائے تو اس پر فخر کرنے لگیں۔ نعوذباللہ من ذٰلك۔

اگر وہ ایسا کر کے جماعت علماء یا ان کے منتخب کردہ صدر و امیر کی قیادت سے باہر ہوں گے تو اس کی پاداش میں ان کے لئے ناگزیر ہوگا کہ وہ جماعت جہلاء یا فساق و فجار کی امارت کے تحت میں آجائیں اور اپنا رہا سہا دین بھی کھو بیٹھیں۔ پس یہ کیا کم حیرت کی بات ہوگی کہ جو لوگ کسی ایک آدھ جزئیہ کی مزعومہ خطا تک کو معاف نہیں کر سکتے تھے اب انہیں اپنی خوشی سے کلیاتی خطاؤں اور عمومی فسق و فجور کی حکومت و قیادت کو بطوع و رغبت قبول کر لینا پڑے گا اور اب وہ اسی کے زیر سایہ ساری زندگی غیر شرعی طور پر بسر کرنے لگیں گے۔

میرے خیال میں علماء صالحین کے برملا تخطیہ کی ایک کھلی سزا ہے کہ ایک ایک جزئیہ میں تقویٰ و طہارت کے طالب کلی طور پر فسق و فجور کی امامت کے لئے جائیں اور پھر انہیں خطا و صواب کا احساس بھی باقی نہ رہے۔ اصول دانش کی رو سے ایسی جزئیاتی خطا بہتر ہے کہ جس کو ترک کرنے سے کلیاتی معاصی میں ابتلاء ہوتا ہو۔

پس ضروری ہے کہ امت اسلامیہ زیر قیادت صلحائے امت و جماعت (جس کا رسمی نام جمعیت العلماء رکھ لیا جانا کوئی مذموم بات نہیں ہے) شرعی زندگی گزارے منہیات شرع سے ہجرت کر کے مامورات شرعیہ کی حدود میں رہے۔ جہالت رفع کرے فقہ فی الدین پیدا کرے۔ اپنے سیاسی مستقر اور حقیقی امارت کو جو علماء حقانی کا جامع ہو جس میں دینی رنگ کا غلبہ قوی اور وسیع سے وسیع تر کرے، جزئیات مسائل پر لڑنا جھگڑنا ترک کر کے بنیادی مقاصد میں خلل نہ ڈالے۔ عمل میں رواداری قائم کرے تو پھر حقیقی امارت و امامت قائم ہو جانے میں زیادہ دیر نہیں لگ سکتی۔

مخلوط معاشرہ میں جمعیت مسلمہ کے دو اصول

اس جامع علم و تقویٰ جماعت کے اصولاً دو کام سب سے بڑے اور سب سے اہم ہو جانے چاہئیں ایک یہ کہ کسی جماعت میں مدغم ہوئے بغیر جب مسلمانوں کے حقوق کا سوال آئے خواہ کسی بھی پلیٹ فارم سے اٹھے تو وہ ان کی غیر مشروط حمایت کرے اور نصرت کے لئے اپنی پوری

قوت عمل سے کھڑی ہو جائے اور جب آزادی ملک کا سوال اٹھے خواہ کسی غیر مسلم پلیٹ فارم ہی سے اٹھے تو اس کی غیر مشروط حمایت کرے اور اپنی پوری قوت ادراک و عمل سے اس کو آگے بڑھائے کہ اس ملک کے تمام مادی و نفسانی امراض کی اصلی جڑ صرف غلامی ہے اور اس کی حقیقی بہبود و فلاح صرف آزادی ہے۔

اس طرز عمل سے اس جنگ آزادی کے سلسلہ میں تو باہم ربط و اتحاد قائم رہ سکتا ہے جو حصول آزادی کے لئے رکن اولین ہے اور غیر مسلم جماعتوں سے تصادم و نزاع قائم نہیں ہو سکتا۔ جو حصول آزادی کے لئے شرط اولین ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نہ رکن کی خاطر شرط سے قطع نظر کی جا سکتی ہے اور نہ شرط میں لگ کر رکن چھوڑا جا سکتا ہے۔ رسمی لفظوں میں اس حقیقت کو سمجھنا چاہئے کہ جمعیت العلماء کا تمام آزادی پسند مسلم جماعتوں کو اپنے سے وابستہ رکھنا بھی ضروری ہے اور نوائے آزادی میں غیر مسلم آزادی خواہ جماعتوں کا ہموار رہنا بھی از بس ضروری ہے۔

غیر مسلم سے اشتراک عمل

غیر مسلم جماعتوں سے اشتراک عمل شرعاً ممنوع یا حرام نہیں ہے جبکہ حدود شرعیہ میں ہو، آج ملکی معاملات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ہندو مسلم اشتراک عمل نہ ہو پھر ملکی آزادی جیسے عظیم مقصد میں ہندو مسلم اشتراک عمل ممنوع و حرام کیوں بن جاتا ہے۔ جب کہ ایک طرف تو ملک تمام جزوی امور میں عملاً اسی اشتراک عمل کی تائید میں ہے اور دوسری طرف حکومت نے بھی اس کا کھلا اعلان کر دیا ہے کہ وہ آزادی ہند کے بارے میں مشترکہ اور متفقہ مطالبہ پر ہی غور کر سکتی ہے۔

تو کیا ان حالات میں شرعاً یا سیاسۃً یہ ناجائز یا ممنوع ٹھہر سکتی ہے کہ تمام اقوام ہند باہمی اعتماد رواداری کے ساتھ بیک آواز اس موجودہ شہنشاہی اور نظام حکومت سے کھلی بیزاری اور نفرت کا اعلان کرتے ہوئے ملک کی آزادی کا مطالبہ کریں اور اس سلسلہ میں اندرون حدود اشتراک عمل کریں اگر غیر مسلم سے اشتراک عمل ممنوع ہے تو گورنمنٹ کے ماتحت ہر سیاسی ادارہ میں ممنوع رہنا چاہئے کیونکہ اصول ہر جگہ اصول ہے۔ ہاں حدود و قیود کی ہر جگہ ضرورت ہے کہ غیر محدود عمل ہمیشہ مضرتوں کا خیمہ ہوتا ہے۔

پس اس بارے میں بھی باہمی معاہدہ سے حدود عمل کی اصولی دفعات ایسی ضرور مشخص کر لی جائیں کہ ان دو قوموں میں نزاعات و اعتراضات کا سد باب ہو جائے جو آئے دن باہمی بے اعتمادی اور آپس کی سر پھٹول کا باعث ہوتا رہتا ہے اور خصو سے جمعیت العلماء خدشات و اعتراضات کا مورد بنی رہتی ہے۔ پھر یہ معاہدہ بھی دفاع اور حسک کی حد تک ہونا چاہئے۔ تعمیری معاہدوں کے لئے آزادی کا زمانہ موزوں ہوتا ہے نہ کہ غلامی کا۔

ہمہ گیر مقصد کے حصول کا طریق کار

بہر حال جمعیت العلماء کو اپنے ہمہ گیر مقصد اور بلند پایہ منصب کے لحاظ سے ملک کی ہر قومی جماعت سے درجہ بدرجہ تعلق قائم رکھنا ضروری ہے۔ مسلم جماعتوں سے یگانگت واتحاد کا اور آزادی پسند غیر مسلم جماعتوں سے اشتراک عمل کا۔ مگر ساتھ ہی خود اپنے پروگرام اور اپنے پلیٹ فارم کا استقلال محفوظ رکھنا بھی اس کا عقلی وشرعی فریضہ ہے ایک منٹ کے لئے نہ اس کی حمایت کی جاسکتی ہے کہ جمعیت العلماء اپنی خصوصیات فنا کر کے اپنا استقلال کھودے اور دوسری مسلم یا غیر مسلم یا نیم مسلم جماعت میں مدغم یا اس کے پسرو ہونے کا دھبہ اپنے دامن تقدس پر لگائے اور نہ حالت میں اس کی حمایت کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے محدود جماعتی استقلال میں محو ہو کر ہر دوسری جماعت سے مستغنی ہو جائے اور اپنے یا دوسروں کے تعلق منقطع کر دینے پر آسانی سے صبر کر کے بیٹھ جائے کیونکہ پہلی صورت میں اس کا وجود ہو جاتا ہے اور دوسری صورت میں اس کی منصبی حیثیت ہو جاتی ہے کہ وہ بجائے ایک ہمہ گیر راہنما اور قائد ہونے کے صرف ایک ٹی سی پارٹی بن کر رہ جاتی ہے۔ پس اسے اپنا مستقل اور غیر تابع وجود قائم رکھ کر دوسروں کی طرف ملاپ اور اشتراک کا ہاتھ بہر صورت بڑھاتے رہنے ہی کی ضرورت ہے۔ پھر خصو سے مسلم اداروں سے تو اسے وداد و تعلق کی خاطر دوڑ دھوپ کرنے کے ساتھ ا تی لجاجت وسماجت سے بھی کام لینا پڑے اور شدید سے شدید تعدیوں پر بھی جو اس کی ذات پر کی جائیں مسامحت سے کام لینا پڑے تب بھی اسے ہرگز گریز نہ کرنا چاہئے کہ یہ خود اس کی ا تی عظمت اور عمومی راہنمائی کا ایک جزء لاینفک ہے کہ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا صحیح نقشہ علماء کی جماعت بھی نہ کھینچے گی تو پھر اس کا سلیقہ اور کس میں تلاش کیا جائے گا؟ اگر انبیاء علیہم السلام اپنی عالمگیرا تی شفقت سے کفار تک کو اپنا کر انہیں مسلم و قانت کر سکتے ہیں تو کیا نائبان انبیاء اسی شفقت ورحمت کے ظل سے اپنوں کو بھی اپنا نہیں بنا سکتے؟

باہمی ربط و تعاون کی بنیاد اتحاد مقصد اور تقسیم عمل پر ہونی چاہئے

مجھے اس سے ا ر نہیں کہ اس سلسلہ میں بعض اوقات جبکہ لوگوں کے ب پر غرض مندوں یا غلط فہمیوں کی گھٹا چھا جاتی ہے اور وہ اپنے ہی مربیوں اور مصلحوں کے ف عناد تک کا مظاہرہ کرنے سے دریغ نہیں کرتے تو علماء کو تعاون اور تعلق سے مایوسی تک کی نوبت بھی آجاتی ہے لیکن پھر بھی فرائض نصیحت وموعظت اور روابط شفقت ورحمت قطع کرنے کی کوئی وجہ پیدا نہیں ہوتی الا یہ کہ شفقت وموعظت کے تمام مراحل سے گزر کر ب دیانۃً اس یاس پر شاہد ہو جائیں اور یکسوئی کے سوا چارہ کار باقی نہ رہے تو سکوت میں مضائقہ نہیں لیکن انقطاع تعلق یا طنز آمیز نکتہ چینیاں پھر بھی شان علم اور وراثت نبوت کے منافی رہیں گی أصديقين ولعانين (کیا سچائی کی علمبرداری بھی اور طعن و تشنیع بھی؟ یہ دو یں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟) بہر حال جیسے جمعیت العلماء کا قیام اور اس کی منصبی

حیثیت کے وقار کا وجود امت کے لئے ضروری ہے ایسے ہی دوسری جماعتوں سے حسب حیثیت ومرتبت اس کا تعلق اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ ادھر اپنے شرعی نظریوں کی تبلیغ اور امت کو رحمت ویسر کے ساتھ ان پر لانا بھی از بس ضروری ہے۔ اس سے میرا یہ منشاء ہر گز نہیں کہ جمعیت العلماء کی قیادت کے یہ معنی ہیں کہ دوسری مسلم جماعتیں توڑ دی جائیں اور یہ ممکن بھی کب ہے جبکہ آزادی جیسے مبادی مقصد کے لئے اور بھی بہت سے مبادی اور مقاصد طبعی طور پر ضروری ہیں جن سب کو نہ تنہا جمعیت العلماء انجام دے سکتی ہے اور نہ بہت سے وظائف کی انجام دہی اس کی منصبی حیثیت پر چسپاں ہی ہوتی ہے۔

اس لئے جب تک ان مختلف مقاصد کے لئے اتحاد مقصد کے اور تقسیم عمل کے اصول پر دوسری جماعتیں بھی موجود نہ ہوں اور ان کا اور جمعیت کا باہمی ربط و تعاون نہ ہو اصل مقصد کی تکمیل دشواری ہی نہیں ناممکن ہے۔

جمعیت العلماء کا شرف وامتیاز

ہاں مگر یہ بھی میں ضرور کہوں گا اور شرعی راہنمائی کی روشنی میں کہوں گا کہ یہ تمام دوسری مسلم جماعتیں جمعیت العلماء کے سامنے مستفتی ہوں گی نہ کہ مفتی۔ نہ بلحاظ ذوات علماء بلکہ اس لحاظ سے کہ امت کے ہر مرض کی دوا بالآخر کتاب وسنت ہے اور اس کی حامل حقیقۃً یہی علماء کی جماعت ہے جبکہ وہ اپنے علمی وقار، صحیح اور ا ق کی بلندیوں کو محفوظ رکھ کر خالص کتاب وسنت کی روشنی امت کے سامنے کرتی رہے۔ ایسی صورت میں افراد امت ہوں یا جماعات امت انہیں سمع وطاعت کے سوا چارہ کار نہیں کہ ارشاد ربانی ہے ۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِيْنًا.

"اور ایمان دار مرد اور ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں کہ جب کہ اللہ اور اس کا رسول کام کا حکم دے دیں تو ان کو انکے اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا"۔

پس تمام مسلم جماعتوں کا فرض ہو گا کہ وہ ہر ایسے مسئلہ میں جمعیت العلماء کی شرعی راہنمائی بالضرور حاصل کریں جس میں ذرا بھی اصول یا فروع اسلام سے ٹکرا جانے کا کوئی احتمال ہو بلکہ ان کے لئے بہر حال یہی ضروری اور مصلحت ہے کہ وہ صرف جمعیت العلماء ہی کی طرف رجوع کرے تا کہ مسلم مجالس سے ربط باہمی قائم ہونے کے ساتھ ان کے کام بھی جمعیت کے علم میں آتے رہیں اور خود جمعیت کی بھی کوئی ٹی بڑی تجویز ان مجالس کی تجاویز سے متصادم نہ ہو سکے۔

پھر اگر جمعیت العلماء کی تجویز سے مسلم جماعت کو کوئی ادنیٰ سا بھی اختلاف پیدا ہو تو وہ جب تک کہ اس میں جمعیت سے آخری حد تک رجوع کر کے مسئلہ صاف نہ کر لے کتابت و خطابت سے کوئی ادنیٰ پہلو تہی نہ کرے یعنی ابتداءً ہی مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہ کر لے اور انتہا انقطاع یا بے گانگی یا بے مروتی کا معاملہ نہ کرے اور ادھر جمعیت بھی فراخ دلی اور کشادہ پیشانی سے اپنے ف تنقید سننے اور معقول و منقول تنقید کو مان کر اس کی تلافی کے لئے تیار رہے کہ۔

كلمة الحكمة ضالة المئومن حيث وجدها فهواحق بها.

"کلمہ حکمت مومن کی گم کردہ پونجی ہے ں مل جائے وہ اس کا مستحق ہے"۔

افہام و تفہیم کا راستہ اپنانے کی ضرورت

صہ یہ کہ جس طرح موسیٰ وہارون علیہما السلام نے امام قوم بن کر جب کہ بنی اسرائیل کی تربیت و تعمیر کی اور ان کا وکیل شرعی بن کر فرعون سے ان کی آزادی کے بارے میں گفت و شنید اور مطالبہ و احتجاج کیا اور تمام بنی اسرائیل نے جن میں ا ط کی متعدد جماعتیں تھیں۔ سمع وطاعت سے کام لے کر موسیٰ وہارون کی مشترک و مختصر جمعیت پر اعتماد کیا جس کی بدولت بالآخر وہ آزاد ہوئے۔ اسی طرح آج کے دور غلامی میں بھی مسلمان افراد اور جماعات نا بان کی اجتماعی قیادت میں اور اگر وہ اپنے میں سے کو امیر منتخب کر تو اس کی امارت میں اس کی تعمیر و تربیت پر اعتماد کریں اور شک اندازوں یا خود غرضوں کی تفرقہ پردازیوں سے جزئیات میں پڑ کر اصل مقصد کو ہاتھ سے نہ کھوئیں تاکہ جماعت یا امیر جماعت ان کی آزادی کے لئے بانبساط خاطر پوری جدوجہد کریں اور آزادی کو ان کے قریب لے آئیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جمعیت العلماء نے ان وظائف کو اپنے مقدور بھر ادا کیا ہے اور ادا کرتی رہے گی۔ مگر یہ کارخانہ بشری ہے اس لئے فروگذاشت یا اجتہادی خطا ممکن ہے۔ سو جن حضرات پر بھی ایسی کوئی خطا واضح ہو وہ اعتراض و مطاعن اور اخباری پروپیگنڈوں کا راستہ ڑ کر دل سے جمعیت کی طرف رجوع کریں اور جذبات کے بجائے دلائل و اصول سے افہام و تفہیم کر اور ابتداء سے فریقین میں نیت مناظرہ کے بجائے تحقیقِ مسئلہ کا عزم ہو تو بات نہیں بڑھ سکتی۔

اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا

صہ کلام یہ ہے کہ آج ہندوستان کا سب سے گہرا اور ہمادی مرض غلامی ہے جس کی جڑوں کو ایک پردیسی حکومت رات دن مضبوط کرنے کی میں لگی ہوئی ہے جس نے شعائر اسلامیہ ہی کو نہیں شعائر انسانیت کو بھی مٹا دیا ہے۔ اس غلامی سے ہماری تعلیم، روایات، مذہب، اقتصادیات تہذیب و تمدن، قومی وقار، آبرو اور اندرونی و بیرونی تعلقات سب برباد ہو چکے ہیں۔ قرآن نے اس

غلامی کو بدترین عذاب قرار دیا تھا اور اس لئے ہمارا او فریضہ ہے کہ اس مہلک مرض سے بعجلت ممکنہ نجات حاصل کر کے آزادی کے مقام رفیع تک پہنچیں جیسا کہ اس کی فرضیت وضرورت ابتدائی نمبروں میں عرض کی تھی۔

حصول آزادی کا مختصر اُپروگرام

ل آزادی کے پروگرام کا حاصل یہ ہے کہ:-

(۱) سب سے اول غلامی کے منشاء کو سمجھنا چاہئے کہ وہ برطانوی شہنشاہی اور اس کی استبدادی پالیسی ہے۔

(۲) ل آزادی میں نبوت کے وقت سے مدد لینی چاہئے تاکہ پروگرام ا ائی نہ رہے بلکہ الہامی ہو جائے اور قیادت وحی الٰہی کی قائم ہو۔

(۳) پہلے اپنوں سے اتحاد اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ پھر غیروں سے بقدر حاجت اشتراک عمل مگر حدود وقیود شریعت میں رہ کر اور اس کا بصورت معاہدہ ہندو مسلم اعلان کر کے۔

(۴) موجودہ صورت حال میں حںک آزادی عدم تشدد سے لڑی جاسکتی ہے جس کے اسلحہ ا قی ہیں۔ ذکر اللہ، دعا، رجوع الی اللہ، استعداد باہمی واتحاد اور احتجاجی ومطالباتی جدوجہد، نیز مسلمانوں کی تنظیم۔

(۵) باہمی اشتراک عمل میں شرکاء عمل کا عاقل وباخدا ہونا ضروری ہے، غافل اور چالاک ہونا مضر ہے۔

(۶) اس ا قی حںک میں بحیثیت حزب اللہ اور فرستادۂ خدا کام کرنا چاہئے نہ کہ حظ نفس سے۔

(۷) مسلط قوم سے خطاب میں نرمی برتنی چاہئے نہ کہ تشدد اور اظہار غیظ۔

(۸) خطاب کنندہ قائدوں کا متواضع اور بے تکلف ہونا ضروری ہے جن کی نظر اپنی کمزوریوں اور عیوب پر بھی ہو اور متکبر یا رسمی وقاور ہونا مضر ہے۔

(۹) قائدوین کی جماعت کو متغلب قوم کے درباروں میں پہنچ کر اپنی اسلامی پوزیشن اور اپنی تحریک کی دینی پوزیشن علی الاعلان واضح کر دینی چاہئے۔

(۱۰) آزادی کی طلب مذہب کے لئے کرنی چاہئے نہ کہ ترفہ وتنعم دنیوی کے لئے۔

(۱۱) آزادی خواہ ذمہ داروں کا عاقل وفہیم ہونا، دین سے متاثر ہونا اور دین دار ہونا ضروری ہے ورنہ مذہبی آزادی حاصل نہیں ہوگی۔ جو مقصود بالذات ہے بلکہ صرف قومی آزادی ملے گی جو مقصود اصلی نہیں ہے۔

(۱۲) اپنوں کی اصلاح وتعمیر ان کی ا قی تربیت اور جزئیات عمل کی تہذیب مسلم جماعتوں کی تقویم ازبس ضروری ہے کہ ناتربیت یافتہ فوج بالآخر تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

(۱۳) مسلط قوم کو بھی تبلیغ دین ضروری اور تا ل آزادی مسلسل ضروری ہے کہ اس سے نصرت غیبی اور ذمہ داری حق تعالیٰ ہو جاتی ہے اور مطالبات کی جڑ مضبوط ہو جاتی ہے۔

(۱۴) مصائب دنیا کی شکایت زبان پر نہ آنی چاہئے بلکہ عنوان مطالبات موانع دین کی شکایت ہونی چاہئے کیونکہ اسلام میں آزادی کی ضرورت صرف دین کے لئے ہے دنیا تابع محض ہے۔

(۱۵) ہر مطالبہ اور احتجاج کی حجت قرآنی معجزہ یعنی کتاب وسنت کے براہین سے کی جائے۔

(۱۶) شرعی امارت اور دینی قیادت کا قیام ضروری ہے تاکہ قوم میں مرکزیت آجائے۔ ایک مرجع الامر متشخص ہو کر پوری قوم کو بجائے تشتت وپرا گی کے تعمیل شرائع میں یکسوئی نصیب ہو جائے اور ب میں تشویش کی جگہ سکون وطمانیت پیدا ہو سکے۔

(۱۷) قائد علماء مفکر و مبصر، دانایان مسائل ودلائل، عارفان حوادث ووقائع متستند وجید اور ساتھ ہی صلحاء والتقیاء ہونے چاہیں نہ کہ محض خطیب اور زعیم۔

(۱۸) علماء مفکرین کی حیثیت اجتماعی کا وجود ضروری ہے جس کا رسمی نام جمعیت العلماء ہے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ اس کے اہل حل وعقد مستند علماء ہوں۔ رسمی یا متکلف علماء نہ ہوں جن کے سامنے آنے سے غیر شرعی یں باور ہونے لگیں اور تلبیس حق بالباطل کا بازار گرم ہو جائے۔

(۱۹) اس وقت جمعیت العلماء کا بڑا کام حقوق مسلمین کی غیر مشروط حفاظت اور آزادی ملک کی غیر مشروط حمایت کرنا ہے۔

(۲۰) ہر آزادی خواہ کی حمایت وہم نوائی کی جائے مگر اپنا پروگرام مستقل رکھا جائے۔ معاہدہ کے ساتھ غیر مسلم اقوام سے اشتراک عمل بحالات موجودہ ضروری ہے۔ اس اشتراک سے وہ بھی اسلام سے قریب لائی جاسکتی ہیں۔ اپنے استقلال تام کی صورت میں سب ہمارے ساتھ ہوں گے اور ہم صرف خدا کے ساتھ، یہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم سب کے ساتھ ہوں اور ہمارے ساتھ کوئی نہ ہو۔

(۲۱) ل آزادی کی جدوجہد کے ساتھ نماز باجماعت کا اہتمام اشد ضروری ہے کیونکہ اس نے موسیٰ وہارون علیہما السلام کو تحصیل آزادی کے لئے بھیجتے ہوئے فرمایا۔

وَلَاتَنِيَا فِیْ ذِكْرِیْ.

"میرے ذکر میں سستی مت کرنا"۔

اور ذکر اللہ کا فرد کامل ہے ۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ.

"میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو"۔

اور اقامت صلوٰۃ کا جزءِ اعظم جماعت ہے۔

فانّ تسویة الصّفوف من اقامة الصّلوٰة.

"جماعت کی صفوں کو سیدھا رکھنا اقامت صلوٰۃ میں سے ہے"۔

اور ظاہر ہے کہ تسویہ صفوف بلا جماعت کے ناممکن ہے۔ اس لئے ل آزادی کی جدوجہد کے وقت تعلق مع اللہ اور ا ل فرد نماز باجماعت ناگزیر ہے تاکہ نصرت غیبی شامل حال رہے۔

(۲۲) تبلیغی مساعی کی منظم طریق پر ضرورت ہے۔ تبلیغ دین سیاسی پلیٹ فارموں سے ہونی چاہئے اور حکومت ورعایا کے کانوں میں مساوی طور پر اسلام کی آواز پہنچنی چاہئے جس سے دیانات کے ساتھ اسلامی قوانین وسیاسیات کو بھی اصولی طور پر کرسی نشینوں کے کانوں تک پہنچایا جائے تاکہ ان کے مقصد سے دشمنوں میں بھی ہمدردی پیدا ہونے کا راستہ پڑ جائے اور ل مقصد دور نہ رہے۔

بہرحال یہ بائیس ت ہیں جو تلاوت کردہ آیات سے مستنبط ہوتے ہیں جن میں غلامی کی قباحت وشناعت ازالۂ غلامی کی فرضیت طریق احتجاج ومطالبات اور اس کی نوعیت' آزادی کی برکات' ل آزادی کی سعی' سعی میں خلوص وللہیت۔

ل آزادی کا پروگرام' دشمنانان آزادی کا انجام اور غلام وضعیف قوم کی کامیابی وغیرہ کے مہمات ارشاد فرمائے ہیں۔

میں نے اپنی ضعیف بساط کے مطابق یہ مضامین آیات بالا سے استنباط کر کے عرض کئے ہیں جن میں اصولی طور پر مسائل حاضرہ کی بحث بھی موقع بموقع آ ہے مگر سیاسی زبان کی بجائے دینی اور قرآنی زبان میں آئی ہے اور یہ زبان سیاسی اور غیر سیاسی افراد کے لئے یکساں مقبول اور جاذب توجہ ہے۔ اہل تفکر اور اذکیاء علماء اس سے بہت زیادہ ئق ان آیات سے ل سکتے ہیں کہ آخر کلام الٰہی ہے جس کی گہرائیوں کی کوئی حدود نہایت نہیں ہو سکتی۔

سیات شرعیہ کی عظمت

میں نے کوشش کی ہے کہ آزادی کے پروگرام کے اجزاء صرف کتاب وسنت سے کئے جائیں۔ میرے ل میں جو شرعی راہنمائی سے قائم شدہ ہے ضروری ہے کہ کوئی بھی پروگرام ی سیاست کے ڈھچر اور اس سے اخذ کر کے نہ جائے یہ پرفریب سیاست رد کرنے کے قابل ہے۔ جس نے دنیا کا امن وسکون برباد کر دیا ہے نہ کہ معمول بنانے کے لائق ہے۔ البتہ سمجھ لینے کے قابل ضرور ہے اس پر مکر ی سیاست کی ظلمت دور ہو سکے اور ب پر سے اس کا استیلاء اٹھ جائے' کیونکہ آج اس کی مخالفت کرنے والے بھی بوجہ اس کی شوکت کے وقیع اسی کو سمجھتے ہیں اور اسی میں خود اپنی شوکت بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے مزے لے کر اس کا ذکر اور اس کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ صرف کتاب وسنت کے منصوص روگراموں سے ہی نہ عظمت زائل ہو کر حقیقی عظمت خدائی پروگراموں کی قائم ہو سکتی ہے۔

تعمیری سلسلہ کا پروگرام میں کافی تفصیل کے ساتھ اپنے خطبہ صدارت جمعیت العلماء صوبہ سندھ میں کر چکا ہوں۔ اگر اس کی تمام دفعات ان ۲۲ نمبروں کے ساتھ شامل کر لی جائیں تو دفاعی اور تعمیری پروگرام کی تمام مہم اور مبادی دفعات سامنے آجائیں گی جو نصوص کتاب وسنت سے ماخوذ ہوں گی۔

بزرگان محترم! میں نے بہت سا وقت آپ کا جس کی میں معذرت کرتا ہوں اور اس تمغہ صدارت پر جو آپ حضرات کی ذرہ نوازی نے مجھے عطاء فرمایا ہے، مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

فجزاکم اللہ عنا خیر الجزاء

ہندوستان آزاد، اسلام زندہ باد، جمعیت العلماء آباد

واخر دعونا ان الحمدللہ ربّ العلمین وصلّی اللہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیّدنا ومولانا محمّدٍ وّعلٰی الہٖ واصحابہٖ اجمعین، برحمتك یا ارحم الرّاحمین۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تکمیل انسانیت

بڑے بوڑھوں کی تحسین زیادہ کی جاتی ہے عمل کا بار کم ڈالا جاتا ہے--- یہی وجہ ہے کہ اس امت پر عمل کا بار کم کر دیا گیا' پچھلی امتوں میں سلاسل اور اغلال تھے' نہایت شاق شاق ریاضتیں اور نہایت محنت کے اعمال۔ وہ ختم کر کے بہت سہل اعمال دیئے گئے اور تحسین زیادہ کی گئی' ایک عمل کرو گے تو دس نیکیوں کا ثواب اور اس کے بعد سات سو تک---- اور وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ.

غرض اجر بڑھا دیا' تحسین بڑھا دی مگر عمل کا بار گھٹا دیا--- اس لئے کہ امت بوڑھی ہو چکی تھی--- تو عمل کا بار بہت کم اجر بہت ہی زیادہ۔

(از حضرت حکیم الاسلامؒ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةِ لِلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.........اَمَّابَعْدُ.........

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ——— صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

تقریب تکمیل

بزرگان محترم!

یہ تقریب ہمارے عزیز محمد ازہر صاحب کے ختم قرآن شریف کے لئے ہو رہی ہے۔ اسی

مجلس میں انہوں نے قرآن کریم ختم کیا اور اس میں دعاء کی گئی۔ ایک وقت وہ تھا کہ ہمارے یہ عزیز قرآن شریف شروع کرنے کی ابتداء کر رہے تھے اور اس کے حفظ کا قصد تھا۔ یقیناً وہ بھی خوشی کا دن تھا جس میں انہوں نے قرآن کریم حفظ کرنے کا آغاز کیا۔۔۔۔ اور ایک آج کا دن ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں حافظ بنایا اور انشاء اللہ "حافظ جید" بھی ہوں گے اور ان کی قرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قاری مجود بھی ہوں گے۔ تو ایک ابتداء تھی اور ایک انتہا اور یہ دونوں چیزیں خوشی کی ہوتی ہیں۔

ابتداء اور تکمیل پر خوشی

ابتداء کی خوشی توقع کی بناء پر ہوتی ہے کہ ماں باپ بچے کو مکتب میں بٹھاتے ہیں اور خوشی کرتے ہیں مگر یہ خوشی توقعات پر مبنی ہوتی ہے کہ ہمارے بچہ پڑھے گا' چند دن بعد حفظ کرے اور اس اس میں کمال پیدا کرے گا۔۔۔۔ غرض ابتداء میں امید کی بناء پر خوشی ہوتی ہے اور انتہاء میں تکمیل کی بناء پر خوشی ہوتی ہے کہ جو توقعات باندھی گئی تھیں وہ اللہ نے پوری فرمادی۔ اس لئے انتہائی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ تو ہر ابتداء بھی خوشی کی چیز ہے۔ اور پھر انتہاء بھی خوشی کی چیز ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ابتداء میں خوشی توقع پر ہوتی ہے اور انتہا میں تکمیل پر ہوتی ہے۔

تکمیل پسند امت

ویسے بھی مسلمان کچھ تکمیل پسند واقع ہوا ہے۔ اس لئے کہ دین ہی اس کا کامل ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا.

دین کی ابتداء تو حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور تکمیل و انتہا نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات پر ہوئی۔

عالم بشریت کی طفولیت اور اس کا ابتدائی علم

ابتداء کے وقت بالکل ابتدائی چیزیں تھیں، جو بچوں کے لئے ہوتی ہیں' بچے کا سب سے بڑا علم یہ ہوتا ہے کہ اسے کچھ چیزوں کے نام سکھلا دئے جائیں۔ یہ روٹی ہے' یہ لوٹا ہے' یہ زمین ہے' یہ آسمان ہے۔۔۔ تو اگر بچے کو نام یاد ہو جائیں یہ اس کا سب سے بڑا علم ہوتا ہے اور علم کا پہلا درجہ بھی "علم الاسماء" ہی کا ہے کہ اشیاء کے نام معلوم ہوں۔۔۔۔ اگر کسی چیز کا نام ہی معلوم نہ ہو تو وہ مجہول مطلق ہوتی ہے اس کی طلب ہی نہیں ہو سکتی۔۔۔۔ غرض علم کا ابتدائی درجہ ناموں کا معلوم ہونا ہے۔ اس کے بعد پھر طبعاً آدمی کا جی چاہتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اس اسم کا مسمّٰی کون ہے۔ اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ جب مسمی کی صورت دیکھ لی تو طبعاً جی چاہتا ہے کہ اب۔۔۔ یہ معلوم ہو کر اس مسمی کی خصوصیات کیا ہیں۔ تو آدمی ان خصوصیات کا علم حاصل کرتا ہے۔ جب وہ بھی حاصل ہو گیا تو

اس کے بعد اس کے خواص اور آثار ہیں۔۔۔۔ اس کے بعد اس کے حقائق ہیں۔ اس طرح درجہ بدرجہ علم ترقی کرتا ہے۔۔۔ تو آدم علیہ السلام کے زمانے میں عالم بشریت کی طفولیت تھی۔ انسانیت کے لڑکپن کا زمانہ تھا اور بچوں کا سب سے بڑا علم ناموں کا یاد کرنا ہے۔ اس لئے آدم علیہ السلام پر جو وحی اتاری گئی اس میں زیادہ تر اسماء ہی تھے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا.

آدم علیہ السلام کو نام یاد کرا دیئے گئے۔۔۔ ناموں کے کچھ مسمیات بتا دیئے گئے مسمی پہچانوا دیا گیا۔ تو علم کی ابتداء اسماء سے ہوئی حضرت آدم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے تیس صحیفے اتارے۔ جیسے اس امت مرحومہ پر قران کریم کے تیس سپارے اتارے گئے۔ تو تیس صحیفے اترے۔ ان میں زیادہ تر رہائشی امور کی تعلیم تھی۔ کھیتی یوں کرنی چاہئے۔ باغ یوں لگانا چاہئے کپڑا یوں بننا چاہئے۔ لکڑی کا کام یوں ہونا چاہئے۔ جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ ۔

”آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ایک ہزار صنعتیں سکھلائیں۔ وہ ان کی لولاد میں پھیلیں۔ ہر طبقے نے اپنی مناسبت سے ایک صنعت اختیار کرلی“۔

کسی نے لکڑی کا کام کسی نے لوہے کا کام کسی نے تعمیر کا کام کسی نے کھیتی باڑی کا بنی آدم میں مختلف صنعتیں پھیل گئیں۔۔۔۔ مگر سب کی سب وحی کے ذریعہ سے آئی ہیں۔

ابتدائی عبادت

بہر حال آدم علیہ السلام پر تیس صحیفوں میں جو وحی کی گئی اس میں زیادہ تر رہائشی امور تھے حلال و حرام کے احکام فقہیہ بہت اقل قلیل تھے اس لئے کہ بچوں کو ابتدائی علم ناموں ہی کا سکھلانا ہے حلال و حرام زیادہ نہیں بتلاتے۔ وہ تو معصومیت اور فطرت پر ہوتے ہیں۔ آدم علیہ السلام کی ساری اولاد فطرت پر تھی نیک اور صالح تھی۔ جو نام یاد کرا دیئے گئے انکو پڑھ لینا ہی سب سے بڑھ عبادت تھی۔

جب کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے صاجزادے حضرت شیث علیہ السلام کو کچھ اسماء کی تلقین کی کہ یہ پڑھا کہ۔ تو اس دور کی سب سے بڑی عبادت یہ تھی کہ اسماء خداوندی کو رٹا جائے اور بار بار پڑھا جائے۔

غرض ابتداء علم یہی کہ ناموں کا علم ہو جائے اور اسماء معلوم ہو جائیں۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا.

اس پر شاہد ہے۔۔۔۔

عالم بشریت کا دوسرا دور اور اس کا علم

اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا دور آیا۔۔۔ تو طبعی طور پر جذبہ ہوتا ہے کہ یہ معلوم

ہو جائے کہ اس اسم کا مسمی کیا ہے۔ یہ نام کس چیز پر صادق اتا ہے۔ اس کا مسمی کون ہے اس کی طلب ہوتی ہے۔ تو آدم علیہ السلام نے تو ناموں کے ذریعہ سے معرفت خداوندی کرائی اور نوح علیہ السلام نے مسمیات کے ذریعہ سے معرفت خداوندی کی طرف پہنچایا۔۔۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا. وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا. وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلاً فِجَاجاً.

”زمین کو اللہ تعالیٰ نے پھیلایا۔ تمہیں اس طرح سے پیدا کیا جس طرح نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی“۔

تو حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں اسماء سکھلائے گئے تھے، یہاں مسمیات سامنے رکھے گئے کہ ان کہ ذریعے معرفت خداوندی حاصل کرو۔ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا تصور بندھتا ہے۔ اگر مصنوع بہت عمدہ ہو تو تعریف کی جاتی ہے کہ صناع بڑا کامل ہے۔ جس نے ایسی بڑی صنعت دکھلائی۔ تو آسمان اور زمین وہ چیزیں ہیں کہ بجز اللہ کے کوئی نہیں بنا سکتا۔۔۔ اس واسطے ان کی طرف متوجہ کیا گیا کہ انکے ذریعے سے صانع کو پہچانو کہ وہ، کیسا حکیم و خبیر ہے کیسا قادر مطلق اور قدیر علے الاطلاق ہے کہ جس نے آسمان کا خیمہ تان دیا اور زمین کا فرش بچھادیا۔

آپ چھوٹا سا بھی ایک شامیانہ کھڑا کرتے ہیں تو بانس کے بیسیوں ستون لگاتے ہیں تا کہ وہ تھمے۔۔۔ مگر آسمان کا یہ اتنا بڑا خیمہ جسکی مسافت پانچ سو برس کی ہے۔ نہ اس کے نیچے کوئی بانس ہے نہ ٹیک ہے اور ہوا کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔ تو وہ کتنا بڑا قادر ہے جس نے یہ خیمہ تان دیا۔

بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا۔۔۔۔

نہ کوئی ستون ہے نہ کوئی لکڑی۔۔۔ بہرحال نوح علیہ السلام نے اسماء کے بعد مسمیات کی طرف متوجہ کیا اور مسمیات کے ذریعے سے حق تعالیٰ کو پہچانوادیا۔ معرفت خداوندی کرائی۔۔۔ اب گویا عالم بشریت کو نام بھی معلوم ہیں اور مسمیات بھی معلوم ہو گئے۔

عالم بشریت کا تیسرا دور اور اس کا علم

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔۔۔ تو اس درجے کے بعد اب طبعی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان مسمیات کے خواص کیا ہیں؟ انکے آثار کیا ہیں؟ یہ کیوں بنائے گئے؟ ان کی غرض و غایت کیا ہے؟

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نفسیات کی طرف متوجہ کیا۔ نفوس فلکیہ، نفوس

ارضیہ۔۔۔ اور ان کے ذریعے سے معرفت خداوندی کرائی۔ اس لئے کہ اسم اور مسمی تو معلوم ہو چکے تھے۔ اب تو خواص و آثار سامنے تھے۔ تو خواص و آثار کے طرف متوجہ کر کے انہیں معرفت خداوندی کی طرف بڑھایا۔

دور موسوی اور اس کا علم

طبعی طور پر جذبہ یہ ہوتا ہے کہ نام یہ ہے، مسمی یہ ہے، خواص یہ ہیں ان کے استعمال کا طریقہ کیا ہو؟ کس طریقے سے استعمال کریں۔ ان کے احکام کیا ہیں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور آگیا اور تورات نازل ہوئی اور اس شان سے کہ ۔

تَفْصِيْلاً لِكُلِّ شَيْءٍ.

ہر چیز کے احکام کی تفصیل بتلائی گئی کہ اسے یوں استعمال کرو، یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، یہ حلال ہے یہ حرام ہے۔ غرض احکام کی تفصیل آگئیں۔

احکام کی حقیقت کا دور

اب یہ کہ نام بھی معلوم ہو گیا، خاصیتیں بھی معلوم ہو گئیں اور احکام کا بھی پتہ چل گیا تو طبعی طور پر ذہن اس کی طرف جاتا ہے کہ احکام کی علت کیا ہے جس پر یہ مبنی ہیں؟ کیونکہ حکم کا تعلق بہر حال کسی حقیقت اور علت سے ہوتا ہے۔

اس لئے کہ جب علت سامنے آتی ہے تو فقط ایک ہی چیز کا حکم معلوم نہیں ہوتا، جہاں جہاں وہ علت پائی جائے گی احکام معلوم ہوتے رہیں گے۔ تو ایک علت سے سینکڑوں ابواب کے احکام سامنے آجاتے ہیں۔

دور نبوی (علیہ السلام) اجتہاد انسانیت کا دور

پھر نبی کریم ﷺ کا دور آگیا۔۔۔ اور آپ ﷺ نے یہ تفاصیل ارشاد فرمائیں کہ ہر حکم کے نیچے حکمت، ہر حکومت کے نیچے علت ہر کے نیچے ایک حقیقت، ہر حقیقت کے نیچے ایک صفت خداوندی جس سے اس علت اور حقیقت کا رابطہ ہے۔ تو علمی طور پر گویا بنی آدم اس قابل بن گئے کہ حق تعالیٰ تک پہنچ سکیں۔ صورت دکھلانے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ مسمیات پہچانے جائیں۔ وہ تو پہچان چکے تھے۔ اس طرح نام بتلانے کی ضروت نہیں ہوئی کہ وہ معلوم ہو چکے تھے۔ زیادہ احکام بتلانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو چکے تھے۔ علل احکام بتلانے کی ضرورت تھی تاکہ یہ امت مجتہد بنے اس امت کے اندر یہ قوت پیدا ہو کہ اس ایک علت سے ہزاروں چیزوں کے احکام نکالے :

اور یہ اس لئے کہ ختم نبوت کا دور ہے کوئی، نبی آنے والا نہیں۔ کوئی شریعت آنے والی

نہیں۔ تو اس امت کے علماء کو یہ قوت دی گئی کہ قیامت تک کے حوادث کا فیصلہ اسی قرآن کریم سے کریں۔ انہی اصول و کلیات اور انہی علل سے اور انہیں حقائق سے فیصلہ کریں۔۔۔ چودہ سو برس گذر گئے ہیں اور امت فیصلے کرتی آرہی ہے' ہر صدی میں نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں نت نئے حوادث سامنے آتے ہیں' لیکن کبھی امت میں عجز پیدا نہیں ہوتا اسی قرآن مجید' اسی حدیث' اسی فقہ سے احکام نکلتے چلے آتے ہیں' انہی علل سے احکام کا استخراج کیا جاتا ہے' تو یہ مجتہدین کی امت ہے۔

امت محمدیہ میں آثار نبوت

اور جیسا کہ بعض روایات میں فرمایا گیا:

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔

گو اس روایت کی سند میں کچھ کلام کیا گیا ہے' مگر باوجود اس کے علماء اس سے استدلال و استشہاد کرتے ہیں کہ سنداً گو یہ روایت کچھ ضعیف ہو مگر اس مضمون کی دوسری روایتیں بھی ہیں۔ اگرچہ عنوان بدلا ہوا ہو۔ اس لئے مضمون کی حیثیت متواتر ہے۔ ایک حدیث سند کے لحاظ سے اگر ضعیف بھی ہو مگر اس معادل دوسری چیزیں مل جائیں تو درجہ حسن پر پہنچ ہی جاتی ہے' بہر حال سند کچھ ضعیف بھی سہی مگر معنی ضعیف نہیں ہے:

تو امت کے علماء نبی تو نہیں ہیں۔ مگر کام وہ کیا جو نبیوں کا ہوتا ہے۔ جہاں ایک بھی عالم بیٹھ گیا' ہزاروں کو ایمان اور معرفت سے رنگ دیا۔

ایک امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کوفہ میں پیدا ہوئے' ان کے علمی آثار کوفہ سے خراسان اور ایران کی طرف پہنچے اور ایران سے افغانستان کی طرف اور افغانستان سے ہندوستان کی طرف۔

تو ہندوستان' افغانستان کی اکثریت حنفی ہے' حتی کہ شام کی اکثریت بھی حنفی ہے' آپ کی فقہ وہاں پہنچی اور اس فقہ نے ان ممالک کی اکثریت کو اپنے ذوق میں رنگ دیا اور لاکھوں کروڑوں حنفی بنے۔

امام شافعیؒ ایک امام حق اور امام مجتہد ہیں' آپ کی پیدائش مصر میں ہوئی اور حجاز میں زیادہ تر قیام ہوا ہے' تو حجاز کی اکثریت شوافع ہے' مصر کی اکثریت شافعی ہے۔۔۔ پھر وفات بھی مصر میں ہی ہوئی۔

امام مالکؒ امام دار الهجرة ہیں۔ تو عرب کے جو مغربی قطعات ہیں تو وہ اکثر و بیشتر مالکی ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کا نجد اور یمن میں قیام ہوا ہے' تو وہاں اکثریت حنبلیوں کی ہے۔۔۔ غرض ایک عالم ربانی بھی جہاں پہنچ گیا' لاکھوں کے اندر ایمان کا نور پیدا کر دیا۔ لاکھوں کو ایمان میں رنگ دیا تو:

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔

ایک نبی کی ذات بابرکات آتی ہے تو امتیں بن جاتی ہیں' لاکھوں' کروڑوں کو ایمان نصیب

ہوتا ہے۔۔۔اس دور میں چونکہ نبوت نہیں رہی تھی، تو علماء کو خاتم الانبیاء علیہ ﷺ کا قائم مقام بنادیا گیا یہ وہ کام کریں جو انبیاء علیہم السلام کا ہے۔وہ انہی کی طرز پر تبلیغ کریں۔وہی تربیت ہو۔وہی تعلیم ہو۔ وہی تزکیہ نفوس ہو۔اس طرح سے ان علماء اور مشائخ ربانی نے کام کیا اور صحیح معنی میں اپنے پیغمبر علیہ السلام کا قائم مقام بن کر دکھلایا۔

شرائع اصلیہ اور وضعیہ

علم کے ساتھ قرنِ اول میں ظاہر بات ہے کہ ساری جزئیات تو نہیں آئی تھیں۔ہزاروں حوادث بعد میں پیدا ہوئے مگر علل و کلیات کی صورت میں احکام موجود ہیں اور وہ منصوص ہی کے حکم میں ہیں۔۔۔تو یہ امت گویا مجتہدین کی امت ہے۔جس کو علماء نے دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کیا کہ :

"ایک شرائع اصلیہ ہیں وہ وہ ہیں جو قرآن و حدیث میں حضور علیہ السلام کے قلب مبارک پر نازل ہوئیں۔۔۔اور ایک شرائع وضعیہ ہیں کہ ان شرائع اصلیہ سے احکام نکال نکال کر فقہ مرتب کر دیا گیا۔۔ کتابیں مدون ہو گئیں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں وہ کتاب و سنت ہی سے نکلے احکام ہیں۔معاذ اللہ کوئی مجتہدین کا ذاتی اختراع تھوڑا ہی ہے"۔

انہوں نے اصول سے احکام کا استنباط کیا۔ تو وہ بھی در حقیقت کتاب و سنت ہی کے احکام ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مجتہد کا ذہن پہنچتا ہے۔ہمارا اور آپ کا نہیں پہنچتا ہم سوائے اس کے کہ ان کا اتباع کریں اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ ان کی تقلید کریں اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

تو اصل میں ان حضرات نے کتاب و سنت سے علوم اخذ کئے اور دین کو باغ و بہار بنایا ابواب مرتب ہوئے فصول مرتب ہوئیں اور ان فنون پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔فقہ مرتب ہوا تو ہزار ہا کتابیں فقہ میں آگئیں اصول فقہ مرتب ہوئے تو وہ ایک مستقل فن ہو گیا۔۔۔اس طرح سے علم در علم اور شاخ در شاخ ہوتے ہوئے عالم کے اندر علم پھیلا تو جو شان انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی ہے کہ وہ اللہ سے علم حاصل کر کے مخلوق کو دیتے ہیں۔وہی شان مجتہدین کی ہے کہ وہ پیغمبر علیہم السلام سے علم حاصل کر کے امتوں کو بانٹ رہے ہیں :

عالم بشریت کا شباب

میں نے اس پر عرض کیا کہ علم کا ابتدائی درجہ "علم الاسما" تھا۔یہ عالم بشریت کی طفولیت کا زمانہ تھا۔اس کے بعد جب مراہقت کا زمانہ آیا جو حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ تھا تو "مسمیات" کا دور آگیا۔۔۔اور پھر بیچ میں شباب آگیا تو حضرت ہود اور حضرت صالح علیہ اسلام مبعوث ہوئے۔اس وقت عمر بھی زیادہ قد و قامت بھی زیادہ :

قوم عاد پر جب عذاب آیا اور وہ ہوا سے پچھڑ پچھڑ کر گرے ہیں تو فرمایا گیا۔

كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ۔

اتنے لمبے لمبے قد جیسے کھجوروں کے تنے ہوتے ہیں۔ ہزار ہزار۔ ڈیڑھ ہزار برس کی عمر ہے۔۔۔ ہم اور آپ ایک ایک مکان بناتے ہیں۔ تو سو دو سو برس میں ہماری کئی نسلیں اس میں گذرتی ہیں اور وہاں تین سو برس۔ چار سو برس گذرے مکان گر گیا پھر مکان بنایا پھر چار سو برس کی عمر ہوئی پھر مکان بنایا تو ایک ہی آدمی چار چار دفعہ مکان بناتا تھا۔ کیونکہ عمر ہی ڈیڑھ ہزار برس کی ہوتی تھی۔ تو مکانات بھی نئے نئے بنتے تھے۔ بہر حال عمریں بھی زیادہ تھیں۔۔۔ تو یوں کہنا چاہئے کہ آدم علیہ السلام کا زمانہ تو عالم بشریت کی طفولیت کا زمانہ ہے اور عاد و ثمود کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہے

جوانوں میں تو یہی ہوتا ہے کہ پنجے لڑا رہے ہیں۔ اکھاڑے کر رہے ہیں کشتیاں کر رہے ہیں۔ ہر ایک کہتا ہے کہ مجھ سے طاقت میں کون زیادہ ہے تو دوسرا کہتا ہے کہ میں تجھ سے طاقت میں زیادہ ہوں۔ یہی ان قوموں کی حالت تھی:

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً۔

”ہم سے زیادہ کون قوی ہے؟“۔

اور ان کے کام دیکھو تو جنات جیسے۔ فرمایا گیا:

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتاً۔

”پہاڑوں کو تراش تراش کر بلڈنگیں بناتے تھے“۔

دنیا کی بلڈنگیں نیچے سے اوپر کو چلتی ہیں۔ وہ اوپر سے بناتے ہوئے نیچے لاتے پہاڑوں کو کھود کھود کے اور تراش کے بلڈنگیں تیار کیں۔۔۔ بہر حال یہ جوانی کا زمانہ ہے کام وہ کئے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

عالم بشریت کی طفولیت کے لئے اندازِ تعلیم

اور ظاہر بات ہے بچوں کے سامنے ’اگر وہ بد شوقی اختیار کریں‘ تو کچھ پیار کرتے ہیں‘ کچھ ترغیب دیتے ہیں کہ مٹھائی کھلائیں گے پیسے دیں تو بچہ تعلیم میں لگ جاتا ہے‘ تو کھیل کود کے اسباب سامنے زیادہ رکھتے ہیں تاکہ بچہ متوجہ ہو جائے۔

تو آدم علیہ السلام کے جو صحیفے تھے تو اس میں صنائع و حرفت کی تعلیم تھی کہ دنیا کی چیزیں یوں بناؤ۔ تو دنیا کے بارے میں فرمایا گیا:

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ۔

یہ دنیا تو کھیل کود ہی ہے۔۔۔ تو کھلونے زیادہ سے زیادہ دیئے گئے تاکہ ان کا دل راغب ہو اور اس راستہ سے علم کا راستہ دکھلا دیا گیا۔ یہ گویا حکمت تربیت ہے کہ اسی مزاج سے اللہ تک پہنچا دیا جائے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ تم پہلے جوان بنو۔ تب اللہ تک پہنچو گے بلکہ طفولیت ہی میں اللہ تک پہنچنے کا راستہ

دکھلا دیا گیا۔ تو مربی کامل وہی ہے کہ انسان جس حالت میں ہے۔ اسی حالت کو وصول الی اللہ کا ذریعہ بنا دے۔

مولانا محسن کاکورویؒ بڑے عالم اور شاعر بھی بہت بڑے گذرے ہیں اور نعت میں ان کے اشعار واقعی بڑے عالمانہ اور اونچے ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے اپنا واقعہ لکھا ہے کہ لکھنو میں ہر سال پتنگ بازی کا ایک موسم آتا تھا۔ بڑے بڑے نواب اور بڑے بڑے اُمراء کنکلے اُڑا رہے ہیں اور کنکوں کے میچ ہو رہے ہیں کہ دوسرے کے مانجے کو کاٹا تو انہوں نے کہا کہ وہ جیت گیا۔ تو ہار جیت ہوتی تھی۔ میچ ہوتے تھے۔ ہوا میں پتنگ اُڑاتے تھے۔۔ تو مولانا محسن کہتے ہیں کہ ہمارا بچپن تھا تو ہمیں پتنگ اُڑانے کا شوق تھا مگر یہ پتنگ بازی علماء کے گھرانوں کی شان کے مناسب نہیں تھی۔ اس لئے والد ماجد نے روکا بھی مگر اس میں سے اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا راستہ نکال دیا۔ چنانچہ فرمایا:

"تم چاہتے ہو کہ تم جیت جاؤ اور تم دوسرے کے مانجے کا کاٹ دو؟ انہوں نے کہا جی! یہ چاہتے ہیں۔۔۔ فرمایا اس کی تدبیر میں تم کو بتلائے دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ رات کو اخیر شب میں اٹھ کر پہلے تو چار رکعات پڑھو اور اس کے بعد قُل ھُوَ اللّٰہُ پڑھ کر مانجا سوتتے رہو اور اللہ کا نام لیتے رہو۔ پھر جو لڑو گے تو تم ہی جیت جاؤ گے۔"

مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ اب ہم اخیر شب میں اٹھتے وضو کرتے نماز پڑھتے، قل ہو اللہ پڑھ کر مانجا سوتتے۔ اب جو صبح میچ ہوتا۔۔۔ اکثر کامیاب ہو جاتے۔۔۔ فرمانے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ جو جوان ہونے کے بعد پتنگ بازی تو چھوٹ گئی۔۔۔ مگر تہجد باقی رہ گیا۔۔۔ اور معرفت باقی رہ گئی۔ غرض یہ ایک تدبیر تھی۔ یہ نہیں کہا گیا کہ جب تم بڑھو گے تو تم خدا کو پہچانو گے۔ نہیں بلکہ لڑکپن ہی کی نفسیات اور کیفیات سے تم اللہ کو پہچانو۔ تو اس راستے پر ڈال دیا۔

اسی طرح سے آدم علیہ السلام کے زمانے میں اسماء کے ذریعے اللہ تک پہنچایا گیا اور نوح علیہ السلام کے زمانے میں مسمیات کے ذریعے پہنچایا۔

قوم عاد اور قوم ثمود جوان قومیں تھیں۔ ان کو ان کے قوت کے راستے سے پہنچایا۔

عالم بشریت کے شباب کے لئے انداز تعلیم

یہ قاعدے کی بات ہے کہ بچہ اگر بدشوقی دکھلائے تو ایک آدھ تھپڑ مار دیا۔ کچھ ترغیب دیدی۔۔۔ لیکن اگر جوان آدمی سستی دکھلائے تو استاذ صبر نہیں کر سکتا، سخت سزا دیتا ہے کہ جب جوانی میں کام نہیں کیا تو کیا بڑھاپے میں کام کرو گے؟ جوانی اور مانجا ڈھیلا۔۔۔؟

تو اس عمر میں پیار وغیرہ زیادہ نہیں کرتے۔ ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہوتی ہے کہ پھر تمہارے کام

کرنے کی کونسی عمر آئے گی۔ ؟ تو قوم عاد اور ثمود نے جب سرکشی دکھلائی تو یہ نہیں کہ انہیں کھیل کھلونے دیئے گئے ہوں۔۔۔ بلکہ آندھی مسلط کی گئی اور ہوا سے تباہ کیا گیا۔۔۔ قوم ثمود کو چنگھاڑ سے تباہ کیا گیا کہ جوان ہو کر جب علم نہیں کرو گے تو کیا عمل کرنے کے لئے بڑھاپے کا زمانہ آئے گا؟ اس واسطے جوانوں پر ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہوتی ہے۔ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ زیادہ نہیں ہوتی۔ انہیں ترغیبات زیادہ دیتے ہیں اس لئے عذاب میں گرفتار ہو گئے۔

عالم بشریت کا بڑھاپا قوتِ فکریہ کا اِزدیاد

درجہ بدرجہ یہاں تک کہ پھر نبی کریم ﷺ کا دور آیا۔۔۔ تو عالم بشریت کے بڑھاپے کا زمانہ ہے۔
گویا بنی آدم ضعیف ہو چکے ہیں۔ نہ قد و قامت رہے نہ وہ عمریں رہیں نہ وہ طاقتیں رہیں جو پچھلوں میں تھیں۔۔۔ مگر بوڑھے آدمی کا دماغ تجربہ کار ہو جاتا ہے۔ عقل بڑی ہوتی ہے اگرچہ کام کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن جوانوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ بوڑھوں سے مشورہ لیں۔ اس لئے کہ وہ زمانے کے گرم اور سرد سے گزر چکے ہیں اور تجربات ان کے سامنے ہیں۔

تو جوان کا کام یہ ہے کہ وہ علم میں لگیں لیکن جب رکاوٹ پیش آئے تو بوڑھوں سے مشورہ لیں۔ وہ کام کی بات بتائیں گے۔

بڑھاپے میں علم وسعت

وہ کہتے ہیں کہ کہیں بارات گئی اور بارات میں سو دو سو آدمی تھے۔ جس گھر میں گئی وہ بہت کھاتا پیتا گھرانہ تھا تو انہوں نے شرط لگائی کہ بارات جو آئے تو اس میں کوئی بوڑھا ساتھ نہ ہو۔ سارے جوان ہوں۔۔۔

دولہے والوں کے ہاں مشورہ ہوا کہ بڑا بوڑھا ساتھ نہ ہو اور کوئی مشکل آن پڑی تو مشورہ کون دے گے ؟ تو بوڑھے کو ڈھول میں بند کر کے لے گئے تاکہ ان کی بات کا بھی خلاف نہ اور بوڑھا بھی پہنچ جائے۔

بارات جب پہنچی تو صاحب خانہ نے کہا کہ لڑکی تو دی جائے گی مگر۔۔۔ شرط یہ ہے کہ ہر آدمی کے سامنے ایک بکرا تل کر رکھا جائے گا اور وہ اس کو پورا کھانا پڑے گا۔ اگر نہ کھا سکیں تو ہم بیٹی نہیں بیاہیں گے۔

اب یہ بے چارہ پریشان ہوئے کہ اتنا معدہ کس کا ہے کہ پورا بکرا اپنے اندر اتار لے۔۔۔ تو انہوں نے کہا کہ بھئی! سوچ کر جواب دیں گے، تو ڈھول والے کے پاس پہنچ تو بڑے میاں کو ڈھول میں سے نکالا اور کہا کہ شرط لگائی ہے کہ ایک آدمی ایک بکرا کھائے۔ ہم میں تو اس کی طاقت ہے نہیں۔ اگر شرط رد کرتے ہیں تو پھر نکاح نہیں ہو گا۔ مانتے ہیں تو ہم میں طاقت نہیں۔

بڑے میاں نے کہا کہ نہیں تم مان لو اور ان سے کہو کے ایک ایک کر کے تل کر دیتے جائیں۔۔۔اب جونہی ایک بکرا آتا تو ساری بارات میں بوٹی بوٹی آتی اور بکرا ختم ہو جاتا۔ اس طرح کر کے بڑے میاں کے مشورہ سے ان کی شرط بھی پوری ہوئی اور بارات دلہن لے کر واپس ہوئی۔

بوڑھی اُمت پر بار عمل کی کمی

یہ امت بوڑھی ہو گئی ہے۔ اس واسطے عملی طاقت تو اگر چہ گھٹ گئی مگر دماغی اور قلبی طاقت بڑھ گئی، تجربات وسیع ہوگئے دنیا کی امتوں کے احوال قرآن وحدیث کے ذریعے سے اس کے سامنے ہیں۔ تو یہ امت عالم بھی ہے اور مجتہد بھی اور تجربہ کار بھی ہے۔

بڑے بوڑھوں کا یہی کام کرتا ہے کہ عملی بات تو ان پر ڈالی نہیں جاتی۔ ان کے ذمہ معمولی کام لگایا جاتا ہے مگر ان کی تحسین زیادہ کی جاتی ہے کہ بڑے میاں نے بڑا کام کیا۔

چنانچہ اگر شادی بیاہ ہو تو دیگ کے اوپر بڑے میاں کو بٹھا دیتے ہیں۔ آپ نگرانی فرماتے ہیں۔ جوان آدمی کھانا لے جا رہے ہیں۔ رکھ رہے ہیں مگر بڑے میاں بیٹھے ہوئے ہیں اور شام کو کہتے ہیں کہ :

"صاحب! بڑے میاں کی حکمت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ صبح سے شام تک نگرانی فرمائی۔

حالانکہ بڑے میاں نے کیا کیا بیٹھے ہی تو رہے۔ کوئی حرکت تو نہیں کی"۔

مگر بڑی تحسین کرتے ہیں کہ بڑے میاں کی ہمت ایسی تو بڑے بوڑھوں کی تحسین زیادہ کیجاتی ہے۔ عمل کا بار کم کر دیا گیا۔ وہ پچھلی امتوں میں سلاسل اور اغلال تھے، نہایت شاق شاق ریاضتیں اور نہایت محنت کے اعمال، وہ ختم کر کے بہت سہل اعمال دیئے گئے اور تحسین زیادہ کی گئی کہ ایک عمل کرو گے تو دس نیکیوں کا ثواب اور دس کے بعد سات سو تک۔۔۔ اور :

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ۔

"اور اللہ جتنا چاہے اجر دیتا بڑھا دے"۔

غرض اجر اور بڑھا دیا، تحسین بڑھا دی۔ اس لئے کہ امت بوڑھی ہو چکی تھی۔ تو عمل کا بار بہت کم اور اجر بہت ہی زیادہ۔

تکمیل دین

بہر حال مطلب یہ کہ درجہ بدرجہ عالم بشریت نے ترقی کی تو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں ابتداء ہوئی اور یہ انتہا ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ہوئی۔۔۔اس وقت توقعات تھیں کہ امتیں بڑھیں گی اور اس دور میں آ کر وہ توقعات عملی شکلوں میں آگئیں کہ امت کامل ہو گئی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِینَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً۔

دین کامل کر دیا گیا۔۔۔ بلحاظِ عقائد کے بھی ' بلحاظِ اخلاق کے بھی' بلحاظِ اعمال کے بھی اور بلحاظِ احوال و سُنن کے بھی۔ تو ہر حیثیت سے اس امت کی تکمیل کی گئی۔۔۔ یوں دین کامل ہوا۔

انتہاء زیادہ خوشی کی چیز

تو میں شروع میں عرض کر رہا تھا کہ یہ امت تکمیل پسند ہے۔ اس لئے کہ اس کے اندر تکمیل پسندی کا جذبہ ہے' اس لئے اس کو ابتداء سے زیادہ انتہا پر خوشی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ وقت تکمیل ہوتا ہے۔ گو ابتدا اور انتہا دونوں ہی خوشی کی چیزیں ہیں۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس وقت مٹھائی بانٹتے ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب انتقال ہو تو انتہائی خوشی کریں کہ بھائی! آج تکمیل ہو گئی! گویا کتنا خوشی کا وقت ہے۔۔۔ مگر آپ کہیں گے اس وقت تو کوئی بھی خوش نہیں ہوتا۔ سارے بیٹھ کر روتے ہیں۔ لیکن چونکہ تکمیل کو پہنچ گیا تو خوش ہونا چاہئے۔

میں کہتا ہوں کہ موت پر کوئی خوش نہیں ہوتا۔ انتقال پر کوئی خوش نہیں ہوتا بلکہ موت اگر اچھی ہو تو سب کہا کرتے ہیں کہ خدا ایسی موت تو سب کو نصیب کرے۔ اگر موت کوئی رونے کی ایسی چیز ہوتی تو یہ دعائیں کیوں کرتے کہ ایسی موت ہمیں بھی نصیب ہو جائے۔۔۔ اللہ کے راستے میں کوئی شہید ہوا۔ کہتے ہیں بڑے رتبے کی چیز ہے۔ اللہ ہمیں بھی ایسی موت نصیب کرے۔ معلوم ہوا موت غم کی چیز نہیں۔ موت تو خوشی کی چیز ہے۔ غم اپنے عزیز کی جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے ہمارا عزیز جدا ہو گیا۔ اس کے فیض سے محروم ہو گئے۔ اس کے انتقال کا صدمہ نہیں ہوتا انتقال سے تو وہ اللہ تک پہنچ گیا۔ یہ کوئی صدمہ کی چیز ہے 'ایک آدمی خدا سے جاملا' یہ کون سی رونے کی بات ہے' یہ تو عین خوشی کی چیز ہے کہ عمر جس کام کے لئے رکھی گئی تھی آج وہ کام پورا ہو گیا کہ وہ اللہ تک پہنچ گیا۔

اس بات کو حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ :

اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ۔

سب سے بڑا تحفہ مومن کے لئے موت ہے۔۔۔ اور کیوں ہے؟ اس لئے ہے کہ :

انّ الموت جسرٌ یصل الحبیب اِلی الحبیب۔

موت ایک پل ہے جس سے گزر کر آدمی اپنے محبوب حقیقی سے جاملتا ہے' تو محبوب سے کسی عاشق کا مل جانا' یہ غم کی چیز تھوڑا ہی ہوتا ہے؟ یہ تو عین خوشی کی چیز ہے۔ آپ روتے ہیں اس لئے کہ ایک عزیز جدا ہو گیا۔ تو جدائی کا صدمہ ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کا صدمہ نہیں ہوتا۔۔۔ مگر

وہ چونکہ ایک وقت میں دو چیزیں ہیں تو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ موت پہ رو رہے ہیں۔ موت پر کوئی نہیں روتا وہ تحفہ ہے:

تمنائے اِنتہاء

یہی وجہ ہے کہ موت حقیقت میں ولایت کی علامت ہے۔ جتنے اولیاء ہیں وہ موت کی تمنا رکھتے ہیں۔۔۔ فُساق و فجار موت سے گھبراتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی امیدیں سامنے نہیں آ رہیں۔ اولیاء کرام اور ربانی لوگ وہ تمنا میں رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
تادر میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

کون سی مبارک گھڑی ہوگی جو اس اجڑے دیار کو ہم چھوڑیں گے اور اس شہر مطلوب میں ہم پہنچیں گے جس کا اللہ نے وعدہ دیا ہے۔

تو موت کی تمنا علامت ولایت ہے اس لئے حدیث میں آپ ﷺ نے دعا فرمائی:

اللّھم حبّب الموت الی من یعلم انی ۔۔ لک۔

"اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں ۔۔ ت ن محبت ڈال دے جو میرے رسول و نبی ہونے کا قائل ہو"۔

جس حدیث میں موت کی تمنا سے ممانعت کی گئی ہے۔ وہ اس لئے کہ دنیا کی کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرے، اللہ کی ملاقات کے شوق میں جو تمنا مطلوب ہے، اس کا حکم دیا گیا ہے:

یوم تکمیل کا انتخاب

اس امت کے مزاج میں چونکہ تکمیل پسندی ہے۔ تو سید الایام کے انتخاب میں امم کے امتحان کے وقت اس امت نے اپنی عبادت کے لئے یوم تکمیل خلائق یعنی جمعہ و پسند لیا۔ یہود نے ہفتہ کو اختیار کیا اور نصاری نے اتوار کو مگر اللہ تعالی کے علم میں جو منتخب دن تھا وہ یوم جمعہ تھا جو یوم تکمیل ہے اور وہ اس امت مسلمہ نے پسند کیا:

حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق عصر اور مغرب کے درمیان ہوئی۔ اس سے پہلے نظام بنا دیا گیا تھا گھر بار سجا دیا گیا تھا۔ ضرورت مہیا کر دی گئیں تھیں، کھانا دانا پانی غذا وغیرہ سب چیزیں زمین میں پھیلا دی گئی تھیں۔ اخیر میں مہمان کو لایا گیا۔۔۔ اور اسی پر تخلیق کی تکمیل ہو گئی ۔۔۔ غرض اس امت نے یوم تکمیل کو پسند کیا۔ اس لئے کہ تکمیل پسند تھی تو دن بھی وہ اختیار کیا جس میں کمال تھا۔

ایک درجہ میں تکمیل اور ایک درجہ میں آغاز

بہر حال بات دور جاتی ہے، تو ابتدا بھی خوشی کی چیز اور انتہاء بھی خوشی کی چیز۔۔۔ تو بحمد اللہ ہمارے عزیز محمد ازہر نے قرآن کریم ختم کیا تو یہ یوم تکمیل ہے، جس وقت یہ

شروع کر رہے تھے تو اساتذہ کرام نے ماں باپ نے امیدیں باندھی تھیں کہ انشاء اللہ حافظ ہو گا۔ توقع ہے کہ وہ حافظ ہو جائے۔ آج وہ توقع پوری ہو گئی۔ یہ انتہائی خوشی کا دن ہے۔

بہر حال آج یہ تقریب ہے اور تقریب خوشی کی ہے اور خوشی بھی تکمیل کی ہے آغاز اور ابتداء کی نہیں بلکہ حدِ کمال پر پہنچ جانے کی ہے۔ تو ان کے لئے دعا ہے کہ حق تعالیٰ نہیں حافظ جید بنائے اور قاری مجود بنائے۔ عالم با عمل بنائے صاحب اخلاق وصی و نقی و تقی بنائے اور ساری امیدیں پوری ہوں جو ماں باپ اور اساتذہ کرام نے باندھی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ ان چیزوں کو بھی اسی طرح سے مکمل فرمادے جس طرح سے قرآن شریف کے حفظ کو آج انہوں نے مکمل کر دیا۔

آج اس کے الفاظ ان کے سینے میں جمع ہو گئے کل کو اِنشاء اللہ اس کے معانی جمع ہوں گے معانی کے بعد اس کے حقائق جمع ہوں گے حقائق کے بعد ان کی علل آئیں گی علل کے بعد پھر اسرار و مصالح اور حکم بھی منکشف ہوں گی۔ تو اس طرح علم بڑھے گا۔۔۔ غرض ایک درجہ میں یہ آغاز ہے یعنی معانی سمجھنے کے لئے اور ایک درجے میں یہ تکمیل ہے یعنی الفاظ کے حفظ کی۔

عُلوم و شخصیات کے مَراتِب

تو الفاظ سینے میں آ گئے اور قرآن کریم دو ہی چیزوں کے مجموعے کا نام ہے نہ محض الفاظ کا نام قرآن ہے نہ محض معانی کا نام۔۔۔ بلکہ الفاظ مع المعانی کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ اس میں الفاظ یاد کئے جاتے ہیں اور معانی سمجھے جاتے ہیں تو ایک میں قوت حافظہ کام کرتی ہے ایک میں قوت عاقلہ کام کرتی ہے، تو قوت حافظہ کا کام یہ ہے کہ الفاظ بعینہ اپنے اندر محفوظ کر لے اور قوت عاقلہ کا کام یہ ہے کہ ان الفاظ کے اندر سے معانی نکالے اور معانی کے اندر سے معانی نکالے۔۔ اس لئے کہ قرآن تو ایک سمندر ہے۔ معانی در معانی اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ ؎

حرف حرفش راچند در معنی
معنی در معنی در معنی

ابتدا میں ایک لفظ ہے جو قشر کی مانند ہے اور مغز اس کے معنی ہیں۔ پھر معنی بھی قشر کی طرح سے ہے اس کے اندر اور معنی ہیں پھر وہ بھی قشر کی طرح سے ہے اس کے اندر اور معانی ہیں۔۔۔ غرض جیسے علوم کے مراتب ہیں ایسے ہی حق تعالیٰ نے شخصیات کے بھی مراتب قائم کئے ہیں۔ ایک وہ ہے کہ الفاظ کے فقط مدلول کو سمجھ لیتا ہے وہ بھی اونچے درجے کا آدمی ہے ایک یہ کہ مدلول سے آگے بڑھ کر وہ حقائق تک پہنچتا ہے۔ وہ اس سے اونچا عالم ہے اور ایک وہ ہے کہ حقائق کے بعد علل واسرار کو بھی سمجھتا ہے وہ اور بھی اونچے درجے کا عالم ہے تو جیسے آیات، قرآنیہ میں مراتب ہیں ایسے ہی شخصیات میں بھی مراتب ہیں ایک لفظوں کا عالم ایک معانی کا عالم ایک علل واسرار کا عالم پھر سینکڑوں قرآن کریم کے علوم ہیں جن کا آدمی عالم بنتا ہے۔

غرض یہ ایک دن ہے۔ کہ ہمارے ایک عزیز کے قرآن کریم کے حفظ کی تکمیل ہو گئی۔ اس کے بعد حفظ معنی کا درجہ شروع ہو گا۔۔۔ اب ہم دعا کریں گے اللہ تعالیٰ انہیں معانی کا عالم بھی بنائے۔ پھر یہ دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اندر نفسِ مزکی بھی پیدا کرے تا کہ حقائق اور علوم و معارف ان پر کھلیں۔

تبریک

بہر حال اس خوشی کے موقع پر میں ان الفاظ کے ساتھ ان کی خدمت میں ان کے والدین اور ان کے اساتذہ کرام کی خدمت میں "مبارک باد" پیش کرتا ہوں۔

حُسنِ طلب نہیں بیانِ واقعہ

مگر بھئی! ہمارے ہاں تو یہ دستور ہے کہ جب مبارک باد ہوتی ہے تو منہ میٹھا ضرور کراتے ہیں۔۔۔ فقط چائے پہ ٹرخا دینا یہ کافی نہیں ہے۔ اس لئے منہ میٹھا ہونا چاہئے۔ بلکہ پہلے ہونا چاہئے تھا۔ میٹھے منہ سے جو دعا نکلتی ہے" اس میں چپک زیادہ ہوتی ہے۔ اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ منہ میٹھا کرایا جائے تا کہ دعا جا کے اچھی طرح چپکے۔۔۔ اور یہ حسن طلب نہیں بلکہ بیان واقعہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ہمارے کہنے سے ایسا کریں۔ بلکہ یہ دستور ہے۔ اب اللہ تعالیٰ جس کو توفیق دے وہ اس کا درجہ ہے۔ بہر حال ہمارا کام تو یہ ہے کہ جب حاضری ہوئی تو مبارک پیش کریں اور خوشی کا اظہار کریں۔ حق تعالیٰ شانہ۔ ان جیسے اور بھی حفاظ اس مدرسے سے پیدا کرے۔

حُسنِ نیّت کے ثمرات

ہمارے بھائی مولانا (محمد یوسف) بنوری مرحوم جس خلوص سے انہوں نے یہ ادارہ قائم کیا اور جس ضبط و نظم اور منظم طریق پر اسے چلایا اور بہترین قواعد و اصول بنائے یہ حقیقت میں ان کی نیت کے ثمرات ہیں جو سامنے آرہے ہیں۔ بلڈنگیں کھڑی ہوئی ہیں۔ نظم بنا ہوا ہے علماء و طلباء جمع ہیں درس و تدریس بھی ہے۔

ایک مخلص پیدا ہوا تو ہزاروں اس سے بن جاتے ہیں۔ جیسے دنیا میں نبی ایک ہی ذات آتی ہے۔ مگر لاکھوں لوگ ایمان سے رنگے جاتے ہیں۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہ اس امت میں شخصیات پیدا فرماتے ہیں۔ ان شخصیتوں کے ذریعے سے آگے شخصیتیں بنتی ہیں۔۔۔ بہر حال یہ مولانا مرحوم کی نیت کے ثمرات ہیں۔

اَخلافِ صدق کا وعدہ

جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے" اسی طرح سے شخصیات کے بھی پیدا کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ حدیث میں اس کا وعدہ موجود ہے۔

یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله۔

سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے اور وہ سلف کا علم حاصل کرتے رہیں گے۔۔۔ غرض شخصیات کے پیدا ہونے کا وعدہ دیا گیا۔ یہ ناممکن ہے کہ نہ ہوں۔۔۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحب! زمانہ خراب آگیا۔ اب خلف صحیح پیدا ہی نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ علی الاطلاق یہ غلط ہے۔ بے شک خلف ویسے نہیں جیسے سلف ہیں تو نوعیت قائم رہے گی۔ کبھی مٹنے والی نہیں۔ علماء کے بعد علماء، حفاظ کے بعد حفاظ پیدا ہوتے رہیں گے۔

چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا:

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم

بہترین دور میرا دور ہے، جو صحابہؓ کا دور ہے۔ پھر تابعین ہیں۔ پھر تبع تابعین ہیں تو جو مقام صحابہؓ کا ہے وہ تابعین کا نہیں۔ جو تابعین کا ہے وہ تبع تابعین کا نہیں۔ یہ شخصیات میں درجات اور فرق مراتب کا قصہ ہے۔۔۔ لیکن نوعیت قیامت تک یکساں رہیں گی۔ جس کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا:

> "میری امت کی مثال بارش کی سی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پہلا قطرہ زیادہ نافع ثابت ہوا کہ بعد کا قطرہ۔۔۔"۔

بارش ہے۔ اول و آخر قطرات پڑ رہے ہیں، زمین سیراب ہو رہی ہے۔

غرض امت میں خیر باقی رہے گی۔ فرق مراتب ہوتا رہے گا۔ اس سے خیر کا انقطاع نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت اور شخصیات کے ذریعے سے معیار قائم کر لیا۔ ان کے ذریعے حق کی راہیں نظر آئیں گی۔

ضرورتِ انتخاب:

اور میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر اہلِ حق میں اختلاف ہو جائے۔ تو اختلاف اس کا عذر نہیں کہ حق کو چھوڑ دیا جائے۔ جدوجہد ختم کر دی جائے۔

اگر آپ خدانخواستہ بیمار ہو جائیں اور اطباء کی رائے میں اختلاف ہو جائے تو کبھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم تو انتقال کرتے ہیں اور قبر میں جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اطباء میں اختلاف ہے۔ آپ منتخب کرتے ہیں۔ خواہ اس لحاظ سے کہ یہ طبیب فلاں طبیہ یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہے یا اس معیار سے کہ لوگ اس کے یہاں زیادہ شفایاب ہوتے ہیں یا اس لحاظ سے کہ ان کے خاندان میں جدی طور پر طب چلی آرہی ہے اس کو طب سے زیادہ مناسبت ہے، کوئی نہ کوئی معیار لے کر آپ انتخاب کریں گے یہ فیصلہ کبھی نہیں کریں گے کہ اطباء میں اختلاف ہے لہٰذا انتقال فرما جانا چاہئے۔ لہٰذا قبر کو آباد

کرنا چاہئے۔

غرض جسمانی صحت اور اطباء کے بارے میں ان کے اختلاف سے آپ گھبراتے نہیں اور انتخاب کرتے ہیں۔ تو علماء میں اگر اختلاف ہو تو آپ کیوں انتخاب نہیں کریں گے؟ وہاں کیوں یہ فیصلہ کریں گے کہ چونکہ علماء اختلاف رکر رہے ہیں لہٰذا دین کو چھوڑ دینا چاہئے۔ وہاں بھی انتخاب کرنا چاہئے۔

معیارِ انتخاب

اب انتخاب کا معیار الگ ہے۔ اصل چیز آپ کی طلب صادق ہے جس عالم کی دیانت پر آپ کو اعتماد و اطمینان ہو۔ دین اس کے سپرد کریں اور اس سے پوچھ پوچھ کر اس پر عمل کریں۔

آپ کو حکم کس نے بنایا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے تو آپ ثالث بنیں کہ جب ان کا اختلاف ختم ہو تو میرا دین سنبھلے گا۔ تو نہ اختلاف رفع ہوگا نہ آپ کا دین سنبھلے گا۔ ان لڑنے والوں میں اور اختلاف کرنے والوں میں جس فرد یا جس جماعت اور طبقہ پر آپ کا دل مطمئن ہو۔ اس کی طرف آپ رجوع کریں اور اس سے آپ آنکھ بند کرلیں کہ دوسرے کیا کہتے ہیں۔

عوام کے لئے حجت

میں تو ایک مختصر بات کرتا ہوں کہ عالم کے لئے تو کتاب و سنت حجت ہے ان میں وہ مسائل تلاش کریں۔ عوام کے لئے حجت خود وہ عالم ہے۔ عوام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ براہ راست قرآن و حدیث کو سمجھیں۔ انہیں تعلیم نہیں وہاں اسے کیا سمجھیں گے؟ عوام کا کام یہ ہے کہ عالم ربانی جو فتوی دیں اس پر عمل کریں۔

اور مان لیجئے کہ کسی نے غلط فتویٰ دیا۔ آپ کی ذمہ داری نہیں آپ کے لئے نجات ہے، اس عالم کی گردن نپے گی کہ اس نے کیوں غلط فتوی دیا؟

من افتیٰ بغیر علم فاثمہ علی من افتیٰ

حدیث میں ہے کہ جس نے غلط فتویٰ دیا تو مفتی کو پکڑا جائے گا عمل کرنے والے کو نہیں پکڑا جائے گا اس نے دیانت داری سے عمل کیا، تو آپ اپنی جدوجہد صرف کریں، ان اختلاف کرنے والوں میں کون سا طبقہ ہے، کون سا فرد ہے جو واقعی متدین ہے، اس کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ آپ دین کے بارے میں اس سے مدد لیں۔ علماء میں اختلاف ہے وہ ان پر چھوڑ دیں آپ کوئی حکم نہیں ہیں کہ بیٹھ کر فیصلہ دیں وہ اپنا فیصلہ خود کریں گے آپ میں اس کی سکت اور استطاعت نہیں ہے۔ ان میں فیصلہ کا حکم وہ بنے گا جو ان دونوں عالموں سے بڑھ کر عالم ہو۔ وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ صحیح کہتا ہے یہ غلط، آپ الف سے ب نہیں جانتے اور علماء کے اندر فیصلہ کرنے کے لئے چلے۔

تو آپ کیا فیصلہ دیں گے؟ آپ کا کام اطمینان کے بعد انتخاب ہے اس سے سن کر اپنا دین

چلائیے فتویٰ اور مسئلہ پوچھنے کیذریعے اپنا دین سنبھالیں۔ جب دین اور علم آگیا اب آپ ذمہ دار ہیں جس راستے پر آپ چلیں گے۔ دیانت سے چلیں گے۔ اس لئے بڑی خرابی یہ ہے کہ اختلاف کو دیکھ کر لوگ اس فکر میں ہیں کہ دین کو چھوڑ دیا جائے کہ صاحب! ہم کہاں جائیں؟

سوال یہ ہے کہ جب بیمار ہوتے ہو تو اطباء میں اختلاف ہو جائے تو کہاں جایا کرتے ہو؟ کیا قبر میں جایا کرتے ہو؟ ان میں سے کسی کو حکم اور منتخب کرتے ہیں' یہاں کیوں نہیں انتخاب کر لیتے؟ دین کے بارے میں خود مفتی بننے کی کوشش کرتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔

اِتحادِ علماء کی ضرورت

اس واسطے علماء کے حق میں تو یہی عرض کیا جائے گا کہ وہ آپس میں اتحاد کریں۔ کوئی بھی قدر مشترک لے لیں۔ مگر اتفاق کریں۔ اپنی ذاتی خصوصیات اپنے گھر میں رکھیں۔ خود عمل کریں اور جو آپ کے زیر اثر ہے' اس سے عمل کرائیں' لیکن جو قدر مشترک ہے۔ اس میں متفق ہو کر سامنے آؤ۔ دشمنانِ اسلام بہت ہیں' اعداءُاللہ بہت ہیں جو رات دن دین پر حملہ آور ہیں اور استیصال کی فکر میں ہیں۔ آپ ان کے مقابلے میں کیوں نہیں آتے۔ تمام تر جدوجہد آپس کی لڑائی میں صرف ہو رہی ہے۔ غرض آپس میں کسی بھی قدرِ مشترک پر اتفاق کر کے سامنے آؤ۔ مثلاً اللہ واحد' رسول ﷺ واحد کتاب اللہ واحد۔۔۔ اب اگر کسی میں مفہوم کا اختلاف ہے تو ہوتا رہے۔ آپ اپنی دینی زندگی کی فکر کریں۔

طلبِ صادِق

بہر حال علماء میں اتفاق کرانے یا علماء میں اتفاق ہو جانے کے انتظار میں آپ اپنی دینی زندگی کے بارے میں بے فکر نہ ہوں۔ طلبِ صادق سے آپ کو با اعتماد علماء مل جائیں گے۔ آج بھی ایسا نہیں کہ دنیا میں علماء ربانی آپ کو نہ ملیں۔ اگرچہ وہ تھوڑے ہیں مگر ضرور موجود ہیں۔ ان کا دامن پکڑ پکڑ کر پوچھ پوچھ کر اتباع کرتے چلے جائیں۔ آپ کی اپنی زندگی سنورتی چلی جائے گی۔

غرض علماء کے اختلاف کو دین سے بیزاری کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ انتخاب کا طریق اپنایا جائے۔

یہ چند باتیں میں نے آپ حضرات کی خدمت میں عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عمل مرحمت فرمائے اور ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنا نصیب فرمائے آمین!

واخر دعونا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین۔

(کتبہ ۵ جُمادیٰ الاولیٰ ۱۴۱۳ھ)

☆☆☆☆☆☆☆☆

عظمت حفظ

میدانِ محشر میں آدم علیہ السلام کی ساری اولاد جمع ہو گی اوّل سے لے کر آخر تک اربوں کھربوں انسان جمع ہوں گے۔ جلسہ ہو گا اور صدر، حق تعالیٰ شانہ ہوں گے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم سبھی ہوں گے۔ ابھی حساب وکتاب نہیں ہوا ہو گا۔ اس وقت ایک بچے کے باپ کو جس نے قرآن حفظ کرایا تھا اس کی تاج پوشی کی جائے گی۔

تو اولین و آخرین جمع، تاج پہنانے والے حق تعالیٰ اس سے بڑھ کر ایک حافظ کے لئے فخر و اعزاز کا اور کونسا موقع ہو گا؟

(از حضرت حکیم الاسلامؒ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًاوَّ نَذِيْرًاوَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.............. اَمَّابَعْدُ..............

فَاَعُوْذُ بِا اللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ الٓمّٓ ذَالِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ. صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

ظلمت کدہ میں روشن چراغ

بزرگان محترم!

آج ہم سب کے لئے بے انتہا خوشی اور مسرت کا دن ہے کیونکہ آج ہماری قوم کے چند بچے حافظ ہوئے اور ان کو پگڑی باندھی اور سند عطا کی گئی اور ان کے سینے میں حق تعالیٰ نے اپنا کلام مبارک اتار دیا۔ حق تعالیٰ کا کلام کسی بندے کے سینے میں آجانا یہ خود ایک عظیم سعادت ہے، حق تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات اور اس کی صفاتِ کمال نُورِ مطلق ہیں اور بندہ ظلمت کدہ میں یہ چراغ روشن ہو جانا اور نورِ مطلق کی کرنیں اس میں گھومنا اور اِنشراحِ قلب، یہ خود ایک عظیم کرامت ہے انسان کے لئے اور قرآنِ کریم ایک عظیم ترین برکت اور سعادت ہے۔

سر چشمہ حیات

اگر غور کیا جائے تو یہ ایک حیات اور ایک زندگی ہے اس نے دنیا کو بھی زندہ کیا، اقوام کو بھی زندہ کیا اور عربوں کو بھی زندہ کیا اور ان میں زندگی کی روح ڈالی، خود قرآن کریم میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا

"اے پیغمبر! آپ کی طرف ہم نے وحی کی اور وحی کے ذریعہ اپنی روح آپ کے اندر ڈالی مراد ہے قرآن کریم"۔

آگے فرمایا گیا:

مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا

"آپ اس سے پہلے یہ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے۔ اس سے بھی آپ واقف نہیں تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔ ہم نے اس وحی اور اس روح کو نور بنا کر آپ کے اندر ڈالا"۔

جس سے تمام علوم آپ پر منکشف ہوئے۔

تو قرآن کریم کے بارے میں دو باتیں فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ روح خداوندی ہے اور نوعیت اس کی علم اور کمال ہے۔ تو دوسرے لفظوں میں علم کو روح بتلایا گیا ہے۔

ہم اور آپ اپنے عرف میں جانتے ہیں کہ روح باطنی چیز ہے اور وہ زندگی ہے بدن کی، بدن

کی کوئی زندگی نہیں اصل میں زندگی روح کی ہے اس کی وجہ سے بدن بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ جس دن روح نکل جاتی ہے اسی دن یہ بدن بھی لاش ہو کر گندگی میں شمار ہوتا ہے۔ تو حقیقۃً یہ زندگی روح کی ہے اور بدن کی زندگی اس روح کے روپ میں اللہ کے کمال کی ہے۔ تو قرآن کریم جس کو روح کہا گیا ہے وہ روحِ خداوندی ہے اور حقیقت میں ایک معدنِ حیات اور سرچشمہ زندگی ہے۔

یہ روحِ خداوندی جب عربوں میں پہنچی تو وہ قوم زندہ ہوئی جو پُشت ہا پُشت سے مُردہ چلی آرہی تھی، دنیا جس کو حقیر و ذلیل جانتی تھی۔ کوئی ان کو اونٹ کی مینگنیوں میں کھیلنے والا سمجھتا تھا۔ کوئی ان کو جُہلائے عرب کا خطاب دیتا تھا۔ کوئی جاہلینِ مکہ کہتا تھا اور مختلف تحقیر آمیز خطابات سے ان کو یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ روح ان کے اندر بھر گئی تو وہ عالموں سے بڑھ کر عالم اور عارفوں سے بڑھ کر عارف باللہ بن گئے اور جن کا نام جُہلائے عرب تھا ان کا نام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہو گیا۔

پہلے ان کو نفرت سے یاد کیا جاتا ہے، اب ان کو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ ورَضُوْا عَنْہ' کے اعزاز کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس روحِ خداوندی سے پہلے جس زمانہ کا نام تھا "زمانہ جاہلیت" اب اس کا نام "خیرُ القرون" ہے۔ تو زمان میں بھی زندگی آئی مکان میں بھی زندگی آئی اور اَعیان میں بھی اور افراد بھی ایسے زندہ ہوئے کہ دنیا کو زندہ کیا۔

سپرُ طاقتوں کی شکست کی بنیادی وجہ

اور دُنیا کی مُردنی کو دفع کر کے پوری دنیا میں زندگی پھیلا دی اور مُردہ قوم جو پہلے کروٹ نہیں لے سکتی تھی اب قوت پا کر بڑھی تو اتنی بڑھی کہ قیصر و کسریٰ کا کبر و غرور خاک میں ملا دیا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ ان مقدس ہستیوں کو اپنی جواں مَردی ثابت کرنی نہیں تھی بلکہ ان خُرافات کو مِٹانا تھا جو دنیا کے اندر پھیلی ہوئی تھیں۔ قیصریت و کسرویت کا حاصل خدائی کرنا تھا۔ وہاں جو آتا تھا اسے اپنے بادشاہ کو سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ بعض نے زبان سے دعویٰ کیا کہ ہم معبود اور خدا ہیں اور بعض نے عملاً رعایا سے وہ کام کرائے جو خدا ہی کے لئے مخصوص تھے تاکہ سمجھا جائے کہ وہ خدا ہیں چنانچہ رعایا کا ہر فرد آکر سجدہ کرتا تھا اور فریاد کرتا کہ میری ساری حاجتیں آپ سے متعلق ہیں۔۔۔ تو جو خدا کی شان میں کہا جاتا تھا وہ قیصر و کسریٰ کی شان میں کہا جاتا تھا۔ رعایا سب کی سب غلام سمجھی جاتی تھی۔ اس غلامی کے معنی صرف یہ تھے کہ وہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے چند اُمراء اور بادشاہ کو عیش کرائے اور خود بیلوں کی طرح اپنے کھیتوں میں لگی رہے اور ان کی محنتوں سے چند افراد فائدہ اٹھائیں' مساوات تھی نہ عدل و علم تھا۔

ان ناگفتہ بہ حالات میں حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جنگیں ملک گیری کے لئے

نہیں تھیں، وہ تخت شاہی کے خواہش مند نہیں تھے بلکہ اس اقتدار کو خاک میں ملانا تھا جو اللہ تعالیٰ کے دین کی سر بلندی اور اللہ تعالیٰ کے بندوں میں عدل و مساوات کی راہ میں حارج تھا۔۔۔ اور اس وقت سب سے بڑی رُکاوٹ تھا اس وقت دنیا میں دو ہی حکومتیں تھیں۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جب تک یہ اقتدار ختم نہیں کیا جائے گا۔ یہ اوصافِ کمال، عالم میں نہیں پھیل سکتے۔ انسانوں میں خدائی اور بندگی کی تفریق رہے گی۔ یہ مساوات اور عدل اسلام لے کر آیا ہے اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی قیصریت و کسرویت ہے اس لئے ان حضرات نے ملک سے قیصریت و کسرویت کو مٹایا بڑی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کا تختہ جا کے اُلٹا۔ جب جا کے مساوات پیدا ہوئی۔ اسلام پھیلا، دین پھیلا اور وہی لوگ جو انسانوں کے عبد بنے ہوئے تھے وہ عباد اللہ بنے، وہ اللہ تعالیٰ کے بندے بنے سب میں مساوات آئی ان میں زندگی آئی۔ تو قرآن کریم نے اپنے کو روح کہا ہے اور حق تعالیٰ نے روح بتلایا ہے اور روح ہی معدنِ حیات ہے۔۔۔ اس سے گویا واضح ہو گیا کہ قرآن کریم زندگی ہے اور جس قوم میں یہ سرایت کر جائے گا وہ زندہ ہو جائے گی اور جس سے نکل جائے گا وہ مُردہ ہو جائے گی۔

حافظِ قرآن کا باطل سے تحفظ

اور پھر آپ غور کریں تو واقعی جس سینے میں قرآن ہو گا۔ باطل اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا اس واسطے کہ قرآن کی شان مثبت طریق پر یہ فرمائی گئی ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَانُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَالْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ

"وہ جو ایمان لے آئے حضرت محمد ﷺ پر نازل شدہ چیز پر قرآن پر"

فرمایا:

وَهُوَالْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ۔(القرآن الحکیم)

"وہ تو اللہ کی طرف سے حق ہی بنا کر اُتارا گیا ہے"۔

تو مثبت طریق پر قرآن کو حق کہا ہے۔ اصل میں حق یہی ہے۔ دوسرے منفی پہلو میں دوسری جگہ فرمایا گیا کہ:

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ

"یہ وہ کلام ہے کہ اس کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں

باطل نہیں پھٹک سکتا"۔

یہ حق ہی حق ہے۔ اندر سے بھی حق، اوپر سے بھی۔ نہ باطل اس کے اندر ہے نہ اس کے آس پاس آسکتا ہے۔ پھر قرآن کریم باطل سے منزہ اور مبرا اور ذاتی طور پر حق اور سر تا یا حق۔ اب یہ حق اور غیر باطل جب کسی کے سینے میں گھسے گا تو اس کے سینے میں بُطلان کہاں سے آجائے گا۔

اور دوسرا یہ جب حق ہے تو اس میں باطل نہیں آسکتا۔ تو جن بچوں نے آج قرآن کو اپنے سینے میں لے لیا ہے۔ حقیقت میں لفظوں کے اعتبار سے تو وہ منزہ ہو چکے ہیں باطل سے، کل کو معانی اس کے پڑھ لیں گے تو معانی کے لحاظ سے بھی باطل سے منزہ ہو جائیں گے۔ تو ایک وصف تو یہ تھا کہ قربِ خداوندی ملا۔ دوسرا وصف یہ کہ مشابہت ملی نبی کریم ﷺ سے اور تیسرا وصف یہ ملا کہ مجسّم حق بنے گا۔ باطل اس کے آس پاس نہیں آسکتا۔ اس لئے اس کے اندر قرآن رُوح بن کر سرایت کر گیا ہے اور وہ حق ہی حق ہے۔ بُطلان اس کے آس پاس نہیں باطل دُور سے ہی بھاگے گا۔

حافظِ قرآن کی حیاتِ دائمی ہے   اگر اس پہلو کو دیکھیں کہ وہ حَیات ہے اور آپ نے حَیات کو اپنے اندر ڈال لیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ زندہ ہیں مُردہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ مُردنی بدن ضرر رسائی ہو گی اور بد پہلے سے باطل ہے۔ اسے موت آجائے تو کون سے بڑی بات ہے۔ اصل میں زندہ روح ہے۔ اس کا زندگی کا سامنا تو وہ دوامی زندگی ہے۔ تو حافظ اور قاری مَرنے والا نہیں۔ روح اس کی جاری وساری ہے۔ نہ حافظ مرتا ہے نہ قاری مرتا ہے نہ عالم مرتا ہے بلکہ اس کا بدن مرتا ہے۔ اس کی روح زندہ ہی رہتی ہے۔ اس روح کا فیضان اس عالم میں پہنچتا رہتا ہے۔ اس لئے موت حقیقت میں اس کے پاس بھٹکتی ہی نہیں اور موت کا یہ حاصل ہے کہ بدن کھانے پینے کے قابل نہ رہا بلکہ روح کھانے پینے کے قابل ہے۔ اسے وہاں بھی غذا مِل رہی ہے۔ یہاں بھی مِل رہی ہے۔ یہاں بھی اس کی غذا علم و معرفت تھی اور برزخ میں بھی اس کی غذا علم و معرفت ہے اور جنت میں بھی اس کی غذا اعلیٰ سے اعلیٰ علم و معرفت ہو گا تو ہر جگہ اسے زندگی ہے۔ بدن کو یہاں غذا ملی تھی مگر بہت سی دفعہ بیمار ہو کر یہاں بھی محروم ہو جاتا ہے۔ برزخ میں پہنچا وہاں بھی محروم ہو گا۔ حشر میں پہنچے گا تو وہ وہاں بھی محروم رہے گا۔ جب تک وہ روح کے ساتھ نہ ملے کوئی اس کی قدر قیمت نہیں۔

تو بدن کی نہ یہاں زندگی نہ برزخ میں زندگی اور نہ وہاں زندگی اور روح یہاں بھی زندہ، برزخ میں بھی زندہ اور عالمِ آخرت میں بھی زندہ اور روح کی غذا یہی قرآن کریم ہے جس سے حیاتِ اَبدی ملتی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حافظِ قرآن مرتا نہیں وہ زندہ ہی رہے گا۔ اس کے لئے موت نہیں ایک حِسی موت ہے کہ بدن ناکارہ ہو جائے۔ روح اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ مگر روح جو لے کر

گئی ہے وہ قائم ہے اس کے ساتھ وہ اس سے ہٹنے والی چیز نہیں جو قرآن ہے وہ روح ہے بلکہ روحِ خداوندی ہے۔ تو حافظ کی شان یہ ہے کہ باطل اس کے پاس نہیں آئے گا جس حد تک وہ قرآن کو لے چکا ہے اور حیات اس کی دائمی بن گئی ہے اور وہ مشابہ بن گیا نبی کریم ﷺ کے اور اللہ تعالیٰ کی صفات اور خطابات اسے مل گئے کس کے ایسے نصیب ہیں۔۔۔ اسی واسطے اس کا اثر یہ ہو گا۔

حافظِ قرآن کے والد تاجپوشی

حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن حافظ کے باپ کی تاجپوشی کی جائے گی یعنی میدانِ حشر میں جہاں اولین و آخرین جمع ہوں گے تاج پہنایا جائے گا جس کی نورانیت سے پورا محشر منور ہو گا۔ اعلان ہو گا کہ یہ وہ ہے جس نے اپنے بچے کو قرآن کریم یاد کرایا تھا۔

یہ آج اس کی عزت افزائی ہو رہی ہے' جو تاج پوشی کی گئی ہے۔

دنیا میں اگر کسی کی تاجپوشی کی جائے یہ عظیم ترین اعزاز ہے اس سے بڑھ کر کوئی فخر و اعزاز کی چیز نہیں۔ لیکن کسی بادشاہ کی اگر تاج پوشی ہو تو اس ملک کے جو اعیان ہیں وہ جمع ہوتے ہیں اور بادشاہ کو تاج پہنا کر اعلان کرتے ہیں کہ آج سے یہ ہمارا بادشاہ ہے ملک والوں کو فخر ہوتا ہے۔ اس میں ہر اقلیم کے لوگ جمع نہیں ہوتے بلکہ اپنے اپنے ملک والے لوگ جمع ہو کر تاج پہنائیں گے۔۔۔ اور ایک یہ کہ اگر مان لیا جائے کہ کسی کی تاج پوشی میں ساری دنیا کے ملکوں کے نمائندے جمع ہو گئے اور سب نے کھڑے ہو کر تاج پہنایا مگر اس زمانہ کے جو لوگ گزر چکے ہیں وہ تو نہیں آویں گے یا آئندہ آنے والے ہیں وہ تو شریک نہیں ہوں گے پھر تاج پوشی ناقص رہی۔

مگر میدان محشر میں آدم کی ساری اولاد جمع ہو گی۔ اول سے آخر تک۔ اربوں کھربوں انسان جمع ہوں گے۔ جلسہ ہو گا۔ صدر حق تعالیٰ شانہ' ہوں گے۔ ملائکہ علیہم السلام معاون ہوں گے' جلسہ کے تمام آفاق پر' زمینوں پر ان کی فوجیں کھڑی ہوئی ہوں گی۔ بیچ میں بنی آدم ہوں گے۔ اس میں مسلم غیر مسلم سبھی ہوں گے۔ ابھی حساب و کتاب نہیں ہوا ہو گا۔ اس وقت ایک بچے کے باپ کو جس نے حفظ کرایا اس کی تاجپوشی کی جائے گی۔ تو اولین و آخرین جمع' تاج پہنانے والے خدا تعالیٰ تو اس سے بڑھ کر اک حافظ کے لئے فخر و اعزاز کا اور کون سا موقعہ ہو گا۔ حافظ کو اپنی ذات سے جو تھا وہ تھا ہی۔ اس کے ماں باپ تک یہ اثر پہنچا کہ ان کو بادشاہ بنا دیا گیا' ان کی تاج پوشی کی گئی اور اولین و آخرین میں شور یہ ہو گا' بھائی انہوں نے اپنے بچے کو قرآن کریم حفظ کرایا تھا۔ تو بہر حال خود کلام کو دیکھو تو وہ حق محض ہے جس میں باطل پاس نہیں آسکتا جس محل میں آیا بچے کے وہ اتنا بلند ہوا کہ اسے مشابہت حاصل ہوئی حضور سے' اسے القاب ملے گا حق تعالیٰ کے' حیات ملی اسے دائمی۔ اس کے اثرات متعدی

ہوئے تو ماں باپ تک اثرات پہنچے۔ اور ماں باپ کی تاج پوشی کی گئی۔ اولین و آخرین میں شہرت ہوئی۔ تو گویا قرآن کے آثار دنیا سے لے کر برزخ تک اور برزخ سے لے کر آخرت تک سب سے اعلیٰ ہیں۔

قرآن حکیم کی ابدی حکومت

اور پھر یہی نہیں کہ یہیں ختم ہو جائیں بلکہ آگے جنت تک بھی یہ اثر چلتا رہے گا۔

حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔ رَتِّلْ وَارْتَقِ تلاوت کرتا جا اور ترقی کرتا جا' جنت کے درجات کماتا جا۔ اس کی جزا یہ ہے کیونکہ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ جتنی آیات ہیں قرآن کی اتنے ہی درجات ہیں جنت کے۔ ہر درجہ میں تفصیلات تو لاکھوں ہیں۔ لیکن نوعی طور پر درجات کی وہی تعداد ہے جو قرآنی آیتوں کی تعداد ہے۔ اب کوئی قرآن کی آیت ہے چار حرفوں کی۔ اس کے اندر غور کرو تو ہزاروں قسم کے درجات نکلیں گے۔ تفصیل کھولو تو احکام الگ نکل رہے ہیں۔ لطائف الگ نکل رہے ہیں۔ علل الگ نکل رہے ہیں۔ اسرار الگ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حد و نہایت نہیں اس کے کمالات کی تفصیلات کی' آیت ایک ہی ہے۔ تو قرآن کی ایک آیت مستقل موضوع ہے علم و کمالات کا۔ لیکن مجمل دیکھا جائے تو انواع علوم کی اتنی ہیں جتنی آیات ہیں۔ اور درجات جنت کے اتنے ہی ہیں جتنی آیتیں ہیں۔ تو فرمایا جائے گا اس حافظ قرآن سے کہ تلاوت کرتا جا۔ جہاں تک تیری طاقت ہے۔ درجات کماتا جا اور پھر ہر درجہ کی تفصیل الگ ہے۔ جیسے آیت کے اندر تفصیلات ہیں۔ لاکھوں علوم بھرے پڑے ہیں۔ تو جو درجہ جنت کا کمائے گا اس کی نعمتوں کی تفصیلات اتنی ہیں کہ کوئی حد و نہایت نہیں ہے ابد الآباد گزر جائے گا۔ مگر وہ سیر و سیاحت میں ہی رہے گا اور نعمتیں کماتا رہے گا۔

تو قرآن کی حکومت دنیا میں ہی نہیں' برزخ میں ہی نہیں' حشر میں ہی نہیں' بلکہ جنت میں ابد الآباد تک رہے گی۔ اس واسطے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ میرا اور آپ کا کلام نہیں۔

قرآن کریم کے ابدی آثار کی وجہ

ہمارا کلام جب فضا میں آتا ہے وہ گم نہیں ہوتا وہ مٹتا نہیں' اس کو فضا گھیر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام جب چلتا ہے تو وہ فضا کو گھیر لیتا ہے۔ ساری فضا کو گھر لیتا ہے ساری فضا اس کا محل بن جاتی ہے۔ تو فرق یہ ہے کلام اللہ تعالیٰ نے فضا کو گھیرا اور ہمارے کلام کو فضا نے گھیر لیا ہے جسے ریڈیو نے ضبط کر کے دنیا تک پہنچا دیا۔ اگر فضا میں محفوظ نہ ہوتا تو ریڈیو کس کو پیش کرتا' اسی پر ریڈیو کی ایجاد مبنی ہے کہ جو لفظ ہم بولتے ہیں فضا میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ جیسے قرآن کریم نے فرمایا ہے۔

مَایَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلاَّ لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ

کوئی لفظ، کوئی ہاں ہوں تم اپنے منہ سے نہیں نکالتے مگر ٹانکنے والا اسے ٹانک لیتا ہے، محفوظ کر لیتا ہے۔ ہر ہر لفظ محفوظ ہے۔ ہر ہر ادا محفوظ ہے اور آواز محفوظ ہے اور قیامت کے دن وہ سامنے کر دی جائے گی، وہ عمل بھی، وہ ہیئت بھی، وہ قول بھی، اس قول کی آواز بھی، وہ زمانہ بھی ہر چیز محفوظ ہے۔ تو بہر حال ہماری آواز جب نکل جاتی ہے منہ سے تو گم نہیں ہوتی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو کلام نکلے وہ گم ہو جائے۔ ہمارے اور آپ کے کلام کو تو فضا گھیر کر محفوظ کر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام نکل کر ساری کائنات کو گھیر لیتا ہے تو وہ کیسے گم ہو سکتا ہے وہ تو گم ہونے والی چیز نہیں جس جس میں وہ کلام خدا ہوگا۔ وہ انشاء اللہ تعالیٰ گم ہونے والی چیز نہیں ہے آخرت تک اس کے آثار و برکات چلتے ہی رہیں گے۔

حافظ قرآن کا حق شفاعت

حدیث میں ہے کہ حافظ قرآن کو حق دیا جائے گا کہ اپنے عزیزوں میں سے دس کی شفاعت کر، خواہ وہ ماں باپ ہوں، بھائی بند ہو۔ تجھے حق ہے دس آدمیوں کی شفاعت کا جس کی چاہے شفاعت کر اور اگر کسی نے گھر میں سے پانچ بچوں کو حفظ کرا دیا ہے تو پچاس آدمیوں کی شفاعت کا حق ہو گا ان کو، اگر گھر میں پچاس آدمی نہیں تو باقی شفاعت اوروں کے کام آئے گی۔ گھر والے تو بخشے ہی جائیں گے۔ باقی شفاعت اوروں میں پہنچ جائے گی۔

کسی کو شفاعت کا حق دیا جانا بڑی عزت و عظمت کی بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود وہ بخشا بخشوایا ہے۔ جب ہی تو اس کو دوسروں کو بخشوانے کا حق دیا جا رہا ہے کہ تو شفاعت کر دس آدمیوں کی ہم قبول کریں گے۔ اسی طرح سے علماء کو حق دیا جائے گا۔ شہداء کو حق دیا جائے گا، کسی کو سات، کسی کو دس آدمیوں کی شفاعت کا۔ اب اگر سارے ہی گھر والے حافظ ہیں تو ان کی شفاعت کہاں تک پہنچے گی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

ابدی سربلندی

بہر حال جن ماں باپ نے اپنے بچوں کو حفظ کرا لیا ہے۔ وہ یہاں بھی محروم نہیں وہاں بھی محروم نہیں۔ یہاں بھی ان کے لئے برکات ہیں وہاں بھی ان کے برکات ہیں۔ بچہ بھی چھ سات برس کا ہوتا ہے مگر جب پیش کرتے ہیں، پہلے ماں باپ کا نام آتا ہے کہ فلاں صاحب کا بیٹا ہے جس نے قرآن حفظ کیا تو پبلک جان گئی کہ بچہ یہ ہے باپ یہ ہے۔ اس باپ کا احسان ہے جو اس بچہ کو قرآن حفظ کرا دیا۔ تو دنیا میں بھی سرنام ہوا اور آخرت میں تو تشہیر ہو گی ہی۔

ولین میں آخرین میں تو بچہ بھی اور ماں باپ بھی سارے کے سارے ہی سرنام ہوں گے۔

عظمتِ قرآنِ کریم

بہر حال قرآن کریم کی عظمت کے سینکڑوں پہلو ہیں جو احادیث میں فرمائے گئے وقت اتنا نہیں ہے کہ اور سارے پہلوؤں کا ذکر کیا جائے اور سارے پہلو ذکر میں آ بھی نہیں سکتے۔ یہ دو چار پہلو ذکر کر دیئے گئے ہیں کہ یہ قرآن کے پہلو ہیں جن سے قرآن کی عظمت واضح ہوتی ہے اور ان بچوں کو پگڑی باندھ کر چند چیزیں ذہن میں آئیں کہ بڑی اور بڑی خوش نصیبی ہے ان بچوں کی، حق تعالیٰ نے ان کو یہ فضیلت عطاء فرمائی۔

اور یہ بھی کم فضیلت ہے کہ ایک نالائق یہاں آکر بیٹھا کرسی کے اوپر کہ بچوں کی پگڑی باندھے اور آپ نے سپاس نامے میں یہ کس کی تعریفیں کر دی؟ حالانکہ یہ مبالغہ ہے اور میں کہتا ہوں کہ مبالغہ تو جھوٹ کی قسم ہے اور آپ لوگ بری ہیں خدانخواستہ جھوٹ بولیں۔ آپ نے تو اپنے نزدیک سچی باتیں کہی ہیں۔

نگاہِ محبت

مگر یہ کہتا ہوں کہ آپ نے ایک نالائق بھائی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور محبت کی نگاہ سے کوئی چیز بری نہیں لگتی ہے۔ اس کا عیب بھی اچھا معلوم ہوتا ہے یہ سب محبت کرنے والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ محبت اور اخلاص سے جب انہوں نے دیکھنا شروع کیا تو عیب دار کے عیب بھی چھپ گئے اور ساری چیزیں انہیں خوبیاں ہی خوبیاں نظر پڑیں تو خوبیاں سراہنی شروع کر دیں حالانکہ وہ خوبیاں کہاں اور ہم جیسے کہاں؟

اور سادگی سے میں یہ کہتا ہوں کہ یہ تو آپ نے اپنی تعریف کی ہے۔ اس لئے کہ آپ نے اپنے حوصلہ کا ثبوت دیا ہے۔ آپ نے اپنی وسعت قلبی کا ثبوت دیا ہے کہ آپ نے اپنے ایک ناکارہ بھائی کو بہت بڑھایا آپ میں وسعت تھی جب ہی تو آپ نے بڑھا دیا۔ تو وسعت قلبی کا ثبوت آپ دیں تو شکریہ میں کیوں ادا کروں یہ تو آپ نے اپنے کمالات ظاہر کئے ہیں۔ اس کی ضرورت نہیں کہ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں۔

برکتؓ سے بڑھ کر برکتؓ اور میں کہتا ہوں کہ نہ تم ہمارا شکریہ ادا کرو اور نہ ہم تمہارا شکریہ ادا کریں۔ بس ہم سب مل کر اپنے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں کہ اس نے ہم پر اپنا فضل فرمایا کہ ہمیں ایک جگہ جمع کیا۔ ہمارے بچوں کو حافظ بنایا۔ ہمیں توفیق دی کہ ان کو پگڑی باندھیں، ہمیں توفیق دی کہ ان کو سند دیں اور اس قرآن کریم کی تعلیم کو ہم آگے چلائیں۔ یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت جو ہمیں توفیق عطاء فرمائی۔ تو بجائے اس کے کہ ہم ایک دوسرے کا شکریہ ادا کریں کہ ہمیں جمع کر دیا کہ

مسلمانوں کا اجتماع یہ خود ایک مستقل نعمت ہے اور برکت ہے اور اجتماع ہو قرآن کے لئے یہ برکت سے بھی بڑھ کر برکت ہے۔ قرآن سے بھی افادے کے لئے وہ آگے بڑھیں تو یہ برکت در برکت در برکت ہے۔

تو اتنی برکات اور اتنی نعمتیں ہمیں عطاء فرمائیں تو اس لئے اصل میں مستحق تو شکر کے وہ ہیں۔

ولہٗ الثّناء الحسن ولہٗ الکبریاء فی السّمٰوات والارض وھو العزیز الحکیم.

عزت والا وہ، شکر کا مستحق وہ، حمد و ثنا اس کے لئے۔ تو ہم سب مل کر اس کی حمد و ثناء کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ مدرسہ کو اور زیادہ مضبوط اور وسیع فرمائے اور اس کے معلم اور ہمارے قاری صاحبؒ کی عمر دراز فرمائے اور ان کے ایثار اور اخلاص میں اور زیادہ برکتیں عطاء فرمائے اور ہمارے اس قصبے اور علاقے کے لوگوں کو اور زیادہ توجہ عطاء فرمائے۔

"آمین"۔

اللّٰھمّ تقبّل منّا انّك انت السّمیع العلیم.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

آخر عمر میں آپ نے بطور خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ
میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ پہنچ کر بتلاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دنیا و عقبیٰ دونوں کے اکتشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔
(از حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ')

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے اپنے یہاں علماء اور مصلحین امت کے تعارف کے لئے ایک سلسلہ تقاریر شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی تقریر جو حضرت نانوتوی رحمہ' اللہ تعالیٰ کے متعلق براڈ کاسٹ ہوئی' نذرِ قارئین ہے۔

موضوع تقریر

میری اس تقریر کا موضوع ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی ایک زندہ جاوید شخصیت حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ' اللہ بانی دار العلوم دیوبند ہے۔

حضرت ممدوحؒ کی ولادت سن ۱۲۴۸ھ' بمطابق سن ۱۸۳۲ء میں اور وفات سن ۱۲۹۷ھ بمطابق سن ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ اس ۴۹ سال کی قلیل مدت میں آپؒ نے اسلامی اور قومی خدمت کے سلسلے میں جو عظیم کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ صدیوں کی وسعت کے تھے' جنہیں ہندوستان ہی نہیں پوری اسلامی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

انگریزی اِقتدار کا تسلط اور مسلمانوں کی شکست

سن ۱۸۵۷ء میں آپ نے اپنے پیرو مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں ہندوستان سے غیر ملکیوں کا قبضہ اٹھانے کے لئے جنگ لڑی لیکن جنگ میں شکست ہو گئی اور ملک پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا اس سے تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص

مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے اور ان میں احساس کمتری کے ساتھ ایک عام مایوسی پھیل گئی۔ ادھر مغربیوں نے عیسائی اقتدار کے زیر سایہ صاف صاف یہ اعلان کرنا شروع کر دیا کہ انگریزوں کے لئے یہ ملک (ہندوستان) عیسیٰ مسیح کا عطیہ اور امانت ہے اس لئے اس میں مسیحی مذہب ہی کی اشاعت اور ترویج ہمارا نصب العین ہے اور ساتھ ہی کھلے بندوں ہندوستان کے تمام مذاہب اور خصوصیت سے اسلام پر اعتراضات اور اتہامات کی بوچھاڑ بھی شروع کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے باشندے مایوسی میں مبتلا ہو کر اور بالخصوص مسلمان اس ابھرتی ہوئی مغربی تہذیب و تعلیم سے الحاد و دہریت کی زد میں بہنے لگے اور صاف نظر آنے لگا کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو وہ دن دور نہیں کہ آئندہ نسلیں خواہ وہ کسی بھی قوم کی ہوں خود اپنے اخلاقی نظام اور تہذیب و کلچر سے بیگانہ محض ہو کر رہ جائیں گی۔

مذہبی اِنقلاب کی ضرورت

حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور معرفت سے وقت کی رفتار اور اس کے خطرناک نتائج کا اندازہ لگایا اور باشارت غیب ہندوستان کے تمام باشندوں کو بجائے آپس میں الجھنے کے ایک عالمی نقطہ نظر پر ڈال دینے اور قوم میں ایک مذہبی انقلاب لانے کی ضرورت محسوس فرمائی تاکہ یہ احساس کمتری دور ہو۔ اس کے لئے آپ نے تعلیم و تربیت کا راستہ اختیار فرمایا جو بے ضرر اور رسمی سیاست سے دور تھا۔

چنانچہ سن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ نے اپنی ایمانی فراست سے چھینے ہوئے اقتدار کا نعم البدل تعلیمی راہ سے حریت فکر کے بقاء وارتقاء کو قرار دیا اور اپنا یہ عظیم مقصد سن ۱۲۸۳ ہجر بمطابق سن ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند قائم فرما کر با آسانی حاصل کر لیا۔ اس الہامی نقطہ فکر کے تحت دارالعلوم دیوبند محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ حریت فکر اور استقلال وطن کے جذبات کو زندہ رکھنے کا ایک ہمہ گیر مکتب فکر اور عظیم تحریک ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد مولانا محمد قاسمؒ نے مقصد کی اہمیت کے تحت ملک گیر پیمانے پر مدارس قائم فرمانا شروع کئے اور بنفس نفیس خود جا کر مراد آباد، گلاوٹھی، امروہہ، مظفر نگر وغیرہ میں مدارس قائم فرمائے اور جابجا اپنے متوسلین کو زبانی خطوط کے ذریعے قیام مدارس کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ بہت سے مدارس ہندوستان میں حضرتؒ کی زندگی ہی میں قائم ہو گئے۔

ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی

اور پھر حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے حریتِ فکر کے امین فضلاء نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ممالک میں بھی اسی قاسمی طرز فکر پر تعلیم گاہیں قائم کیں اور میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ آج انگلستان میں یہ قاسمی فکر فروغ پا رہا ہے۔ عالمی پیمانہ پر ہندوستان میں مفت تعلیم کا سب

سے پہلا عوامی مرکز مدرسہ دارالعلوم دیوبند ہے، جس کیلئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو صاحب دل علماء اور صداقت شعار اتقاء کار حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمھم اللہ وغیرہ کا مخلصانہ تعاون حاصل رہا۔ یہ دارالعلوم دیوبند آج ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی مرکزی اور اقامتی یونیورسٹی بن کر ایک خاص مکتب فکر کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت وعظمت کی حامل ہے۔

مدارسِ عربیہ کی معنوی بنیاد

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند کو ایسے اصولوں پر قائم فرمایا جن کے تحت روز اول سے یہ درسگاہ ایک عوامی ادارہ کی پوزیشن میں نمایاں ہوئی۔ حضرتؒ والا نے اس سلسلہ میں آٹھ اصول اپنے دست مبارک سے لکھے جو دارالعلوم کے تاریخی ریکارڈ میں آج بھی محفوظ ہیں اور آج تک ہر دور میں بانی دارالعلوم کے ان الہامی اور اساسی رہنما اصولوں کی پوری پوری حفاظت ورعایت کی جاتی رہی ہے۔ یہ اصول در حقیقت دارالعلوم دیوبند کی معنوی بنیاد ہیں، جن پر اس کی ظاہری اور باطنی تعمیر کھڑی ہوئی ہے۔

اور نہ صرف دارالعلوم ہی بلکہ ان تمام مدارس عربیہ کی بھی اساس ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے رنگ پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور ان کے متوسلین نے قائم فرمائے۔ چنانچہ ان اصولِ ہشت گانہ پر حضرت اقدس نے سرخی بھی یہی قائم فرمائی کہ:

"وہ اصول جن پر مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں"

یہی ہمہ گیر اصول قیام مدارس کی اس اجتماعی تحریک کی بنیاد بنے جس سے سن ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو نئی زندگی اور نشاۃ ثانیہ ملی۔ ان اصول کے مطابق حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند کو صرف عوامی چندہ پر قائم فرمایا تاکہ اس میں ابتداہی سے ہمہ گیری کا عنصر نمایاں رہے اور یہ دارالعلوم ہندوستان کے غریب عوام کا ادارہ ثابت ہو۔ ساتھ ہی اصول میں یہ ہدایت بھی ہے کہ اس مدرسہ کے لئے جائیدادوں اور کارخانہ تجارت سے کسی مستقل آمدنی کا کوئی بندوبست نہ کیا جائے۔ ایسا کرنے پر امداد غیبی منقطع ہو جائے گی۔ رجوع اِلی اللہ کا سرمایہ ہاتھ سے جاتا رہے گا اور کارکنوں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ جس کو ان کے مخلص رفیق کار حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی۔ نے اپنی طویل نظم کے بعض اشعار میں بایں الفاظ ظاہر فرمایا کہ :-

اس کے بانی کی وصیت ہے جب اس کے لئے
کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ

یوں سمجھ لینا کہ بے نور و ضیاء ہو جائے گا

ان اصولوں میں خصوصیت سے اسے اہمیت دی گئی ہے کہ تعلیم مکمل طریق پر آزاد ہے جو کہ اجتماعیت کی روح ہے۔ پھر اسی کے ساتھ اصولاً معاملات دار العلوم کو مشورہ کے اصول پر قائم فرما کر اس کو عہد استبداد میں جمہوریت کا نقیب بنا دیا گیا اور خاص طور پر ذمہ دار ادارہ (مہتمم) کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ وہ علاوہ مقررہ اہلِ شوریٰ کے ایسے واردین ' صادرین سے بھی مشورہ کرے جو مدارس کے خیر خواہ اور ان سے دلچسپی رکھتے ہوں۔

یہ اصول حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دار العلوم کے ہمہ گیر اور اجتماعی فکر کے ناقابل انکار شواہد ہیں اور انہیں سے دار العلوم دیو بند کی نوعیت ' اہمیت بھی واشگاف ہو جاتی ہے۔

خلافتِ ترکی کی تائید

انگریزوں کے قومی استبداد کو توڑنے کے لئے جس کا رخ خصوصیت سے مسلمانوں کی طرف تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اپنی ہمہ گیر سیاسی راہنمائی سے اس دور کی خلافت اسلامیہ یعنی خلافت ترکی کی تائید کی طرف مسلمانوں کو خاص طور پر جھکایا۔ سلطان ترکی کی مدح میں قصیدے لکھے اور بحیثیت خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین ہونے کے مسلمانوں کو ان کی طرف مائل کرتے رہے اور اس دور میں جنگ روم و روس ہوئی تو خود بہ نفسِ نفیس دورے کر کے ترکوں کے لئے ہزاروں روپیہ روانہ فرمایا اور خود اپنے گھر کا تقریباً بڑا سامان بطورِ چندہ ترکی خلافت کی مدد کے لئے روانہ فرمایا تا کہ خلافت سے وابستہ رہ کر ملی اجتماعیت برقرار اور شیرازہ بندر ہے۔

اس جذبہ سے ملک کی دوسری قوموں کو بھی ہمدردی تھی اور اسی کا اثر تھا کہ جب مسلمانان ہند نے احیاءِ خلافت کی تحریک شروع کی بلا تفریق مذہب وملت ملک کی تمام مذہبی اکائیاں متفق و متحد ہو کر اس میں برابر کی شریک رہیں۔ اس اجتماعیت پسندی کی وجہ سے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ حج کی ترغیب دیتے تھے کہ بذاتِ خود حج ایک اجتماعی اور بین الاقوامی عبادت ہے تا کہ مشرق و مغرب کے مسلمان یکجا جمع ہو کر باہم وابستہ ہوں اور ان کی بین الاقوامی اجتماعیت کا رشتہ مضبوط ہو اور ساتھ ہی ترکی خلافت سے بھی انہیں وابستگی رہے۔

فکر قاسمیؒ کے تین بنیادی عناصر

یہ تفصیل فکرِ قاسمیؒ کے ان تین بنیادی عناصر کو واشگاف کر دینے کے لئے کافی ہے کہ ملت کا بقاء وارتقاء تعلیم کی ہمہ گیری ذوق اجتماعیت کے عموم اور مرکزیت سے باعظمت وابستگی ہی میں مضمر ہے۔

آخر کار یہی روح ان کے تربیت یافتوں میں بھی راسخ ہوئی اور ان کے بعد ان کے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ قاسمی فکر کے امین بنے اور ان کے بعد حضرتؒ کے حلف الرشید حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ اس قاسمی فکر کے امین بنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے حضرت شیخ الہندؒ نے ریشمی خطوط کی تحریک اٹھائی اور پانچ برس مالٹا میں انگریز کی قید و بند کی صعوبتیں جھلیں۔ ان کے بعد ان کے ہزارہا شاگردوں میں بھی یہی رنگ جوہر نفس ہوتا رہا۔

جن میں خصوصیت سے قابل ذکر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری وغیرہ تھے (رحمہم اللہ اجمعین) جنہوں نے بالآخر ہندوستان کو آزاد کرالیا اور انجام کار ان بزرگوں کا وہ وحدتِ عالمِ اسلام کا خواب اب تعبیر کے قریب ہوتا جارہا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی دورۂ یورپ کی تمنا

آخر عمر میں آپ نے بطورِ خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ میں پہنچ کر بتلاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو۔ بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دنیا و عقبیٰ دونوں کے اِکتشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔

مباحثہ شاہجہاں پور کا واقعہ وہ تاریخی موڑ ہے کہ اس میں حضرتؒ نے ہندو مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی انگریزی سیاست کا رخ انگریزوں کی طرف موڑ دیا جس کا اعتراف اس دور کے ہندو زعماء نے یہ کہہ کر کیا کہ:

"یہ مولوی ہے جس نے ہندوستان کی لاج رکھ لی"۔

یہ روشن حقائق اس عظیم حقیقت کو طشت از بام کرنے کے لئے کافی ہیں کہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی شخصیت ایک عالمی اور تاریخ ساز شخصیت تھی اور ان کے شیخ و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کا یہ قول کہ:

"کئی صدیوں کے بعد اللہ نے مولانا محمد قاسم جیسی شخصیت پیدا فرمائی ہے"

ان کی عظمت و اہمیت کے باب میں بلا خوف تردید حرفِ آخر قرار دیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

افاداتِ علم وحکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور
حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز
کے علمی جوابات

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

حامداً لِلّٰہ العظیم ومصلیاً علٰی رسولہٖ الکریم

وعلٰی اٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین

امابعد

اَحوالِ واقعی

اس مجلس کا موضوع مذاکرہ تھا۔ کوئی تقریر اور وعظ نہیں ہے۔ جیسا کہ بمبئی میں بھی یہی صورت ہوتی ہے کہ عشاء کے بعد کچھ لوگ جمع ہوتے اس میں جس نے کو سوال یا شبہ پیش کیا تو جو اپنے علم میں ہوا وہ عرض کر دیا گیا۔ وہی موضوع اس مجلس کا بھی ہے۔۔۔ لیکن بجائے اس کے کہ مختلف لوگ مختلف باتوں کے سوالات کریں، بعض حضرات نے کچھ سوالات مجھے لکھ کر دیئے ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ کہا جائے۔۔۔ اور یہ سوالات اکثر غلط فہمیوں کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ اس واسطے ان کے بارے میں کچھ باتیں عرض کی جائیں۔

مزاراتِ اولیاء پر حاضری اور علماء دیو بند

سوال (۱) پہلا سوال یہ کیا گیا ہے کہ علماء دیوبند، اولیا اللہ اور بزرگان دین کی قبروں اور مزارات پر جانے سے روکتے ہیں اور قبروں پر فاتحہ ودعا کو منع کرتے ہیں۔۔۔ حالانکہ یہ کذب محض اور بالکل جھوٹ ہے اور افتراء باندھا جاتا ہے۔۔۔ علماء دیو بند کا مسلک یہ ہے کہ اولیاء اللہ اہل کی قبروں پر جانا انتہائی برکت کا ذریعہ ہے، فیض کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے اور علماء دیو بند کے

ہاں خود بیعت و ارشاد کا سلسلہ ہے' ہم لوگ ویسے تو چشتی کہلاتے ہیں لیکن چاروں خاندانوں میں ہمارے بزرگ ریاضتیں بھی کرواتے ہیں اور اجازت بھی دیتے ہیں یعنی چشتیہ' قادریہ' سہروردیہ اور نقشبندیہ۔ ہمارے دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولانا عزیزالرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ نقشبندی تھے اور ہر سال حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر عرس کے موقع پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہ دارالعلوم کے مفتی اعظم تھے۔

تو ایک سلسلہ میں ہمارے ہاں نقشبندیت کا ہے۔۔۔ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے بزرگوں میں سے ہیں اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ سے بیعت تھے اور ان کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہؒ تک پہنچتا ہے۔ یہ لوگ نقشبندیہ ہیں اور عامہ دیوبند کے بزرگ جیسے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ یہ سب چشتی ہیں۔ ہمارا سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیر رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ' ان بزرگوں سے ہوتا ہوا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہوتا ہے' یہ حضرات تقریباً سلسلہ کے جس قدر اولیاء اور بزرگ ہیں ان کے مزارات پر حاضر ہوتے تھے اور استفاضہ کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ' بانی دارالعلوم دیوبند اکثر و بیشتر سال میں کلیر شریف حاضر ہوتے اور اس انداز سے کہ میرے خیال میں آج بھی کوئی بزرگوں کا معتقد شاید اس انداز سے نہ جاتا ہو۔ رڑکی سے چھ میل کے فاصلے پر حضرت صابر کلیری رحمتہ اللہ اللہ کا مزار ہے اور نہر کے کنارے کنارے راستہ جاتا ہے۔۔۔ تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ' نہر کے کنارے پٹڑی پر پہنچ کر جوتے اتار لیتے تھے۔ چھ میل ننگے پیر طے کرتے تھے اور وہاں پہنچ کر عشاء کی نماز کے بعد روضہ میں داخل ہوتے۔ پوری رات مزار پر گزارتے تھے۔ اس میں ریاضتیں' مجاہدہ اور استفاضہ و حصول فیض کرنا اور صبح کی نماز کے لئے وہاں سے نکلتے تھے۔۔۔ بہرحال یہ کہنا انتہائی غلط بیانی اور افتراء پردرازی ہے کہ علماء دیوبند اولیاء اللہ کو نہیں مانتے اگر نہ مانتے تو ان کے سلسلے میں کیوں داخل ہوتے؟ بیعت و ارشاد کا سلسلہ کیوں قائم کرتے؟ اگر مزارات کی حاضری پر جانے کو وہ ناجائز سمجھتے تو خود ننگے پیر ادباً مزارات کے لئے کیوں پیدل جاتے؟

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ' جس قدر بھی ہندوستان میں سلسلے کے اکابر ہیں سفر کر کے ان مزارات پر حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ محبّ اللہ صاحب الٰہ آباد رحمتہ اللہ علیہ کا مزار الٰہ آباد میں ہے۔ تو وہاں گئے۔ اس طرح کلیر شریف گئے اور اجمیر شریف الگ گئے۔۔۔ اسی طرح خود میں نے بھی ان تمام مزارات کی حاضری دی اور جب موقع ہوتا ہے حاضر ہوتا ہوں۔

چنانچہ ایک بار اجمیر شریف میں حاضر ہوا اور کسی کو اطلاع نہیں دی اور یہ خیال تھا کہ ایصال ثواب کر کے بس دو گھنٹوں کے بعد واپس ہو جاؤں گا جمعہ کا دن تھا جب میں وہاں پہنچا تو مزار پر حاضر ہوا۔ دو' اڑھائی گھنٹے وہاں قیام کیا' اس کے بعد باہر نکلا تو تقریباً جمعہ کی اذان میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ تو میں نے ارادہ کیا کہ نماز جمعہ پڑھ کر اسٹیشن چلا جاؤں گا۔ گاڑی رات کو آٹھ بجے جاتی تھی۔ اس بناء پر ارادہ تھا' چونکہ یہاں کسی سے خاص کوئی تعارف بھی نہیں۔۔۔ لیکن جب میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے گیا تو بعض لوگوں نے مجھے کچھ غور سے دیکھنا شروع کیا۔ میں سمجھا کہ شاید کسی نے پہچان لیا ہو۔ نماز جمعہ کے بعد ایک جماعت نے آکر مجھے گھیر لیا اور اس میں دیوان صاحب آگے آگے تھے۔ جو وہاں کے سجادہ نشین ہیں۔۔۔ انہوں نے فرمایا کہ :-

"اپنوں سے یہ اجنبیت کیوں؟۔۔۔ کہ نہ کوئی اطلاع ہے نہ خبر ہے اور چپکے چپکے آنا اور آکر چلے جانا۔ آخر ہم لوگوں سے یہ اجنبیت کیوں برتی گئی؟"۔

میں نے عرض کیا کہ میں نیاز مندانہ اور خادمانہ حاضر ہوا تھا اور خادم اعلان کر کے نہیں آیا کرتے' نیاز منداطلاعیں دے کر نہیں آتے' حاضر ہونا ان کا فرض ہے۔

تو میں اطلاع دے کر کیسے آپ حضرات کو تکلیف دیتا۔ نیاز مندانہ حاضر ہوا ہوں ہزاروں یہاں خدام آتے ہیں۔ ایک خادم اور آگیا۔ اس میں اطلاع کی ضرورت نہیں تھی' بہر حال انہوں نے اصرار کر کے ٹھہرا دیا۔

مجھے رات کو واپس ہونا تھا۔ ریزرویشن بھی ہوا ہوا تھا۔ اس لئے سب کو منسوخ کر والیا۔ میں کہا مجھے دہلی لازمی پہنچنا ہے۔ وہاں جلسہ کا پروگرام ہے۔ تو انہوں نے فون اٹھا کر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (سیوہارویؒ) سے بات کی کہ آپ چاہے جلسہ کریں نہ کریں مگر اسے نہیں آنے دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے روک لیا۔

پھر خانقاہ میں وہیں تقریر کا اعلان کیا۔ چنانچہ حضرت خواجہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے فضائل پر کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تقریر بھی کی۔

اگر علماء دیوبند بزرگوں کے مزارات پر جانے سے روکتے' تو مجھے کیوں جانے کی توفیق ہوتی اور ہمارے بزرگوں کو کیوں توفیق ہوتی؟

مانعین زیارت قبور سے جنگ

ہم لوگوں کی ان لوگوں سے جنگ تھی اور ہے جو واقعہ میں مزارات پر جانے سے روکتے ہیں اور محض تعصباً جنگ نہیں تھی بلکہ دلائل سے جنگ ہے اور حدیث کی رو سے جنگ ہے۔

کنت نَهَیْتُکُمْ عن زیارة القبور . الا تزُورها فانها تذکرّ الاخرة.

"حضرت ﷺ نے فرمایا' میں تمہیں زیارت قبور سے روکتا تھا لیکن اب میں اجازت دیتا ہوں۔ قبروں پر جایا کرو۔ کیونکہ وہاں جانے سے آخرت یاد آتی ہے اور آدمی کے سامنے خود اس کی موت آجاتی ہے جس سے طاعت اور عبادت کی طرف جھکتا ہے"۔

غرض فرمایا کہ پہلے روکتا تھا اب اجازت دیتا ہوں۔ گویا ممانعت منسوخ ہو گئی اور اجازت ثابت ہو گئی۔۔۔۔ غرض اول تو اس حدیث کی رو سے حق ہے اور ہر مسلمان کو ضرورت ہے کہ قبور پر جائے اور آخرت کی یاد تازہ کرے۔

زیارت قبور کے لئے سفر

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ قبر کو مستقل مقصد سفر بنا کر جانا جائز ہے یا نہیں؟ ایک جماعت کہتی ہے کہ ناجائز ہے۔۔۔۔ ہمارے بزرگوں کا دعوی یہ ہے کہ مستقلاً اگر زیارت قبور ہی کے لئے سفر کیا جائے تو جائز ہے۔ بحث اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

لاتشدوا الرحال الا الیٰ ثلاثة مساجد مسجد حرام' مسجد اقصی' و مسجدی هٰذا.

"سفر جائز نہیں ہے مگر تین مساجد کی طرف۔۔۔۔ ایک مسجد حرام یعنی بیت اللہ شریف' ایک مسجد اقصیٰ یعنی شام میں بیت المقدس اور ایک میری مسجد۔ یعنی مسجد نبوی"۔ (علی صاحبها الف الف تحیة و سلام)

اس سے بعض لوگوں نے یہ مسئلہ پیدا کیا کہ قبروں کی زیارت کے لئے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔۔۔ علماء دیوبند یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قبروں کو مقصد بنا کر سفر نہ کرو۔ اس لئے کہ اس میں مسجد کی قید ہے کسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے سفر جائز نہیں۔۔۔ اگر ہو سکتا ہے تو ان مسجدوں کی طرف ہو سکتا ہے۔

ان تینوں کو کیوں جائز رکھا گیا۔۔۔۔؟

اس لئے کہ ان تین مساجد کی جو خصوصیت ہے وہ عالم میں کسی مسجد کی نہیں۔۔۔ بیت اللہ شریف کی تو یہ خصوصیت کہ ایک نماز پڑھی تو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔۔۔ مسجد نبوی کی یہ خصوصیت کہ ایک نماز پڑھی تو پچاس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔

مسجد اقصیٰ کی یہ خصوصیت کہ ایک نماز اس میں پڑھی جائے تو دس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ بقیہ اللہ کی سب مسجدیں برابر ہیں اور محترم ہیں۔ خصوصیت سے کسی مسجد کو مقصد بنا کر جانا' اس کے

یہ معنی ہوں گے کہ اس میں کوئی خاص ثواب ہے۔ حالانکہ کوئی خاص ثواب اللہ کے رسول ﷺ نے نہیں بتلایا تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم کوئی معاملہ کریں کہ گویا ہم زیادہ ثواب سمجھتے ہیں جہاں بھی جائیں گے نماز برابر ہو گی اور اجر ملے گا۔

تو جو لوگ قبروں کا سفر ممنوع قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں استثناء منقطع ہے۔ یعنی کسی مسجد کی طرف سفر جائز نہیں، مگر ان تین مسجدوں کی طرف۔

گویا مسجدوں کی طرف سفر کرنے سے روکا گیا ہے لیکن ان تین مسجدوں کی اجازت ہے۔ بقیہ کی نہیں اس واسطے کہ مسجد کا مفہوم عام لے لیں۔ چاہے اس مین قبر ہو چاہے کچھ ہو۔ تو کسی قبر کی طرف بھی جانا جائز نہیں۔ صرف ان تین مسجدوں کی طرف جانا جائز ہے۔

ہم کہتے ہیں استثناء میں اصل متصل ہے۔ سفر کر کے مساجد کی طرف جانے سے روکا گیا۔ صرف تین مسجدوں کی اجازت دی گئی ہے۔ اس روایت میں قبروں کا ذکر ہی نہیں۔ اس لئے قبروں کا مسئلہ بالکل جداگانہ ہے۔ اس حدیث سے قبروں کے سفر کی ممانعت یا قبروں کی طرف سفر کی اجازت کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ حدیث صرف مساجد کے بارے میں ہے۔

رہا قبروں کا مسئلہ ۔۔۔ تو اول تو حضور علیہ السلام نے خود فرمایا کہ پہلے تو میں تمہیں روکتا تھا۔ اب اجازت دیتا ہوں۔ اس اجازت میں یہ قید نہیں لگائی کہ اگر شہر میں ہوں تو کرلو اگر باہر ہوں تو مت جاؤ (یعنی کجاوہ کس کر شہر سے باہر مت جاؤ) تو عمومی طور علماء دیوبند اس کو جائز سمجھتے ہیں کہ قبروں کو مقصد بنا کر اگر سفر کیا جائے تو جا سکتے ہیں۔ گویا یہ حضرات دوسروں سے اس بارے میں لڑتے ہیں کہ دوسرے کہتے ہیں کہ قبروں کی طرف سفر جائز نہیں اور علماء دیوبند کہتے ہیں کہ جائز ہے' برکات کا موجب ہے اور ان سے استفاضہ ہوتا ہے۔ ایک عام استفاضہ' وہ ہر مسلمان کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہاں پہنچ کر آخرت کی یاد تازہ ہو گی۔ ایک خاص استفاضہ ہے جو اہل حال کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ صاحب قبر سے برکات کا اخذ کرنا اور لینا' تو جو لوگ صاحب مراقبہ ہیں یا صاحب کشف ہیں' روحانیت سے اخذ کرنا جانتے ہیں۔ اس طریقہ سے واقف ہیں۔ وہ فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔

غرض ان حالات میں یہ کہنا کہ علماء دیوبند قبروں پر جانے سے روکتے ہیں بالکل ایک سفید جھوٹ ہے کوئی اس کی اصلیت نہیں۔ شریعت جب ممانعت نہیں کرتی تو علماء دیوبند کیا چیز ہیں کہ ممانعت کریں۔ وہ تو شریعت کے تابع اور غلام ہیں۔ جو شریعت حکم دے گی کریں گے، جس سے روک دے گی، روکیں گے۔ بہر حال اجازت بھی دیتے ہیں اور ان کا عمل بھی ساتھ ساتھ ہے۔ یہ سب حضرات گئے ہیں جاتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں، محض عوام کو اشتعال دلانے کے لئے اس قسم کی افتراء پردازیاں کی جاتی ہیں۔ جیسا موقع ہوتا ہے ویسا ہی جھوٹ بول دیا جاتا ہے۔ تو کوئی اس کی اصلیت نہیں۔

تعظیم جائز اور عبادت ناجائز

ہاں ایک ہے قبروں پر جاکر بے ادبی سے پیش آنا اس کو ہم بھی روکتے ہیں اور ساری دنیا روکے گی قبریں اس لئے ہیں کہ وہ اللہ کے مخلص بندے ہیں۔ ان سے ہم بندگی سیکھیں اور وہی کام کریں جو ان اصحاب قبور نے کیا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتی رحمتہ اللہ علیہ کی قبر مبارک پر اس لئے جاتے ہیں کہ وہ اللہ کے نیک اور مخلص بندے تھے انہوں نے خدا کے ٹوٹے ہوئے بندوں کو اللہ سے جوڑا اور کہا کہ ؎

صرف اللہ کے آگے جھکو!

ہم اس لئے نہیں جاتے کہ خواجہ معین الدین رحمتہ اللہ علیہ کی قبر مبارک کو سجدہ کریں۔ ہم اس کو شرک جانتے ہیں۔ ہم اس لئے جاتے ہیں کہ برکات حاصل کریں۔

انبیاء علیہم السلام نے جب اپنے لئے سجدہ جائز نہیں سمجھا تو اولیاء اللہ اس کو کس طرح سے جائز سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے۔

حضور ﷺ اپنی مجلس مبارک میں تشریف رکھتے تھے۔ بعض صحابہؓ حاضر ہوئے اور آتے ہی حضور علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا یہ کیا حرکت کی؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے قیصر اور کسریٰ کے درباروں کو دیکھا یہ سلاطین اپنی مسندوں پر ہوتے ہیں اور لوگ آکر ان کو سجدہ کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ سجدے کرائیں تو اللہ کا رسولؐ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ ہم اس کو سجدہ کریں۔

آپ ﷺ نے فرمایا ؎

"کبھی ایسا مت کرنا اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔ لیکن دنیا میں کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں۔ بجز اللہ کے۔۔۔۔ عبادت صرف ایک ذات کی کی جائے گی اور توقیر و تعظیم سب اللہ والوں کی حسب درجہ و مرتبہ کی جائے گی"۔

تو انبیاء علیہم السلام جیسی قدسی ذوات ان کے لئے بھی جب سجدہ جائز نہیں ہے تو اولیاء اللہ کے لئے کس طرح جائز ہوگا؟ اور عوام تو بھلا کس شمار و قطار میں ہیں۔ تو قبروں پر جاکر قبروں کو سجدے کرنا اس کو علماء دیوبند شرک جانتے ہیں۔۔۔۔ حاضر ہوکر برکات حاصل کرنا ان اللہ کے بندوں کے نام لے کر اللہ سے دعائیں مانگنا اس سب کو جائز قرار دیتے ہیں اور یہ عبدیت کے خلاف نہیں بلکہ یہ "عین عبدیت" ہے۔

اگر یہ اہل اللہ اور بزرگ دنیا میں موجود ہوتے اور ان کی بارگاہ میں ہم لوگ حاضر ہوتے جب بھی سجدہ نہ کرتے۔ اس لئے کہ اگر ہم سجدہ کرتے تو وہ حضرات خود ہمیں اپنی مجلس سے نکال دیتے کہ

”میں تمہیں اللہ سجدہ کرانے کے لئے آیا ہوں یا اپنے لئے سجدہ کرانے کے لئے آیا ہوں؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام صلحاء کے بارے میں قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ.

”کسی بشر کے لئے جائز نہیں، جس بشر کو اللہ نے کتاب دی ہو، علم دیا ہو۔ فضل و کمال دیا ہو۔۔۔ کیا جائز نہیں ہے؟ یہ کہ لوگوں سے یوں کہے کہ میرے بندے بنو اور میرے سامنے جھکو“۔

بلکہ اللہ کا بندہ جس میں علم اور حکمت ہوگی کہے گا کہ اللہ والے بنو اس کے آگے جھکو اس کو اپنا رب سمجھو اسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھو، صرف اس کے آگے جھکو۔ یعنی عبادت اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں۔ عبد بنا صرف اللہ کے سامنے جائز ہے اور کسی کے لئے نہیں۔

اسماء شرکیہ سے احتراز اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

احبّ الاسماء الی اللہ عبداللہ و عبدالرّحمٰن.

”اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں“۔

کیونکہ اس میں خدا کے سامنے عبدیت اور بندگی ظاہر ہوتی ہے۔ کسی بندے کے نام کے سامنے آدمی عبد لگا دے۔ مثلاً عبدالنبی کہہ دے یا کوئی چیز کہہ دے کہ کسی بندے کا نام لے کر عبد لگا دے وہ جائز نہیں رکھا۔۔۔ چاہے اس کے دل میں نہ ہو کہ میں اس کی عبادت کروں، مگر نام رکھنا بھی جائز نہیں۔ ممنوع قرار دیا۔ اس لئے کہ اس نام سے شرک کی بو آئے گی۔ توقیر اور تعظیم کا ذکر آئے گا تو انبیاء علیہم السلام کی بھی عظمت کی جائے گی، اولیاء اللہ کی بھی عظمت کی جائے گی، صلحاء مومنین کی بھی عظمت کی جائے گی۔

تعظیم اولیاء کرام مومن کا اکرام اور تعظیم شریعت نے فرض قرار دی ہے۔ فرمایا۔

اَلْمُؤمن علی اَلْمُؤمن حرام' دمه ومالُهٗ وعرضه.

"ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان پر حرام قرار دیا ہے۔ یعنی اس کی جان اور اس کا خون بھی حرام اور اس کی آبرو بھی حرام"۔

نہ خون گرایا جائے نہ آبروریزی کی جائے نہ گالم گلوچ کی جائے۔ گویا ہر مسلمان کو با آبرو سمجھا گیا۔۔۔ تو مسلمانوں کا اعلیٰ ترین طبقہ اولیاء کرام ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ان کی عزت اور حرمت فرض قرار دی گئی ہے۔ اولیاء سے بڑھ کر انبیاء علیہم السلام کا طبقہ ہے کہ وہ سارے عالم بشریت کا خصالہ ہیں۔ اس کے حق میں ظاہر بات ہے کہ انتہائی تعظیم فرض قرار دی گئی ہے۔ اگر ذرا توہین ہوئی تو آدمی اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

غرض ایک تعظیم وتوقیر ہے ایک عبادت ہے۔ اس میں یہ فرق ہے کہ عبادت خالص اللہ کے لئے ہے تعظیم اور توقیر بندوں کے لئے ہے۔ پھر جس درجے کے بندے ہوں گے' اسی درجے کی تعظیم کی جائے گی' لیکن جس تعظیم میں عبادت کی بو آنے لگے تعظیم ممنوع ہو جائے گی۔

جزءِ عبادت بھی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں

فقہاء حنفیہ لکھتے ہیں کہ سلام اتنا جھک کر کرنا کہ رکوع کی سی صورت ہو جائے یہ ناجائز ہے۔ اسی لئے کہ اس میں عبادت کی بو آنے لگی اور اس میں عبدیت اور بندگی کا شبہ پیدا ہو گیا اور عبدیت اللہ کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں۔ تو سلام بھی اتنا جھک کر مت کرو کہ رکوع کی شکل ہو۔ کیونکہ رکوع عبادت کا جز ہے۔ رکوع کسی بندے کے آگے جائز نہیں۔

قیام وسجدہ کی ممانعت

حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے یہ چاہا کہ حضور ﷺ کے دربار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں۔۔۔ ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات جس درجہ عظیم وکریم اسی درجہ تعظیم کی بھی مستحق ہے۔

لیکن آپؐ نے ارشاد فرمایا۔

من سره ان يتمثل له الرجال قياما فليتبوا مقعده من النار.

"جس کو یہ پسند ہو کہ لوگ میرے آگے ہاتھ باندھ کے تعظیم سے کھڑے ہوں وہ جہنم میں جا کر اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لے"۔

تو اس کی ممانعت فرمائی کہ لوگ میری بارگاہ میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔ فرمایا' میں بھی بندہ ہوں' تم بھی بندے ہو' اللہ نے مجھ پر وحی کی یہ عظمت دی۔ اس کی تعظیم کرو' سامنے کھڑے

ہو کر قیام کرنا' یہ اصطلاحی عبادت کا ایک جز ہے' اس واسطے شریعت اسلام نے مستقلاً قیام کو روکا۔۔۔ غرض انبیاء علیہم السلام دنیا میں موجود ہوں سجدہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر سجدہ کیا جائے وہ خود ناخوش ہو جائیں گے۔ رکوع نہیں کیا جائے گا۔ وہ رکوع کرنے والے کو خود اپنی بارگاہ سے نکالدیں گے۔ ہاتھ باندھ کے قیام نہیں کیا جائے گا۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسے دھتکار دیں گے۔

اولیاء اللہ سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اس لئے اولیاء اگر یہاں موجود ہوں تو ان کی بارگاہ میں ایسی حرکت جائز نہیں ہو سکتی تو وفات کے بعد کس طرح سے جائز ہو سکتی ہے۔۔۔؟

سجدۂ قبر کی ممانعت

اس واسطے حضور علیہ السلام نے فرمادیا۔

لاتجعلوا قبری وثنا یعبد.

"دیکھو میری قبر کو بت مت بنالینا کہ اسے سجدہ کر دیا یا کر اس کی پوجا کرو"۔

اس معلوم ہوا کہ آپؐ نے اپنے زمانہ قیام دنیا میں بھی سجدہ سے روک دیا۔ جیسا کہ میں نے حدیث بیان کی اور وفات کے بعد بھی روکا کہ میری قبر کو سجدہ گاہ مت بنانا کہ اسے بت بنالو اور اسے سجدہ کرو۔

درود شریف کی عمومیت کی حکمت

چنانچہ فرمایا۔

صلوا علی حیث شئتم.

"درود شریف پڑھو' جہاں سے بھی پڑھو گے میرے پاس پہنچ جائے گا"۔

بہر حال ہم یہ دلائل شرعیہ سے سمجھے ہوئے ہیں کہ اولیاء اللہ کی تعظیم جزء ایمان ہے۔ ان کی محبت جزء ایمان ہے' لیکن عبادت حرام ہے چاہے وہ دنیا میں موجود ہوں یا وہ آخرت میں تشریف لے گئے ہوں' نہ ان کی عبادت کی جائے گی نہ ان کی قبروں کی عبادت کی جائے گی۔ ان کی ذات کی تعظیم زندگی میں بھی واجب اور وفات کے بعد بھی واجب۔ اس لئے قبروں پر بے ادبی کے ساتھ جانا یہ بھی بے ادبی ہے۔ ادب کے ساتھ حاضر ہونا چاہئے اور اسی طرح سمجھ کر کہ گویا وہ حضرات موجود ہیں۔

آداب زیارت قبور

امام ابو حنیفہؒ نے مسند ابی حنیفہ میں روایت نقل کی ہے کہ آداب زیارت میں سے ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کرو اور میت کی طرف منہ کرو اس لئے کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے اور تمہاری بات سنے گا۔ تو جب یہ تفصیل موجود ہے تو اولیاء تو بڑی چیز ہیں' صلحاء مؤمنین کی قبروں کے ساتھ گستاخی جائز نہیں۔

چنانچہ فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ قبر کو تکیہ لگا کر بیٹھنا یہ ممنوع ہے۔ قبر کو پھلانگ کر جانا یہ

ممنوع ہے یا ادھر سے جائے یا ادھر سے جائے۔ قبر کے اوپر سے پھلانگ کر جانا یہ صاحب قبر کی بے حرمتی ہے۔۔۔ تو جس شریعت نے مؤمنین' صالحین کی اور اولیاء اللہ کی اتنی توقیر کی ہو کہ ان کی زندگی میں بھی تہذیب سے پیش آؤ۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کی قبروں سے توقیر و تعظیم کا معاملہ کرو۔ تو کون ہے جو ان کی قبروں کی بے ادبی جائز رکھے گا۔۔۔؟ کون مسلمان ہے جو کسی درجہ میں بھی اولیاء اللہ کی حیاو میا گستاخی جائز قرار دے گا؟

علماء دیوبند نہ صرف جانا بلکہ مستقل مقصود سفر بنا کر جانا جائز قرار دیتے ہیں۔

وھابی اہل نجد کا عقیدہ

البتہ نجد کے لوگ جو خود کو وہابی کہلواتے ہیں۔ وہ ممانعت کرتے ہیں اور بے ادبی سے پیش آتے ہیں۔ وہ روضۂ اقدس کے پاس جانے کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ مسجد نبوی کی نیت کر کے جاؤ۔ مزار اقدس کی نیت کر کے نہ جاؤ۔

زیارۃ روضۂ اطہر کی نیت سے سفر

تو علماء دیو بند ان کے خلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جانا ضروری ہے جو شخص بھی حج کو جائے وہ قبر شریف کو مقصد بنا کر مدینہ منورہ حاضر ہو۔ مسجد کی حاضری تو جداگانہ عبادت و طاعت ہے۔ حضور ﷺ کی زیارت کی نیت سے سفر کرے۔ احادیث میں ایسے عنوانات موجود ہیں۔

من زار قبری وجبت لہ' شفاعتی۔

"جس نے میری قبر کی زیارت کی میری شفاعت اس کے حق میں واجب ہو گئی"۔

بعض روایات میں ہے کہ

من حج ولم یزرنی فقد جفانی.

"جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہ آیا اس نے میرے اوپر ظلم کیا"۔

علماء دیوبند تو فقط زیارت قبر شریف ہی کی اجازت نہیں دیتے بلکہ وہ زیارت قبر کے لئے سفر کر کے بھی جانا جائز قرار دیتے ہیں۔ تو جو جماعت اس درجہ آگے بڑھی ہوئی ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ روکتی ہے سوائے جھوٹ' اتہام اور افتراء کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

علماء دیوبند کے خلاف بے جا اشتعال

بس میں نے یہ عرض کیا جماعت علماء دیوبند بے ادبیوں کو ناجائز کہتی ہے اور قبر پر جا کر سجدہ کرنا یہ صاحب قبر کی گستاخی ہے۔ اس لئے کہ جس صاحب قبر نے کبھی قبر کو سجدہ نہ کیا ہو اس کی قبر پر جا کے آپ سجدہ کریں' اس کا کتنا دل دکھے گا' جس نبی اور پیغمبر پاک ﷺ نے عمر بھر یہ تعلیم دی ہو کہ غیر

اللہ کے آگے کبھی سجدہ مت کرنا۔ اس نبی کی قبر پہ جا کے آپ سجدہ کریں تو اس نبی مکرم کے اوپر کیا گزرے گی؟ ان کو اس بندے سے کتنی نفرت پیدا ہو گی۔ جو شرک میں مبتلا ہوا۔ تو بدعات و منکرات کو روکا جاتا ہے۔ لوگ اس کو اصل کو روکنا قرار دیدیتے ہیں اور یہ محض اشتعال دلانے کے لئے ایسا کرتے ہیں اس لئے کہ دوسرے لوگ' لوگوں کو ان منکرات و بدعات کے اندر مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ جب بدعات سے روکتے ہیں تو وہ ہمارے خلاف اشتعال دلانے کو کہتے ہیں کہ یہ تو قبروں پر ہی جانے سے روکتے ہیں۔ یہ تو اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت ہی کو ناجائز کہتے ہیں۔

جسے جائز کہتے ہیں وہ الگ ہے' جسے ناجائز کہتے ہیں وہ الگ ہے۔ گستاخی کرنا ناجائز ہے۔ زیارت کرنا عین طاعت ہے۔ زیارت قبور کرنا عین مقصد دین ہے۔

ایصال ثواب کی ممانعت کا الزام

سوال یہ بھی کہتے ہیں کہ قبروں پر فاتحہ اور درود کو منع کرتے ہیں۔

اگر فاتحہ پڑھنے سے منع کریں تو قبروں پہ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر قبروں پر تو فاتحہ ہی پڑھنے کے لئے جاتے ہیں کہ وہاں ایصال ثواب کریں اور یہ فاتحہ کا عنوان بھی کچھ نیا عنوان ہے۔ ایصال ثواب کے لئے فاتحہ کا لفظ بعد میں لوگوں نے گھڑ لیا ہے۔ اصل لفظ ایصال ثواب ہے۔ بلکہ ایصال ثواب کے سلسلہ میں جن سورتوں کے تذکرے آتے ہیں ان میں فاتحہ کا ذکر تک بھی نہیں۔ اخلاص' زلزال اور کافرون کا ذکر آتا ہے۔ سورت فاتحہ کا ذکر نہیں۔ نامعلوم فاتحہ کا لفظ کہاں سے استعمال کیا گیا ہے۔ سیدھا جو لفظ شرعی ہے۔ وہ "ایصال ثواب" ہے کہ ثواب پہنچاؤ۔ اب اس میں جس کو جو سورت یاد ہو۔ اخلاص (قل ھو اللہ) کو اس لئے فرمایا گیا ہے کہ مختصر سورت ہے۔ ایک دفعہ پڑھنے پر۔۔۔۔ ایک تہائی قرآن کا ثواب پہنچائے گا۔

اور سورت کافرون کا فرمایا گیا یہ ربع قرآن یعنی چوتھائی ہے۔ تو قرآن کی چوتھائی کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اگر کسی نے چار دفعہ یہ سورت پڑھ لی تو گویا پورے قرآن کا ثواب ہو گیا اور وہ پہنچا دیا۔

سورت زلزال کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کا ثواب نصف قرآن کے برابر ہے۔ تو اگر کسی نے دو ۲ دفعہ سورت کو پڑھ لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو پورے قرآن کو ثواب ہو گیا۔ تو ان سورتوں کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ تھوڑے سے وقت میں ثواب زیادہ ہو جائے۔۔۔ اور جو اس سے زیادہ پڑھے مثلاً سورۃ یٰسین ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کے پڑھنے سے دس قرآن کا ثواب ملتا ہے۔ اگر کوئی باہمت آدمی یہ سورت پڑھ لے تو سبحان اللہ نور علی نور ہے۔ دس قرآن کا ثواب پہنچائے۔۔۔ اور اس میں اچھی صورت یہ ہے کہ اگر وقت کم ہو تو قبر کی زیارت کو گھر سے چلے تو اسی وقت سورۃ یٰسین پڑھنا شروع کر دے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو جائے گی۔ وہاں جا کر ثواب پہنچا

دے۔ تو یہ جو چند سورتوں کی تخصیص کی گئی۔ یہ اس لئے کہ وقت کم لگے اور ثواب زیادہ ہو۔ ورنہ جونسی آیات پڑھ کے ثواب پہنچائے گا۔ ہر حرف پر دس نیکی کا وعدہ ہے۔ اگر الم کا لفظ پڑھ کر ثواب پہنچائے تو تیس نیکیوں کا ثواب ہو گیا۔ تو جتنا چاہے ثواب پہنچائے۔ تو یہ کہنا کہ فاتحہ سے روکتے ہیں۔ یہ بالکل کذب محض' افتراء اور دوسروں پر اتہام ہے۔۔۔اور خدا جانے یہ چیزیں کہاں سے لی گئی ہیں۔ ان حضرات کا نہ یہ عمل ہے نہ یہ عقیدہ ہے۔ تو کسی شخص کے اوپر یا کسی جماعت کے اوپر اس عقیدے یا اس کے عمل کے خلاف اس پر تہمت باندھنا' افتراء پردازی سوائے اس کے کہ عوام کو بٹورنے کے لئے یہ حرکت کی جائے۔۔۔اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی یا یہ کہ ان کا اس میں کوئی فائدہ ہو گا۔ وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ اگر یہ علماء دیوبند جانے لگیں تو ہمارا یہ فائدہ رک جائے گا۔ تو فائدے میں ہم حارج نہیں ہیں۔ تم فائدے اٹھاؤ مگر افتراء پردازی کی کیا ضرورت ہے؟ غرض یہ چیز بالکل غلط ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخی

دوسرا سوال یہ کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خصوصاً سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نعوذ باللہ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ وفات کے بعد مٹی میں مل گئے ہیں۔۔۔۔یہ بھی بالکل جھوٹ اور افتراء پردازی ہے۔ یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے معتقدین کا ہے۔ جن کو "وھابی" کہا جاتا ہے۔ علماء دیوبند اس عقیدے سے بری ہیں۔

علماء دیوبند کہتے ہیں کہ حدیث صحیح میں فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور تمام انبیاء علیہم السلام کے بدنوں کو زمین کے اوپر حرام قرار دیدیا گیا ہے۔ مٹی ان کو نہیں کھا سکتی۔۔۔ تو یہ کہنا کہ مٹی میں مل کے مٹی ہو گئے' بالکل جھوٹ ہے اور علماء دیوبند پر جھوٹ نہیں بلکہ حدیث پر جھوٹ لگانا ہے۔ جو حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ وہی عقیدہ علماء دیوبند کا ہے۔

اور علماء دیوبند صرف یہی نہیں کہتے کہ حضور ﷺ کا جسم مبارک مٹی میں بالکل صحیح وسالم محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا بلکہ علماء دیوبند کا عقیدہ یہ کہ نبی کریم ﷺ آج بھی اسی طرح سے جسم کے ساتھ زندہ ہیں جس طرح سے جسم کے ساتھ دنیا میں تھے اور اس میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ فقط یہ نہیں کہ بدن محفوظ ہے بلکہ بدن میں وہی حیات محفوظ ہے جو حیات دنیا کے اندر محفوظ تھی۔ اسی طرح آپ حی اور زندہ ہیں۔

علامات حیات

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

ونبیّ اللّٰہ یرزَق.

"اللہ کا نبی زندہ ہے اور اس کو رزق دیا جارہا ہے"۔

تو کھانے پینے کے لئے رزق عطاء کیا جا رہا ہے۔ اب جیسا وہاں کا عالم ہے رزق بھی ویسا ہی ہوگا اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ پلاؤ زردہ اور گیہوں کی روٹی ہو۔ جیسے روح پاک اور جسم پاک لطیف ہے۔

تو لطیف ترین غذائیں آپ کے لئے تجویز کی گئی ہیں وہ پہنچتی ہیں۔

اس طرح سے حدیث پاک میں فرمایا گیا۔

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون.

"انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں"۔

تو حیات کے لئے دو چیزیں ہیں۔

علامت ہوتی ہیں۔ ایک خورد و نوش وہ بھی حدیث سے ثابت ہے اور ایک حرکت وہ بھی حدیث سے ثابت ہے۔

بلکہ اعلیٰ ترین حرکت "حرکت عباداتی" ثابت ہے۔۔۔ غرض حیات آج بھی ثابت ہے۔ البتہ یہ ہے کہ آثار و افعال کو روک دیا گیا ہے۔ کہ وہ جو دعوت و تبلیغ کے لئے جاتے تھے وہ روک دیا گیا۔۔۔۔ اور یہ بالکل ایسا ہے جیسا ایک روشن چراغ ہو یا روشن بتی یا قمقمہ ہو آپ اسے ہنڈیا میں بند کر دیں تو اس کی روشنی میں کوئی فرق نہیں آیا مگر جو اس کی کرنیں ہیں وہ عالم سے منقطع ہو گئیں۔ وہ جو چاندنا پھیل رہا تھا وہ ایک ہنڈیا میں چلا گیا۔

تو حضور ﷺ قبر مبارک میں تشریف لے گئے' حیات اور روشنی اور فیضان کی وہی نوعیت ہے جو اس عالم میں تھی۔ مگر اب عالم قبر میں محدود کر دی گئی اور اس عالم سے منقطع کر دی گئی۔۔۔ مگر اس کے باوجود ہم اس کے قائل ہیں کہ آپ اس عالم میں تشریف نہیں لاتے لیکن روحانی فیض جاری ہے۔ یہ جو ہمارا اور آپ کا ایمان سنبھلا ہوا ہے' یہ اسی فیض سے تو سنبھلا ہوا ہے۔ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ادھر توجہ نہ ہو تو ایمان باقی نہیں رہ سکتا۔ اصل مومن آپ کی ذات بابرکات ہے۔ آپ کے طفیل میں اور لوگ مومن ہیں۔ آپ کے ایمان کا پرتو پڑ گیا جو ہم مومن کہلانے لگے۔ ورنہ اصل مومن آپ ہیں۔ وہ جو ایمانی فیض ہے وہ برابر جاری ہے۔ غرض یہ کہنا کہ انبیاء علیہم السلام مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے۔ العیاذ باللہ۔

یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے ہمارا عقیدہ نہیں۔ ہمیں زبردستی اور خواہ مخواہ وھابی اور نجدی بنا دیا۔ یہ فقط اشتعال انگیزی ہے اور یہ محض اس لئے کہ چونکہ ہم بدعات کا رد کرتے ہیں تو اس کے جواب میں نجدیوں اور وھابیوں سے نسب نامہ جوڑ دیا' حالانکہ کہاں نجدی و وہابی اور کہاں دیوبندی؟۔

غرض یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے کہ مٹی میں مل گئے۔ ہم اس کا رد کرتے ہیں کہ یہ غلط عقیدہ

ہے۔ انبیاء علیہم السلام اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اس دنیا میں زندہ تھے۔

استدلال حیات

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن آپ کی وراثت نہیں بٹتی۔

نحن معاشر الانبیاء لانورث.

"انبیاء علیہم السلام وہ گروہ ہیں کہ ہم وراثت میں کسی کو وارث نہیں بناتے"۔

اس لئے کہ وراثت مردہ کی بٹا کرتی ہے۔ زندہ کی وراثت بٹنے کے کیا معنی؟ جب آپ اسی طرح سے زندہ ہیں تو جو اس وقت آپ کی ملک تھی آج بھی آپ کی ملک ہے۔ آپ کی ازواج مطہرات سے کسی کا نکاح جائز نہیں۔ اس لئے کہ آپ حیات ہیں تو کسی زندہ کی بیوی سے کس کی مجال ہے کہ نکاح کرے۔ بیوہ سے نکاح ہوتا ہے نہ کہ زندہ خاوند کی بیوی سے۔

غرض جب آپ زندہ ہیں تو آپکے مال میں وراثت نہیں بٹ سکتی۔ یہ دلائل ہیں جو آپ نے حیات انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں پیش کئے ہیں جو ان دلائل کے قائل ہوں' ان کی طرف نسبت کر کے یہ کہنا کہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں کہتے کہ قبر میں مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے۔ تو یہ نہایت نازیبا بات ہے کہ عقیدہ کسی کا ہو اور جوڑ دیا کہیں۔۔۔ تو جو لوگ اتنی بے تحقیق بات کہیں کہ انہیں یہ پتہ نہیں کہ کس کا عقیدہ ہے اور کس کی طرف منسوب کر رہے ہیں کیا وہ اسی طرح سے اسٹیج پر مسلمانوں کی تربیت کریں گے؟

ہاں یوں کہو کہ فلاں کا عقیدہ ہے اور فلاں کا نہیں ہے۔ ایک لاٹھی سے ہانک دینا یہ تو کذب محض اور افتراء محض ہے اس لئے یہ سوال بھی بالکل بے محل ہے۔ علماء دیوبند اس عقیدے سے بری ہیں۔

نذر و نیاز یا ایصال ثواب

ایک یہ سوال کیا گیا ہے کہ اولیاء اللہ اور دوسرے حضرات جو اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ انکے نام کی نذر و نیاز اور ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں۔۔۔ یہ بھی وہی بات ہے۔ ایصال ثواب کو تو ہم خود کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہنا کہ یہ ایصال کو روکتے ہیں یہ افتراء پردازی ہے۔۔۔ ہم لوگ چشتی ہیں اور چشتیہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جب صبح و شام بیٹھ کر اپنے معمولات کو پڑھو کوئی ذکر و شغل کرو یا نفی اثبات کرو۔ تو ہمارے اکابر اور بزرگوں کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کم سے کم تین مرتبہ "سورۃ اخلاص" پڑھ کر نبی کریم ﷺ تک سلسلہ کے تمام بزرگوں کو ثواب پہنچاؤ اور پھر دعا مانگو کہ یا اللہ! ان کے طفیل سے ہمارے قلب میں بھی

نورانیت پیدا فرمادے۔ تو جن کے صبح وشام روزانہ کا معمول یہ ہو کہ وہ حضور ﷺ کو بھی ثواب پہنچاتے ہوں اور اولیاء سلسلہ کو بھی۔ ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں یہ ایک سفید جھوٹ ہے۔ ایک بے وجہ کی تہمت لگانی ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ ان سے نفرت دلانے کے لئے جہاں جیسا موقع ہوا ویسا ہی اٹھا کے جھوٹ بول دیا۔ بالکل بے اصل چیز ہے۔ غرض ایصال ثواب کے قائل ہی نہیں بلکہ ان کے معمولات میں داخل ہے۔ جیسے روزانہ تسبیح وتہلیل معمولات میں ہے۔ خود ہم لوگ بھی اس کی تلقین کرتے ہیں کہ اپنے معمولات شروع کرنے سے پہلے کم از کم تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر نبی کریم ﷺ تک تمام پیران سلسلہ کو ثواب پہنچائے اب آ گئے رہ گئی نذر ونیاز؟

تو اگر نذر ونیاز کے یہ معنی ہیں کہ بھائی! مال دیدو اور ثواب پہنچاؤ تو اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ یہ تو جائز ہے۔۔۔۔ آپ نے چار فقیروں کو کھانا کھلا دیا اور یہ نیت کی کہ اس کا ثواب فلاں فلاں بزرگ کو پہنچے۔ حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ وہ پہنچے گا علماء دیوبند بھی اس کے قائل ہیں اور نہ صرف اس کے قائل ہیں بلکہ اس کا بھی ان کے ہاں معمول ہے۔۔۔ تقریباً سال میں ایک دو مرتبہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ بکرا ذبح کر کے کھانا پکایا اور غریبوں میں ایصال ثواب کے لئے تقسیم کر دیا۔

جو صاحب حیثیت ہیں وہ بڑا جانور ذبح کر کے بہت سوں کی دعوت کر دیتے ہیں جو بے چارے کم حیثیت ہیں انہوں نے دو چار پیسے صدقہ کر دیئے۔ بہر حال اگر نذر ونیاز کے معنی یہ ہیں کہ مالی عبادت کا ثواب پہنچاؤ اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہم اس کو شرعاً جائز سمجھتے ہیں اور ہمارا معمول ہے۔

مشرکانہ نذر ونیاز

ایک نذر ونیاز کے معنی بھینٹ چڑھانا ہے کہ کسی بکرے کو لے جا کر قبر پر باندھ دے یا کسی بزرگ اور فقیر کے نام پر چھوڑ دو اس کو ہم شرک جانتے ہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کی نذر ونیاز صرف اللہ کے نام کی ہو سکتی ہے۔ صرف اللہ کے نام پر جانور چھوڑا جا سکتا ہے۔۔۔ جیسے آپ حج پر جائیں تو "ھدی" لے کر جانا یا ھدی کو چھوڑ دینا یعنی اونٹنی خدا کے نام پر چھوڑ دینا یہ اللہ کے لئے جائز ہے۔ غیر اللہ کے لئے جائز نہیں۔ مشرکین مکہ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مختلف قسم کے جانور اپنے بزرگوں اور بتوں کے نام پر چھوڑا کرتے تھے۔ ایک کو سائبہ ایک کو وصیلہ اور ایک کو حام کہتے تھے۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں۔

مثلاً جس اونٹنی نے دس دفعہ بچے جن دیئے ہوں۔ جب وہ جن چکی اب اس کو ایک بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ جس نے پہلا حمل جنا اس کو ایک بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے اس کو کچھ نام دیدیتے تھے اور اسکے گلے میں ہار ڈال دیتے تھے اور عقیدہ یہ رکھتے تھے کہ یہ فلاں بت کے لئے اور یہ

فلاں بت کے لئے

قرآن کریم نے اس کا رد کیا۔۔۔ فرمایا۔

مَاجَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَائِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ.

"اللہ نے نہ سائبہ رکھا نہ بحیرہ نہ وصیلہ' نہ حام رکھا کہ بتوں کا نذرونیاز کرو۔ یہ اللہ پر افتراء ہے کہ بھینٹ چڑھاؤ بتوں کے نام پر اور یہ کہو کہ وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۔۔۔۔اللہ نے ہمیں امر کیا ہے۔۔۔ فرماتے ہیں یہ افتراء پردازی ہے۔ ہم نے اس کا امر نہیں کیا"۔

غرض نذرونیاز کے معنی اگر مالی عبادت کے ہیں کہ کھانا پکا کے غریبوں کو کھلاؤ اور اس کا ثواب پہنچاؤ۔ یہ جائز ہے' اگر کپڑا دینا ہو تو ثواب کی نیت کر دو۔ یہ بھی جائز ہے۔ تلاوت قرآن کریم کر کے ثواب پہنچاؤ' یہ بھی جائز ہے' غرض بدنی عبادت ہو یا مالی عبادت ہو' دونوں کا ثواب پہنچتا ہے۔ اگر مالی عبادت کو آپ نذرونیاز کہتے ہیں' علماء دیوبند اس کے منکر نہیں اور اگر نذر کے معنی چڑھاوے کے ہیں کسی کے نام پر خواہ وہ کتنا ہی بڑا ولی ہو یا نبی ہو۔ اس کو قرآن کریم نے روکا ہے اس کو علمائے دیوبند بھی روکتے ہیں۔ تو مطلقاً یہ کہہ دینا کہ نذرونیاز سے روکتے ہیں یہ غلط ہے۔ ایک خاص نذر ہے جس میں شرک ہے اس کو روکتے ہیں۔ مطلقاً مالی عبادت کا ثواب پہنچانا اس کو کسی نے نہیں روکا۔ یہ جائز ہے اور ان حضرات کا بھی یہ عمل جاری ہے۔

ذبیحہ کی نامزدگی

اسی طرح کسی بزرگ کے نام پر ذبیحہ کرنا یہ بھی ناجائز ہے۔ فقط اللہ کے نام پر ذبح ہوگا۔ جب بھی آپ ذبح کریں گے تو یوں کہیں گے۔

بسم اللّٰه وعلى ملة رسول اللّٰه.

یا جب بھی قربانی کرتے ہیں اس میں بھی آپ کا نام لیتے ہیں۔ ذبیحہ تو صرف اللہ کے نام پر ہوگا لیکن جس کو ثواب پہنچانا چاہیں آپ نام لے سکتے ہیں کہ۔

"اے اللہ! میں اس ذبیحہ کو کرتا ہوں تاکہ ثواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دے یا فلاں بزرگ کو پہنچادے"۔

تو ایک ہے ثواب پہنچانے کے لئے نامزد کرنا کہ فلاں بزرگ کو ثواب پہنچانے کے لئے نامزد کر رہا ہوں۔ یہ جائز ہے اور ایک ہے کسی کے نام پر ذبح کرنا یہ عبادت ہے۔ تو ذبح تو اللہ کے نام پر ہوگا اور ثواب کے لئے کسی ایک یا دو یا بیس کو نامزد کر دیں اس میں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ اگر نذر کے

معنی یہ ہیں کہ کسی کو ثواب کے لئے نامزد کردے کہ مثلاً میں فلاں بزرگ کو ایصال ثواب کے لئے یہ کھانا پکار ہا ہوں۔ اس میں کچھ حرج نہیں۔ ایک کو نامزد کرو، دو کو نامزد کرو، بے شک تمام اولیاء امت کے نام لگاؤ۔۔۔ اور یہ کہ فلاں کے نام پر ذبح کرتا ہوں اور ثواب کا کوئی ذکر نہیں۔ جو نام پر ذبیحہ ہوگا۔ وہ صرف اللہ کے نام پر چھوڑا جائے گا وہ کسی بزرگ کے نام پر نہیں چھوڑا جائے گا۔

بہر حال میں نے عرض کیا کہ اگر نذر و نیاز کے معنی ایصال ثواب کے ہیں یا نامزد کرنے کے ہیں کہ فلاں بزرگ کو ثواب پہنچانے کے لئے اس بکرے کو ذبح کر رہا ہوں اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے ہم بھی اس کے قائل ہیں اور اگر نذر و نیاز کے یہ معنی ہیں کہ ثواب کا کوئی ذکر نہیں اور فلاں بزرگ کے نام پر میں اس کو چھوڑ رہا ہوں۔ یہ جائز نہیں۔ بالکل ایسا ہی ہے جیسے مشرکین مکہ بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے اور قرآن کریم نے اس کا رد کیا ہے۔

ہدیہ ضیافت یا صدقہ ایصال ثواب

اگر ایصال ثواب کے لے کچھ پکارئیں تو وہ غرباء کا حق ہوگا۔ اغنیاء کا حق نہیں ہے کہ وہ کھائیں اس لئے کہ یہ صدقہ ہے۔۔۔۔ یہ رسم ہے کہ آپ نے رشتہ داروں اور برادری کو جمع کیا اور ان کو کھلادیا۔ یہ صدقہ کیا ہوا۔ یہ تو نام و نمود کی دعوت ہو گئی۔ صدقہ اس کو کہتے ہیں کہ آپ فقیروں کو کھلائیں تاکہ آپ کو ثواب ہو۔ اور اغنیاء کو اگر کھلائیں تو اس میں ثواب نہیں ہوگا۔

ہاں اس طرح ثواب ہو سکتا ہے کہ آپ ہدیہ کی نیت کریں خوشی کے طور پر دعوت کر رہا ہوں۔ اس میں ایصال ثواب کا کوئی تذکرہ نہ ہو۔ غرض ایک یہ ہے کہ اپنے بھائی بندوں کو دعوت پہ بلانا۔ تو یہ ضیافت اور ان کے لئے ہدیہ ہے جو آپ ان کے لئے گویا پیش کر رہے ہیں۔ اس میں ایصال ثواب کی نیت نہیں ہوئی اور ایک ایصال ثواب کے لئے صدقہ کرنا ہے اس کو ہدیہ نہیں کہتے۔ تو صدقہ کے لئے غریب کا ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ اغنیاء اور مال داروں کو بلا کر کھلادیں گے تو وہ کھانا بھی کھا جائیں گے اور ثواب بھی سارا کھا جائیں گے۔ وہ کسی اور کو نہیں پہنچے گا۔

ایصال ثواب کے لئے ایام کی تخصیص

سوال نمبر (۵) ایسے عزیز و اقارب اور متوفیاں کے لئے اگر تیسرے یا دسویں اور چالیسویں کوئی کھانا وغیرہ پکا کر اس پر فاتحہ دیں اور برادری وغیرہ کو جمع کر کے کھلائیں۔ اس کو بھی علماء دیو بند منع کرتے ہیں؟

جواب تو اتنی بات معلوم ہو گئی کہ ایصال ثواب سے تو نہیں روکتے۔ اس لئے کہ شریعت

نے اجازت دی ہے کسی کو روکنے کا کیا حق ہے۔ اب اس میں اپنی طرف سے قیدیں بڑھانا کہ تیسرے دن کرو، چوتھے دن کرو، اگر یہ اتفاقاً ہے تو بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اتفاق سے آپ کے دل میں آیا میں کہ میں میت کو ایصال ثواب کروں اور وہ تیسرا دن تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں یا دسواں اور چالیسواں دن اتفاق کے طور پر تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن اگر یہ سمجھ کر آپ کریں کہ چالیسویں دن تو پہنچے گا ورنہ نہیں۔ تو یہ غلط ہے کہ یہ عقیدے میں خلل اندازی ہے، عقیدے میں برابر قرار دیا گیا ہے کہ چالیسویں دن پہنچائے گا جب پہنچے گا۔ انتالیسویں دن پہنچائے جب بھی پہنچ گا تو جس چیز کو شریعت عام قرار دے اس کو خاص بنا دینا یہ امت کا حق نہیں۔ یہ صرف رسول کا حق ہے۔ جس چیز کو اللہ کا رسول خاص قرار دے۔ اس کو عام کرنا یہ امت کا حق نہیں۔

مثلاً رمضان شریف کے لئے شریعت نے تیس روزے خاص کر دیئے امت کو حق نہیں کہ وہ شعبان کے بھی روزے رکھا کرے کہ ہم اس کو بھی رمضان سمجھتے ہیں۔ اپنی طرف سے تخصیص کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح شریعت نے نماز کے پانچ اوقات مقرر کئے ہیں۔ بندہ پابند اور مقید ہے کہ انہی اوقات میں نماز ادا کرے۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ کہے کہ میں آج ظہر کو عشاء کے بعد ادا کروں گا یا عصر کے بعد پڑھ لوں گا اور یہ کہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس میں حرج یہ ہے کہ اللہ نے نمازوں کے اوقات خود مقرر فرما دیئے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا.

اللہ نے نماز وقت کی قید کے ساتھ فرض کی ہے تو وقت کی قید اٹھانے والا کوئی دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ کہ خدا تو قید لگائے اور وہ اٹھائے۔ یہ تو اللہ کا مقابلہ ہے تو جہاں شریعت نے قید لگا دی اسے اٹھانے کا حق نہیں اور جہاں قید نہیں لگائی اور بے قید رکھا۔ وہاں قید لگانے کا کسی کو حق نہیں۔ دونوں چیزیں برابر ہیں تو مقید کو مطلق کرنا اور مطلق کو مقید کرنا یہ صرف شارع علیہ السلام کا کام ہے۔ اللہ ورسول کا کام ہے کسی غیر کو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

دوام والتزام کا فرق

پھر اس میں دوسرا فرق یہ کہ ایک وقت کا تقید کرنا اپنی سہولت کے لئے۔ مثلاً میرے پاس فلاں مہینہ کے فلاں دن آمدن زیادہ ہوتی ہے۔ اس دن میں اپنے حالات کے لحاظ سے کر سکتا ہوں۔ ورنہ مشکل ہو جاتی ہے۔ اگر اتنا کریں اور دوسرے کو ملامت نہ کریں۔ تو معلوم ہوگا کہ یہ سب دنوں کو برابر سمجھتا ہے اس میں بھی کوئی حرج

نہیں۔ جیسے مثلاً آپ حضرات تاجر ہیں اور سیزن کا کوئی مہینہ آگیا۔ اس میں آمدنی زیادہ ہوتی ہے اور بکری زیادہ ہوتی ہے۔ آپ نے ارادہ کیا کہ اس مہینے میں غرباء کو کھانا کھلایا کروں گا۔

تو یہ ایک عمل ہے اس عمل پر آپ نے اتفاق احوال کے لحاظ سے دوام کر لیا آپ کے عقیدے میں یہ نہیں ہے کہ اس دن ثواب پہنچاؤں گا تو پہنچے گا۔ ورنہ نہیں پہنچے گا۔ اس واسطے کہ اگر کوئی شعبان میں کرتا ہے تو اس کو بھی صحیح قرار دے رہے ہیں اور ایک نے اتفاق سے شوال میں کیا۔ آپ نے کہا اس نے بھی ٹھیک کیا۔ اب آپ خود جس مہینے میں دواماً کر رہے ہیں تو اس کے خلاف کو بھی جائز سمجھتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔

• بہر حال یہ سمجھنا کہ اس مہینے میں ہوگا اور اس کے خلاف کو ناجائز سمجھنا یہ عقیدہ ہے اور عقیدہ بنانا جائز نہیں جب تک اللہ کا رسول عقیدہ نہ بتلائے۔ غرض ایک ہے دوام اور ایک ہے التزام۔ دوام اور التزام میں فرق ہے تو ایک یہ ہے کہ آدمی کسی مہینے کا پابند بن جائے اور عقیدے میں یہ سمجھے کہ یہ کام اسی مہینے ہو سکتا ہے' یہ مہینہ نکل گیا تو یہ کام نہیں ہوگا۔ یہ جائز نہیں۔ کیونکہ یہ عقیدہ ہے اور ایک التزام کے بغیر دوام ہے کہ میری مصلحت کے لحاظ سے اس مہینے میں کھلا سکتا ہوں اور عمر بھر اس کا پابند ہو گیا۔ عقیدہ یہ ہے کہ جائز اس میں بھی ہے دوسرے بھی جائز ہے۔ یہ ایک ذاتی مصلحت ہو گی۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مشابہت سے احتراز

بس اب اتنی بات دیکھی جائے گی کہ اگر کوئی قوم دنیا میں ایسی موجود ہے جو اس خاص مہینے میں یا اس وقت کو لازم سمجھتی ہے اور آپ نہیں سمجھتے لیکن اگر آپ عمل کریں گے تو آپ پر تہمت یہ آئے گی کہ ان کا بھی وہی عقیدہ ہے۔ ایسے میں مشابہت کی وجہ سے ترک کر دینا چاہئے۔۔۔۔ لیکن اگر سارے ہی ایسے ہوتے کہ فی نفسہ ہر مہینے میں جائز سمجھتے لیکن اپنی مصلحت کی وجہ سے کسی نے کوئی مہینہ اختیار کر لیا کسی نے کوئی۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ فی نفسہ عقیدہ بنائے بغیر عمل کا اپنے کو پابند کر لینا جائز ہے لیکن بعض مصالح کی وجہ سے ترک کرایا جائے گا' اگر کوئی قوم دنیا میں اسے لازم سمجھتی ہے اور آپ اسے لازم نہیں سمجھتے مگر عملاً وہی کر رہے ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ ان کا بھی وہی (لازم سمجھنے کا) عقیدہ ہے تو لوگ اس سے حجت پکڑیں گے تو ایسے مواقع پر ممانعت کی جائے گی۔ مگر وہ ممانعت مصلحتاً ہو گی حرام یا ناجائز ہونے کی وجہ سے اس فعل کی ممانعت نہیں ہو گی۔

بہر حال اس سے آپ سمجھ گئے کہ عزیز و اقرباء یا متوفیان کے لئے تیسرے دسویں یا چالیسویں دن کھانا پکا کر فاتحہ دے کر برادری کو بلا کر دعوت کھلانے سے جو علماء دیوبند روکتے ہیں اس

کا آپ تجزیہ کر لیں کہ کیوں روکتے ہیں۔ بات کو گول مول نہ رکھئے۔۔۔ اب تک میں نے تیسرے، دسویں اور چالیسویں دن کے روکنے کے بارے میں کلام کیا کہ ان کو عقیدہ بنا کر مخصوص کرنا تو ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اگر اپنی مصلحت کی وجہ سے خاص کرتے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔

چہلم، برسی ہندوانہ رسم ہے

مگر یہ ظاہر بات ہے کہ اگر آپ کو فرض کیجئے تیسرے دن اور محرم کے مہینے کی سہولت ہے تو کیا ضروری ہے کہ جس کا عزیز مرے وہ محرم ہی کے مہینے میں مرے اتفاق سے وہ شعبان کے مہینے میں انتقال کر گیا تو وہ کون سا دن ہو گا جس میں آپ کو سہولت ہو گی۔ تجارت کا تو ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ تو یہ تیسرا دسواں اور چالیسواں بلکہ چہلم یہ کوئی قید شریعت میں نہیں ہے۔ نہ نبی کریم ﷺ سے ثابت نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہ تابعین اور ائمہ مجتہدین سے ثابت۔ یہ ایک بے اصل سی چیز ہے۔

بلکہ اگر ثابت ہے تو یہ ہندوؤں سے ثابت ہے۔ ان کے ہاں تیسرا بھی ہے، چوتھا بھی ہے، چالیسواں بھی ہے، برسی بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسم وہیں سے لی گئی ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں میں رسوم کی پابندی کی وجہ

اور اس کی بناء در حقیقت یہ ہوئی ہے اور بھی بہت سی رسمیں اسی طرح ہیں۔

غرض اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اس کی بناء یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام حضرات صوفیاء کرام کے صدقے پھیلا ہے تو ان حضرات کے طفیل سے ہندوستان کے جو لوگ مشرک تھے، وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ چنانچہ ننانوے لاکھ آدمی تنہا حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں اور آپ کے خلفاء کے ہاتھ پر جو ہوئے ہیں وہ تعداد اس کے علاوہ ہے۔۔۔ اسی طرح اور حضرات صوفیاء ہیں۔ تو کروڑوں کی تعداد میں ان حضرات کی دیانت، امانت، سچائی، خلوص اور بزرگی دیکھ دیکھ کر خود بخود جوق در جوق لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اسلام میں داخل ہو گئے۔۔۔ لیکن ان کی تعلیم کا بندوبست پورا نہیں ہو سکا۔ حکومتوں نے توجہ نہیں کی۔ عوام مسلمین نے دھیان نہ کیا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں تو داخل ہو گئے، مگر مسائل کا علم نہیں ہو سکا۔

تو جو رسمیں انہوں نے اسلام کے نام سے کرنی شروع کر دیں۔ مثلاً ان کے دیوالی کی چھڑی نکلتی تھی انہوں نے بھی بعض بزرگوں کے نام پر جھنڈا نکالنا شروع کر دیا۔۔۔ ان کے ہاں ستی کے اوپر پرشاد چڑھتا تھا انہوں نے جا کر قبروں پر مٹھائی چڑھا دی۔۔۔ ان کے ہاں کسی دیوتا کے نام پر کوئی کام ہوتا تھا انہوں نے وہ کام کسی بزرگ کے نام پر کر دیا۔

تو اسلام کا ایڈیشن بنا دیا جب کہ حقیقت وہی تھی جو پہلے سے آ رہی تھی۔ غرض اس کی بنا یہی ہوئی کہ اسلام میں داخل تو جوق در جوق ہوئے مگر ان کی تعلیم نہ ہو سکی۔ تو وہ عورتیں اور مرد جو رسمیں ان کے گھروں میں تھیں ان کے اپنے ذہن سے یا کسی کے کہنے سے انہی کا نقشہ بدل کے وہ سب اسلام بنا دیا۔ اب وہ ساری رسمیں اسی طرح سے چلی آ رہی ہیں۔ اب جبکہ کوئی عالم اس کو ناجائز کہتا ہے تو خفا ہوتے ہیں کہ باپ دادا سے تو ہم یہ رسمیں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ کون ہوتا ہے منع کرنے والا؟

پھر اس کو طعنہ دیتے ہیں کہ یہ کافر ہے دائرہ اسلام سے خارج ہے حالانکہ وہ ان کی خیر خواہی میں یہ سب کچھ کر رہا ہے کہ یہ دین نہیں ہے۔ دین اصلی وہ ہے جو نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہؓ نے پیش فرمایا۔ اسلام کا مزاج یہ ہے۔ یہ رسوم وغیرہ یہ شرکیہ مزاج ہے۔ لوگ اس کو نہیں سنتے۔ بلکہ اس رسم پر زور دیتے ہیں۔

ہندو مسلم اختلاط کے اثرات

تو زیادہ تر یہ رسمیں ابنائے وطن (ہندوؤں) سے آئی ہیں اور پورے ہندوستان میں اس کا مسلمانوں کے دین پر اثر پڑا ہے۔ بعض چیزیں انہوں نے بھی آپ کی قبول کیں اور رفتہ رفتہ ان میں توحید آئی کہ ایک ان میں مستقل ایسا فرقہ (آریوں کا) پیدا ہو گیا۔ جو شرک اور بت پرستی کو روکتا ہے اور مسلمانوں میں شرک اور بت پرستی اسلام سے پیدا ہو گئی ہے کہ آپ اپنے ذہن میں اسلام سمجھ کر رہے ہیں اور حقیقت میں وہ شرک ہو جاتا تو یہ چیزیں وہاں سے چلیں۔ ورنہ دور صحابہؓ میں کہیں اس کا وجود نہیں کہ کہیں دسواں اور چالیسواں ہیں۔ اسی طرح تابعین کے زمانہ میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ آئمہ مجتہدین میں کہیں اس کا ذکر نہیں اسی طرح فقہ میں نہیں۔ البتہ فقہ میں رد موجود ہے کہ یہ غلط اور یہ غلط۔

دین اور رواج کا امتیاز

بس ایک رواج چلا آ رہا ہے۔ تو رواج کا نام دین نہیں۔ دین تو رواجوں کو مٹانے کے لئے آتا ہے تاکہ خدائی رواج قائم ہو۔ خدائی قانون قائم ہو۔ اس واسطے جب بھی کوئی عمل کیا جائے تو دیکھا جائے کہ کتاب اللہ میں ہے یا نہیں؟ سنت رسول اللہؐ میں ہے یا نہیں؟ سنت صحابہؓ میں اس کا وجود ہے یا نہیں؟ اگر معلوم ہو جائے تو آدمی سر آنکھوں پر کرے اور اگر نہ نکلے تو پھر اس سے بچنے کی کوشش کرے۔۔۔ اور اگر نہیں ہے۔ مگر غیروں کے اندر ہے اور عمل کریں تو ان سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کو پوری طرح سے ترک کر دینا چاہئے۔ ورنہ وہ مسلم اقوام کا مزاج بدل دے گا۔ جو ان کا موحدانہ مزاج ہے اور اسلام نے توحید کا مزاج بنایا

ہے۔

حاصلِ کلام

غرض دو باتیں میں نے عرض کیں ایک یہ ہے کہ کسی مسئلہ کو شریعت نے مطلق چھوڑ دیا ہو اور اپنی طرف سے قید لگانا یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کون ہیں کہ خواہ مخواہ اس کو مقید کریں؟

لیکن اگر آپ کوئی دن اپنی مصلحت سے مقید کر رہے ہیں کہ مجھے آج کے دن سہولت ہے اور آپ اس کی تبلیغ نہیں کرتے۔ اپنی سہولت دیکھتے ہیں تو کر لیں لیکن یہ بھی جائز سمجھتے ہوں کہ اگر اس کے کوئی خلاف کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔۔۔ البتہ اس میں یہ ہوگا کہ اگر کسی قوم نے اس کو لازم سمجھ رکھا ہے تو احتیاطاً آپ کو رکنا پڑے گا کہ اس وقت یہ فعل آپ کے واسطے موضع تہمت ہو جائے گا۔ اس لئے آپ کو اس سے بچ جانا چاہئے۔

اور اس کے بچنے میں کوئی دشواری نہیں۔۔۔ اور بچنے سے آدمی جب نہ کے کہ اس دن تو ثواب پہنچتا ہے پھر نہیں پہنچے گا۔ جب ثواب اب بھی پہنچتا ہے اور چار دن بعد بھی پہنچتا ہے تو ضرورت کیا ہے کہ خواہ مخواہ اپنے اوپر ایک بلا لی جائے اور اپنے سر پر تہمت رکھی جائے۔

دوسری بات یہ کہ فاتحہ کے معنی اگر ایصال ثواب کے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ ہونا چاہئے۔۔۔ حدیث میں میت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ایسا ہوتا ہے جیسے دریا میں ڈوبتا ہوا آدمی کہ تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے وہ آس کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ میرا کوئی عزیز مجھے ثواب پہنچاتا ہے یا نہیں؟ تو آپ کو اس کی آس پوری کرنی چاہئے۔ اس کو ثواب پہنچانا چاہئے۔

ایصال ثواب کا تعلق نیت سے ہے

ایصال ثواب کا تعلق قلب سے ہے۔ آپ نیت کریں گے تو ثواب پہنچ جائے گا۔ اگر آپ اس ثواب پہنچانے میں چند قیدیں لگائیں کہ رکھا جائے اور اس پر یوں پڑھا جائے۔۔۔ بعض سہاگنیں جمع ہوں جن کے اب تک بچہ نہ ہوا ہو اور وہ ایک ایک یا سات سات چاول کے دانے اٹھائیں۔ یہ محض رسوم ہیں۔ شریعت کے اندر ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ غرض ایصال ثواب کا تعلق قلب کی نیت سے ہے۔ آپ نے نیت کی، کھانا پکا کے بانٹ دیا۔ فقیر سے بھی یوں نہ کہا کہ میں کیوں کھلا رہا ہوں؟

بس قلب کی نیت یہ ہے کہ ثواب پہنچے، بس پہنچ جائے گا۔ یہ جو قید لگائی گئی ہے کہ جب تک مسجد کا ملا نہ آئے گا ثواب نہیں پہنچے گا۔ یہ سب کھانے پینے کی باتیں ہیں۔ مسئلے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ چونکہ ثواب پہنچانا ہے اور یہ صدقہ ہے۔ اسی واسطے مستحقین کو کھلائے۔ یہ جو ساری برادری کے لوگوں کو جمع کیا اور ان کو کھلا دیا یہ تو وہی رسمی بات ہو گئی۔ ثواب سے اس کا کیا تعلق ہو گا وہ تو

کھانے کے ساتھ ثواب کو بھی کھا کر چلے جائیں گے۔ میت غریب کے لئے کچھ بھی نہ رہے گا۔ میت کو جب پہنچے گا جب آپ مستحق کو صدقہ دیں۔

ایصال ثواب کا صحیح طریقہ

اس واسطے اگر دعوت کرنی ہے، شوق سے کیجئے اور آپ ہر روز دعوت کیا کیجئے۔ آپ کے عزیز ہیں، اقربا ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے۔ جتنی چاہیں آپ دعوتیں کریں۔ دس، بیس سو سو کو جمع کریں۔۔۔ مگر ثواب پہنچانے کی عبادت کو کیوں آپ کر کرا کرتے ہیں کہ اس میں خلط ملط کریں۔ کچھ مستحق کچھ غیر مستحق کچھ امراء کچھ غرباء۔۔۔ معلوم ہوتا ہے دل کے اندر کچھ نمو کا جذبہ ہے۔ برادری کی اٹک ہے کہ نہیں کریں گے تو برادری میں ناک کٹ جائے گی، تو جس میں ناک کٹنے کا خوف ہو وہ عبادت ہوتی ہے؟

ناک کٹنے کا خوف ہو تو وہ مخلوق کی اطاعت ہو گئی۔ نہیں کریں گے تو برادری والے نام رکھیں گے۔ تو نماز، روزہ اور صدقہ نام رکھنے اور نام کٹنے کے خوف سے تھوڑا ہی کیا جاتا ہے، تو آدمی عبادت بھی کرے اور اس کو کر کے کھو دے، تو اس کے کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ صحیح طریق سے کیجئے۔

تو یہ کہنا کہ یہ علماء دیوبند منع کرتے ہیں تو وہ ایصال ثواب سے منع نہیں کرتے ان رسموں سے منع کرتے ہیں۔ تو یہ اشتعال دلانا ہے اور یوں نہیں کہتے کہ علماء دیوبند ایصال ثواب کو جائز بلکہ ضروری کہتے ہیں کہ مگر جو رسوم باندھ رکھی ہیں، ان سے روکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں ان کے کھانے پینے کا نقصان ہے۔۔۔ تو یوں کہتے ہیں کہ یہ مطلق ثواب سے روکتے ہیں تا کہ عوام میں اشتعال پیدا ہو۔ ایصال ثواب جیسی مطلق چیز کو تم مقید کرتے ہو تو اس تقیید کو روکتے ہیں کہ تم کو اس کے مقید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جس کو خدا تعالیٰ نے عام کر رکھا ہے اس کو عام رکھنا پڑے گا جس کو وہ خاص کر دے اس کو خاص رکھنا پڑے گا۔ ہم عیاذاً باللہ شارع نہیں ہیں کہ شریعت وضع کریں۔ شریعت وضع کرنے والا اللہ ہے اور اس کو پہنچانے والے واللہ کے رسول ہیں اس کے بعد کسی کو شریعت کے وضع کرنے کا حق نہیں۔ صحابہؓ میں یا آئمہ مجتہدین بھی اس شریعت میں سے مسائل نکال سکتے ہیں۔ لیکن مستقل شریعت وضع کر دیں یہ کسی کا حق نہیں۔

علم غیب کا تنازع

سوال: علماء سرکار دوعالم جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں، دیوانوں اور جانوروں کے مشابہہ کہتے ہیں؟

العیاذ باللہ، العیاذ باللہ اور معاذ اللہ شیطان کے علوم کو آپؐ کے علوم سے زیادہ بتاتے ہیں۔

جواب: یہ بھی بالکل افتراء اور بالکل کذب ہے۔۔۔ یہ دعویٰ اصل میں وہی لوگ کرتے ہیں

جو علماء دیو بند کو الزام دے رہے ہیں۔۔۔اور یہ قصہ یہاں سے چلا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ نبی کریم ﷺ کو وہ سارا علم حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ علم غیب کلی اور جزئی جزئی کا وہ علم ہے جو حق تعالیٰ کو ہے۔۔۔ خود حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میرا اور میرے ساتھ ساری مخلوق کا علم ملا کر اللہ کے علم کے سامنے ایسا ہے کہ جیسے ایک بے پید سمندر پر ایک چڑیا آئے اور اس میں چونچ لگائے۔ اس کی چونچ کو جو تری لگ جاتی ہے تو اس تری کو سمندر سے کوئی نسبت نہیں۔ ساری مخلوقات کا علم مل کر اللہ کے علم سے وہ نسبت رکھتا ہے جو چڑیا کی چونچ کی تری کو سمندر سے ہے۔ تو حضور علیہ السلام تو یہ فرمائیں اور ہم دعویٰ یہ کریں کہ جتنا اللہ تعالیٰ کو علم ہے وہ سب آپ کو ہے۔ عقلاً بھی خلاف ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات بھی لامحدود اور صفات بھی لامحدود صفات کاملہ میں سے علم بھی ہے۔ تو علم بھی اس کا لامحدود' اس کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ بندہ خود محدود' عمر محدود' ذات محدود' صفات محدود اور قوتیں محدود' تو لامحدود چیز' محدود چیز میں کس طرح سما سکتی ہے؟

تو شرعاً میں نے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک پیش کیا اور عقلاً بھی یہ محال ہے تو عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔

علماء دیو بند کا عقیدہ

علماء دیو بند کا یہ دعویٰ کہ نبی کریم ﷺ کو جو حق تعالیٰ نے علم دیا ہے ساری کائنات میں سے وہ علم کسی کو نہیں دیا۔ نہ اتنا زیادہ کسی کو ہے۔ آپ اعلم الخلائق ہیں۔ تمام ملائکہ کو بھی وہ علم نہیں ہے جو آپ کو ہے۔ تو کائنات میں سب سے زیادہ علم والی ذات جناب نبی کریم ﷺ کی ہے۔ یہ دعویٰ ہے کہ ایک تو اعلم الخلائق ہونا ہے کہ ساری مخلوق سے زیادہ آپ عالم ہیں اور ایک اللہ کے برابر ہونا۔ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔

مخلوق' خالق کی کسی صفت میں اللہ کے برابر ہو جائے۔ یہ عقلاً بھی محال ہے اور نقلاً بھی اور ایک یہ کہ مخلوقات میں سے سے زیادہ افضل ہونا۔ تو وہ ذات ہے ہے جناب نبی کریم ﷺ کی۔۔۔ غرض مسئلہ یہاں سے چلا کہ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا کہ حضور ﷺ کو علم غیب کلی حاصل ہے۔

علماء بریلی کے دعویٰ کا تجزیہ

اس کے بارے میں بعض بزرگان دیو بند نے لکھا۔۔۔ کہ آپ جو کہتے ہیں کہ "علم کلی" حاصل ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

اگر علم کلی کا یہ مطلب ہے کہ ساری کی ساری جزئیات اور کلیات حاصل ہیں۔ یہ عقلا بھی اور نقلا بھی غلط۔ خود حدیث کے بھی خلاف۔ قرآن کریم کے بھی خلاف۔۔۔ اور اگر یوں کہتے ہیں اور آپ کا مطلب یہ ہے کہ کل میں سے بعض علم حضور علیہ السلام کو حاصل ہے تو وہ بعض کچھ کو

اور بعض کچھ اوروں کو بھی حاصل ہے۔ تھوڑا بہت علم اللہ نے ہر انسان کو دیا ہے۔ تھوڑا بہت علم ہر فرشتے کو دیا۔ تھوڑا بہت علم جنات کو بھی دیا۔ پھر اس میں حضور ﷺ کی فضیلت کیا رہی؟

تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ اگر تمہارے دعوے کا یہ مطلب ہے تو یہ بھی غلط ہے اور یہ مطلب ہے تو یہ بھی غلط۔ یہ مطلب علمائے دیوبند کا تھوڑا ہی ہے یہ تو خود بریلوی حضرات کا مطلب ہے جن کو ہم رد کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے سر پر تھوپ دیا کہ تم یوں کہتے ہو کہ معاذ اللہ جانوروں کے برابر علم ہے۔

اور جنات کے برابر علم ہے "عیاذاً باللہ' عیاذاً باللہ' نقل کفر' کفر نہ باشد۔۔۔ شیطان کے برابر علم ہے۔۔۔۔ تو یوں کہا گیا ہے کہ اگر تم علم کے معنی یہ سمجھتے ہو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہر جانور کو بھی علم ہے۔ ہر فرشتے کو بھی علم ہے۔ جناب کو بھی یہ علم ہے۔ اس میں فضیلت کیا رہی؟

غرض تمہارے مطلب کی دو شاخیں بیان کر کے اسے رد کیا جا رہا ہے۔ نہ کہ اپنے مطلب کا کوئی دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ تھوپ دیا ہمارے سر کہ تم یہ دعویٰ کر رہے ہو۔ یہ بالکل غلط ہے۔۔۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ ہم سے یوں کہیں کہ صاحب! فلاں آدمی آیا ہے اور وہ یوں کہتا ہے کہ فلاں جگہ وبا پھیل گئی ہے خدانخواستہ کوئی باقی نہ رہا۔

تو ہم اس کو کہیں گے کہ بھائی! "سوچ لو کہ کوئی باقی نہیں رہنے کا کیا مطلب ہے"۔ آیا یہ مطلب ہے کہ ایک بھی باقی نہیں۔ یہ تو بظاہر خلاف بات ہے کل کے اخبار میں آچکا کہ بہت سارے زندہ ہیں اور اگر یوں کہو کہ بعض آدمی انتقال کر گئے تو کون سا شہر ایسا ہے جس میں روز بعض لوگ انتقال نہیں کرتے۔ تو یہ جو ہم نے الزام قائم کیا یہ آپ کے دعویٰ پر ہم نے قائم کیا۔ ہم نے تو کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

تو مطلب تو آپ کے دعویٰ کا بیان کیا جا رہا ہے اور آپ ہمارے سر تھوپ رہے ہیں کہ تمہارا یہ مطلب ہے۔۔۔ ہمیں اس مطلب سے کیا تعلق؟

علمائے دیوبند کا دعویٰ

ہم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو ساری مخلوقات سے زیادہ علم دیا گیا ہے نہ اتنا علم انبیاء علیہم السلام کو ہے نہ اولیاء کو ہے نہ فرشتوں کو ہے۔۔۔ لیکن اللہ کے علم کے سامنے وہ جز ہے۔ کلی علم تو فقط اللہ کو ہے آپ کا علم اس کا ایک جز اور ایک شمہ ہے۔

اس طرح انبیاء علیہم السلام کو جو علم دیا گیا ہے وہ بھی ایک جز ہے تو اس فرق کو سمجھ لیجئے کہ ایک حضور ﷺ کا ساری کائنات سے بڑھ کر عالم ہونا اور ایک ہے حضور علیہ السلام کے علم کا اللہ کے

علم کے برابر ہونا۔۔۔۔ یہ برابر تب ہو گا جب ذات برابر ہو' صفات برابر ہوں' احوال برابر ہوں۔ جب کہیں برابری نہیں ہے تو صفات میں کیسے برابری ہو گی۔۔۔۔؟ صفات میں سے علم بھی ہے تو علم میں برابری کیسے ہو گی؟

یہ ناممکن اور محال ہے۔ خود قرآن کریم بھی اس کے خلاف دعویٰ کر رہا ہے' حدیث بھی اس کے خلاف دعویٰ کر رہی ہے۔ تو یہ عجیب چیز ہے کہ ان کے دعویٰ کے مطلب کی ایک شق کو بیان کیا جائے۔ اور وہ اس کو ہمارے سر تھوپیں۔۔۔ بھائی! تمہارا یہ دعویٰ تھا اور اس کی وضاحتیں تھیں۔ تم دونوں کا انکار کر دو۔ بس ٹھیک ہے۔۔۔ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ حضور علیہ السلام "اعلم الخلائق ہیں" باقی تمام مخلوقات کا علم مل ملا بھی ایسا ہے جیسے سمندر کے سامنے چڑیا کے چونچ کی تری ہوتی ہے۔۔۔ اور یہی نسبت حضور علیہ السلام کے علم کو اللہ کے علم کے ساتھ ہے۔

نماز کے بعد مصافحہ

سوال: نماز کے بعد مصافحہ کو منع کرتے ہیں؟

جواب: نماز کے بعد مصافحہ کو واجب کس نے کیا ہے جو آپ کر رہے ہیں۔ کسی جائز چیز کو اگر آپ واجب سمجھیں گے تو منع نہیں کیا جائے گا تو اور کیا جائے گا۔۔۔۔ نماز کے بعد مصافحہ کرنا نماز کی سنتوں میں داخل نہیں، سنن وضو میں داخل نہیں، سنن دعا میں داخل نہیں، نبی کریم ﷺ نہیں فرماتے تھے' صحابہ کرامؓ نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے کوئی لازمی چیز نہیں اتفاقاً کر لیا تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ کبھی عقیدت و محبت میں کر لیا تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن جو نہ کرے اس کو آپ ملامت کریں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسے واجب جانتے ہیں۔ تو جو چیز واجب نہ ہو آپ اسے واجب جان کر کرنے لگیں تو روکا نہیں جائے گا تو اور کیا کیا جائے گا؟

تو یہ ساری باتیں وہی تو ہیں کہ جس چیز کو اللہ جائز قرار دیں اسے جائز رکھو۔ جسے واجب قرار دیں اسے واجب رکھو۔ جسے حرام قرار دیں اسے حرام رکھو۔ واجب کو جائز بنا دے اور جائز کو واجب بنا دے۔ اس کا آپ کو حق نہیں۔ مصافحہ کرنا جائز ہے۔۔۔۔ لیکن نہ کرنا بھی جائز ہے جائز کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جب کرو جب بھی مضائقہ نہیں۔ نہ کرو تب بھی مضائقہ نہیں۔ اگر کوئی کرنے پر زور دینے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے واجب جانتا ہے۔ تو اس کو روکا جائے گا اگر نہ کرنے پر زور دینے لگے تو اسے بھی روکا جائے گا۔ کیونکہ اسے ترک پر زور دینے کا حق نہیں' اللہ نے برابر رکھا ہے۔ کرے جب بھی کوئی حرج نہیں' نہ کرے جب بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ روکنا فرض بنا کر کرنے سے ہے اور سنن نماز سمجھ کر کرنے سے روکتے ہیں۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ ہم نے مصافحہ کو رواج سمجھ لیا ہے اور جہاں کسی نے رواج سے روکا وہ کافر۔۔۔ تکفیر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ضروریات دین کا جو انکار کرے وہ کافر ہے۔ تمہارے مصافحہ کو روک دیا وہ کافر، کھانا پکانے کو روک دیا وہ کافر۔۔۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کس مصلحت سے روکا ہے۔ کون سی حد بندی کے لئے روکا، اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ اسی طرح تکفیر کرنا یہ آپ کے لئے بھی جائز نہیں۔

نماز کے بعد دعا ثانیہ

سوال: نماز کے بعد دعاء ثانیہ کو منع کرتے ہیں۔

جواب: دعا ثانیہ کے لازم ہونے کو منع کرتے ہیں۔ جائز ہونے کو تو منع نہیں کرتے۔ دعا ثانیہ اگر اتفاق سے کوئی کرے اور ثانی کیا چیز ہے۔ کوئی دس دفعہ کرلے، چار دفعہ کرلے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔۔۔ لیکن اس کو اس طور پر لازم قرار دے کہ جو نہ کرے تو اسے کہے کہ یہ غلط آدمی ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام لازم سمجھتے ہیں۔ تو یہ لازم تو نہیں۔ غرض جواز ہے، لزوم نہیں۔ جواز کو منع نہیں کیا جاتا، لزوم کو منع کیا جاتا ہے۔

واللہ اعلم بالصّواب

واخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العالمین.

حررہ،

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ شخصیت و کردار

میری سعادت

حضرت مولانا الاستاذ علامہ شبیر احمد صاحبؒ نور اللہ مرقدہ کی سوانح کے سلسلہ میں محترم عاشق عمر صاحب عباسی کا امر ہے کہ میں بھی سوانح نگاروں کی فہرست میں نام درج کرالوں، تعمیل امر سعادت ہے۔ لیکن حضرت علامہ کے مناقب کی فہرست اتنی طولانی ہے کہ ہم جیسے ناقص المعلومات کی چند سطریں اس کے چند عنوانات کا بھی حق ادا نہیں کر سکتیں۔ تاہم یہ کیا کم سعادت ہے کہ ان کے سوانح نگاروں کی فہرست میں میرا نام ہی آجائے۔ گو چند ناتمام سطریں ہی لکھ کر ہو جن میں کوئی خاص ترتیب یا مضمون نگارانہ تشکیل نہیں۔ قلم برداشتہ ذکر محاسن کے طور پر جو بات بے ساختہ ذہن میں آئی اور بات سے بات کی طرف ذہن منتقل ہوا اسے سپرد کاغذ کر دیا ہے۔ پس یہ سوانح یا سوانح کا عرفی نہیں۔ محض ایک تذکرہ ہے جس سے اپنی اور ناظرین کی تسلی اور تنشیط مقصود ہے۔ (وباللہ التوفیق)

ذوق علم کا رنگ

حضرت علامہ میرے استاذ تھے اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مولانا اپنی جامعیت علوم کے ساتھ خصوصیت سے علوم عقلیہ سے طبعی دلچسپی رکھتے تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ کی تصانیف نہ دیکھ لیتا تو نہ معلوم اعتزال کے کس گڑھے میں پڑا ہوا ہوتا۔ لیکن حضرت نانوتویؒ کے علوم نے مجھے سنبھالا علوم عقلیہ سے پہلے سے دلچسپی تھی، حکمت قاسمیہ کے مطالعہ نے معقولات ایمانی کا راستہ دکھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا میں متکلمانہ رنگ کا غلبہ ہوگیا۔ اسی لئے اسلام کے اصول و کلیات سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور اس موضوع پر ان کا کلام نہایت بسیط اور محققانہ ہوتا تھا۔ ابتداء میں معقولات کی کتابیں، حمد للہ وغیرہ زیادہ پڑھاتے تھے۔ مگر آخر میں یہ تمام مشاغل ترک ہو گئے تھے اور صرف کتاب و سنت اور فنون دینیہ کا شغل باقی رہ گیا تھا۔۔۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بالآخر مولانا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی خدمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ قرآن شریف کے تفسیری فوائد لطیف و شیریں زبان اور شگفتہ طرز ادا کے ساتھ ان کی قلمی کاوشوں کا شاہکار اور صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم آپ کی علمی محنتوں کا نچوڑ ہے۔ اس تفسیر و حدیث کی خدمت کے سلسلہ میں بہت سے اہم مسائل کو سہل عنوانات کے ساتھ حل فرما گئے ہیں۔ جس سے حضرت ممدوح کے علم کا اندازہ ہوتا ہے۔

تقریر و بیان کا رنگ

تقریر و بیان آپ کا خاص حصہ تھا۔ قوت استدلال نہایت مضبوط اور مستحکم تھی معمولی سی بات کو اس خوبصورتی اور قوت سے ادا کرتے تھے کہ وہ ایک اہم مگر حل شدہ مسئلہ نظر آنے لگتی تھی اور اس کے تمام پہلو متانت کے ساتھ صاف ہو جاتے تھے۔ تحریر کا ایک خاص رنگ تھا جس میں نہ زمانہ حال کی بے قید شوخی تھی نہ قدیم طرز کی کھنگی، حال کی فصاحت اور ماضی کی متانت سے ملا جلا رنگ تھا، جو آپ کی تحریر کا نمایاں پہلو تھا۔

بلاغت کلام بکلام پر برستی تھی جو ہر طبقہ کے جذبات کو اپیل کرتی تھی۔

طرز تدریس

درس میں مضامین کو جامعیت اور استقصاء کے ساتھ ادا کرتے تھے کلام میں بسط ہوتا تھا مگر غیر مہمل۔ ایک مسئلہ کو اس کے تمام شقوق و جوانب کے ساتھ کھولنے اور صاف کرنے کی روش تھی۔ اس لئے درس میں کمیت پر نہیں کیفیت پر نظر رہتی تھی سبق خواہ تھوڑا ہو مگر تمام ہو اسی لئے درس و تدریس کے سلسلے میں وقت کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے، تنقیح مسئلہ اور اس میں تدبر و تفکر پر وقت زیادہ صرف ہوتا تھا مگر اسباق کا یہ تخلل اس لئے گراں نہ ہوتا تھا کہ ایک ہی دن کے درس میں کیفی طور پر کئی دنوں کے درس کا مواد فراہم ہو جاتا اور کسر نکل جاتی تھی۔

میری ابتدائی تعلیم کے دوران حضرت والد صاحب قبلہ رحمتہ اللہ علیہ سے خود ہی فرمائش کی کہ اسے معقولات میں پڑھاؤں گا اور مجھے فرمایا کہ منطق تجھے میں پڑھاؤں گا چنانچہ خصوصیت سے صغریٰ کبریٰ شروع کرائی اور مرقات تک پہنچے، گو یہ کتابیں بیچ میں رہ گئیں۔ لیکن جس قدر پڑھایا اتنے ہی سے فن سے کافی مناسبت پیدا ہو گئی کیونکہ ان کی ابحاث کا نقطہ نظر کتاب نہیں ہوتی تھی بلکہ فن ہوتا تھا اور طلبہ کی حسب استعداد فن سے مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔

احقر جب کہ متوسط کتابیں ہدایہ، جلالین وغیرہ پڑھتا تھا تو میں نے خود فرمائش کی کہ ترجمہ قرآن شریف پڑھا دیجئے۔ دوسرے طلبہ بھی بکثرت شائق اور ملتجی ہیں۔ فرمایا کہ اول اول تو طلبہ شوق میں نام لکھا دیتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے آخر کار جماعت صفر کے درجہ میں رہ جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کم از کم مجھ پر تو اطمینان فرمائیے۔ نہ میں ناغہ کروں گا نہ بد شوقی دکھلاؤں گا، مگر آپ بھی پابندی فرما دیں، وعدہ فرما لیا اور بڑی شفقت سے قرآن کا درس شروع کرا دیا۔ ابتداء میں سو، سوا سو طلبہ کا جمگھٹا جمع ہو گیا، مگر آخر کار وہی ہوا کہ طلبہ گھٹنے شروع ہوئے اور آخر میں تنہا رہ گیا، قدرتی طور پر مولانا کی تدریسی امنگ بھی کم ہو گئی اور ناغے بکثرت ہونے لگے۔ مگر میں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ اس گھنٹہ میں مولانا جہاں بھی ہوتے وہیں پہنچ جاتا، خواہ مکان پر یا دفتر میں یا کتب خانہ مدرسہ میں اور وہ گھنٹہ میں ان کے پاس بیٹھ کر خاموشی سے گزار دیتا تھا، کبھی پڑھا دیتے کبھی عذر فرما دیتے مگر میں یہ وقت ان کے پاس پورا ہی کر دیتا۔ آخر کار ایک دن فرمایا کہ بھائی میں ہار گیا اور تو جیت گیا، تو نے

اپنی بات پوری کر دکھائی۔

کمال اخلاق

اخلاقی طور پر ایک خاص وصف یہ تھا جو بہت ہی اونچا تھا کہ ظاہر و باطن میں یکسانی تھی۔ وہ اپنے قلبی جذبات کے چھپانے یا ان کے خلاف اظہار پر قدرت نہ رکھتے تھے اگر کسی سے خوش ہیں تو ظاہر و باطن خوش اور اگر ناخوش ہیں تو اعلانیہ اس کا اظہار ان کے چہرہ بشرہ سے ہو جاتا تھا اور کہہ بھی دیتے تھے دار العلوم کے معاملات میں اگر ذمہ داروں سے انہیں کوئی گرانی پیش آتی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ مہتمم دار العلوم (جو ان کے بڑے بھائی بھی تھے) کچھ رنجش ہو جاتی تو اکثر روٹھ کر بیٹھ جاتے یا سفر میں چلے جاتے انہیں منانے اور راضی کرنے کے لئے اکثر میں مامور ہوتا تھا کیونکہ مجھ پر شفقت زیادہ فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ خفا ہو کر تھانہ بھون تشریف لے گئے تو یہ احقر وہاں گیا اور راضی کر کے لے آیا۔۔۔ ایک دفعہ ناخوش ہو کر گھر بیٹھ رہے اور مدرسہ میں آنا جانا ترک کر دیا' حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے طے فرمایا کہ تو ہی جا کر لا سکتا ہے۔

میں حاضر ہوا اور عرض معروض کی تو راضی ہو گئے اور دار العلوم میں چلے آئے۔ طبیعت اس قدر صاف تھی کہ جس وقت بھی بات ان کے ذہن میں آجاتی تھی تو اسی لمحہ گرانی رفع ہو کر حقیقۃً بشاشت چہرہ پر نمودار ہو جاتی اور ایسے خوش اور منفرح ہو جاتے کہ گویا کوئی گرانی ہی نہیں۔ ایک عالم دین کے لئے یہ وصف ایک عظیم مقام ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو اور بے تکلف نہیں بلکہ بلا تصنع و بناوٹ اس کی قلبی رفتار ہی یہ ہو۔

حق تعالیٰ نے علم و فضل کا ایک وافر حصہ عطا فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی بارہا دیکھا کہ انکے بڑوں۔ نے اگر بھری مجلس میں بھی انہیں تہدید آمیز لہجہ سے کوئی بات کہی تو اف کبھی نہ کرتے تھے' اگر بات ان کے نزدیک قابل تسلیم بھی نہ ہوتی تب بھی اپنے اکابر کے حقوق کی رعایت فرماتے۔

حق پسندی

قلبی جذبات کو بالکل صفائی سے کہہ ڈالتے خواہ وہ اپنی ہی کوئی کمزوری ہو۔۔۔ ایک بار ناخوش ہو کر گھر بیٹھ گئے ہیں۔ حسب معمول منانے کے لئے گیا تو غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ بھائی نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے' جو اس طرح سے مجھ سے قطع نظر کر لی تو سن لو کہ اس قطع نظر کرنے پر میرے دل میں دو قسم کے جذبے پیدا ہوئے اک جذبہ للّٰہیت سے اور ایک نفسانیت سے۔ نفسانیت سے تو یہ کہ اگر انہوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے تو میں انہیں اپنی زندگی باور کراؤں؟ اور اس کا یہ اور یہ طریقہ ہوتا جو انہیں میری زندگی سمجھوا دیتا۔ دوسرا جذبہ للّٰہیت سے پیدا ہوا اور وہ یہ کہ میں دیوبند سے کہیں باہر جا کر صحیح مسلم کی شرح لکھنے میں لگ جاؤں۔ میری طرف سے

کچھ بھی ہوتا رہے نہ میں یہاں رہوں گا نہ یہ روز روز کی کوفت اٹھانی پڑے گی۔

میں نے عرض کیا کہ حضرات ان دونوں جذبوں میں سے کون سے کو آپ نے ترجیح دی ہے؟ فرمایا للّٰہیت والے جذبے کو۔ میں نے کہا کہ الحمد للہ مگر میں نے کہا کہ حضرت آپ کے لئے تو اس میں بلاشبہ اجر ہے اور یہ نیت یقیناً پاک ہے مگر اس پر بھی تو دھیان فرمائیے کہ کیا اس قسم کی چھوٹی چھوٹی طبعی ناگواریوں سے جماعتی کام کا ترک کر دیا جانا مناسب ہوگا جب کہ کاموں کا دارومدار آپ ہی جیسے حضرات کے اوپر ہے اسی طرح کل کو جماعت کے دوسرے بزرگ بھی ایسی ہی وقتی اور ہنگامی ناگواریوں کے سبب جو کبھی نہ کبھی آپ کی طرف سے اس میں پیش آجاتی ہیں یہی فیصلے کرلیں کہ ہم کو کام چھوڑ دینا چاہئے تو فرمائیے کہ یہ کام آخر کس طرح چلے گا؟ اور اسے کون سنبھالے گا؟ میرے نزدیک تو آپ نے یہ اپنے کو یکسو کرنے کا فیصلہ نہیں فرمایا' بلکہ اس جماعتی کام کو ختم کر دینے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے؟

بس اتنا سن کر ایک دم چہرے پر بشاشت آگئی اور فرمایا ہاں یہ تو نے صحیح کہا' بس! میں نے اب یہ دوسرا جذبہ بھی دل سے نکال دیا اور کل سے دار العلوم پہنچ کر کام کروں گا' چنانچہ علی الصبح حسب وعدہ تشریف لائے اور ایسے انداز سے آئے کہ گویا کوئی بات پیش ہی نہیں آئی تھی۔

یہ در حقیقت وہی ظاہر و باطن کی یکسانی' قلب کی صفائی اور حقیقت پسندی کا اثر تھا کہ دل میں کبھی کچھ نہیں رکھتے تھے۔

انداز تحریر

بہر حال علم کے ساتھ حق تعالیٰ نے یہ خاص وصف عطا فرمایا تھا جس نے ان کی بڑائی دلوں میں بٹھادی تھی' قلبی طور پر استغناء اور ناز کی کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا۔ کام کے سلسلہ میں جب تک کہ دوسروں کی طرف سے طلب اور کافی طلب ظاہر نہ ہوتی تھی' متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ کتب بینی اور مطالعہ کا شغف بہت زیادہ تھا خود بھی کبھی کبھی فرماتے تھے کہ کیا کام کروں میں تو کتابوں کا کیڑا بن کر رہ گیا ہوں۔ پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ تفسیری فوائد اور شرح مسلم جیسے دو اہم اور عظیم الشان کام یادگار زمانہ چھوڑے ہیں۔ اسکے علاوہ بھی اعلیٰ ترین تصانیف "العقل والنقل" "الاسلام"۔ "الشہاب الثاقب" "صدائے ایمان" "اعجاز القرآن"۔ اور دوسرے مفید ترین رسائل و مسائل پر قلم زنی فرمائی اور حق یہ ہے کہ بیان مسائل کا حق ادا کر دیا ہے۔ حضرت علامہ الاستاذ الکشمیری نور اللہ مرقدہ انہیں اس لحاظ سے لسان الغیب فرمایا کرتے تھے۔

ذکاوت و ذہانت طبعی تھی' فہم تیز اور طبیعت سادہ تھی۔ علم کی بنیاد فہم ہی ہے جب اسے کتاب و سنت میں استعمال کیا گیا تو علم کا دوچند ہو جانا قدرتی امر تھا۔ تحریر کی شگفتگی مسلم تھی' ایک ہی

مضمون کئی آدمی لکھتے اور اسی کو وہ قلم بند فرماتے تو سب پر ان کی تحریر کی شگفتگی نمایاں رہتی تھی۔
حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے واپس پر مالٹا کے بعد ترک موالات کا استفتاء کیا گیا۔ حضرت نے اپنے تین ارشد تلامذہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمتہ اللہ علیہم کے سپرد کیا کہ فتویٰ یہ حضرات مرتب کریں اور غایت احتیاط و تدین سے فرمایا کہ انگریزوں کے بارے میں مجھے اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے۔ مجھ پر ان کے بغض و عداوت کا غلبہ ہے ہو سکتا ہے کہ فتویٰ میں جذبات کا رنگ آجائے۔ اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى.

"تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف سے کام نہ لو' انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے"۔

اس لئے اس استفتاء کا جواب آپ تینوں حضرات لکھیں۔ چنانچہ تینوں حضرات نے قلم بند فرمایا اور حضرت نے تینوں کے جوابات ملاحظہ فرما کر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے جواب کے بارے میں فرمایا کہ جواب تو ماشاء اللہ سب ہی بہتر اور جامع ہیں۔ لیکن بھائی میں اگر لکھتا تو وہ اس کے قریب ہوتا جو شبیر نے لکھا ہے۔

بہر حال ان ی تحریر کی جامعیت شگفتگی اور بلاغت کو خود ان کے اکابر بھی مانتے تھے اور اس کی کافی داد دیتے تھے۔

نظم و شعر

مولانا نظم اور شعر و شاعری سے بھی عاری نہ تھے' گو اس کا ذوق نہ تھا' چند مواقع ایسے بھی پیش آئے کہ جذبات دلی کی ترجمانی آپ نے نظم میں فرمائی۔ حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کی وفات پر "نالہ دل" کے نام پر ایک نظم لکھی جو بہت پسند کی گئی اور ایک بار میرے متعلق ایک نظم قلم بند فرمائی جس کا واقعہ یہ ہوا کہ میرا رشتہ رام پور میں مولوی محمود صاحب مرحوم رام پوری کے یہاں ہو چکا تھا' نکاح ابھی تک نہیں ہوا تھا کہ یہ میری اہلیہ جے پور اپنے تایا کے پاس گئی ہوئی تھی اور شدید علیل ہوئی' حالت نازک دیکھ کر غلطی' یا غلط فہمی سے وہاں سے انتقال کا تار دے دیا جس سے یہاں دیو بند میں صف ماتم بچھ گئی' تیسرے دن تار پہنچا کہ وہ انتقال کا تار غلط تھا۔

اس پر بساط شادی بچھ گئی اور تہنیتی جلسے گھروں میں اور مدرسہ میں ہونے شروع ہو گئے ـــــ تقریباً پندرہ بیس دن تک جلسہ ہائے شیرینی و تہنیت کا سلسلہ قائم رہا۔ ان مجالس میں مختلف حضرات کی طرف سے مبارک بادی کی نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں' اس سلسلہ میں حضرت مولانا نے بھی ایک جلسہ میں نہایت بلیغ نظم لکھی اور سنائی' جس کا واقعاتی شعر یہ تھا۔

غلط ایک تار برقی پہنچی تھی جے پور سے، جس نے
جلایا خرمن مقصود کو برق تپاں ہوکر

اسی طرح کبھی کبھی کسی خاص محرک کے ماتحت نظم بھی کہہ لیتے تھے، مگر یہ چیز ذوق کے درجہ میں نہ تھی صرف ضرورت کے درجہ میں تھی اور طبیعت اس سے عاری اور عاجز نہ تھی۔۔۔۔۔ بہرحال حضرت علامہ کی ہستی تقریر، تحریر، نظم ونثر اور علم وفضل کی ایک مجسم تصور تھی، جس کے اٹھ جانے کے بعد یہ مخصوص کمالات بھی گویا اٹھ گئے۔ یوں حق تعالیٰ اپنے دین کا خود محافظ ہے اور وہ شخصیتیں پیدا فرماتا رہے گا جو اس کے دین اور اس کے نبی کے علم کو سنبھالتے اور تازہ کرتے رہیں گے لیکن جن کے سامنے علم وفضل کی ہستیاں اٹھتی ہیں ان کی نگاہوں میں تو اندھیرا ہو جاتا ہے اور وہ جس قسم کے فضل وکمال سے مانوس اور مالوف ہوتے ہیں اس کے اٹھنے سے یہ پسماندہ بالیقین یتیم رہ جاتے ہیں۔

سیاسی خدمات

آخر میں سیاسی راہوں پر ان سے جو مہم کام انجام پائے یہ بھی فی الحقیقت ان کی زندگی کا ایک شاہکار تھا۔ یہ بات تو الگ ہے کہ ان کی رائے سے بہت سے اکابر کو اختلاف تھا۔ اختلاف رائے اپنی جگہ پر ہے اور اس میں ہر شخص اپنی حجت سے مجبور ہے لیکن عزم وعمل کی جو طاقتیں مولانا ممدوح سے پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد ظاہر ہوئیں دوسرے انہیں خلاف توقع سمجھتے تھے مگر حق تعالیٰ نے یہ حصہ ان کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے پاکستان بننے کے بعد دین اور علماء دین کو کافی سنبھالا۔ قدرت نے تنہا انہیں وہاں کی مرکزی شخصیت بنا دیا اور اس سے وہ کام لیا جو مرکزی شخصیتوں سے لیتا جاتا رہا ہے، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو وہاں کے کاموں کی نوعیت اور ہوتی۔ یہاں کے لوگ ان کی رائے سے تو اختلاف رکھتے مگر ان کے جذبات اور صدق و خلوص کی قدر بھی کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر اختلاف رائے کے حیلہ سے حضرت ممدوح وہاں نہ پہنچتے تو دین کا جو کام ہوا بظاہر اسباب وہ نہ ہو سکتا۔

خراج تحسین

غرض مجموعی حیثیت سے حضرت علامہ کی شخصیت ایک ممتاز ترین شخصیت تھی جس کے علم وفضل کا سکہ ملک بھر نے مانا ہوا تھا۔ اور بیرونی ممالک میں بھی اس کا شہرہ پہنچا ہوا تھا جس کے سامنے اہل علم وفضل سر جھکانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔

ان کے تفسیری فوائد کا حکومت افغانستان کی طرف سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا جانا اور ان فوائد کا انتخاب عمل میں آنا درحقیقت ان کے فضل وکمال کے سامنے جھک جانا تھا، فتح الملہم کو علامہ زاہد

کوثری مشہور فاضل مصر کا خراج تحسین ادا کرنا ہی انکے فضل و کمال کا اعتراف تھا۔ بہر حال جہاں جہاں بھی ان کے فضل و کمال کا کوئی اثر پہنچا وہیں اعتراف و تسلیم کا شیوہ بھی اختیار کیا گیا۔ اس طرح حضرت مولانا کی شخصیت صرف ہندوستان ہی کے لئے مایہ ناز نہ تھی بلکہ دنیائے اسلام کے لئے سرمایہ ناز تھی۔

تعمیلِ حکم

اگر اس طرح سے قلم چلاتا ہوا چلا جاؤں جس طرح سے وہ بے ساختہ چل رہا ہے اور اس مجلس میں چند سطور سپر قلم ہو گئیں تو ممکن ہے کہ قلم چلتا ہی رہے اور بات پر بات یاد آتی چلی جائے مگر سوئے اتفاق سے وقت ختم ہو گیا۔ میں بہار کے سفر کے لئے پابرکاب ہوں‘ ریل کا وقت آ گیا اس لئے قلم کو روک دینا پڑا‘ اگر قلم چلتا ہی رہتا تب بھی مناقب کی طولانی فہرست پوری نہ ہو سکتی اور اسے رک جانا پڑتا۔ اس لئے اگر رک بھی گیا تو مضائقہ نہیں‘ تکمیل فہرست جب ہوتی نہ اب اس لئے یہ سطور بے ساختگی کے ساتھ حافظہ سے باہر آ گئیں اور محترم عاشق صاحب کے حکم کی تعمیل ہو گئی اور میں بھی اس حیلہ سے مولانا کے سوانح نگاروں کی فہرست میں شامل ہو گیا‘ جو میرے فخر کے لئے کافی ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا۔

اے ربّ ہمارے‘ مت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم یا خطا کی ہم نے“۔

آمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نعمان پبلشنگ کمپنی
اردو بازار، لاہور